DAMAGE BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222109

UNIVERSAL
LIBRARY

OUP—2273—19-11-79—10,000 Copies.

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No ۸۹۱۶۳۳۳ Accession No 13684

Author

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

نصیب تھے کہ اُن کی رقمیں دبتی نہ تھیں۔ ایسا جذاکش آدمی بھی لم ہوگا۔ گھڑی بھر رات رہے جمنا اشنان کرنے چلے جاتے اور طلوع کے قبل مندروں میں درشن کرکے دوکان پر پہنچ جاتے۔ بلیم کو ضروری کام سمجھا کر تقاضے پر چلے جاتے اور تیسرے پہر لوٹتے۔ کھانا کھا کر پھر دوکان پر آجاتے اور آدھی رات تک جمے رہتے۔ تھے بھی دیو قامت۔ کھانا صرف ایک بار کھاتے مگر خوب ڈٹ کر۔ دو ڈھائی سو مگدر کے ہاتھ ابھی تک پھیر لے جاتے تھے۔ امرکانت کی ماں اُس کے بچپن ہی میں مر چکی تھی۔ سمرکانت نے دوستو [illegible] سے دوسری شادی کر لی تھی۔ اس سات سال کے بچے نے بڑے جوش سے نئی ماں کا خیر مقدم کیا لیکن اُسے جلد معلوم ہو گیا کہ نئی ماں اس کی ضد اور شرارتوں کو اس عفو کی نگاہ سے نہیں دیکھتی جس کی یاد اس کے دل میں ابھی تازہ تھی۔ وہ اپنی ماں کا اکلوتا لاڈلا لڑکا تھا۔ بڑا ضدی نہایت خود پسند اور بہت ہی شوریدہ سر۔ جو دھن سما جاتی اُسے پورا کر کے چھوڑتا۔ نئی ماں بات بات پر ڈانٹتی تھی۔ یہاں تک کہ اُسے ماں سے نفرت ہو گئی۔ جس بات کو وہ منع کرتی اُسے وہ ضد آکر کرتا۔ باپ سے بھی گستاخی کرتا۔ باپ اور بیٹے میں الفت کا وہ رشتہ نہ رہا۔ لالہ جی جو کام کرتے امر اس کا الٹا ہی کرتا۔ انھیں ملائی سے رغبت تھی۔ بیٹے کو ملائی بالکل نہ بھاتی تھی۔ باپ دیندار آدمی تھے۔ لڑکا اسے ریاکاری سمجھتا تھا۔ وہ پرلے سرے کے حریص تھے۔ لڑکے کی نگاہ میں دولت حقیر چیز تھی۔

لڑکا عموماً باپ کے نقش قدم پر چلتا ہے۔ مہاجن کا لڑکا مہاجن، پنڈت کا پنڈت، وکیل کا وکیل، کسان کا کسان ہوتا ہے۔ مگر یہاں اس مغائرت نے مہاجن کے لڑکے کو مہاجن کا دشمن بنا دیا۔ باپ نے جس بات کو منع کیا [illegible] پابندی بیٹے پر لازم ہو گئی۔ مہاجن کے ہتھ کنڈے اور ابا فریب

کے علم میں روز ہی آتی رہتی تھیں۔ اُسے اس روزگار ہی سے نفرت ہو گئی تھی خیریت یہ ہوئی کہ اس کے کوئی سوتیلا بھائی نہ ہوا ورنہ شاید وہ گھر سے نکل گیا ہوتا سمرکانت اپنی دولت کو لڑکے سے زیادہ بیش قیمت سمجھتے تھے۔ لڑکے کے لئے تو دولت کی ضرورت نہ تھی مگر دولت کے لئے لڑکے کی ضرورت تھی۔ نئی ماں کا عندیہ تو یہی تھا کہ اس کے حقوق کو پامال کر کے اپنی چہیتی، اپنی لاڈلی نینا کے لئے راستہ صاف کر دے لیکن سمرکانت اس سے متفق نہ ہوئے۔ لطف یہ تھا کہ نینا کو بھائی سے محبت تھی اور امرکانت کے دل میں بھی گھر والوں کے لئے کوئی نازک جگہ تھی تو وہ نینا کے لئے تھی۔ نینا کی صورت بھائی سے اتنی مشابہ تھی گویا جیسے وہ اس کی سگی بہن ہو اس مشابہت نے جسم سے گذر کر دلوں میں بھی یکرنگی پیدا کر دی تھی۔ ماں باپ کی سرد مہری کو اس بے پایاں جنس کے سامنے وہ بھول جایا کرتا تھا۔ گھر میں کوئی اور لڑکا نہ تھا اور نینا کے لئے ایک رفیق کی ضرورت تھی۔ ماں چاہتی تھی نینا بھائی سے دور دور رہے۔ وہ امرکانت کو اس قابل نہ سمجھتی تھی کہ اس کی لڑکی کے ساتھ کھیلے۔ لیکن نینا کی طفلانہ فطرت کو یہ مصلحت اندیشیاں نہ بدل سکیں۔ بھائی بہن میں یہ موافقت یہاں تک بڑھی کہ بالآخر نینا بھی ماں کی نظروں سے گر گئی اور بدنصیب ماں لڑکی کی آرزو لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئی۔

اب نینا گھر میں اکیلی رہ گئی۔ سمرکانت کم سنی کی شادیوں کی برائیاں سمجھتے تھے۔ اپنی شادی بھی نہ کی۔ بڑھاپے کی شادیوں کی برائیاں بھی سمجھتے تھے کانت کا بیاہ کرنا لازم ہو گیا۔ اب اس کی مخالفت کون کرتا۔ امرکانت کی عمر سال سے کم نہ تھی لیکن جسم اور دماغ کے اعتبار سے ابھی عالم طفلی جس پودے کو کبھی روشنی اور ہوا نہ ملی ہو کیسے بڑھتا، کیسے پھولتا۔

بڑھنے اور پھلنے کے دن بری صحبتوں میں نکل گئے۔ دس سال پڑھتے ہو گئے تھے اور ابھی جوں توں کر کے آٹھویں جماعت میں پہنچا تھا۔ لیکن جس برادری میں روزگار ہی خاص پیشہ ہو وہاں دولت علم سے برتر سمجھی جاتی ہے۔ لکھنؤ کے ایک متمول خاندان سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔ سمرکانت کی رال ٹپک پڑی۔ لڑکی کے خاندان میں بیوہ ماں کے سوا کوئی قریبی رشتہ دار نہ تھا۔ اور دولت کی بھی کوئی کمی نہ تھی ایسی لڑکی بھاگوانوں ہی کو ملتی ہے۔ اُس کی ماں نے بیٹے کی آرزو بیٹی سے پوری کی تھی۔ نفس کشی کی جگہ نفس پروری، نری کی جگہ تندی انکساری کی جگہ خود پروری، نزاکت کی جگہ جسارت کا اُسے خوگر بنا دیا تھا۔ سکڑنے اور سمٹنے کا اُس نے ریاض نہ کیا تھا۔ اور یہ مردانہ اوصاف کی نازنین بیاہی گئی زنانہ اوصاف کے نوجوان سے جس میں مردانگی کا شائبہ بھی نہ تھا۔ اگر دونوں کے کپڑے بدل دیے جاتے تو ان کی ہیئت بدل جاتی۔

شادی ہوئے دو سال ہو چکے تھے مگر دونوں میں خلوص کا نام بھی نہ تھا دونوں اپنے اپنے راستے پر چلے جا رہے تھے۔ دونوں کے خیالات الگ، طور طریق الگ، دنیا الگ۔ جیسے دو مختلف آب و ہوا کے مخلوق ایک ہی پنجرے میں بند کر دیے گئے ہوں۔ ہاں شادی کے بعد ہی امرکانت کی زندگی میں احتیاط اور عمل کی لگن پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی سیرت میں جو حجاب، بے توجہی اور بیزاری تھی وہ رخصت ہوتی جاتی تھی تعلیم سے اسے رغبت ہو گئی تھی۔ حالانکہ لالہ سمرکانت اب اُسے گھر کے کام میں جوتنا چاہتے تھے کیونکہ وہ تار دار پڑھنے لگا تھا اور اس سے زیادہ لیاقت کی اُن کے نزدیک کوئی ضرورت نہ تھی۔ مگر امرکانت اس مسافر کی طرح جس نے سارا دن بھکن ٹلنے میں کاٹ دیا ہو اب اپنی منزل پر پہنچنے کے لئے دونی رفتار سے قدم بڑھا رہا تھا۔

(۳)

اسکول سے لوٹ کر امرکانت حسب معمول اپنی مختصر سی کوٹھری میں جا کر چرخے پر بیٹھ گیا۔ اس وسیع مکان میں جہاں ایک برات ٹھہر سکتی تھی اس نے اپنے لئے یہی ایک چھوٹی سی کوٹھری پسند کی تھی۔ ادھر کئی مہینوں سے اُس نے دو گھنٹے روز سوت کاتنے کا عہد کر لیا تھا اور باپ کے منع کرنے پر بھی اُسے نبھائے جاتا تھا۔

مکان تھا بہت وسیع مگر مکینوں کی آسائش کے لئے اتنا موزوں نہ تھا جتنا دولت کی حفاظت کے لئے، نیچے کی منزل میں کئی بڑے بڑے کمرے تھے جو گودام کے لئے بہت مناسب تھے۔ ہوا اور روشنی کا کہیں راستہ نہیں۔ جس راستہ سے ہوا اور روشنی آسکتی ہے اُسی راستے سے چور بھی آسکتا ہے۔ چور کا اندیشہ اس کی ایک ایک اینٹ سے ٹپکتا تھا۔ اوپر کی دونوں منزلیں ہوادار اور کھلی ہوئی تھیں۔ کھانا نیچے پکتا تھا۔ سونا بیٹھنا اوپر ہوتا تھا۔ سامنے سڑک پر دو کمرے تھے۔ ایک میں لالہ جی بیٹھتے تھے، دوسرے میں منیم۔ کمرے کے آگے ایک سائبان تھا جس میں گائیں بندھتی تھیں۔ لالہ جی دیندار آدمی تھے۔

امرکانت سوت کاتنے میں محو تھا کہ اس کی چھوٹی بہن نینا آ کر بولی، کیا ہوا بھیا فیس جمع ہوئی یا نہیں۔ میرے پاس بیس روپے ہیں لے لو۔ میں کل اور کسی سے مانگ لاؤں گی۔"

امرکانت نے چرخا چلاتے ہوئے کہا، "آج ہی تو فیس جمع کرنے کی تاریخ تھی نام کٹ گیا اب روپئے لے کر کیا کروں گا۔"

نینا روپ رنگ میں اپنے بھائی سے اتنی ملتی تھی کہ امرکانت اس کی

پھینک دیئے تھے اور وہ ساری کوٹھری میں بکھرے پڑے تھے۔ دونوں میں سے ایک بھی چننے کا نام نہ لیتا تھا۔ دفعتاً لالہ سمرکانت آکر دروازے پر کھڑے ہو گئے نینائی سسکیاں بند ہو گئیں اور امرکانت جیسے تلوار کا وار کھانے کے لئے اپنے دل کو تیار کرنے لگا۔ لالہ جی دوہرے بدن کے مہیم آدمی تھے۔ سر سے پاؤں تک سیٹھ۔ وہی گنجا سر، وہی پھولے ہوئے گال، وہی نقارے کی سی توند۔ چہرے پر اعتدال کی سرخی تھی اور آنکھوں میں حرص اور خود غرضی کی جھلک۔ تند لہجے میں بولے۔ اچھا چرخا چل رہا ہے۔ اتنی دیر میں کتنا سوت کاتا۔ ہوگا کوئی دو چار روپے کا؟"

امرکانت نے استغنا کی شان سے کہا "چرخا روپیہ کمانے کی مشین نہیں ہے۔"

"تو اور کس مرض کی دوا ہے؟"

"تہذیب نفس کی"

سمرکانت کے زخم پر گویا نمک چھڑکا گیا "آج یہ نئی بات معلوم ہوئی تب تو تم ضرور ہی روشن ضمیر ہو گئے۔ مگر تہذیب نفس کے ساتھ ساتھ ..... کام کرنے کی ضرورت شاید تمہیں نظر نہیں آتی۔ دن بھر اسکول میں رہو، وہاں سے لوٹو تو چرخے پر بیٹھو۔ شام کے وقت جلسوں میں جاؤ۔ رات کو مدرسہ نسواں جاری ہو تو گھر کا کام کون کرے۔ میں بیل نہیں ہوں۔ تمہیں لوگوں کے لئے جنجال میں پھنسا ہوا ہوں۔ کچھ اپنے اوپر لاد کر نہ لیجاؤں گا آخر تمہیں کچھ تو میری مدد کرنی چاہئے۔ بڑے اصول پرور بنتے ہو۔ کیا یہی تمہارا اصول ہے کہ بوڑھا باپ مرا کرے اور جوان بیٹا اس کی بات بھی نہ پوچھے۔"

امر کانت نے نا سعادت مندانہ انداز سے کہا۔ "میں تو آپ سے بار بار کہہ چکا آپ میرے لئے ذرا بھی پریشان نہ ہوں۔ مجھے دولت کی ضرورت نہیں۔ آپ کا بھی عالم ضعیفی ہے۔ اطمینان سے بیٹھ کر ایشور کو یاد کیجئے۔"

سمر کانت اور بھی طیش میں آکر بولے۔ "دولت نہ رہے گی لالہ تو دربدر بھیک مانگو گے۔ یوں چین سے بیٹھ کر چرخہ نہ چلاؤ گے۔ یہ تو نہ ہوگا کہ میرا ہاتھ بٹاؤ۔ پست ہمت آدمیوں کی طرح کہنے لگے۔ مجھے دولت کی ضرورت نہیں گون ہے جو دولت سے بے نیاز ہے؟ سادھو سنیاسی تک تو پیسوں پر جان دیتے ہیں۔ دولت بڑی کاوش سے ملتی ہے۔ جس میں ہمت اور ارادہ نہیں وہ کیا دولت کمائے گا۔ بڑے بڑے تو دولت کے آستانے پر ماتھے رگڑتے ہیں۔ تم کس کھیت کی مولی ہو۔"

امر نے اسی شوریدہ سری سے جواب دیا۔ "دنیا دولت کی غلامی کرے مجھے اس کی خواہش نہیں۔ مزدور بھی اپنے مذہب اور ایمان کو قائم رکھ کر زندہ رہ سکتا ہے۔ کم سے کم میں اپنی زندگی میں اس کا امتحان کرنا چاہتا ہوں۔"

لالہ سمر کانت کو بحث کرنے کی فرصت نہ تھی۔ زچ ہو کر بولے۔ "اچھا بابا خوب جی بھر کر امتحان کر لو لیکن روز روز روپے کے لئے میرا سر نہ کھایا کرو میں اپنی گاڑھی کمائی تمہارے شوق کی نذر نہیں کر سکتا۔"

لالہ جی چلے گئے۔ نینا کہیں تنہائی میں جا کر خوب رونا چاہتی تھی مگر ہل نہ سکتی تھی اور امر کانت ایسا افسردہ خاطر ہو رہا تھا گویا زندگی سے بیزار ہے۔

اسی وقت دھری نے اوپر سے آکر کہا۔ "بھیا تمہیں بہو جی بلا رہی ہیں۔"

امر کانت نے بگڑ کر کہا۔ "جا کہہ دے مجھے فرصت نہیں ہے۔ چلی وہاں

سے بہو جی بلا رہی ہیں۔"

لیکن جب مہری پیچھے کی طرف لوٹی تو اس نے اپنی زود رنجی پر شرمندہ ہو کر کہا۔ "میں نے تمھیں کچھ نہیں کہا ہے سلو۔ کہدو ابھی آتا ہوں۔ تمھاری رانی جی کیا کر رہی ہیں؟"

سلو کا پورا نام تھا کوشلیا۔ سیتلا میں شوہر، لڑکا اور ایک آنکھ جاتی رہی تھی تب سے اس کے دماغ میں کچھ فتور آ گیا تھا۔ رونے کی بات پر ہنستی اور ہنسنے کی بات پر روتی۔ گھر کے سب آدمی، یہاں تک کہ نوکر چاکر بھی، اس کو ڈانٹتے رہتے تھے۔ صرف امر کانت اسے انسان سمجھتا تھا۔

سلو خوش ہو کر بولی: "بیٹھی کچھ لکھ رہی ہیں۔ لالہ جی بگڑ رہے ہیں۔ اسی لئے تمھیں بلا بھیجا۔"

امر کانت گویا گر پڑنے کے بعد گرد جھاڑتا ہوا، چہرے پر خوشی کا رنگ بھرے اوپر چلا۔ سکھدا اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی اسے دیکھ کر بولی "تمھارے تو اب درشن ہی نہیں ہوتے۔ اسکول سے آ کر چرخا لے بیٹھتے ہو کیوں نہیں مجھے میرے گھر بھیج دیتے۔ اب کے آئے چھ مہینے ہو گئے میعاد پوری ہو گئی۔ اب تو رہائی ہونی چاہیے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک طشتری میں کچھ نمکین اور مٹھائی لا کر میز پر رکھدی اور امر کو لیجا کر کرسی پر بٹھا دیا۔

یہ کمرہ گھر کے اور سب کمروں سے بڑا، ہوادار اور سجا ہوا تھا۔ دری کا فرش تھا اس پر قرینے سے کئی گدے دار اور سادی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں بیچ میں ایک چھوٹی سی نقشین گول میز تھی۔ شیشے کی الماریوں میں مجلد کتابیں سجی ہوئی تھیں۔ طاقوں پر طرح طرح کے کھلونے تھے۔ ایک گوشے میں ایک [illegible]

میز پر ہار مونیم رکھا ہوا تھا۔ دیواروں پر دھرندھر، روی ورما اور کئی بنگالی مصوروں کی تصویریں زیب دے رہی تھیں۔ دو تین پرانی تصویریں بھی تھیں۔ کمرے کی سجاوٹ سے خوش مذاقی اور فارغ البالی کا اظہار ہوتا تھا۔

دو سال ہوئے امر کی شادی سکھدا سے ہوئی تھی۔ دو بار تو سکھدا ایک ایک مہینے رہ کر چلی گئی تھی۔ اب کے آئے چھ مہینے ہو گئے تھے۔ مگر ان میں اب تک محض سطحی محبت تھی۔ گہرائیوں میں دونوں ایک دوسرے سے جدا تھے سکھدا نے کبھی افلاس نہ جانا تھا۔ زندگی کی مشکلیں نہ سہی تھیں۔ جانے مانے راستے کو چھوڑ کر انجان راستے پر پاؤں رکھتے ڈرتی تھی۔ عیش اور نمود کو وہ زندگی کی سب سے بیش بہا جنس سمجھتی تھی اور اُسے سینے سے لگائے رکھنا چاہتی تھی امر کانت کو وہ گھر کے کاروبار کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتی رہتی تھی کبھی سمجھاتی تھی، کبھی روٹھتی تھی، کبھی جھگڑتی تھی۔ ساس کے نہ رہنے کے باعث وہ ایک طرح سے گھر کی مالکہ ہو گئی تھی۔ باہر کے مالک لالہ سمر کانت تھے۔ بھیتر کا انتظام سکھدا ہی کے ہاتھوں میں تھا۔ مگر امر کانت اُس کی خواب گاہی فہمائشوں کو ہنسی میں ٹال دیتا تھا۔ اُس پر اپنا وقار جمانے کی یا اپنا ہم خیال بنانے کی کبھی کوشش نہ کرتا۔ اُس کی عیش پسندی گویا کھیتوں کے ہوّے کی طرح اُسے ڈراتی رہتی تھی کھیت میں ہریالی تھی۔ دانے تھے لیکن وہ ہوا بے حس و حرکت دونوں ہاتھ پھیلائے کھڑا اُس کی طرف گھورتا رہتا تھا، اپنی امیدوں اور مایوسیوں، کامیابیوں اور ناکامیوں کو وہ سکھدا سے برائی کی طرح چھپاتا تھا۔ کبھی کبھی اُسے گھر لوٹنے میں دیر ہو جاتی تو سکھدا طعنوں سے محبت کا اظہار کرتی۔ ہاں یہاں کون اپنا بیٹھا ہوا ہے۔ باہر کی دلچسپیاں گھر میں کہاں! اور یہ نیش زنی کسان

کی کڑے! کڑے کی طرح ہوتے کے خوف کو اور بھی مشکل کر دیتی تھی۔ وہ اُس کی خوشامد کرتا۔ اپنے اصولوں کو لمبی سے لمبی رسّی دیتا لیکن سکھدا اسے اُس کی اخلاقی کمزوری سمجھ کر ٹھکرا دیتی تھی۔ وہ شوہر کو رحم کی نگاہ سے دیکھتی تھی اُس کے ترک کی توہین نہ کرتی تھی مگر اس کی حقیقت سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ اگر اس سے ہمدردی کی بھیک مانگتا تو شاید وہ اس کی دلجوئی کرتی، اپنی مٹھی بند کر کے اپنی مٹھائی آپ کھا کر وہ اُسے رُلا دیتا تھا۔ وہ بھی اپنی مٹھی بند کر لیتی تھی اور اپنی مٹھائی آپ کھا لیتی تھی۔ دونوں آپس میں ہنستے بولتے۔ تاریخ اور ادب کے تذکرے کرتے لیکن زندگی کے حقیقی معاملات میں جدا تھے۔ ان میں دودھ اور پانی کا میل نہیں، ریت اور پانی کا میل تھا جو ایک لمحے کے لئے مل کر الگ ہو جاتے ہیں۔

امر نے اس شکایت کی نزاکت کو یا تو سمجھا نہیں یا سمجھ کر اس کا مزہ نہ لے سکا۔ لالہ سمر کانت نے جو ضرب لگائی تھی اس کے درد سے ابھی تک اس کا کلیجہ کانپ رہا تھا۔ بولا "میں بھی یہی مناسب سمجھتا ہوں۔ مجھے پڑھنا چھوڑ کر روزی کی فکر کرنی پڑے گی۔"

سکھدا نے چڑ کر کہا۔ "ہاں سُنتی ہوں زیادہ پڑھ لینے سے آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔"

امر نے لڑنے کے لئے یہاں بھی آستین چڑھائی "تم ناحق یہ الزام لگا رہی ہو۔ پڑھنے سے میں جی نہیں چراتا لیکن ان حالتوں میں پڑھنا نہیں ہو سکتا آج اسکول میں مجھے جتنا شرمندہ ہونا پڑا بس میں ہی جانتا ہوں۔ اپنے ضمیر کا خون کر کے پڑھنے سے جاہل رہنا کہیں اچھا ہے۔"

سکھدا نے بھی اپنے ہتھیار سنبھالے۔ "میں تو سمجھتی ہوں کہ گھڑی دو گھڑی

دوکان پر بیٹھ کر بھی آدمی بہت کچھ پڑھ سکتا ہے۔ چرخے اور چلسے میں جو وقت صرف کرتے ہو وہ دوکان پر لگاؤ تو کوئی بُرائی نہ ہوگی۔ پھر جب تم کسی سے کچھ کہو گے نہیں تو کوئی تمہارے دل کی باتیں کیسے سمجھ لے گا۔ میرے پاس اس وقت بھی ایکہزار روپئے سے کم نہ ہوں گے۔ وہ میرے روپئے ہیں۔ میں انھیں اڑا سکتی ہوں تم نے مجھ سے ذکر تک نہ کیا۔ میں تمہاری دشمن تو نہیں ہوں۔ مجھ سے مانگتے ہوئے تمہاری غیرت کو چوٹ لگتی ہو تو اماں سے لے لو۔ انھیں اس کا ارمان ہی رہ گیا کہ تم ان سے کچھ مانگتے۔ میں تو کہتی ہوں مجھے لے کر لکھنؤ چلے چلو اور بے فکر ہو کر پڑھو۔ اماں تمھیں انگلینڈ بھیجدیں گی۔ وہاں سے اچھی ڈگری لا سکتے ہو"

سکھدا نے صاف دلی سے یہ تجویز کی تھی۔ شاید پہلی بار اس نے شوہر سے اپنے دل کی بات کہی ہو لیکن امر کانت کو ناگوار گذرا۔ "مجھے ڈگری اتنی عزیز نہیں ہے کہ اُس کے لئے سسرال کی روٹیاں توڑوں اگر میں اپنی محنت سے کوئی وسیلہ پیدا کر سکا تو پڑھوں گا ورنہ کوئی دوسرا دھندا دیکھوں گا۔ میں اب تک فضول تعلیم کے پیچھے پڑا رہا۔ اسکول اور کالج سے الگ رہ کر بھی آدمی بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ میں غرور نہیں کرتا لیکن ادب اور تاریخ کی جتنی کتابیں ان دو تین سالوں میں میں نے پڑھی ہیں شاید ہی میرے کالج میں کسی نے پڑھی ہوں"

سکھدا نے اس قضیئے کا خاتمہ کرنے کے لئے کہا۔ "اچھا ناشتہ تو کر لو آج تو تمہاری میٹنگ ہے۔ نو سے پہلے کیوں لوٹنے لگے؟ میں تو ٹاکیز میں جاؤں گی اگر تم لے چلو تو تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں"

امر نے بے اعتنائی سے کہا۔ "مجھے ٹاکی میں جانے کی فرصت نہیں۔ تم ہو تم جا سکتی ہو"

"فلموں سے بھی بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے"۔
"میں تمھیں منع تو نہیں کرتا"
"تم کیوں نہیں چلتے؟"
جو آدمی کچھ کماتا نہ ہو اُسے سینما دیکھنے کا کوئی حق نہیں۔ میں اُسی پیسے کو اپنا سمجھتا ہوں جسے میں نے اپنی قوت بازو سے کمایا ہو۔
کئی منٹ تک دونوں گم سم بیٹھے رہے۔ جب امرکانت ناشتہ کر کے اٹھا تو سکھدا نے محبت آمیز اصرار کے ساتھ کہا "کل سے شام کے وقت دوکان پر بیٹھ جایا کرو۔ مشکلوں کو آسان کرنا ہمت آدمیوں کا کام ہے لیکن مشکلوں کو پیدا کر کے خواہ مخواہ پاؤں میں کانٹے چبھانا کوئی عقلمندی نہیں ہے"
امرکانت اس اصرار کا مطلب سمجھ گیا۔ یہ عورت مشکلوں سے کس قدر خائف ہے! بولا "میں بھی غریبوں کا خون چوسوں۔ اُن کا گلا کاٹوں؟"
سکھدا اُس کے زاویہ نگاہ پر صاد کر کے اُس پر قابو پا سکتی تھی۔ اُدھر سے ہٹانے کی کوشش کر کے وہ اس کے عزم کو اور بھی مضبوط کر رہی تھی۔ امرکانت اُس سے ہمدردی کر کے اپنا رفیق بنا سکتا تھا مگر زاہدانہ ترک کی شکل دکھا کر اُسے ڈرا رہا تھا۔

(۴)

امرکانت میٹریکیولیشن کے امتحان میں صوبے میں اول آیا۔ لیکن عمر زیادہ ہو جانے کے باعث وظیفہ نہ پا سکا۔ اس سے اُسے مایوسی کی جگہ ایک قسم کا اطمینان ہوا کیونکہ وہ اپنے نفس کو کسی طرح کی آڑ نہ دینا چاہتا تھا۔ اس نے کئی بڑی بڑی کوٹھیوں میں انگریزی میں خط و کتابت کرنے کی خدمت تلاش کر لی

خوش حال باپ کا بیٹا تھا یہ کام اُسے آسانی سے مل گیا۔ لالہ سمرکانت کے اصول تجارت سے اکثر ان کے ہم چشم جلتے تھے اور باپ بیٹے میں اس کشمکش کا تماشا دیکھنا چاہتے تھے۔ لالہ جی پہلے تو بہت برہم ہوئے۔ اُن کا لڑکا اسی درجے کے آدمیوں کی خدمت کرے یہ اُن کے لئے باعث تحقیر تھا لیکن جب امرکانت نے سمجھایا کہ محض کاروبار میں مہارت پیدا کرنے کے لئے یہ کام کر رہا ہے اور لالہ جی نے سمجھا کہ کچھ نہ کچھ سیکھ ہی جائے گا تو کچھ نیم راضی ہو گئے۔ سکھدا اتنی آسانی سے ماننے والی نہ تھی۔ ایک دن اسی بات پر دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔ سکھدا نے کہا "تم دس دس پانچ پانچ روپے کے لئے دوسروں کی خوشامد کرتے پھرتے ہو تمھیں شرم بھی نہیں آتی؟"

امرکانت نے متانت سے جواب دیا۔ "کام کر کے کچھ پیدا کرنا شرم کی بات نہیں ہے۔ دوسروں کا منہ تکنا شرم کی بات ہے۔"

"تو یہ امیروں کے جتنے لڑکے ہیں سب بے شرم ہیں؟"

"ہیں ہی اس میں بھی کوئی شک ہے۔ اب تو دادا خوشی سے بھی روپے دیں تو نہ لوں۔ جب تک اپنی صلاحیت کا علم نہ تھا انھیں تکلیف دیتا تھا۔ اب مجھے معلوم ہو گیا کہ میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکتا ہوں پھر کسی کے سامنے کیوں ہاتھ پھیلاؤں۔"

سکھدا نے ترش ہو کر کہا۔ "تو جب تم اپنے باپ سے کچھ لینا ذلت سمجھتے ہو تو میں کیوں ان کی دست نگر بن کر رہوں۔ اس کا مطلب تو یہی ہو سکتا ہے کہ میں بھی کسی مدرسے میں نوکری کر لوں یا سینے پرونے کا دھندا اٹھاؤں۔"

امرکانت کو کوئی معقول جواب نہ سوجھا۔ وہ اسے اتنی ذرا سی بات نہ کر اُسے سر کھپانے کی ضرورت نہیں۔ بولا "تمہاری بات اور ہے۔"

"کیوں ؟ میں کھاتی پہنتی نہیں ہوں۔ گہنے بنواتی ہوں، کتابیں لیتی ہوں رسالے منگواتی ہوں، دوسروں ہی کی کمائی پر تو۔ اس کا مطلب تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مجھے تمہاری کمائی پر بھی کوئی حق نہیں۔ مجھے خود اپنی گذران کی فکر کرنی چاہیئے۔"

امرکانت ایک نرغے میں پھنس گیا تھا۔ یکایک اُس سے باہر نکلنے کی اُسے ایک ترکیب سوجھ گئی۔ بولا۔ "دادا یا تمہاری اماں تمہاری بات نہ پوچھیں اور میں بھی تمہیں طعنے دوں تو بے شک تمہیں فکر معاش کی ضرورت ہے۔"

سکھدا نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔ "کوئی زبان سے نہ کہے مگر دل میں تو سمجھ ہی سکتا ہے۔ اب تک تو میں سمجھتی تھی تم پر میرا حق ہے۔ تم سے جو کچھ چاہوں گی لڑ کر لے لوں گی۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ میرا کوئی حق نہیں۔ تم جب چاہو مجھے جواب دے سکتے ہو۔ یہی بات ہے یا کچھ اور۔"

امرکانت نے زچ ہو کر کہا۔ "تو تم مجھے کیا کرنے کو کہتی ہو ؟ دادا سے ہر مہینے روپئے کے لئے لڑتا رہوں ؟"

"ہاں۔ میں یہی چاہتی ہوں۔ یہ غیروں کی غلامی چھوڑو اور گھر کا دھندا دیکھو۔"

"لیکن مجھے اس لین دین، سود بیاج سے نفرت ہے۔"

سکھدا مسکرا کر بولی۔ "یہ تو تم نے اچھی دلیل پیش کی۔ یعنی مریض کو چھوڑ دو وہ آپ ہی آپ اچھا ہو جائے گا۔ تم دوکان پر جتنی دیر بیٹھو گے کم سے کم اتنی دیر تک تو یہ بیہودگیاں نہ ہونے دو گے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ تمہاری توجہ دیکھ کر لالہ جی سارا کاروبار تمہیں کو سونپ دیں۔ اس وقت تمہیں اختیار ہوگا کہ اپنے اصولوں کے مطابق چلاؤ۔ اگر ابھی اتنا بار نہیں اٹھانا چاہتے تو

لیکن لالہ جی کے خیالات پر اتنا اثر تو ڈال سکتے ہو۔ وہ بھی وہی کر رہے ہیں جو اپنے اپنے ڈھنگ سے ساری دنیا کر رہی ہے۔ ان سے محترز رہ کر تم ان کے طرز عمل کو نہیں بدل سکتے اور اگر تم اپنا ہی راگ الاپو گے تو میں کہے دیتی ہوں میں اپنے گھر چلی جاؤں گی۔ زندگی کا جو معیار تمہارے سامنے ہے وہ میرے بس کا نہیں۔ تم بچپن ہی سے تکلیفیں سہنے کے عادی ہو۔ میرے لئے یہ نیا تجربہ ہے۔"

امرکانت ہار گیا۔ اس کے کئی دن بعد اُسے کئی اچھے اچھے جواب سوجھے لیکن اس وقت اس کی زبان بند ہو گئی۔ نہیں سکھدا کی باتیں اُسے قرین انصاف معلوم ہوئیں۔ ابھی تک اُس کی آزادانہ روش کی بنیاد لالہ جی کا بخل تھا سوتیلی ماں کی بے مہری نے اسی بنیاد پر ردے چڑھائے تھے۔ دلیل یا اصول پر اس کی بنیاد نہ تھی۔ اور وہ دن تو ابھی دور، بہت دور تھا جب اُس کے دل کی کیفیت ہی بدل جائے۔ اُس نے دل میں فیصلہ کیا کہ خط و کتابت کا کام چھوڑ دوں گا۔ دوکان پر بیٹھنے سے بھی اُسے اتنا گریز نہ رہا۔ ہاں۔ اپنی تعلیم کا خرچ باپ سے وصول کرنے پر وہ اپنے دل کو راضی نہ کر سکا۔ اس کے لئے اُسے کوئی دوسرا ہی راستہ ڈھونڈنا پڑے گا۔ سکھدا سے کچھ دنوں کے لئے اُس کی صلح سی ہو گئی۔

اسی درمیان میں ایک اور واقعہ ہو گیا جس نے اُس کی آزادانہ روش کا خاتمہ کر دیا۔

((سکھدا ادھر سال بھر سے میکے نہ گئی تھی۔ بیوہ ماں بار بار بلاتی تھی۔ لالہ امرکانت چاہتے تھے کہ مہینے دو مہینے کے لئے سیر کر آئے لیکن سکھدا جانے کا نام نہ لیتی تھی۔ امرکانت کی طرف سے اسے اطمینان نہ ہوتا تھا۔ وہ ایسے

گھوڑے پر سوار تھی جسے ہمیشہ پھیرنا لازم تھا۔ دس پانچ دن بندھا رہا تو پٹھے پر ہاتھ بھی نہ رکھنے دے گا۔ اسی لئے وہ امرکانت کو چھوڑ کر نہ جاتی تھی۔ آخر سکھدا کی ماں نے خود دہلی آنے کا فیصلہ کیا۔ ایک مہینے تک امرکانت ان کے استقبال کی تیاریوں میں لگا رہا۔ جمنا کے کنارے بڑی مشکل سے پسند کا مکان ملا۔ اس کی صفائی اور سفیدی میں کئی دن لگ گئے۔ خانہ داری کی سیکڑوں چیزیں جمع کرنی تھیں۔ اُس کی ساس نے اُس کے نام ایک ہزار روپئے کا بیمہ بھیجا تھا۔ امر نے کتر بیونت کرکے اس کے آدھے ہی میں سارے مرحلے طے کرنے پائی پائی کا حساب لکھ تیار تھا۔ جب اس کی ساس پرباگ کا اشنان کرتی ہوئی ماگھ میں دہلی پہنچی تو یہاں کا حسن انتظام دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔

امرکانت نے بچت کے پانسو روپئے اس کے سامنے رکھ دئے۔

رامادیوی نے حیرت سے کہا "کیا پانچ سو ہی میں یہ ساری سجاوٹ ہوگئی مجھے تو یقین نہیں آتا۔"

"جی ہاں، پانچ ہی سو خرچ ہوئے۔"

"یہ تو تم نے انعام دینے کا کام کیا ہے۔ یہ بچت کے روپئے تمہارے ہیں۔"

امر نے جھینپتے ہوئے کہا۔ "جب مجھے ضرورت ہوگی آپ سے مانگ لوں گا ابھی تو ایسی کوئی ضرورت نہیں۔"

رامادیوی شکل اور عمر سے نہیں بخیال اور عمل سے بوڑھی تھیں۔ دان اور برت میں انھیں اعتقاد نہ تھا لیکن بدنامی سے ڈرتی تھیں۔ بیوہ کی زندگی ترک اور عبادت کی زندگی ہے۔ دنیا اس کے خلاف کچھ نہیں دیکھ سکتی۔ راما کو مجبور ہو کر دھرم کا سوانگ بھرنا پڑتا تھا لیکن زندگی کے لئے کتنی تنگی

دلچسپی کا ہونا ضروری تھا۔ عیش و آرام، سیر تماشے سے روح کو اسی طرح اطمینان نہیں ہوتا جیسے کوئی چٹنی اور اچار کھا کر سیر نہیں ہو سکتا۔ زندگی کسی حقیقت پر ہی ٹک سکتی ہے۔ راما کی زندگی میں ورحقیقت جانوروں اور چڑیوں کا شوق تھا وہ اپنے ساتھ ایک خاصہ چڑیا گھر لائی تھیں۔ طوطے، مینا، بندر، بلی، گائیں، ہرن، مور، کتے وغیرہ پال رکھے تھے۔ اور انھیں کے سکھ دکھ میں شریک ہو کر زندگی کی نثار کا احساس کرتی تھی۔ دوسرے رئیسوں کی طرح اُس کا یہ انس نمائش یا تفریح کے لیے نہ تھا۔ اپنے جانوروں اور چڑیوں میں اُس کی جان بستی تھی۔ وہ ان کے بچوں کو اُسی مادرانہ شفقت سے کھلاتی تھی جیسے اپنے ہی ناتی پوتے ہوں۔ یہ بے زبان بھی اس کی باتیں اس کے اشاروں سے کچھ اس طرح سمجھ جاتے تھے کہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا۔

دوسرے دن ماں بیٹی میں باتیں ہونے لگیں۔ راما دیوی نے کہا کہ "تجھے سسرال اتنی پیاری ہو گئی"

سکھدا شرمندہ ہو کر بولی "کیا کروں اماں! ایسی الجھن میں پڑی ہوں کہ کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ باپ بیٹے میں بالکل نہیں بنتی۔ دادا جی چاہتے ہیں کہ وہ کاروبار دیکھیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے اس کاروبار سے نفرت ہے۔ میں چلی جاتی تو یہاں نہ جانے کیا حالت ہوتی مجھے برابر یہی اندیشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں وہ دیس بدیس کی راہ نہ لیں۔ تم نے مجھے کوئیں میں ڈھکیل دیا اور کیا کہوں"

راما متفکرانہ انداز سے بولی۔ "میں نے تو اپنی سمجھ میں خوب دیکھ بھال کر کیا تھا مگر تیری تقدیر کو کیا کرتی۔ لڑکے سے تیری پٹتی ہے یا اب بھی یہی حال ہے"

سکھدا پھر شرمندہ ہو گئی۔ اس کے دونوں رخسار سرخ ہو گئے۔ سر جھکا کر

بولی۔ "انھیں اپنی کتابوں اور جلسوں ہی سے فرصت نہیں ملتی۔"

"تعجب ہے کہ تجھ جیسی حسین عورت ایک سیدھے سادے چھوکرے کو بھی قابو میں نہ لا سکی۔ چال چلن کا کیسا ہے؟"

سکھدا جانتی تھی۔ امر کانت میں اس قسم کی کوئی بد وضعی نہیں ہے۔ مگر اس وقت وہ اس امر کا قطعی طور پر اظہار نہ کر سکی۔ اس کی نسائیت پر دھبہ آتا تھا۔ بولی۔ "میں کسی کے دل کا حال کیا جانوں اماں۔ اتنے دن ہو گئے مجھے ارمان ہی رہ گیا کہ کوئی سوغات لا کر دیتے۔ اپنے دل سے ہنسوں یا روؤں اُن سے کوئی مطلب نہیں۔"

راما نے مادرانہ فہمائش کے لہجے میں پوچھا۔ "تو اُس کی کبھی کچھ خاطر کرتی ہے؟ کچھ بنا کر کھلاتی ہے؟ کبھی اس کے سر میں تیل ڈالتی ہے؟ کبھی اس کے پاؤں دباتی ہے؟"

سکھدا نے خود دارانہ انداز سے کہا۔ "جب وہ میری بات نہیں پوچھتے تو مجھے کیا غرض پڑی ہے۔ وہ بولتے ہیں تو میں بھی بولتی ہوں۔ مجھ سے کسی کی غلامی نہیں ہو گی۔"

راما نے سمجھایا۔ "بیٹی برا نہ ماننا۔ مجھے تو بہت کچھ تیری ہی خطا نظر آتی ہے شاید تجھے اپنے حسن کا غرور ہے۔ تو سمجھتی ہے وہ تیرے حسن پر فریفتہ ہو کر تیرے پیروں پر ناک رگڑے گا۔ ایسے مرد ہوتے ہیں میں جانتی ہوں مگر وہ محبت قائم نہیں رہتی۔ نہ جانے تو اس سے کیوں تنی رہتی ہے۔ مجھے تو وہ بڑا غریب اور بے زبان معلوم ہوتا ہے۔ سچ کہتی ہوں مجھے اس پر رحم آتا ہے۔ بچپن میں تو بیچارے کی ماں مر گئی۔ دوسری ماں ملی وہ ڈائن ہو گیا دشمن۔ گھر کو اپنا گھر ہی نہ سمجھ سکا۔ جو دل بے مہریوں سے اتنا خشک

اُسے پہلے محبت اور خدمت سے سینچ کر ہی پیار کا بیج بویا جا سکتا ہے۔"

سکھدا چڑھ کر بولی۔ "وہ چاہتے ہیں میں اُن کے ساتھ پتونی بن کر رہوں۔ روکھا سوکھا کھاؤں، موٹا جھوٹا پہنوں اور وہ گھر سے الگ ہو کر مزدوروں کی سی زندگی بسر کریں۔ مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ چاہے ہمیشہ کے لئے ان سے ناتا ٹوٹ جائے۔ وہ اپنے دل کے بادشاہ ہیں۔ میرے آرام و تکلیف کی انھیں بالکل پروا نہیں ہے، تو مجھے بھی اُن کی پروا نہیں ہے۔"

راما نے تنبیہہ آمیز نظروں سے دیکھا اور بولی۔ "اگر آج لالہ سمرکانت کا دیوالہ نکل جائے؟"

سکھدا نے اس امکان کا خیال بھی نہ کیا تھا۔ لاجواب ہو کر بولی۔ "دیوالہ کیوں نکلنے لگا۔"

"ایسا ممکن تو ہے۔"

سکھدا نے ماں کی دولت کا سہارا نہ لیا۔ وہ یہ نہ کہہ سکی کہ تمھارے پاس جو کچھ ہے وہ بھی تو میرا ہی ہے۔ خودداری نے اس کی زبان بند کر دی۔ ماں کی اس بیدردی پر جھنجھلا کر بولی۔ "جب موت آتی ہے تو آدمی مر جاتا ہے۔ قصداً آگ میں کوئی نہیں کودتا۔"

باتوں باتوں میں راما کو معلوم ہوا کہ اس کی جائداد کا وارث آنے والا ہے۔ سکھدا کے مستقبل کے بارے میں اسے بہت اندیشہ ہو گیا تھا۔ اس خبر نے اُسے مطمئن کر دیا۔ اس نے باغ باغ ہو کر سکھدا کو گلے سے لگا لیا۔

(۵)

امرکانت نے اپنی زندگی میں ماں کی ماتا کے مزے نہ اٹھائے تھے۔ قدرت نے اُسے اس نعمت عظمیٰ سے محروم کر دیا تھا۔ جب اس کی ماں کی وفات ہوئی تو وہ بہت چھوٹا تھا۔ اس ماضی بعید کی کچھ موہوم سی اور اسی لئے نہایت دلفریب اور پر لطف یادیں باقی تھیں۔ اس کا نالۂ درد سُن کر گویا اس کی ماں نے راما دیوی کی صورت میں جنت سے آکر اُسے گود میں اٹھا لیا۔ لڑکا اپنا رونا دھونا بھول گیا اور اُس آغوشِ الفت میں منہ چھپا کر بہشت کے مزے لوٹنے لگا امرکانت نہیں نہیں کرتا رہتا مگر راما اُسے پکڑ کر اُس کے سامنے میوے اور مٹھائیاں لاکر رکھ دیتی۔ اُسے انکار کی جرأت نہ ہوتی۔ وہ دیکھتا یہ نئی ماں اس کے لئے کبھی کچھ پکا رہی ہے کبھی کچھ۔ اور مادرانہ اصرار سے اُسے کھلاتی ہے تو اس کے دل میں فرزندانہ احساس موج زن ہو جاتا۔ وہ کالج سے لوٹ کر سیدھا راما کے پاس جاتا وہاں اس کے لئے ناشتہ تیار کر کے راما اس کی راہ دیکھتی رہتی۔ صبح کا ناشتہ بھی وہ وہیں کرتا۔ اس مادرانہ غمگساری اور پیار سے اس کا جی نہ بھرتا تھا۔ چھٹیوں کے دن وہ اکثر راما ہی کے یہاں گذارتا۔ اس کے ساتھ کبھی کبھی سینما بھی چلی جاتی وہ خاص کر جانوروں اور چڑیوں کی خوش فعلیاں دیکھنے جاتی تھی۔

امرکانت کے کیئے دل میں محبت آئی تو اس کی تنگ ظرفی بھی رخصت ہو گئی سکھدا اس کے قریب تر آنے لگی۔ اُس کی امارت سے اب اُسے اتنی شکایت نہ رہی سکھدا کو ساتھ لے کر اُسے سیر و تفریح کو لے جانے لگا۔ راما وقتاً فوقتاً اسے دس روپے دیدیتی۔ اُس کے محبت آمیز اصرار کے سامنے امرکانت کی ایک نہ چلی۔ اس کے لئے نئے نئے سوٹ بنے، نئے نئے جوتے آئے، موٹر بھی ہے۔

فاؤنٹین پن آئے۔ آرائش کے کتنے ہی سامان خریدے گئے۔ پانچ چھ ہی مہینے میں وہ تکلفات کا دشمن، سادہ زندگی کا قصیدہ گو، اچھا خاصہ رئیس زادہ بن بیٹھا۔ رئیس زادوں کے جذبات اور چونچلوں سے پُر، اتنا ہی خود غرض اور کم اندیش اس کی جیب میں ہمیشہ دس بیس روپئے پڑے رہتے۔ خود کھاتا۔ دوستوں کو کھلاتا اور ایک کی جگہ دو خرچ کرتا۔ وہ تعلیمی انہماک جاتا رہا۔ تاش اور چوسر میں اُسے زیادہ لطف آتا۔ اہل جلسوں سے اب اسے اور زیادہ شغف ہو گیا۔ خوش بیان وہ تھا ہی مشق سے اس کے بیان میں اور بھی روانی پیدا ہو گئی۔ روزناموں اور رسالوں سے بھی اُسے کافی ذوق تھا۔ خصوصاً اس لئے کہ اس سے اس کے دعوے ہمہ گیری کو تقویت ہوتی تھی۔

روزناموں کے مطالعے سے امرکانت میں سیاسی بیداری پیدا ہونے لگی۔ اہل وطن کے ساتھ حکام کی زیادتیاں دیکھ کر اُسے طیش آجاتا۔ جو ادارے اصلاح قوم کے مدعی تھے اُن سے اُسے ہمدردی ہو گئی۔ وہ اپنے شہر کی کانگریس کمیٹی کا ممبر بن گیا اور اس کے جلسوں میں شریک ہونے لگا۔

ایک دن کالج کے کچھ طلبہ دیہاتوں کی اقتصادی حالت کی جانچ کرنے نکلے۔ سلیم اور رام بھی چلے۔ پروفیسر ڈاکٹر شانتی کمار اُن کے رہنما تھے۔ کئی گاؤں کے معائنے کے بعد یہ جماعت لوٹنے لگی تو رام نے کہا "مجھے کبھی اس کا خیال بھی نہ تھا کہ ہمارے کاشتکاروں کی حالت اتنی مایوس کن ہے۔"

سلیم بولا "تالاب کے کنارے وہ جو چار پانچ گھر ملاحوں کے تھے ان دو ایک لوہے کے برتنوں کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔ میں سمجھتا تھا دیہاتیوں کا اناج کی بھاریں بھری ہوں گی لیکن یہاں تو کسی کے گھر میں اناج کے تھے۔"

ڈاکٹر شانتی کمار نے اس خیال کی ترمیم کی "سبھی کسان اتنے غریب نہیں ہوتے۔ بڑے کسان کے گھر میں بکھاریں بھی ہوتی ہیں لیکن ایسے کسان گاؤں میں دو چار سے زیادہ نہیں ہوتے۔"

امرکانت نے اختلاف کیا "مجھے تو ان گاؤوں میں ایک بھی ایسا کسان نہ ملا۔ مہاجن اور عملے انھیں غریبوں کا خون چوستے ہیں۔ میں کہتا ہوں ان لوگوں کو ان بیکسوں پر رحم نہیں آتا۔"

شانتی کمار نے مسکرا کر کہا "فرض اور رحم کا بہت دنوں امتحان ہوا اور وہ دونوں بیکار ثابت ہوئے۔ اب تو انصاف کا زور ہے۔ رحم اور فرض اختیاری چیزیں ہیں۔ انصاف کا انحصار محض اخلاقی قانون پر نہیں مجلسی قانون پر ہے۔ اس سے گریز ممکن نہیں۔"

شانتی کمار کی عمر پینتیس سال کے قریب تھی، گورے چٹے خوشرو آدمی تھے وضع قطع انگریزی تھی اور پہلی نظر میں انگریز ہی معلوم ہوتے تھے کیونکہ ان کی آنکھیں نیلی تھیں اور بال بھورے۔ آکسفورڈ سے ڈاکٹر ہو کر آئے تھے۔ شادی اور دیگر مجلسی قیود کے مخالف، آزاد محبت کے مدّاح۔ بہت ہی خوش مزاج شگفتہ رو، بے لوث آدمی تھے۔ اپنی تجرد کی زندگی کو ہنسی مذاق سے بہلاتے رہتے تھے۔ طلبہ سے دوستانہ برتاؤ تھا۔ سیاسی تحریکوں میں شریک ہوتے تھے مگر خفیہ طور پر۔ کھلے میدان میں نہ آتے تھے

امرکانت نے دردناک لہجے میں کہا "مجھے تو اس آدمی کی صورت نہیں بھولتی جو چھ مہینے سے بیمار پڑا تھا اور ایک پیسے کی دوا بھی نہ خرید سکا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ زمیندار نے لگان کی ڈگری کرالی۔ جو کچھ اثاثہ تھا نیلام کرالیا۔ اس اندھیر نگری کا خالق کوئی داتا و بنیاد جو دے، مجھے تو اس میں شک ہے۔

غریب کے بدن پر چیتھڑے تک نہ تھے۔ اس کی ضعیف ماں کتنا پھوٹ پھوٹ کر روتی تھی۔"

دیہات کی پگڈنڈیاں طے کر کے یہ لوگ پکی سڑک پر آ پہنچے تھے۔ دونوں طرف اونچے اور سایہ دار درختوں نے گویا راستے کو اپنی گود میں چھپا لیا تھا۔ سڑک کے داہنے بائیں ایکھ اور ارہر کے کھیت تھے۔ رستہ قریب قریب بند ہو چلا تھا۔

دفعتاً ایک درخت کے نیچے دس بارہ آدمی خوف سے سمٹے ہوئے دبکے نظر آئے۔ سب کے سب سامنے والے ارہر کے کھیت کی طرف پر معنی نگاہوں سے تاکتے اور آپس میں سرگوشیاں کرتے تھے۔ ارہر کے کھیت پر مینڈ پر ہاتھ میں بیت لئے دو گورے اکڑے کھڑے تھے۔ لڑکوں کو کسی حادثہ کا اندیشہ ہوا۔ سب کے سب وہیں کھڑے ہو گئے اور اُن آدمیوں سے استفسار حال کیا۔ مگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔ سب ایک دوسرے کا منہ تکتے تھے مگر منہ سے کچھ نہ کہتے تھے۔

اتنے میں یکایک ارہر کے کھیت کی طرف سے کسی عورت کی چیخ سنائی دی۔ معاملہ ہو گیا۔ طلبہ اپنے ڈنڈے سنبھال کر کھیت کی طرف لپکے۔

ایک گورے نے آنکھیں نکال کر چھڑی دکھاتے ہوئے کہا۔ "بھاگ جاؤ نہیں ہم ٹھوکر مارے گا۔"

اتنا اس کے منہ سے نکلنا تھا کہ ڈاکٹر شانتی کمار نے جھپٹ کر اس کے منہ پر گھونسا مارا۔ تیلا اٹھا مگر تھا گھونسے بازی کے فن میں مشاق۔ گھونسے کا جواب دیا تو ڈاکٹر صاحب گر پڑے۔ اسی وقت سلیم نے اپنی ہاکی اسٹک اس کے سر پر رسید کی۔ تیورا کر زمین پر گر پڑا۔ دوسرے سپاہی کو امر اور دو تین لڑکوں نے

مل کر پیٹنا شروع کر دیا تھا۔ اتنے میں سلیم بھی آ پہنچا۔ گورے نے جب دیکھا کہ اب جان نہیں بچتی تو بھاگا مگر سلیم نے ایسے زور سے اسٹک دی کہ اوندھے منہ گر پڑا اور ایسا بے حس و حرکت ہو گیا جیسے مر گیا ہو۔ اتنے میں ارہر کے پودوں کو چرتا ہوا تیسرا گورا آ پہنچا۔ شانتی کمار سنبھل کر اس پر لپکے ہی تھے کہ اس نے ریوالور نکال کر داغ دیا۔ ڈاکٹر صاحب زمین پر گر پڑے۔ معاملہ نازک تھا۔ لڑکے ڈاکٹر صاحب کو سنبھالنے لگے۔ یہ خوف بھی لگا ہوا تھا کہ گورا دوسری گولی نہ چلا دے۔ ڈاکٹر صاحب کی ران سے خون جاری تھا۔ درخت کے نیچے والے مزدور اب تک تو محض تماشا دیکھ رہے تھے لیکن ڈاکٹر صاحب کو گرتے دیکھ کر ان کے خون میں بھی جوش آیا۔ خوف کی طرح جرأت بھی متعدی ہوتی ہے۔ سب کے سب اپنی لکڑیاں سنبھال کر گورے پر دوڑے۔ گورے نے ریوالور داغا۔ نشانہ خالی گیا۔ وہ تیسری گولی چلانا ہی چاہتا تھا کہ اس پر ڈنڈوں کی بارش ہونے لگی اور ایک لمحے میں وہ بھی بے جان سا زمین پر گر پڑا۔

خیریت یہ ہوئی کہ لڑکے فوری امداد سے واقف تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی رانوں میں پٹی باندھ کر خون کا بہنا بند کر لیا۔

اسی وقت ایک جوان عورت کھیت سے نکلی اور منہ چھپائے لنگڑاتی، کپڑے سنبھالتی ایک طرف چل پڑی۔ بیکسی اور شرم کے بوجھ سے اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ ان آدمیوں کی صورت سے خائف ہے اور ان کی نظروں سے دور نکل کر غائب ہو جانا چاہتی ہے۔ یا شاید کوئی سوراخ تلاش کر رہی ہے جس میں وہ اپنے روئے سیاہ کو چھپائے۔ کسی کی ہمدردی اس کے کس کام کی۔ جو بیش بہا جنس اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی اس کی بازیافت کیا ممکن ہے؟ ان بدمعاشوں کو مار ڈالو، اس سے تمہارے انصاف

کے احساس کو تسکین ہوگی لیکن اُس کی تو جو چیز گئی وہ گئی۔ وہ اپنا دُکھ کیوں روئے، کیوں فریاد کرے۔ ساری دنیا کی ہمدردی اس کے لئے بے کار ہے۔

سلیم ایک لمحہ تک اس عورت کی طرف تکتا رہا پھر سنبھل کر ان تینوں بدمعاشوں کو پیلٹنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دیوانہ ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے پکارا "کیا کرتے ہو سلیم! اس سے کیا فائدہ؟"

سلیم نے دم لے کر کہا "میں ایک شیطان کو بھی زندہ نہ چھوڑوں گا۔ مجھے پھانسی ہو جائے کوئی غم نہیں۔ انھیں ایسا سبق دیدوں گا کہ پھر کسی بدمعاش کو ایسی جرأت نہ ہو۔"

پھر مزدوروں کو مخاطب کر کے بولا "تم اتنے آدمی کھڑے دیکھتے رہے اور تم سے کچھ نہ ہو سکا۔ تم میں اتنی غیرت بھی نہیں۔ اپنی بہو بیٹیوں کی آبرو کی حفاظت بھی نہیں کر سکتے۔ سمجھتے ہو کہ کون یہ ہماری بہو بیٹی ہے۔ اس ملک میں جتنی بیٹیاں ہیں سب تمھاری بیٹیاں ہیں۔ جتنی بہوئیں ہیں سب تمھاری بہوئیں ہیں۔ جتنی مائیں ہیں سب تمھاری مائیں ہیں۔ تمھاری آنکھوں کے سامنے ایک غریب عورت کی آبروریزی ہوئی اور تمھارے خون میں ذرا بھی جوش نہ آیا۔ سب کے سب جا کر مر کیوں نہ گئے؟"

پھر اس بات کا خیال آگیا کہ میں اشتعال میں آکر انصاف کے دائرے سے باہر نکلا جا رہا ہوں۔ صدیوں سے زنجیر میں بندھا ہوا انسان اگر اپنی انسانیت سے محروم ہو جائے تو اس کی کیا خطا ہے۔ وہ تو محض ایک قانون قدرت کا شکار ہے۔ وہ خاموش ہو گیا اور شرمندہ بھی ہوا۔

قریب کے گاؤں سے بیل گاڑی منگوائی گئی۔ شانتی کمار کو لوگوں نے اٹھا کر اس پر لٹا دیا۔ ابھی گاڑی چلنے کو تھی کہ یکایک ڈاکٹر صاحب نے پوچھا "اور اُن تین آدمیوں کو کیا یہیں چھوڑ جاؤ گے؟"

سلیم نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا "ہم ان کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ انھیں کھود کر دفن کر دوں۔"

سلیم اس وقت تک راضی نہ ہوا جب تک ڈاکٹر صاحب نے اُسے قائل نہ کر دیا۔ اُس گاڑی پر بورے تو پچاس لد سکتے تھے مگر چار آدمیوں کے لئے بڑی مشکل سے جگہ نکلی۔ گاڑی چلی۔ دیہات کے مزدور خطاواروں کی طرح سر جھکائے بہت دور تک گاڑی کے پیچھے پیچھے چلے۔ ڈاکٹر نے انھیں شکریہ کے ساتھ واپس کیا۔

نو بجتے بجتے قریب کا ریلوے اسٹیشن ملا۔ اتنی دیر میں گوروں کے ہوش بجا ہو گئے تھے اور صورت حال ان کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ ڈر رہے تھے کہ معاملہ افسروں تک پہنچا تو تحقیقات لازمی ہو جائے گی اور سب افسروں کا غماض بھی انھیں آفت سے نہ بچا سکے گا۔ اس لئے تینوں بھیگی بلی بنے ہوئے تھے۔ اور باوجودیکہ ہاکی کے ڈنڈوں نے ان کی ہڈیوں کو مضروب اور اعضا کو داغدار بنا دیا تھا سب کے سب ان لوگوں کے تلوے سہلا رہے تھے اور اپنے فعل پر حد درجہ ندامت کا اظہار کر رہے تھے۔ ساری ہیکڑی غائب ہو گئی تھی۔ اسٹیشن پر کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ تینوں بہ مشکل گاڑی سے اترے اور پلیٹ فارم پر لیٹ گئے۔ ادھر لڑکے دون کی لے رہے تھے۔ جب تک گاڑی نہ آئی تھی اسٹیشن کے ملازموں سے داد لی۔ گاڑی میں بیٹھ کر مسافروں سے خراج تحسین لینے لگے۔ سلیم تو اپنی شجاعت اور بسالت پر اتنا نازاں تھا

گویا منزل ہفت خواں طے کر آیا ہے۔ خلقت کو چاہیئے کہ اس پر پھولوں کی بارش کرے، اس کی گاڑی کھینچے، اس کا جلوس نکالے۔ مگر امرکانت خیال میں ڈوبا ہوا ڈاکٹر صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔ آج کے سانحہ نے اس کے دل پر ایسی چوٹ لگائی تھی جو زہر کی طرح اس کے خون میں گردش کر رہی تھی۔ اس واقعہ کی کتنی ہی تصویریں اس کے ذہن میں آ رہی تھیں۔ سپاہی انگلینڈ کے سب سے نیچے طبقے سے بھرتی کیے جاتے ہیں پھر انھیں اتنی جرأت کیونکر ہوئی؟ نہیں ایسے جاہل اور رذیل ہی ایسی شیطنت کر سکتے ہیں۔ اور جب جہل کے ساتھ قومی افتخار بھی شامل ہو جائے تو پھر انسانیت کے لئے کہیں جگہ ہی نہیں رہتی۔ یہ جہلا بھی جانتے ہیں کہ ہندوستانیوں پر ان کا رعب چھایا ہوا ہے۔ وہ جتنے ظلم چاہیں ڈھائیں کوئی چوں نہیں کر سکتا۔

غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لئے وہ طرح طرح کے منصوبے باندھنے لگا۔ جن میں شباب کی امنگ تھی۔ لڑکپن کے خیالی پلاؤ اور ایک شاعر کا تخیل۔

(۶)

ڈاکٹر شانتی کمار ایک مہینے تک اسپتال میں رہ کر اچھے ہو گئے اور پہلا کام جو انھوں نے کیا وہ ان سپاہیوں کا دریافت حال تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ تینوں بھی کئی دن تک اسپتال میں رہے اور اچھے ہو جانے پر تبدیل کر دئے گئے۔ رجمنٹ کے کپتان نے ڈاکٹر صاحب سے اپنے سپاہیوں کے جرم کی معذرت کی اور یقین دلایا کہ آئندہ ان کی نگرانی زیادہ سختی سے کیجائے گی۔

ادھر سے فرصت پاتے ہی امرکانت کو قومی تحریکوں سے بہت زیادہ

دلچسپی ہوگئی۔ ایک بار ایک عام جلسے میں وہ اتنے جوش و خروش سے بولا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے لالہ سمرکانت کو بلا کر لڑکے کو قابو میں رکھنے کی تاکید کی۔ لالہ جی نے وہاں سے لوٹ کر خود تو امر سے کچھ نہ کہا۔ سکھدا اور رامادونوں سے جڑ دیا۔ امرکانت پر اب کون حاوی ہے۔ وہ خوب سمجھتے تھے۔ ان دنوں بیٹے سے انھیں انس ہوگیا تھا۔ جب ماہوار فیس دینی پڑتی تھی۔ تب امرکانت کا اسکول جانا انھیں زہر لگتا تھا۔ اب ان کے اوپر یہ بار نہ تھا اس لئے کچھ نہ بولتے تھے۔ بلکہ کبھی کبھی صندوق کی کنجی نہ ملنے پر یا اُٹھ کر صندوق کھولنے کی تکلیف سے بچنے کے لئے بیٹے سے روپئے قرض لے لیا کرتے۔ نہ امرکانت مانگتا نہ وہ دیتے۔

سکھدا میں جوانی کا زمانہ قریب آتا جاتا تھا۔ اس کا چہرہ بے رونق ہوگیا تھا۔ برائے نام کھانا کھاتی اور بہت کم سیر کرنے جاتی۔ طرح طرح کے اندیشے اور دہشت انگیز خیالات اُسے پریشان کرتے رہتے تھے۔ نہ جانے کیا ہوگا اُس کے جسم میں ذہن اور عقل، حوصلے اور ارمان سے بھرے ہوئے انسان کی تخلیق ہو رہی ہے۔ وہی رینگنے کی سی حس ایک دن زندگی کے بڑے بڑے مسئلے حل کرے گی، قانون بنائے گی، آدمیوں پر حکومت کرے گی۔ اس حیرت انگیز فطری معجزے کی طرف اس کی نگاہ نہ تھی۔ رامانے بچوں کی پیدائش اور پرورش کے متعلق کئی کتابیں منگوادی تھیں۔ انھیں پڑھ کر وہ اور بھی فکرمند ہوجاتی تھی۔

اس دن شام کے وقت امرکانت اس کے پاس آیا تو وہ جلی بیٹھی تھی بولی "تم مجھے تھوڑا سا سنکھیا کیوں نہیں دیدیتے۔ تمھارا گلا بھی چھوٹ جائے اور میں بھی جنجال سے نکل جاؤں"

امرکانت ان دنوں سکھدا کی دلجوئی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتا۔ حسن کی ضیا سے چمکتی ہوئی سکھدا آنکھوں کو فریفتہ کرتی تھی لیکن یہ زرد رو، حاملہ مریضہ اس کے دل کو نور سے منور کر دیتی تھی۔ وہ اس کے پاس بیٹھا ہوا اس کی روکھی زلفوں اور سوکھے ہوئے ہاتھوں سے کھیلا کرتا۔ اس کی اس خستہ حالی کا ذمہ دار وہ ہے۔ اس لئے وہ اس کی دلجوئی کرنے کا موقع ڈھونڈھتا رہتا تھا۔ ان دنوں اس کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ سکھدا اس سے کسی چیز کی فرمایش کرے۔ وہ ایک بار آسمان کے تارے توڑ لانے پر بھی آمادہ ہو جاتا۔ ہمیشہ اُسے اچھی اچھی کتابیں سنا کر خوش کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ ولادت کے خیال سے اُسے جتنی مسرت ہوتی تھی اُس سے کہیں زیادہ فکر سکھدا کی حالت دیکھ کر ہوتا تھا۔ گھبرا کر بولا "یہ کیوں کہتی ہو سکھدا! مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو بتلا دو۔"

سکھدا لیٹی ہوئی تھی۔ تکیئے کے سہارے ٹیک لگا کر بولی "تم عام جلسوں میں پُرجوش تقریریں کرتے پھرتے ہو اس کے سوا اور کیا نتیجہ ہے کہ تم گرفتار ہو جاؤ اور اپنے ساتھ گھر کو بھی لے ڈوبو۔ دادا سے پولیس کے کسی بڑے افسر نے شکایت کی ہے۔ تم ان کی کچھ مدد تو کرتے نہیں۔ الٹے اور ان کے کئے کرائے کو خاک میں ملانے کو تلے بیٹھے ہو۔ میں تو آپ ہی اپنی جان سے مر رہی ہوں اُس پر تمہاری یہ حرکتیں اور بھی مارے ڈالتی ہیں۔ مہینے بھر ڈاکٹر کے پیچھے ہلکان ہوئے ادھر سے فرصت ملی تو یہ مصیبت لے بیٹھے۔ تم سے اطمینان کے ساتھ کیوں بیٹھا نہیں جاتا؟ تم اپنے مالک نہیں ہو کہ جس راستے پر چاہو جاؤ۔ تمہارے پاؤں میں بیڑیاں ہیں۔ کیا اب بھی تمہاری آنکھیں نہیں کھلتیں۔" امرکانت نے اپنی صفائی میں کہا "میں نے تو کوئی ایسی قابل اعتراض تقریر نہیں کی۔"

"تو دادا جھوٹ کہتے تھے؟"

"اس کا تو یہ مطلب ہے کہ میں اپنی زبان بند کر لوں۔"

"ہاں تمھیں اپنی زبان بند کرنی پڑے گی۔"

دونوں ایک لمحے تک خاموش رہے۔ تب امر کانت نے مجبورانہ انداز سے کہا۔ "اچھی بات ہے آج سے زبان بند کر لوں گا۔ پھر تمھارے سامنے کبھی شکایت آئے تو میرا کان پکڑ لینا۔"

سکھدا نرم ہو کر بولی۔ "تم ناراض ہو کر تو یہ وعدہ نہیں کر رہے ہو؟ میں تمھاری ناراضی سے بہت ڈرتی ہوں۔ میں بھی جانتی ہوں کہ ہم لوگ بے دست و پا ہیں۔ یہ بے بسی مجھے بھی اتنی ہی ناگوار گذرتی ہے جتنی تمھیں۔ میرے پاؤں میں دوہری بیڑیاں ہیں۔ جنس کی الگ۔ سرکار کی الگ۔ لیکن آگے پیچھے بھی تو دیکھنا ہوتا ہے۔ ملک کے ساتھ ہمارا جو فرض ہے اُس سے زیادہ دادا جی کے ساتھ ہے اور اس سے بھی زیادہ اپنی اولاد کے ساتھ۔ باپ کو آزردہ خاطر اور معصوم بچے کو بے سہارے چھوڑ کر قوم کی خدمت کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی اپنے گھر میں آگ لگا کر آسمان کے سائے کے نیچے رہے۔ جس جان کو میں اپنا خونِ دل پلا پلا کر پال رہی ہوں میں چاہتی ہوں تم بھی اُسے اپنا لختِ جگر سمجھو۔ تمھاری ساری شفقت اور ایثار اور حمیت کا حقدار وہی ہے۔"

امر کانت سر جھکائے یہ وعظ سنتا رہا۔ وہ نادم تھا اور اس کا ضمیر اُسے نفریں کر رہا تھا۔ اس نے سکھدا کے ساتھ بے انصافی کی ہے اور آنے والے بچے کے ساتھ بے رحمی۔ اس بچے کی خیالی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ وہ کھن سا ملائم اور نورِ سحر کی طرح شگفتہ اس کی گود میں کھیل رہا تھا۔ وہ اس خیالی نظارے میں ہمہ تن محو ہو گیا۔ دیوار پر نو نہال کرشن کی خوبصورت تصویر لٹک

رہی تھی اس تصویر میں آج اُسے جتنی روحانی مسرت حاصل ہوئی اتنی اور کبھی نہ ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں آب گوں ہو گئیں۔

سکھدا نے اُسے ایک پان کا بیڑا دیتے ہوئے کہا۔ "اماں کہتی تھیں میں بچے کو لے کر لکھنؤ چلی جاؤں گی۔" میں نے کہا "اماں، تمھیں بُرا لگے یا بھلا۔ میں تو اپنا لعل نہ دوں گی۔"

امرکانت نے اشتیاق کے ساتھ پوچھا "تو بگڑی ہوں گی۔"

"نہیں جی۔ بگڑنے کی کیا بات تھی۔ ہاں اُنھیں کچھ بُرا ضرور معلوم ہوا ہوگا لیکن میں مذاق میں بھی اپنی زندگی کی کائنات کو نہیں چھوڑ سکتی۔"

"دادا نے پولیس والوں کی شکایت کا ذکر اماں سے بھی کیا ہوگا۔"

"ہاں۔ ضرور کیا ہے۔ جاؤ آج اماں تمھاری کیسی خبر لیتی ہیں۔"

"میں آج جاؤں گا ہی نہیں۔"

"اچھا چلو میں تمھاری وکالت کر دوں گی۔"

"معاف کیجیے۔ وہاں مجھے اور ذلیل کرو گی۔"

"نہیں سچ کہتی ہوں۔ اچھا بتاؤ؟ بچہ کس پر ہوگا؟ مجھ پر یا تم پر؟ میں کہتی ہوں تم پر ہو۔"

"میں چاہتا ہوں تم پر ہو۔"

"یہ کیوں؟ میں تو چاہتی ہوں تم پر ہو۔"

"تم پر ہوگا تو میں اُسے اور زیادہ چاہوں گا۔"

"اچھا اُس عورت کی کچھ خبر ملی جسے گوروں نے خراب کیا تھا۔"

"نہیں پھر تو کوئی خبر نہیں ملی۔"

"ایک دن جا کر اس کا پتہ کیوں نہیں لگاتے بازبانی ہمدردی دکھا کر ہی اپنے

فرض سے سبکدوش ہو گئے۔"

امر کانت نے نادم ہو کر کہا۔ "کل جاؤں گا۔"

"ایسی ہوشیاری سے پتہ لگاؤ کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ اگر گھر والوں نے اسے نکال دیا ہو تو اپنے ساتھ لے آؤ۔ اماں کو اُسے اپنے ساتھ رکھنے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ اور ہوگا تو میں اپنے ساتھ رکھوں گی۔"

امر کانت نے پرغرور نظروں سے سکھدا کو دیکھا۔ کتنی رحم دل، کتنی بیباک کتنی روشن خیال عورت ہے۔ اس نے پوچھا۔ "تمھیں اس سے ذرا بھی احتراز نہ ہوگا؟"

سکھدا نے پس و پیش کے ساتھ کہا۔ "اگر میں کہوں نہ ہوگا تو یہ غلط ہے۔ ہوگا ضرور۔ لیکن اپنے دل پر جبر کرنا پڑے گا۔ اس نے کوئی خطا نہیں کی پھر سزا کیوں دی جائے؟"

امر کانت نے دیکھا۔ سکھدا انسانیت کی پاکیزہ شعاعوں میں نہا رہی ہے اس کی پاک نفسی گویا منعکس ہو کر جلال بن گئی ہے۔

(۷)

امر کانت نے عام جلسوں میں بولنا تو درکنار شریک ہونا بھی چھوڑ دیا لیکن اُس کا ضمیر ان بندشوں سے آزاد ہو جانے کے لئے تڑپتا رہتا تھا۔ وہ کبھی کبھی اخباروں اور رسالوں میں اپنے جذبات کا اظہار کر کے اپنے دل کو تسکین دے لیتا تھا۔ اب وہ کبھی کبھی دوکان پر بھی آ بیٹھتا۔ خاص کر چھٹیوں کے دن تو وہ دوکان ہی پر رہتا۔ اُسے تجربہ ہو رہا تھا کہ دوکان پر بیٹھکر بھی انسانی فطرت کا بہت کچھ علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ سکھدا اور راما دونوں کی محبت اور

شفقت نے اُسے جکڑ لیا تھا۔ وہ دل کی جلن جو پہلے گھر والوں سے مخالفت کرنے میں صورت پذیر ہوتی تھی اب رفع ہوگئی تھی۔ روتا ہوا بچہ مٹھائی پاکر روتا بھول گیا تھا۔

ایک دن امرکانت دوکان پر بیٹھا تھا کہ ایک آسامی نے آکر پوچھا۔ "لالہ کہاں ہیں۔ بابوجی! بڑا ضروری کام تھا۔"

امرکانت نے دیکھا ادھیڑ، سیہ فام، توانا، کریہہ منظر آدمی ہے۔ نام ہے کالے خاں۔ لاپروائی سے بولا "کہیں گئے ہیں۔ کیا کام ہے؟"

"کچھ کہہ نہیں گئے کب تک آئیں گے؟"

امر کو شراب کی ایسی بدبو آئی کہ اس نے ناک بند کرلی اور منہ پھیر کر بولا "کیا تم شراب پیتے ہو؟"

کالے خاں نے ہنس کر کہا۔ "شراب کیسے میسر ہے لالہ۔ روکھی روٹیاں تو ملتی نہیں۔ آج ایک ناتہ داری میں گیا تھا لوگوں نے پلا دی۔"

وہ اب قریب آگیا اور امر کے کان کے پاس منہ لاکر بولا "ایک رقم دکھانے لایا تھا۔ کوئی دس تولہ کی ہوگی۔ بازار میں ڈھائی سو سے کم کی نہیں ہے لیکن میں تمہارا پرانا آسامی ہوں جو کچھ دیدو گے لیلوں گا۔"

اس نے کمر سے طلائی کڑوں کا ایک جوڑا نکالا اور امر کے سامنے رکھدیا امر نے کڑوں کو بغیر اٹھائے ہوئے پوچھا۔ "یہ کڑے تم نے کہاں پائے؟" کالے خاں نے بیحیائی سے مسکرا کر کہا۔ "یہ نہ پوچھو راجہ! اللہ دینے والا ہے۔"

امر نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔ "کہیں سے چرا کر لائے ہوگے۔"

کالے خاں پھر ہنسا۔ "چوری کسے کہتے ہیں راجہ؟ یہ تو اپنی کھیتی ہے۔ اللہ نے سب کے پیچھے حیلہ لگا دیا ہے۔ کوئی نوکری کرکے لاتا ہے، کوئی

مجوری کرتا ہے کوئی روزگار کرتا ہے۔ دیتا سب کو وہی اللہ ہے۔ تو پھر نکالو روپئے مجھے دیر ہو رہی ہے۔ ان لال پگڑی والوں کی بڑی پوجا کرنی پڑتی ہے۔ نہیں تو کچھ بھی کام نہ چلے۔" (مقصد)

امر کانت کو یہ معاملہ اتنا مکروہ معلوم ہوا کہ جی میں آیا کالیخاں کو دھتکار دے اس کے پدر بزرگوار ایسے ذات شریفوں کو بھی منہ لگاتے ہیں! بے اعتنائی سے بولا "مجھے اس چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے لے جاؤ۔ ورنہ میں پولیس میں اطلاع کر دوں گا۔ پھر اس دوکان پر نہ آنا کہے دیتا ہوں۔"

کالیخاں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔ ایسی بے رخی کا برتاؤ اس کے ساتھ کبھی کسی نے نہ کیا تھا۔ جس دوکان پر جاتا تھا لوگ اُس کی آؤ بھگت کرتے تھے۔ اُسے سونے کی چڑیا سمجھتے تھے۔ مگر اس کے سکون میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔ مطمئن انداز سے بولا، "یہ تو تم بالکل نئی بات کہہ رہے ہو بھیا! لالہ کا یہ برتاؤ ہوتا تو آج لکھ پتی نہ بنے بیٹھے ہوتے۔ ہزاروں روپئے کی چیزیں تو میں ہی دے گیا ہوں گا۔ شنکر مہراج، بھکاری، ہینگن سبھی سے تو لالہ کا بیوپار ہے۔ کوئی چیز ہاتھ لگی اور آنکھ بند کر کے یہاں چلے آئے۔ دام لئے اور گھر کی راہ لی۔ اس دوکان سے بال بچوں کی روزی چلتی ہے۔ کانٹا نکال کر تول لو۔ دس تولے سے کچھ اوپر ہی نکلیں گے۔ لینے والے تو بیس ہیں مگر اس دوکان کو چھوڑ کر کہیں جانے کو جی نہیں چاہتا۔ لاؤ ڈیڑھ سو ہی دے دو۔ کہاں دوڑتے پھریں۔"

امر کانت نے ڈانٹ کر کہا "میں نے کہہ دیا مجھے اس کی ضرورت نہیں"

"پچھتاؤ گے لالہ! کھڑے کھڑے ڈھائی سو میں بیچ لوں گا۔"

"کیوں مغز چاٹ رہے ہو میں اسے نہیں لوں گا۔"

"اچھا لاؤ، سو ہی روپے دیدو۔ ایک بار گھاٹا ہی سہی"

"تم ناحق مجھے دق کر رہے ہو۔ میں چوری کا مال نہ لوں گا۔ جا ہے لاکھ کی چیز دھیلے میں ملے۔ تمھیں چوری کرتے شرم نہیں آتی؟ ایشور نے ہاتھ پاؤں دئے ہیں، خاصے موٹے تازے آدمی ہو۔ مزدوری کیوں نہیں کرتے دوسروں کا مال اڑا کر اپنی دنیا اور عاقبت دونوں خراب کر رہے ہو"

کالیخاں نے ایسا منہ بنایا گویا ایسی بکواس بہت سن چکا ہے۔ بولا "تو تمھیں نہیں لینا ہے؟"

"نہیں"

"پچاس دیتے ہو؟"

"ایک کوڑی نہیں"

کالے خاں نے کپڑے اٹھا کر کمر میں رکھ لئے اور دوکان کے نیچے اتر گیا لیکن ایک ہی لمحے میں پھر لوٹ کر بولا "اچھا تمھیں ہی دیدو۔ اللہ جانتا ہے اس میں آدھا لال پگڑی والوں کا ہے"

امرکانت نے اُسے دھکا دے کر کہا "نکل جا یہاں سے مردود مجھے کیوں حیران کر رہا ہے"

کالے خاں چلا گیا تو امر نے اُس جگہ کو جھاڑو سے صاف کرایا اور اگر کی بتی جلا کر رکھ دی۔ شراب کی بدبو ابھی تک اس کی ناک میں بھری ہوئی تھی۔ آج اُسے اپنے باپ سے جتنی نفرت ہوئی تھی اتنی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اُس گھر کی ہوا تک اُسے مسموم معلوم ہونے لگی۔ لالہ جی کے ہتھ کنڈوں سے وہ کچھ کچھ واقف تو تھا لیکن وہ اس درجہ گر گئے ہیں اس کا ثبوت آج ہی ملا اس نے اپنے دل میں عہد کیا آج دادا سے اس مسئلے پر خوب بحث کروں گا

اس نے کھڑے ہو کر منتظر آنکھوں سے سڑک کی طرف دیکھا، لالہ جی کہیں نہ دکھائی دئے۔ اس کے جی میں آیا دوکان بند کر کے چلا جائے اور جب لالہ جی آجائیں ان سے صاف صاف کہدے مجھ سے یہ بیوپار نہ ہوگا۔ وہ دوکان بند کرنا چاہتا ہی تھا کہ ایک بڑھیا لاٹھی ٹیکتی سامنے کھڑی ہوگئی اور پوچھا۔ "لالہ نہیں ہیں کیا بیٹا؟"

بڑھیا کے بال سن ہو گئے تھے، جسم کی ہڈیاں تک خشک ہوگئی تھیں حیات کی اُس دور منزل پر پہنچ گئی تھی جہاں سے محض اس کا عکس نظر آتا تھا گویا دو ایک لمحے میں افق میں ڈوب جائے گی۔

امرکانت کے جی میں پہلے تو آیا کہ کہدے لالہ نہیں ہیں۔ لیکن بڑھیا کے پچکے ہوئے چہرے پر ایسی دردناک بیکسی چھائی ہوئی تھی کہ اُسے رحم آگیا۔ بولا "لالہ جی سے کیا کام ہے؟ وہ تو کہیں گئے ہوئے ہیں۔"

بڑھیا نے مایوس ہو کر کہا۔ "کوئی ہرج نہیں بیٹا! میں پھر آجاؤں گی۔"

امر کی بے التفاتی رخصت ہوگئی۔ ہمدردی سے بولا "اب آتے ہی ہوں گے اوپر چلی آؤ۔"

دوکان کی کرسی اونچی تھی۔ تین سیڑھیاں چڑھنی پڑتی تھیں۔ بڑھیا نے پہلی سیڑھی پر پاؤں رکھا لیکن دوسرا پاؤں اوپر نہ اٹھا سکی۔ پیروں میں اتنی طاقت نہ تھی۔ امر نے نیچے آکر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے سہارا دے کر دوکان پر چڑھا دیا۔ بڑھیا نے دعائیں دیتے ہوئے کہا۔ "تمھاری عمر دراز ہو بیٹا! میں بھی ڈرتی ہوں کہ کہیں لالہ دیر میں آئے اور اندھیرا ہوگیا تو میں گھر کیسے پہنچوں گی۔ رات کو کچھ نہیں سوجھتا بیٹا!"

"تمھارا گھر کہاں ہے بڑی بی؟"

بڑھیا نے بے نور آنکھوں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔
"گوبردھن سرائے میں رہتی ہوں۔"
"تمھارے بال بچے نہیں ہیں؟"
"کوئی نہیں رہا بیٹا۔ ایک زمانے میں پورا خاندان تھا۔ پر اللہ نے سب کو بلا لیا۔ بس ایک پوتی رہ گئی ہے۔ اسی کا منہ دیکھ کر جیتی ہوں۔ اور اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں۔ اس کی مرضی میں کسی کو کیا دخل۔ اسی کے کرم سے تو ایک دن سب کچھ تھا۔ اس نے چھین لیا تو کیوں گلہ کروں۔ [illegible]
میں کسی کے بھروسے نہیں ہوں بیٹا! جیتے رہیں میرے لالہ سمرکانت وہی میری پرورش کرتے ہیں۔ تب تو تم بہت چھوٹے تھے جب میرا سردار لالہ جی کا چیرا سی تھا، اسی کی کمائی میں خدا نے کچھ ایسی برکت دی کہ گھر بار بنا بال بچوں کے شادی بیاہ ہوئے۔ چار پیسے ہاتھ میں آئے۔ تھے تو پانچ روپئے کے پیادے پر کبھی کسی سے دبے نہیں۔ کسی کے سامنے گردن نہیں جھکائی جہاں لالہ کا پسینہ گرے وہاں اپنا خون گرانے کو تیار رہتے تھے۔ آدھی رات پچھلی رات جب بلایا حاضر ہو گئے۔ تھے تو ادنیٰ سے نوکر لیکن لالہ نے کبھی "تم" کہہ کر نہیں پکارا۔ برابر خاں صاحب کہتے تھے۔ بڑے بڑے سیٹھ کہتے خاں صاحب! ہمارے پاس آ جاؤ۔ مگر سب کو یہی جواب دیتے کہ جس کے ہو گئے اس کے ہو گئے۔ لالہ نے بھی ایسا نبھایا کہ کیا کوئی نبھائے گا انھیں مرے آج بیسواں سال ہے اسی طرح دئے جاتے ہیں۔ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہیں آئی۔"
امرکانت نے اپنے والد کو خود غرض، بے درد اور حریص سمجھ رکھا تھا۔ آج اسے معلوم ہوا ان میں رحم اور غربا پروری بھی ہے۔ اُسے اپنے اندر

ایک پرغرور مسرت کا احساس ہوا۔ پوچھا "تو تمھیں پانچ روپے ملتے ہیں؟"

"ہاں بیٹا۔ پانچ روپے مہینہ دے جاتے ہیں۔"

"تو میں تمھیں روپے دے دیتا ہوں۔ لیتی جاؤ۔ لالہ شاید دیر میں آئیں۔"

بڑھیا نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا "نہیں بیٹا انھیں آجانے دو۔ لٹھیا ٹیکتی چلی جاؤں گی۔ اب تو یہی آنکھ رہ گئی ہے۔"

"اس میں حرج کیا ہے؟ میں ان سے کہہ دوں گا پٹھانی روپے لے گئی اندھیرے میں کہیں گر پڑو گی۔"

"نہیں بیٹا ایسا کام نہیں کرتی کہ جس میں بعد میں کوئی بات پیدا ہو۔ پھر آجاؤں گی۔"

"نہیں۔ میں بغیر روپے دیے نہ جانے دوں گا۔"

بڑھیا نے ڈرتے ڈرتے کہا "تو دے دو بیٹا۔ میرا نام ٹانک لینا۔"

امرکانت نے روپے دیدیے۔ بڑھیا نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے روپے لے کر گرہ میں باندھے اور دعائیں دیتی ہوئی آہستہ آہستہ چلی گئی۔ مگر پچاس قدم بھی نہ گئی ہوگی کہ پیچھے سے امرکانت ایک یکہ لئے ہوئے آکر بولا "بڑی بی! آکر اس یکے پر بیٹھ جاؤ۔ میں تمھیں پہنچا دوں۔"

بڑھیا نے تعجب کی نگاہوں سے اُسے دیکھ کر کہا "ارے نہیں بھیا تم مجھے پہنچانے کہاں جاؤ گے۔ میں لکڑی ٹیکتی ہوئی چلی جاؤں گی۔ اللہ تمھیں سلامت رکھے۔"

امرکانت نے بڑھیا کو گود میں اٹھا کر یکے پر بٹھایا اور پوچھا "کہاں چلوں؟"

بڑھیا نے یکے کے ڈنڈے کو مضبوط پکڑ کر کہا "گوبردھن کی سرائے

چلو بھیا! اللہ تمھاری عمر دراز کرے۔ میرا بچہ اس بڑھیا کے لئے اتنا حیران ہو رہا ہے اتنی دور سے دوڑ آیا۔"

پندرہ بیس منٹ میں یکہ بیماروں کے کوچہ میں آ پہنچا۔ سڑک کے داہنے ہاتھ ایک گلی تھی۔ وہیں بڑھیا نے یکہ رکوایا اور اتر پڑی۔ یکہ آگے نہ جا سکتا تھا۔ اندھیرا اتنا زیادہ تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ تاریکی نے منہ پر تارکول پوت لیا ہے۔

امرکانت نے یکہ لوٹانے کو کہا تو بڑھیا بولی "نہیں میرے لال! اتنی دور آئے ہو تو پل بھر میرے گھر بھی بیٹھ لو۔ تم نے میرا کلیجہ ٹھنڈا کر دیا۔"

گلی میں سخت بدبو تھی، گندے پانی کے نالے دونوں طرف بہہ رہے تھے غریبوں کا محلہ تھا۔ اکثر مکان کچے تھے۔ شہروں کے بازاروں اور گلیوں میں کتنا فرق ہے! ایک پھول ہے خوبصورت، پاکیزہ اور خوشبودار دوسری جڑ کے کیچڑ اور بدبو سے لپٹی ہوئی۔ ٹیڑھی میڑھی لیکن گیا پھول کو معلوم ہے کہ اس کی ہستی اس کی جڑ سے ہے۔

بڑھیا نے ایک مکان کے سامنے کھڑے ہو کر آہستہ سے پکارا۔ "سکینہ!" اندر سے آواز آئی "آتی ہوں اماں۔ اتنی دیر کہاں لگائی؟"

ایک لمحے میں سامنے کا دروازہ کھلا اور دوشیزہ ہاتھ میں مٹی کے تیل کی ڈبیا لئے دروازے پر کھڑی ہو گئی۔ امرکانت بڑھیا کے پیچھے کھڑا تھا اس پر اس کی نگاہ نہ پڑی لیکن بڑھیا آگے بڑھی تو سکینہ نے امر کو دیکھا۔ فوراً اوڑھنی سے منہ چھپاتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی اور آہستہ سے پوچھا "یہ کون ہیں اماں؟" بڑھیا نے ایک کونے میں اپنی لکڑی رکھدی اور بولی "لالہ کا لڑکا ہے مجھے پہنچانے آیا ہے۔ ایسا سعادت مند لڑکا تو میں نے دیکھا ہی نہیں۔"

اُس نے اب تک کا سارا واقعہ دعاؤں اور پیار کے جملوں سے بھری

ہوئی زبان میں کہہ سنایا۔ اور بولی۔ آنگن میں کھٹولا ڈال دے۔ بالوں تھک گیا ہوگا۔

سکینہ نے ایک ٹوٹا سا کھٹولا آنگن میں ڈالدیا اور اس پر ایک سڑی سی چادر بچھاتی ہوئی بولی۔ اس کھٹولے پر کیا بٹھاؤ گی اماں! مجھے تو شرم آتی ہے۔

بڑھیا خفا ہو کر بولی "اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ ہمارا حال کیا ان سے چھپا ہوا ہے؟"

بڑھیا نے باہر جا کر امرکانت کو بلایا۔ دروازہ ایک پردے کی دیوار میں تھا۔ اس پر ٹاٹ کا ایک پھٹا پرانا پردہ پڑا ہوا تھا۔ دروازے کے اندر قدم رکھتے ہی ایک آنگن تھا جس میں مشکل سے دو کھٹولے بچھ سکتے تھے۔ سامنے کھپریل کا ایک نیچا سا بان تھا اور سائبان کے پیچھے ایک کوٹھری تھی جو اس وقت اندھیری پڑی ہوئی تھی۔ سائبان میں ایک کنارے ایک چولھا بنا ہوا تھا۔ مٹی اور مٹی کے دو چار برتن، ایک گھڑا اور ایک مٹکا رکھا ہوا تھا۔ چولھے میں آگ جل رہی تھی اور توا رکھا ہوا تھا۔

امر نے کھٹولے پر بیٹھتے ہوئے کہا "یہ گھر تو بہت چھوٹا ہے۔ اس میں تمہاری گذر کیسے ہوتی ہے؟"

بڑھیا کھٹولے کے پاس زمین پر بیٹھ گئی اور بولی "بیٹا! اب تو دو ہی آدمی ہیں، انہیں اسی گھر میں ایک پورا کنبہ رہتا تھا۔ میرے دو بیٹے دو بہوئیں ان کے بچے سب اسی میں رہتے تھے۔ اسی میں سبھوں کے شادی بیاہ ہوئے اور اسی میں سب مر بھی گئے۔ اس وقت یہ گھر کیسا گلزار لگتا تھا کہ میں تم سے کیا کہوں۔ اب میں ہوں اور یہی میری پوتی ہے اور سب کو اللہ نے بلا لیا۔ تمہارے پٹھان کے مرتے ہی گھر میں جیسے بھاڑ و پھر گئی۔ اب تو خدا سے یہی دعا ہے

کہ میرے جیتے جی کسی بھلے آدمی سے اس کا نکاح ہو جائے۔ تمہارے یار دوست تو بہت ہوں گے بیٹا۔ اگر شرم کی بات نہ سمجھو تو کسی سے ذکر کرنا۔ کون جانے تمہارے ہی حیلے سے کہیں بات چیت ٹھیک ہو جائے۔"

سکینہ کرتا پاجامہ پہنے اوڑھنی سے پیشانی چھپائے سائبان میں کھڑی تھی بڑھیا نے جوں ہی اس کی شادی کا ذکر چھیڑا وہ چولھے کے پاس جا بیٹھی اور آٹے کو انگلیوں سے گودنے لگی۔ وہ دل میں سمجھا رہی تھی کہ اماں کیوں ان سے میرا دکھڑا لے بیٹھیں۔ کس سے کیا بات کہنی چاہیئے کیا بات نہیں اس کا انھیں ذرا بھی لحاظ نہیں۔ جو ایرا غیرا آگیا اسی سے شادی کا دکھڑا لے بیٹھیں اور ساری باتیں گئیں ایک شادی رہ گئی۔

امرکانت نے دل میں اپنے مسلمان دوستوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا میرے مسلمان دوست زیادہ تو نہیں ہیں لیکن جو دو چار ہیں ان سے ذکر کروں گا۔"

پٹھانی نے یہ مسئلہ چھیڑ تو دیا لیکن اُسے معاً خیال آگیا کہ امرکانت کے دوست مالدار ہوں گے اور مالدار کسی غریب کے گھر کیوں شادی کرنے لگا اس لئے امرکانت کو یہ سمجھا دینا ضروری تھا کہ اس کی حیثیت کا لحاظ کر کے کسی سے تذکرہ کیا جائے۔ بولی "مجھے تو صرف ایسا لڑکا چاہیئے کہ جو شریف خاندان ہو اور شریف مزاج ہو۔ میں دولت کی قائل نہیں۔ حالانکہ ہمارے رسول پاک کا حکم ہے کہ نکاح میں امیر غریب کا امتیاز مٹا دیا جائے لیکن ان کا حکم اب کون مانتا ہے۔ نام کے مسلمان اور نام کے ہندو رہ گئے ہیں۔ نہ کہیں سچا مسلمان نظر آتا ہے نہ سچا ہندو۔ میرے گھر کا تو تم پانی بھی نہ پیو گے بیٹا! تمہاری کیا خاطر کروں؟" یہ کہہ کر اس نے سکینہ سے وہ رومال لانے

کو کہا۔ جس پر ابھی اس نے کشیدہ کاڑھا تھا۔ شاید بھیا کو وہ رومال پسند آجائے وہ غریب اور کس لائق ہے۔

سکینہ سر جھکائے جھجکتی ہوئی بڑھیا کے پاس آئی۔ اس کے ہاتھ میں رومال رکھا اور تیزی سے غائب ہو گئی۔

امرکانت آنکھیں جھکائے ہوئے تھا مگر سکینہ کو سامنے دیکھ کر وہ آنکھیں نیچی نہ رکھ سکا۔ ایک نازنیں سامنے کھڑی ہو تو اس کی طرف سے منہ پھیر لینا اس کی انگریزی تہذیب میں پرلے درجے کی بدتہذیبی تھی۔ لڑکی کا رنگ سانولا تھا اور خط و خال کے اعتبار سے اُس پر حسین کا اطلاق نہ ہو سکتا تھا مگر خط و خال نک سک شرم و حیا اور سادگی و نزاکت ان سب نے مل جل کر اس میں حسن کی کشش پیدا کر دی تھی۔ وہ بڑی بڑی پلکوں سے آنکھیں چھپائے، بدن چرائے، اک نور سا بکھیرتی ہوئی اس طرح نکل گئی جیسے موسیقی کی تان کان میں آکر غائب ہو جائے۔

امرکانت نے رومال اٹھا لیا اور چراغ کی روشنی میں اُسے دیکھنے لگا۔ کتنی صفائی سے بیل بوٹے بنائے گئے تھے۔ امر کو ان بیل بوٹوں میں سکینہ کی نازک انگلیاں نظر آئیں۔ اس جھونپڑی میں اتنا پاکیزہ مذاق۔

حیرت میں آکر بولا "یہ تو بڑا خوبصورت رومال ہے بڑی بی! سکینہ سوزن کاری میں بڑی ہوشیار معلوم ہوتی ہیں۔"

بڑھیا نے فخر کے ساتھ کہا "یہی کام جانتی ہے بیٹا! نہ جانے کیسے سیکھ گئی محلے کی دو چار لڑکیاں مدرسے پڑھنے جاتی ہیں انھیں کو کاڑھتے دیکھ کر اس نے سب کچھ سیکھ لیا مگر اس غریبوں کے محلے میں ان کاموں کی کون قدر کر سکتا ہے۔ ایک بیس بیوہ کا تحفہ سمجھ کر اسے قبول کرو۔"

امر نے رومال کو لے کر رکھا تو اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اُس کا بس ہوتا تو اسی وقت سو دو سو رومالوں کی فرمائش کر دیتا۔ غربت لطیف کا یہ نظارہ دیکھ کر وہ سوچ رہا تھا۔ کاش وہ اس قابل ہوتا تو دو چار اشرفیاں انعام کے طور پر سکینہ کی نذر کرتا۔ کھڑا ہو کر بولا "میں اس رومال کو ہمیشہ آپ کی دُعا سمجھوں گا۔ اگر میرے دوستوں کو ایسے اور رومالوں کی ضرورت ہو تو آسانی سے بن سکیں گے؟"

یہ پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ امرکانت کو قیافے سے سمجھ لینا چاہئے تھا۔ پٹھانی نے اس کی بلائیں لیں۔ اس طرح کا جتنا کام وہ اُسے دے سکے اتنا ہی اس کا احسان ہوگا۔

امرکانت نے پہلے پٹھانی کے لئے تم کا استعمال کیا تھا۔ رخصت ہوتے وقت وہ تم آپ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ سلیقہ، نفاست، وضع داری اور شرافت کا ایسا دل آویز اجتماع امرکانت کے محدود تجربے میں نہ نظر آیا تھا ہاں اُن خوبیوں پر عسرت اور افلاس کا پردہ پڑا ہوا تھا۔

امر رخصت ہوا اور بڑھیا آنچل اٹھا کر اسے دعائیں دیتی رہی۔

(۸)

امرکانت نو بجتے بجتے لوٹا تو لالہ سرکانت نے پوچھا "تم دوکان بند کر کے کہاں چلے گئے تھے؟ اسی طرح دوکانداری ہوتی ہے۔"

امر نے صفائی پیش کی۔ "وہ بڑھیا پٹھانی روپیہ لینے آئی تھی۔ بہت اندھیرا ہو گیا تھا۔ میں نے سمجھا کہیں راستے میں گر نہ پڑے اس لئے اُس کے گھر تک پہنچانے چلا گیا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے روپئے لئے۔"

"کتنے روپئے دئے؟"

"پانچ"

لالہ جی کو کچھ تشفی ہوئی۔ "پھر پوچھا اور بھی کوئی اسامی آیا تھا؟ کسی سے کچھ روپئے وصول ہوئے؟"

"جی نہیں"

"تعجب ہے"

"اور تو کوئی نہیں آیا؟ ہاں وہی بدمعاش کالے خاں سونے کی ایک چیز بیچنے لایا تھا۔ میں نے لوٹا دیا"

سمرکانت کے چہرے پر ناراضگی کے آثار نمایاں ہوئے۔ "کیا چیز تھی؟"

"سونے کے کڑے تھے۔ دس تولے بتلاتا تھا"

"تم نے تولا نہیں؟"

"میں نے ہاتھ سے چھوا تک نہیں"

لالہ جی کی ناراضی غصے میں تبدیل ہوگئی۔ بولے "ہاں کیوں چھوتے اس میں شاید گناہ لپٹا ہوا ہوگا۔ کتنا مانگتا تھا؟"

"دو سو"

"جھوٹ بولتے ہو"

"شروع دو سو سے کئے تھے ہاں اتر کر تیس تک آگیا تھا"

لالہ جی نے غضبناک ہو کر کہا۔ "پھر بھی تم نے لوٹا دئے؟"

"اور کیا کرتا۔ میں تو اُسے مفت بھی نہ لیتا۔ ایسے روزگار پر میں لعنت بھیجتا ہوں"

سمرکانت آپے سے باہر ہو کر بولے "چپ بھی رہو۔ شرماتے نہیں اوپر

سے باتیں بناتے ہو۔ ڈیڑھ سو روپے مفت میں بیٹھے بٹھائے ملتے تھے وہ تم نے اپنے اصول پروری کے زعم میں کھو دئے۔ اس پر بھی اکڑتے ہو۔ جانتے بھی ہو دولت کیا چیز ہے؟ سال میں ایک بار بھی گنگا اشنان کرتے ہو؟ ایک بار بھی دیوتاؤں کو جل چڑھاتے ہو؟ کبھی رام کا نام لیا ہے زندگی میں؟ کبھی ایکادشی یا کوئی دوسرا برت رکھا ہے؟ کبھی کتھا پُران پڑھتے یا سنتے ہو؟ تم کیا جانو دھرم کسے کہتے ہیں۔ دھرم دوسری شے ہے۔ روزگار دوسری شے ہے پھی، صاف ڈیڑھ سو پانی میں ڈالدئے۔"

امرکانت دھرم کی اس تشریح پر دل میں ہنس کر بولا۔ "آپ گنگا اشنان پوجا پاٹ کو حقیقی دھرم سمجھتے ہیں۔ میں سچائی، خدمت اور اصول کو حقیقی دھرم سمجھتا ہوں، اشنان، دھیان، پوجا، برت دھرم کے معاون اسباب ہیں۔ دھرم نہیں۔"

سمرکانت نے منہ چڑھا کر کہا۔ "ٹھیک کہتے ہو۔ بالکل ٹھیک۔ اب دنیا تمہیں کو اپنا مرشد سمجھے گی۔ اگر تمہارے دھرم کے راستے پر چلتا تو آج میں بھی لنگوٹی لگائے گھومتا ہوتا۔ تم بھی یوں محل میں نہ بیٹھے ہوتے۔ چار حرف انگریزی پڑھ لی نہ۔ یہ اسی کی برکت ہے۔ لیکن میں ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں جو انگریزی کے عالم ہو کر بھی دھرم کرم نبھائے جاتے ہیں۔ صاف ڈیڑھ سو پھینکدئے۔"

امرکانت نے جھنجھلا کر کہا۔ "آپ بار بار اس کا ذکر کیوں کرتے ہیں؟ میں چوری اور ڈاکے کے مال کی خرید فروخت نہیں کر سکتا۔ کسی حالت میں بھی نہیں مجھے ایسے روزگار سے نفرت ہے۔"

"تو میرے کاروبار میں ایسے اصولوں کی گنجائش نہیں۔ میں تو ایسا آدمی چاہتا ہوں جو موقع محل دیکھ کر نفع نقصان کا لحاظ کر کے کام کرے۔"

"دھرم کو میں نفع نقصان کی ترازو پر نہیں تول سکتا۔"

اس احمقانہ دلیل اور کٹھ حجتی کا جواب ہی کیا ہو سکتا تھا۔ لالہ جی خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گئے۔ اگر امر کی شادی نہ ہو گئی ہوتی تو اُسے آج دھرم کی توہین کرنے کا مزہ مل جاتا۔ بولے "بس تمھیں تو دنیا میں ایک دھرم کے ٹھیکیدار رہ گئے ہو اور تو جتنے ہیں سب بے دین ہیں۔ وہی مال جو تم نے اپنی حماقت سے لٹا دیا تمھارے کسی دوسرے بھائی نے دو چار روپئے کم و بیش دے کر لے لیا ہو گا۔ اس نے تو روپئے کمائے۔ تم نیبو نون چاٹ کر رہ گئے۔ ڈیڑھ سو روپئے اسوت ہاتھ آتے ہیں جب ڈیڑھ سو تھان کپڑا یا ڈیڑھ سو بورے چینی کے بک جائیں۔ منہ کا لقمہ نہیں ہے۔"

آمر اب بھی قائل نہ ہوا۔ یہ بھی نہ ہوتا تھا کہ خاموش ہی ہو جائے۔ خواہ مخواہ بات بڑھائے جاتا تھا۔ بولا "دوسرے اگر اپنا ایمان بیچ کر روپئے کما سکتے ہیں تو میں اُن پر رشک نہیں کر سکتا۔"

لالہ جی کو لڑکے کی جہالت پر غصے کی جگہ رحم آ گیا۔ جو بالکل نادان ہو اس پر غصہ کیا۔ بولے "تو پھر کون سا روزگار کرو گے؟ دنیا میں کون سا روزگار ہے جس میں تمھارے اصولوں کا خون نہ ہوتا ہو۔ لین دین، سود بٹہ، غلہ کپڑا تیل گھی سبھی روزگاروں میں داؤ پیچ ہیں۔ جو داؤ گھات سمجھتا ہے وہ نفع اٹھاتا ہے جو نہیں سمجھتا اس کا دیوالہ پٹ جاتا ہے۔ مجھے کوئی ایسا روزگار بتا دے جس میں جھوٹ نہ بولنا پڑے، بے ایمانی نہ کرنی پڑے۔ اتنے بڑے بڑے حکام ہیں بتاؤ کون رشوت نہیں لیتا۔ ایک سیدھی سی نقل لینے جاؤ تو ایک روپیہ لگ جاتا ہے۔ بغیر تحریر لئے تھانہ دار رپٹ تک نہیں لکھتا۔ کون وکیل ہے جو جھوٹے گواہ نہیں بناتا؟ لیڈروں ہی میں کون ہے جو چندے کے روپئے میں سے کھسوٹ

نہ کرتا ہو۔ کون ہے جو دولت سے بے نیاز ہے؟"

امرکانت نے مایوسانہ انداز سے سر ہلا کر کہا۔ "اگر روزگار کا یہ حال ہے تو میں وہ نہیں کرنا چاہتا۔"

"تو پھر گرہستی کیسے چلے گی؟ کنویں میں پانی کی آمد نہ ہو تو لوگ پیاسے مرجائیں۔"

امرکانت نے اس بحث کو ختم کرنے کے ارادے سے کہا۔ "میں بھوکوں مرجاؤں گا لیکن اپنے ضمیر کا گلا نہ گھوٹوں گا۔" ([redacted])

"تو کیا مزدوری کروگے؟"

"مزدوری کرنا شرم کی بات نہیں۔"

امرکانت نے ہتھوڑے سے کام نہ چلتے دیکھ کر گھن چلایا۔ "شرم چاہے نہ ہو مگر تم مزدوری کر نہیں سکتے۔ کہو لکھ دوں۔ منہ سے بک دینا آسان ہے کر دکھانا مشکل۔ چوٹی کا پسینہ ایڑی تک آتا ہے تب چار گنڈے پیسے ملتے ہیں۔ آپ مزدوری کریں گے۔ ایک گھڑا پانی تو اپنے ہاتھوں کھینچا نہیں جاتا چار پیسے کی بھاجی لینی ہوتی ہے تو نوکر لے کر چلتے ہیں۔ یہ مزدوری کریں گے۔ اپنی تقدیر کو سراہو کہ میں نے کما کر رکھ دیا۔ تمہارا کیا کچھ نہ ہوگا۔ تمہاری ان باتوں سے تو ایسا جی جلتا ہے کہ اپنا سارا اثاثہ کسی مندر کے لئے وقف کردوں۔ پھر دیکھوں تمہارا ضمیر کدھر جاتا ہے۔"

امرکانت پر اس چوٹ کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ "آپ شوق سے اپنی جائداد وقف کردیں۔ میرا مطلق فکر نہ کریں۔ جس دن آپ کا یہ مقدس ارادہ پورا ہوگا وہ میری زندگی کا سب سے مبارک دن ہوگا۔ میں ہوس کی قید سے آزاد ہوجاؤں گا۔ جب تک میں اس قید میں پڑا رہوں گا میری روح

کی نجات نہ ہوگی۔"

سمرکانت کے پاس اب کوئی آلہ نہ تھا۔ ایک لمحے کے لئے غصے نے ان کی عقل سلیم کو سلب کر دیا۔ بولے "کیوں اس قید میں پڑے ہو، کیوں اپنی روح کو آزاد نہیں کرتے۔ مہاتما ہی ہو جاؤ، کچھ کر کے دکھاؤ تو، جس چیز کی تم قدر نہیں کر سکتے۔ اُسے میں تمہارے گلے نہیں منڈھنا چاہتا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ ٹھاکر دوارے میں چلے گئے۔ جہاں اس وقت آرتی کا گھنٹہ بج رہا تھا۔ امر اس للکار کا جواب نہ دے سکا۔ وہ الفاظ ہی باہر نہ نکل سکے۔ اس کے دل میں پھوڑے کی طرح ٹیسیں ہونے لگیں۔ آپ مجھ پر اپنی ثروت کی دھونس جمانے چلے ہیں۔ سرقے کا مال بیچ کر جواریوں کو چار آنے سود پر روپے دے کر، غریب مزدوروں اور کسانوں کو فریب کا شکار بنا کر تو روپے جمع کئے ہیں اُس پر آپ کو اتنا غرور ہے۔ خدا نہ کرے کہ میں اس دولت کا غلام بنوں۔ وہ انھیں اشتعال انگیز خیالات میں ڈوبا بیٹھا تھا کہ نینا نے آ کر کہا، "دادا بگڑ رہے تھے کیا؟"

امر کانت کی سنسان زندگی میں نینا ہی محبت اور تشفی کی صدائے شیریں تھی۔ اپنا درد و غم، اپنی ہار جیت، اپنی آرزوئیں اور تمنائیں وہ اسی سے بیان کرتا تھا۔ اگرچہ اب سکھدا سے اسے اتنی بیگانگی نہ تھی۔ نہیں اُسے اب اس سے کچھ محبت بھی ہو گئی تھی۔ مگر نینا اب بھی اس سے قریب تر تھی۔ سکھدا اور نینا دونوں اس کے دل کے دو ساحل تھے۔ سکھدا اونچی ناہموار اور پر خار تھی۔ موجیں اس کے قدموں ہی تک پہنچ کر رہ جاتی تھیں۔ نینا ہموار اور قریب، ہوا کے ہلکے جھونکے پا کر بھی موجیں اس کے تہ دل تک پہنچ جاتی تھیں۔

امر اپنے درد دل کو تبسم کی آڑ میں چھپاتا ہوا بولا "کوئی نئی بات نہیں تھی وہی پرانا قصہ تھا۔ دادا نے تو آج مجھ سے صاف صاف کہدیا تم اپنے لئے کوئی راہ نکال لو۔ اور میں بھی سوچتا ہوں اب مجھے بھی کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے۔ یہ روز روز کا فضیحتا نہیں سہا جاتا۔ میں کوئی بیجا حرکت کروں تو انھیں مجھے تنبیہ کرنے کا اختیار ہے لیکن اصول کے معاملے میں بیجا دباؤ نہیں مان سکتا۔"

نینا نے اس وقت میٹھی پکوڑیاں، نمکین پکوڑیاں اور کھٹی پکوڑیاں اور خدا جانے کیا کیا چیزیں پکا رکھی تھیں۔ اس کی طبیعت ان چیزوں کے کھلانے اور کھانے کی مسرت کا مزہ لے رہی تھی۔ امر و نہی کے جھگڑے اُسے فضول سے معلوم ہوئے۔ بولی "پہلے چل کر پکوڑیاں تو کھا لو پھر اس مسئلہ پر صلاح و مشورہ ہو گا۔"

امر نے بیدلی سے کہا "مجھے تو اس وقت بالکل بھوک نہیں ہے۔ لات ماری ہوئی روٹیاں حلق کے نیچے نہ اتریں گی۔ دادا نے آج فیصلہ کر دیا ہے۔"

"اب تمھاری یہی بات مجھے اچھی نہیں لگتی۔ آج کی سی مزے دار پکوڑیاں تم نے کبھی نہ کھائی ہوں گی۔ تم نہ کھاؤ گے تو میں بھی نہ کھاؤں گی۔"

نینا کی اس دھمکی نے امر کے انکار کو کئی قدم پیچھے ڈھکیل دیا۔ "تو مجھے بہت تکلیف دیتی ہے نینا! سچ کہتا ہوں مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔"

"چل کر تھال پر بیٹھو تو پکوڑیاں دیکھتے ہی ٹوٹ نہ پڑو تو کہنا۔"

"تو جا کر کھا کیوں نہیں لیتی۔ میں ایک دن نہ کھانے سے مر تو نہ جاؤں گا۔"

"تو کیا میں ایک دن نہ کھانے سے مر جاؤں گی۔ میں تو نرجل شیورا تری برت رکھتی ہوں۔ تم نے تو کبھی برت بھی نہیں رکھا۔"

امر میں نینا کے محبت آمیز اصرار کو رد کرنے کی طاقت نہ تھی۔

لالہ سمرکانت رات کو کھانا نہیں کھاتے تھے اس لئے بھائی، بھاوج، بہن ساتھ ہی کھالیا کرتے تھے۔ امر آنگن میں پہنچا تو نینا نے بھابی کو بلایا۔ "سکھدا نے اوپر ہی سے کہا مجھے بھوک نہیں ہے۔"

منا نے کا بار امرکانت کے سر پر پڑا۔ دبے پاؤں اوپر گیا۔ جی میں ڈر رہا تھا کہ آج معاملہ طول کھینچے گا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس کا ارادہ مستقل تھا کہ اس مسئلے پر وہ کبھی نہ دبے گا۔ یہ ایسا اہم معاملہ تھا جس پر کسی طرح کا سمجھوتہ غیر ممکن تھا۔

امرکانت کی آہٹ پاتے ہی سکھدا سنبھل بیٹھی۔ اس کے زرد چہرے پر ایسی دردناک انیچا جھلک رہی تھی کہ ایک لمحے کے لئے امرکانت کا دل کمزور ہو گیا۔

اس نے سکھدا کا ہاتھ پکڑ کر کہا "چلو کھانا کھالو۔ آج تو بہت دیر ہو گئی۔"

"کھانا پیچھے کھاؤں گی پہلے تم سے ایک بات کا فیصلہ کرنا ہے۔ تم آج پھر دادا جی سے الجھ پڑے؟"

"میں الجھ پڑا یا انہی نے مجھے سخت سست کہنا شروع کر دیا؟"

"تو انھیں اس کا موقع کیوں دیتے ہو؟ میں مانتی ہوں کہ ان کا طرز عمل تمھیں پسند نہیں۔ میں بھی اس کی تائید نہیں کرتی۔ لیکن اب اس عمر میں تم انھیں کسی نئے راستے پر نہیں ڈال سکتے۔ آخر ان کا بھی تو وہی راستہ ہے جس پر ساری دنیا چل رہی ہے۔ تمھارا فرض ہے تا حد امکان ان کی مدد کرنا جب وہ نہ رہیں گے اس وقت معیاروں یا اپنے اصولوں کی پابندی کرنا۔ تب کوئی تمھارا ہاتھ نہ پکڑے گا۔ اس وقت تو تمھیں اپنے اصولوں کے خلاف بھی عمل کرنا پڑے تو برا نہ ماننا چاہئے۔ انھیں کم سے کم اتنا اطمینان تو دلا دو کہ ان کے بعد

تم ان کی کمائی کو برباد نہ کردو گے۔ میں آج تم دونوں آدمیوں کی باتیں سن رہی تھی۔ مجھے تو تمھاری ہی زیادتی معلوم ہوتی تھی۔"

امر کانت ان دنوں کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہتا تھا جو سکھدا کے لئے تشویش کا باعث ہو لیکن معاملہ ایسا آپڑا تھا کہ اُسے اپنی صفائی پیش کرنے کی ضرورت تھی۔ بولا "اُنھوں نے آج مجھ سے صاف صاف کہدیا "تم اپنی فکر کرو۔ انھیں اپنی دولت مجھ سے زیادہ پیاری ہے۔"

یہی کانٹا تھا جو امر کانت کے دل میں چبھ رہا تھا۔

سکھدا کے پاس جواب تیار تھا "تمھیں بھی اپنا اصول اپنے باپ سے زیادہ پیارا ہے۔ انھیں تو میں کچھ نہیں کہتی۔ اب ساٹھ برس کی عمر میں ان کی اصلاح نہیں کیجا سکتی۔ کم سے کم تم کو یہ حق نہیں ہے۔ تمھیں روپئے کاٹنے ہوں لیکن اولوالعزم اور جوان ہمت آدمیوں نے ہمیشہ لکشمی کی پوجا کی ہے۔ دُنیا کا اہل ہمت نے ہی لطف اٹھایا ہے اور ہمیشہ اٹھائیں گے۔ ترک خانہ داروں کے لئے نہیں۔ گوشہ نشینوں کے لئے ہے۔ اگر تمھیں ترک و قناعت کی زندگی پسند تھی تو شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ سر منڈا کر کسی سادھو سنت کے چیلے بن جاتے۔ تب میں تم سے کچھ کہنے نہ آتی۔ اب اوکھلی میں سر ڈال کر تم موسلوں سے نہیں بچ سکتے۔ خانہ داری کے چرخے میں پڑ کر بڑے بڑوں کو اپنے اصولوں کا خون کرنا پڑتا ہے۔ تم کس شمار میں ہو؟"

امر کانت نے اس تلقین کا جواب دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔ ایسی دلیلوں پر سنجیدگی سے غور ہی نہ کیا جا سکتا تھا۔ بولا "تو تمھاری صلاح ہے کہ سنیاسی ہو جاؤں؟"

سکھدا چڑھ گئی۔ اپنی دلیلوں کی یہ تحقیر برداشت نہ کر سکی۔ بولی۔

بے غیرتوں کو اس کے سوا سوجھ ہی کیا سکتا ہے۔ دولت پیدا کرنا آسان نہیں ہے۔ روزگاریوں کی سی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑے تو سارا سنیاس بھول جائے کسی بھلے آدمی کے دروازے پر جا کر بھیک مانگنے کے لئے علم، عقل، ہمت تجربہ کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ دولت پیدا کرنے کے لئے خون جلانا پڑتا ہے، گوشت گھلانا پڑتا ہے، دماغ لڑانا پڑتا ہے۔ آسان کام نہیں ہے۔ دولت کہیں پڑی نہیں ہے کہ جو چاہے بٹور لائے۔"

امر کانت نے اُسی ظریفانہ انداز سے کہا۔ "میں تو دادا کو گدی پر بیٹھے رہنے کے سوا اور کچھ کرتے نہیں دیکھتا۔ اور بھی جو بڑے بڑے سیٹھ ساہوکار ہیں انھیں بھی پھول کر کپا ہوتے ہی دیکھا ہے۔ اس سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہاں خون جلانا پڑتا ہے۔ خون اور گوشت تو مزدور جلاتے ہیں۔"

سکھدا نے کچھ جواب نہ دیا۔ ایسی موٹی عقل کے آدمی سے بکواس کرنا بے سود تھا۔

نینا نے پکارا۔ "تم کیا کرنے لگے بھیا! آتے کیوں نہیں۔ پکوڑیاں ٹھنڈی ہوئی جاتی ہیں۔"

سکھدا نے کہا۔ "تم جا کر کھا کیوں نہیں لیتے۔ بیچاری دن بھر پریشان ہوئی ہے۔"

میں تو جبھی کھاؤں گا جب تم بھی چلو گی۔"

"وعدہ کرو کہ پھر دادا سے لڑائی نہ کرو گے؟"

امر نے متین لہجے میں کہا۔ "سکھدا میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ میں نے اس لڑائی سے بچنے کے لئے کوئی بات اٹھا نہیں رکھی۔ ان دو برسوں میں مجھ میں کتنا بڑا انقلاب ہو گیا ہے۔ اس پر مجھے خود حیرت ہوتی ہے۔ مجھے جن جن

باتوں سے نفرت تھی وہ سب میں نے قبول کرلیں۔ لیکن اب اس حد پر پہنچ گیا ہوں کہ جو بھر بھی آگے بڑھا تو اس غار میں جا گروں گا جس کی کوئی تھاہ نہیں ہے۔ اس جہنم کی طرف مجھے مت ڈھکیلو۔"

اس گفتگو میں سکھدا ہی پر الزام آتا تھا۔ اسے وہ کیسے برداشت کرتی بولی۔ "اس کا تو یہ منشار ہے کہ میں تمھاری بدخواہ ہوں۔ اگر تمھارے خیال میں میں اتنی تنگ نظر ہوں تو تمھیں اس سے بہت پہلے مجھے زہر دیدینا چاہیئے تھا۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ میں آرام و آسائش کی لونڈی ہوں اور محض اپنی غرض کے لئے تمھیں سمجھا رہی ہوں تو تم میرے ساتھ بہت بڑی بے انصافی کر رہے ہو۔ میں تم کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ عیش پسند سکھدا موقع پڑنے پر جتنی تکلیفیں جھیلنے کی صلاحیت رکھتی ہے ان کا تم اندازہ نہیں کرسکتے۔ ایشور وہ دن نہ لائے کہ میں تمھاری تباہی کا باعث بنوں۔ لیکن جلنے کے لئے خود اپنی چتا بنانا مجھے منظور نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تھوڑی سی عقل سے کام لے کر تم اپنے اصولوں کی تعمیل اور فرض کی پابندی بھی کرسکتے ہو۔ دادا پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ دنیا دیکھ چکے ہیں۔ اگر تمھاری زندگی میں کچھ صداقت ہے تو اس کا اُن پر یقیناً اثر پڑے گا۔ آئے دن کے ان فضیحتوں سے تم انھیں اور بھی سخت بنائے دیتے ہو بچے بھی تو مار سے ضدی ہوجاتے ہیں۔ بوڑھوں کی طبیعت بھی کچھ بچوں ہی کی سی ہوتی ہے۔ بچوں کی طرح بوڑھوں کو بھی تم اپنی خدمت اور اطاعت سے اپنا بنا سکتے ہو۔"

امر نے پوچھا "چوری کا مال خریدا کروں؟"

"کبھی نہیں۔"

"لڑائی تو اسی بات پر ہوئی؟"

"تم اس آدمی سے کہہ سکتے تھے کہ دادا آجائیں تب لانا۔"

"مینا پکار رہی ہے۔"

"میں تو جب ہی چلوں گی جب تم وعدہ کرو گے۔"

امر نے شش و پنج میں پڑ کر کہا "تمہاری خاطر سے کہو وعدہ کر لوں لیکن میں اسے پورا نہیں کر سکتا۔ یہی ہو سکتا ہے کہ میں گھر کی کسی بات سے سروکار نہ رکھوں۔"

سکھدا بولی "یہ اس سے کہیں اچھا ہے کہ روز گھر میں جنگ چھڑی رہے جب تک اس گھر میں ہو تمہیں اس گھر کے نفع نقصان کا لحاظ کرنا پڑے گا"

امر نے خود داری کی شان سے کہا "میں آج اس گھر کو چھوڑ سکتا ہوں"

سکھدا نے بم سا پھینکا "اور میں؟"

امر سکتے میں آ کر سکھدا کا منہ تکنے لگا۔

سکھدا نے اُسی انداز سے کہا "میرا اس گھر سے تعلق تمہارے رشتے سے ہے۔ جب تم اس گھر میں نہ رہو گے تو میرے لئے اس گھر میں کیا رکھا ہے۔ جہاں تم رہو گے وہیں میں بھی رہوں گی۔"

امر نے پس و پیش کے ساتھ کہا "تم اپنی ماں کے ساتھ رہ سکتی ہو۔"

"ماں کے ساتھ کیوں رہوں۔ میں کسی کی دست نگر بن کر نہیں رہ سکتی۔ میرا دُکھ سُکھ تمہارے ساتھ ہے۔ جس طرح رکھو گے اس طرح رہوں گی۔ میں دیکھوں گی تم اپنے اصولوں کے کتنے پکے ہو۔ میں عہد کرتی ہوں کہ تم سے کچھ نہ مانگوں گی تمہیں میرے باعث کچھ تکلیف نہ اٹھانی پڑے گی۔ میں خود بھی کچھ کما سکتی ہوں تھوڑا ملے گا تھوڑے میں گذر کر لیں گے۔ بہت ملے گا تو پوچھنا ہی کیا۔ جب ایک دن ہمیں اپنی جھونپڑی بنانی ہے تو کیوں نہ ابھی سے ہاتھ لگا دیں۔

تم کنویں سے پانی لانا میں چوکا برتن کرلوں گی - کوئی دھونس تو نہ جما سکے گا"
امرکانت لاجواب ہوگیا۔ اسے اپنے متعلق تو کوئی اندیشہ نہ تھا لیکن سکھدا پر وہ یہ ستم کیسے کرتا خفیف ہو کر بولا۔ "وہ وقت ابھی نہیں آیا ہے سکھدا"
سکھدا نے زخم پر نمک چھڑکا "ڈرتے ہو گے کہ اپنے نصیبوں کو روئے گی کیوں؟"
امرکانت نے زچ ہو کر کہا۔ "اس کا تو مجھے گمان بھی نہ تھا۔"
"کیوں جھوٹ بولتے ہو۔ تمہارے دل میں یہی شبہ ہے اور تم اس سے بڑی بے انصافی میرے ساتھ نہیں کر سکتے [قربانی یا اصولوں کی حمایت کے لئے عورتیں کبھی مردوں سے پیچھے نہیں رہیں] تم مجھے مجبور کر رہے ہو کہ اور کچھ نہ ہو تو اس الزام سے بچنے ہی کے لئے میں دادا سے الگ رہنے کی اجازت مانگوں۔"
امر شرمندہ ہو کر بولا "مجھے معاف کرو سکھدا! میں وعدہ کرتا ہوں کہ دادا کو کبھی شکایت کا موقع نہ دوں گا۔"
"اس لئے کہ تمہیں میرے متعلق اندیشہ ہے؟"
"نہیں محض اس لئے کہ مجھ میں ابھی اتنی قوت نہیں۔"
اسی وقت نینا آکر دونوں کو بکوڑیاں کھلانے کے لئے گھسیٹ لے گئی سکھدا خوش تھی۔ اس نے آج معرکے کی فتح پائی تھی۔ امرکانت شرمندہ تھا۔ اس کے فرض اور اصول کی آج آزمائش ہوگئی تھی۔ اور اسے اپنی کمزوری کا علم ہو گیا تھا۔ اونٹ پہاڑ کے نیچے آکر اپنی اونچائی دیکھ چکا تھا۔

(۹)

امر کانت کو زندگی کی حقیقتوں کا تجربہ ہو رہا تھا۔ وہ ایک لفظ بھی ایسا منہ سے نہ نکالتا جس سے سکھدا کو صدمہ پہنچے۔ کیونکہ وہ ماں بننے والی ہے اس کی مرضی کے خلاف وہ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی نہیں کہنا چاہتا۔ اسے اچھی اچھی کتابیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔ رامائن، مہابھارت اور گیتا سے اب امر کو خاص عقیدت ہو گئی ہے کیونکہ سکھدا ماں بننے والی ہے۔ بچے میں ستو و صفات کیسے پیدا ہوں اس کا ہمیشہ دھیان رہتا ہے۔ سکھدا کو خوش رکھنے کے لئے کوئی بات اٹھا نہیں رکھی جاتی۔ اسے تھیٹر، سینما اور تماشے دکھانے میں اب امر کو تامل نہیں ہوتا۔ کبھی پھولوں کے گجرے آتے ہیں۔ کبھی تفریح کے دوسرے سامان۔ وہ صبح شام دوکان پر بھی آ بیٹھتا ہے۔ عام جلسوں سے اسے اب اتنی رغبت نہیں ہے۔ وہ بیٹے کا باپ بننے والا ہے۔ اس تخیل سے اُسے کبھی کبھی ایسا سرور ہوتا ہے، دل میں ایک ایسا ولولہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ تنہائی میں کرشن کی تصویر کے سامنے فرق نیاز خم کر لیتا ہے۔ سکھدا تپ کر رہی ہے اور امر اپنے کو نئی ذمہ داریوں کے لئے تیار کر رہا ہے اب تک وہ ہموار زمین پر تھا۔ بہت سنبھل کر چلنے کی اتنی ضرورت نہ تھی اب وہ بام رفعت پر جا پہنچا ہے۔ وہاں بہت سنبھل کر پاؤں رکھنا پڑے گا۔

لالہ سرکانت بھی آج کل بہت خوش نظر آتے ہیں۔ بیسیوں مرتبہ اندر جا کر سکھدا کی مزاج پرسی کر آتے ہیں۔ امر پر بھی ان کی نظر کرم ہے۔ اس کی معیار پروری کو وہ اتنا قابل اعتراض نہیں سمجھتے۔ ایک دن کالے خاں کو انھوں نے

دوکان سے کھڑے کھڑے نکال دیا۔ اسامیوں پر اب وہ زیادہ سختی نہیں کرتے زیادہ استغاثے نہیں دائر کرتے۔ ان کا مستقبل اب روشن ہو گیا ہے ایک دن راما سے انھوں نے امرکانت کی سعادتمندی اور حق پسندی کی دل کھول کر تعریف کی۔

راما اتنی خوش نہ تھی۔ وضع حمل کی تکلیفوں کا خیال کر کے وہ گھبرا اٹھتی تھی بولی۔ "لالہ جی میں ایشور سے یہی مناتی ہوں کہ جب یہ دن دکھایا ہے تو بیچ میں رُلا مت دینا۔ پہلونٹی میں بڑا خدشہ رہتا ہے یوں کہئے کہ عورت کا دوسرا جنم ہوتا ہے۔"

سرکانت کو ایسا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ بولے "میں نے تو بچے کا نام طے کر لیا ہے، راما کانت۔" راما سہم کر بولی "ابھی نام وام نہ رکھئے لالہ جی اس مصیبت سے نجات ہو جائے تو نام طے ہو جائے گا۔ میں تو سوچتی ہوں درگا پاٹ بٹھا دیجئے اس محلے میں ایک دائی رہتی ہے اُسے ابھی سے رکھ لیا جائے تو اچھا ہو بیکھا ابھی نادان ہے۔ کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ دائی اسے سنبھالتی رہے گی۔"

لالہ جی نے اس تجویز کو خوشی سے منظور کر لیا۔ یہاں سے جب لوٹے تو دیکھا دوکان پر دو گورے اور ایک میم بیٹھے ہوئے ہیں اور امرکانت ان سے باتیں کر رہا ہے۔ کبھی کبھی ادنےٰ درجے کے گورے یہاں اپنی چیزیں بیچنے یا گرو رکھنے کے لئے آجاتے تھے۔ سرکانت انھیں استرے سے مونڈتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ لوگ بدنامی کے خوف سے کسی دوسری دوکان پر نہ جائیں گے۔ انھوں نے جاتے ہی جاتے امرکانت کو ہٹا دیا اور خود سودا پٹانے لگے۔ امرکانت صاف گو تھا اور یہ صاف گوئی کا موقع نہ تھا۔ میم صاحبہ کو سلام کر کے پوچھا "کہئے۔ کیا حکم ہے؟"

تینوں شراب کے نشے میں چور تھے۔ میم نے سونے کی ایک زنجیر نکال کر کہا۔ "سیٹھ جی ہم اس کو بیچنا چاہتا ہے۔ بابا بہت بیمار ہے۔ اس کی دوائی میں بہت خرچ ہو گیا۔"

سمرکانت نے ہاتھ میں زنجیر لے کر دیکھا اور تولتے ہوئے بولے "اس کا سونا اچھا نہیں ہے میم صاحب! آپ نے کہاں بنوایا تھا؟"

میم ہنس کر بولی "او تم برابر یہی بات کہتا ہے۔ سونا بہت اچھا ہے۔ انگریزی دوکان کا بنا ہوا ہے۔"

سمرکانت نے بے اعتنائی کے انداز سے کہا "بڑی بڑی دوکانیں ہی تو گاہکوں کو لوٹتی ہیں۔ جو کپڑا یہاں چھ آنے گز ملے گا وہی انگریزی دوکان پر بارہ آنے گز سے کم نہ ملے گا۔ میں تو اس کے دام دس روپئے تولے سے زیادہ نہیں دے سکتا۔"

"اور کچھ نہیں دیگا؟"

"اور کچھ نہیں یہ بھی آپ کی خاطر ہے۔"

یہ گورے اس طبقے کے تھے جو اپنے ضمیر کو شراب اور جوئے کے ہاتھوں بیچ دیتے ہیں بے ٹکٹ فسٹ کلاس میں سفر کرتے ہیں۔ ہوٹل والوں کو چرکا دے کر اڑ جاتے ہیں۔ جب کچھ بس نہیں چلتا تو بگڑے ہوئے شریف بن کر بھیک مانگتے ہیں۔ تینوں نے آپس میں صلاح کی اور زنجیر بیچ ڈالی۔ روپیہ لے کر دوکان سے اترے اور تانگے پر بیٹھے ہی تھے کہ ایک بھکارن تانگے کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ تینوں گورے روپئے پانے کی خوشی میں پھولے ہوئے تھے۔ اسی وقت بھکارن نے چھری نکال کر ایک گورے پر وار کیا۔ چھری اس کے منہ پر آ رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر منہ پیچھے ہٹایا تو چھاتی

میں چھپ گئی۔ وہ تو تانگے ہی پر ہائے ہائے کرنے لگا باقی دونوں گورے تانگے سے اتر پڑے۔ عورت تو دوکان پر چڑھ گئی۔ مرد نے بھکارن کے ہاتھ سے چھری چھین لینے کی کوشش کی۔ بھکارن نے چھری اس کی پسلی میں چھادی۔ وہ زمین پر گر پڑا۔ تب بھکارن لپک کر دوکان پر چڑھ گئی اور میم پر جھپٹی کہ امرکانت ہاں ہاں کرکے اس کی چھری چھین لینے کو دوڑا۔ بھکارن نے اسے دیکھ کر چھری پھینک دی اور دوکان کے نیچے کود کر کھڑی ہو گئی، سارے بازار میں ہل چل پڑ گئی۔ خبر اڑی کہ ایک گورے نے کئی آدمیوں کو مار ڈالا۔ لالہ سمرکانت مار ڈالے گئے۔ امرکانت کو بھی چوٹ آئی ہے۔ ایسی حالت میں کسے اپنی جان بھاری تھی جو وہاں آتا۔ فوجی گورے بدمعاش ہوتے ہی ہیں ان کا کیا اعتبار۔ لوگ دوکانیں بند کرکے بھاگنے لگے۔

دونوں گورے زمین پر پڑے تڑپ رہے تھے۔ اور میم کھڑی تھی اور لالہ سمرکانت بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر اندر گھسیٹ لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بھکارن بھی سر جھکائے بت سی کھڑی تھی۔ ایسی بھولی بھالی گویا کچھ کیا ہی نہیں ہے۔

وہ بھاگ سکتی تھی۔ کوئی اس کا پیچھا کرنے کی ہمت نہ کر سکتا تھا۔ مگر وہ بھاگی نہیں۔ وہ خودکشی کر سکتی تھی۔ اس کی چھری اب بھی زمین پر پڑی ہوئی تھی مگر اس نے خودکشی بھی نہ کی۔ وہ تو کچھ اس انداز سے کھڑی تھی گویا نگاہ حیرت سے یہ کیفیت دیکھ رہی ہو۔

آس پاس کے کئی دوکاندار جمع ہو گئے۔ پولیس کے دو جوان بھی آ پہنچے اک مجمع جمع ہو گیا۔ چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں "یہی عورت ہے" پولیس والوں نے اسے گرفتار کر لیا۔

ایک دس منٹ میں سارا شہر اور سارے حکام موقع واردات پر جمع ہو گئے سرخ پگڑیوں کا ایک دریا امڈا ہوا تھا۔ سول سرجن نے آکر زخمیوں کو اٹھایا اور اسپتال لے چلے۔ ادھر تحقیقات ہونے لگی۔ بھکارن نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا۔

پولیس سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا "ان آدمیوں سے تیری عداوت تھی؟"

بھکارن نے کوئی جواب نہ دیا۔ سینکڑوں آوازیں آئیں "بولتی کیوں نہیں ہتیارنی"

بھکارن نے خودداری کی شان سے کہا "میں ہتیارنی نہیں ہوں"

"ان صاحبوں کو تم نے نہیں مارا؟"

"ہاں۔ میں نے مارا۔ مگر میں ہتیارنی نہیں ہوں۔ چھ مہینے ہوئے ایسے ہی تین آدمیوں نے میری آبرو برباد کر دی تھی تب سے میں اپنے گھر نہیں گئی۔ کسی کو اپنی صورت تک نہیں دکھائی۔ مجھے ہوش نہیں کہ میں کہاں کہاں رہی کیا کیا جھیلا اور کیا کیا کیا۔ اس وقت بھی مجھے تب ہوش آیا جب میں ان دونوں گوروں کو گھائل کر چکی۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ میں نے کیا کر ڈالا۔ میں بہت غریب ہوں۔ میں نہیں کہہ سکتی مجھے چھری کس نے دی۔ کیونکر دی اور مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آئی۔ یہ میں اس لئے نہیں کہہ رہی ہوں کہ پھانسی سے ڈرتی ہوں۔ میں تو بھگوان سے مناتی ہوں کہ جتنی جلد ہو سکے مجھے اس سنسار سے اٹھا لے۔ جب آبرو ہی لٹ گئی تو جینا کس کام کا ہے"

اس تقریر نے مجمع کا رنگ بدل دیا۔ پولیس نے جن جن شہادتوں کے بیان لئے سب نے یہی کہا۔ یہ پگلی ہے ادھر اُدھر ماری ماری پھرتی تھی۔ کچھ کھانے کو دیا جاتا تھا تو کتوں کے آگے ڈال دیتی تھی۔ پیسے دیئے

جاتے تھے تو پھینک دیتی تھی۔"

ایک تانگے والے نے بیان دیا۔ "یہ بیچ سڑک میں بیٹھی ہوئی تھی۔ کتنی ہی گھنٹی بجائی مگر راستے سے ہٹی نہیں۔ میں مجبور ہو کر پٹڑی سے تانگہ نکال لے گیا۔"

ایک پان والے نے کہا۔ "ایک دن میری دوکان پر آ کر کھڑی ہو گئی میں نے ایک بیڑا دیا۔ اُسے زمین پر ڈال کر پیروں سے کچلنے لگی۔ پھر گاتی ہوئی چلی گئی۔"

امرکانت کا بیان بھی ہوا۔ لالہ جی تو چاہتے تھے کہ وہ اس قضیے میں نہ پڑے لیکن امرکانت اتنا غضبناک ہو رہا تھا کہ انھیں دوبارہ کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ امر نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔ رنگ کو اور شوخ کرنے کے لئے کچھ اپنی طرف سے آمیزش کر دی۔

پولیس کے افسر نے پوچھا۔ "تم کہہ سکتے ہو۔ یہ عورت پاگل ہے؟"

امرکانت بولا۔ "جی ہاں بالکل پاگل۔ بیسیوں بار اُسے آپ ہی آپ روتے اور ہنستے دیکھا ہے۔ کوئی کچھ پوچھتا تھا تو بھاگ جاتی تھی۔"

یہ سب جھوٹ تھا۔ اس دن کے بعد آج یہ عورت پہلی بار اُسے نظر آئی تھی۔

جب پولیس پگلی کو لے کر چلی تو دو ہزار آدمی تھانے تک اس کے ساتھ گئے۔ اب وہ عوام کی نظروں میں معمولی عورت نہ تھی۔ شہادت کے درجے پر پہنچ گئی تھی۔ کسی غیبی طاقت کے بغیر اس میں اتنی ہمت کہاں سے آجاتی۔ رات بھر شہر کے مختلف حصوں سے آ آ کر لوگ اس موقع کا معائنہ کرتے رہے۔ دو چار آدمی اس سانحہ کی تشریح کرنے میں خاص دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے۔

یوں آکر تانگے کے پاس کھڑی ہوگئی، یوں چھری نکالی، یوں جھپٹی۔ بھیا امرکانت نہ آجائیں تو میم کا بھی خاتمہ کردے۔ اس وقت اس کی آنکھوں سے سرخ انگارے نکل رہے تھے چہرہ شعلے کی طرح دہک رہا تھا۔

امرکانت اندر گیا تو دیکھا۔ نینا بھاوج کا ہاتھ پکڑے سہمی کھڑی ہے اور سکھدا آنکھوں میں آنسو بھرے رقت کے عالم میں منتظر آنکھوں سے دروازے کی طرف تاک رہی ہے۔ امر کو دیکھتے ہی اس نے پوچھا۔ "یہ وہی عورت تھی نہ؟"

"ہاں۔ وہی تو معلوم ہوتی ہے۔"
"تو اب اسے پھانسی ہوجائے گی؟"
"شاید بچ جائے لیکن امید کم ہے۔"

"اگر اسے پھانسی ہوگئی تو میں سمجھوں گی۔ دنیا سے انصاف اٹھ گیا۔ اس نے کوئی جرم نہیں کیا۔ جن بدذاتوں نے اس پر اتنا بڑا ستم کیا۔ انھیں ہی سزا ملنی چاہیئے تھی۔ میں اگر عدالت کی کرسی پر ہوتی تو اسے بے داغ چھوڑ دیتی۔ ایسی دیبی کی تو پوجا کرنی چاہیئے۔ اس نے اپنی ساری بہنوں کا سر اونچا کردیا۔"

امرکانت نے کہا۔ "لیکن یہ تو کوئی انصاف نہیں ہے کہ کام کوئی کرے اور سزا کوئی پائے۔ یہ وہ گورے نہیں ہیں۔"

سکھدا نے جوش میں آکر کہا۔ "وہ سب ایک ہیں۔ جس قوم میں ایسے شیطان ہوں اس کا ستارہ ڈوبا سمجھو۔ قوم میں ایک آدمی کوئی برائی کرتا ہے تو ساری قوم بدنام ہوجاتی ہے۔ اس کی سزا بھی ساری قوم کو ملنی چاہیئے ایک گوری عورت کو سرحد کا کوئی پٹھان اٹھالے گیا تھا۔ سرکار نے

اس کا بدلہ لینے کے لئے سرحد پر حملہ کرنے کی تیاری کردی تھی۔ مجرم کون ہے کسی نے پوچھا تک نہیں۔ سرکار کی نگاہ میں سارے صوبے پر الزام عائد ہوتا تھا۔ اس بھکارن کا کوئی محافظ نہ تھا۔ اس لئے اُسے خود اپنی آبرو کا بدلہ لینا پڑا۔ تم جاکر وکیلوں سے مشورہ لو۔ پھانسی نہ ہونے پائے چاہے کتنے ہی روپئے خرچ ہوں۔ میں تو کہتی ہوں وکیلوں کو اس مقدمے کی پیروی مفت کرنی چاہئے۔ ایسے معاملے میں بھی کوئی وکیل مختانہ نہ مانگے تو میں سمجھوں گی وہ انسان نہیں ہے۔ تم اپنی سبھا میں آج جلسہ کرکے چندہ جمع کرنا شروع کردو میں اس حالت میں بھی اسی شہر سے ہزاروں روپئے جمع کرسکتی ہوں۔ ایسی کون عورت ہے جو اس کے لئے نہیں کرے۔

امرکانت نے اس کا غصہ فرو کرنے کے ارادے سے کہا "جو کچھ تم چاہتی ہو وہ سب ہوجائے گا۔ نتیجہ کچھ بھی ہو مگر ہم اپنی طرف سے کوئی بات اٹھا نہ رکھیں گے۔ میں ذرا پروفیسر شانت کمار کے پاس جاتا ہوں تم جاکر آرام سے لیٹو۔"

میں بھی اماں کے پاس جاؤں گی۔ تم مجھے اُدھر چھوڑ کر چلے جانا۔"

امرکانت نے التجا کی "تم چل کر آرام سے لیٹو میں اماں سے ملتا آؤں گا۔"

سکھدا نے چڑھ کر کہا "یہ کیفیت آنکھوں سے دیکھ کر جو لیٹے اسے میں بے جان کہتی ہوں۔ اس دیبی کے لئے تو اگر مجھے جان بھی دینی پڑے تو دریغ نہ کروں۔ اماں سے جو میں کہوں گی وہ تم نہیں کہہ سکتے۔ عورت کے لئے عورت کے دل میں جو تڑپ ہوگی وہ مردوں کے دل میں نہیں ہوسکتی میں اماں سے اس مقدمے کے لئے پانچ ہزار سے کم نہ لوں گی۔"

امرکانت کو آج معلوم ہوا کہ اس نازنین کے دل میں کتنا درد، کتنی جنسی ہمدردی، کتنا ایثار ہے۔

تانگہ آیا اور دونوں راما دیبی سے ملنے چلے۔

(۱۰)

تین مہینے تک سارے شہر میں تلاطم برپا رہا۔ روز ہزاروں آدمی سب کام دھندے چھوڑ کر کچہری کا چکر لگاتے۔ بھکارن کو ایک نظر دیکھ لینے کا اشتیاق ہر ایک کے دل میں تھا۔ عورتوں کی بھی خاصی تعداد جمع ہو جاتی تھی۔ بھکارن جوں ہی لاری سے اترتی جے جے کے فلک بوس نعرے بلند ہو جاتے اور پھولوں کی بارش ہونے لگتی۔ راما اور سکھدا تو کچہری کے برخاست ہونے تک وہیں رہتیں۔

حاکم ضلع نے مقدمے کو سشن سپرد کر دیا اور روز پیشیاں ہونے لگیں جوری مقرر ہوئی۔ ادھر صفائی کے لئے ایک فوج تیار کی گئی۔ مقدمے کو ثبوت کی ضرورت نہ تھی۔ ملزم نے اپنا جرم تسلیم کر لیا تھا۔ بس یہی فیصلہ کرنا تھا کہ جس وقت اس نے جرم کا ارتکاب کیا وہ اپنے ہوش میں تھی یا نہیں۔ شہادتوں کا بیان تھا کہ وہ اپنے ہوش میں نہ تھی۔ ڈاکٹر کہتا تھا فتور عقل کی کوئی علامت نہیں نظر آتی۔ ڈاکٹر صاحب بنگالی۔ جس دن وہ یہ بیان دے کر نکلے ان پر لعنتوں کی اتنی بوچھار پڑی کہ بیچارے کو گھر پہنچنا مشکل ہو گیا۔ ایسے موقعوں پر عام رائے سے اختلاف کرنا نیر ملامت کا نشانہ بننا ہے۔ خلقت کسی کو اپنی رائے کے آزادانہ اظہار کا موقع نہیں دیتی۔

راما شہر کی رانی بنی ہوئی تھی۔ مقدمے کی پیروی کی ساری ذمہ داری

اسی کے سر تھی۔ ڈاکٹر شانتی کمار اور امر کانت اس کے داہنے اور بائیں بازو تھے۔ لوگ آ کر خود چندے دیجاتے۔ یہاں تک کہ لالہ سمر کانت بھی خفیہ طور پر مدد کر رہے تھے۔

ایک دن امر کانت نے پٹھانی کو کچہری میں دیکھا۔ سکینہ بھی چادر اوڑھے اس کے ساتھ تھی۔ امر کانت نے پوچھا "بینٹنے کو کچھ لاؤں اماں! آج آپ سے بھی نہ رہا گیا؟"

پٹھانی نے شکوہ آمیز لہجے میں کہا "میں تو روز آتی ہوں بیٹا! تم نے مجھے نہ دیکھا ہوگا۔ یہ لڑکی مانتی ہی نہیں۔"

امر کانت کو رومال کی یاد آ گئی اور وہ تجویز بھی یاد آئی جو بڑھیا نے اس سے کی تھی۔ مگر شورش میں وہ کاج تک تو جا نہ پاتا تھا۔ اس معاملے کی طرف متوجہ ہونے کا موقع ہی کہاں تھا۔

پٹھانی نے پوچھا "مقدمے میں کیا ہوگا بیٹا! پگلی چھوٹے گی کہ سزا پا جائے گی؟"

امر نے کہا "کچھ کہہ نہیں سکتا اماں! چھوٹنے کی کوئی امید نہیں معلوم ہوتی مگر ہم نے پریوی کونسل تک جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

پٹھانی بولی "ایسے معاملے میں بھی حاکم سزا کر دے تو اندھیر ہے۔"

امر کانت نے جوش کے ساتھ کہا "ہم اسے سزا ملے یا رہا ہو۔ مگر اس نے دکھا دیا کہ ہندوستان کی غریب عورتیں بھی اپنی آبرو کی کتنی دلیری سے حفاظت کر سکتی ہیں۔"

سکینہ نے پوچھا تو امر سے لیکن منہ دادی کی طرف کر کے مہم اس سے

مل نہ سکیں گے اماں!"

امر نے معاً کہا۔ "ہاں ملنے میں کیا ہے۔ چلو اماں میں تمھیں اپنے گھر کی عورتوں کے ساتھ بٹھا دوں۔ وہاں تم ان لوگوں سے باتیں بھی کر سکو گی۔"

پٹھانی نے احسان مندانہ لہجے میں کہا۔ "ہاں بیٹا پہلے ہی دن سے یہ لڑکی میری جان کھا رہی ہے۔ تم سے ملاقات ہی نہ ہوتی تھی کہ پوچھوں۔ اس نے کچھ رومال بنائے تھے۔ اس کے دو روپے ملے۔ وہ دونوں روپے بھی کسی امانت کی طرح رکھے ہوئے ہیں۔ چندہ دے گی۔ نہ ہو تو تمھیں لے لو بیٹا! چندہ اُن بیبیوں کو دو روپے دیتے مجھے شرم آئے گی۔"

امر کانت ان غریبوں کا ایثار دیکھ کر دل میں بہت شرمندہ ہوا۔ وہ اپنے کو کچھ سمجھنے لگا تھا۔ جدھر نکل جاتا لوگ اس کا احترام کرتے۔ لیکن ان فاقہ مستوں کی یہ حمیت دیکھ کر اُس کی آنکھیں کھل گئیں۔ بولا "چندے کی تو اب کوئی ضرورت نہیں ہے اماں! روپے کی کمی نہیں ہے۔ اسے اپنے پاس رہنے دو۔ ہاں چلو ان لوگوں سے تمھاری ملاقات کرا دوں۔"

سکینہ کا حوصلہ پست ہو گیا۔ سر جھکا کر بولی۔ "جہاں غریبوں کے روپے نہیں پوچھے جاتے وہاں غریبوں کو کون پوچھے گا۔ ان امیر زادیوں کے پاس جا کر کیا کروں گی اماں!"

امر کانت جھینپتا ہوا بولا۔ "نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے اماں! وہاں تو ایک پیسہ بھی شکریہ کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے۔ غریب امیر کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں خود غریب ہوں۔ میں نے تو صرف اس خیال سے کہا تھا کہ تمھیں زیر باری ہو گی۔"

دونوں امر کانت کے ساتھ چلیں تو راستے میں پٹھانی نے آہستہ سے کہا

میں نے اس دن تم سے ایک بات کہی تھی بھیا! شاید تم بھول گئے؟"

امرکانت نادم ہو کر بولا "نہیں نہیں مجھے یاد ہے۔ خوب یاد ہے۔ ذرا آجکل انھیں پریشانیوں میں مبتلا رہا۔ جوں ہی ادھر سے فرصت ہوئی میں اپنے دوستوں سے اس کا ذکر کروں گا۔" امرکانت دونوں عورتوں کا رامادیبی سے تعارف کرا کے باہر نکلا تو پروفیسر شانتی کمار سے مڈبھیڑ ہوئی ڈاکٹر صاحب نے پوچھا "تم کہاں مٹرگشت کر رہے ہو جی؟ سارے وکیل نہ جانے کس بل میں سما گئے۔ مقدمہ پیش ہونے والا ہے۔ آج ملزمہ کا بیان ہوگا اور کوئی وکیل نہیں۔ ان سے خدا سمجھے۔ ذرا سا اجلاس پر کھڑے کیا ہو جاتے ہیں گویا حاتم کی قبر پر لات مارتے ہیں۔ اس سے کہیں اچھا تھا کہ ایک وکیل کو محنتانہ پر رکھ لیا جاتا۔ محنت کا کام بیگار سمجھا جاتا ہے۔ اتنی بے دلی سے پیروی کی جا رہی ہے کہ میرے جسم کا خون کھولنے لگتا ہے۔ نام سب چاہتے ہیں۔ مگر کام کرنا کسی کو منظور نہیں۔ اگر ابھی جرح ہوتی تو پولیس کے سارے گواہ اکھڑ جاتے۔ مگر یہ کون کرتا۔ جانتے ہیں کہ آج ملزمہ کا بیان ہوگا پھر بھی کسی کو فکر نہیں۔"

امرکانت نے کہا "میں ایک ایک کو اطلاع دے چکا ہوں۔ کوئی نہ آئے تو میں کیا کروں؟"

شانتی کمار گرم ہو کر بولے "مقدمہ ختم ہو جائے تو ایک ایک کی خبر لوں گا۔"

وہ لاری آ رہی ہے! امرکانت وکیلوں کی تلاش میں دوڑا۔ تماشائی چاروں طرف سے دوڑ دوڑ کر اجلاس کے کمرے میں آ گئے۔ بھکارن لاری سے اتری۔ اور اجلاس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ ہزاروں آنکھیں اس

کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اُن بیشمار آنکھوں میں ایک بھی ایسی نہ تھی کہ جو آنسوؤں سے نم نہ ہو۔ بھکارن کے زرد، مرجھائے ہوئے چہرے پر خودداری کا ایسا جلال تھا جو ہوسناک نظروں کو بھی اٹھنے سے پہلے مغلوب اور متاثر کر کے ان میں عقیدت اور احترام کا نور بھر دیتا تھا۔

جج صاحب سانولے رنگ کے پست قد، فربہ اندام آدمی تھے اُن کی لمبی ناک اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں خواہ مخواہ مسکرائی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ پہلے یہ حضرت قوم کے سرگرم خادم تھے اور کانگریس کے کسی اجلاس کے صدر ہو چکے تھے۔ لیکن اُدھر تین سال سے وہ اس عہدے پر پہنچ گئے تھے۔ اس لئے اب قومی تحریکوں سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ لیکن جاننے والے جانتے تھے کہ وہ اب بھی اخباروں میں ایک فرضی نام سے اپنے قومی جذبات کا اظہار کیا کرتے تھے۔ ان کے بارے میں کوئی دشمن بھی یہ کہنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا کہ وہ کسی طرح کے دباؤ یا ایما سے حق سے جو بھر بھی ٹل سکتے ہیں۔ ان کی یہی انصاف پروری اس وقت بھکارن کی رہائی میں مخل ہو رہی تھی۔

جج صاحب نے ملزمہ سے پوچھا "تمہارا نام؟"

"بھکارن"

"تمہارے باپ کا نام؟"

"باپ کا نام بتا کر میں انھیں بدنام نہیں کرنا چاہتی"

"تکسونت"

بھکارن نے پر درد لہجے میں کہا "پوچھ کر کیا کیجئے گا۔ آپ کو اس سے کیا غرض؟"

"تمہارے اوپر یہ الزام ہے کہ تم نے تیسری تاریخ کو دو گوروں کو چھری

سے ایسا ظلم کیا کہ دونوں اسی دن اسپتال میں جاکر مر گئے۔ تم اس جرم کا اقبال کرتی ہو؟"

بھکارن نے بے خوف ہو کر کہا "آپ اسے جرم سمجھتے ہیں میں نہیں سمجھتی۔"

"تم یہ تسلیم کرتی ہو کہ تم نے ان دونوں آدمیوں پر چھری چلائی؟"

بھکارن نے بیباکانہ لہجے میں کہا "جی، ہاں چلائی۔ لیکن میں اپنی جان بچانے کے لیے کوئی صفائی نہیں پیش کرنا چاہتی۔ میں تو اس خیال سے خوش ہوں کہ جلد زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا میں بیکس اور مصیبت زدہ عورت ہوں مجھے اتنا ہی یاد ہے کہ کئی مہینے پہلے میری سب سے عزیز چیز ظالموں کے ہاتھوں لٹ گئی اور اب میرا جینا بیکار ہے۔ میں تو اسی دن مر چکی۔ میں آپ کے سامنے کھڑی بول رہی ہوں لیکن اس جسم میں جان نہیں ہے۔ اسے میں زندہ نہیں کہتی جو کسی کو اپنا منہ نہ دکھا سکے۔ میرے اتنے بھائی بہن میری بھائی کے لئے بے کار آئی دوڑ دھوپ کر رہے ہیں۔ روسیاہ ہو کر جینے سے مر جانا کہیں بہتر ہے۔ میں انصاف نہیں مانگتی، رحم نہیں مانگتی۔ میں صرف سزا مانگتی ہوں۔ ہاں اپنے بھائی بہنوں سے میں آخری التجا ضرور کروں گی کہ میرے مرنے کے بعد میرے جسم کی توہین نہ کرنا۔ اسے اچھوت مت سمجھنا۔ بھول جانا کہ یہ کسی بدنصیب عورت کی لاش ہے۔ جیتے جی جو چیز مجھے نہیں مل سکتی وہ مجھے مرنے کے بعد دیدینا۔ میں صاف کہتی ہوں کہ مجھے اپنے فعل کا افسوس نہیں ہے، رنج نہیں ہے، شرم نہیں ہے، ایشور نہ کرے کہ میری کسی بہن پر یہ آفت آئے۔ لیکن اگر آ ہی جائے تو اس کے لئے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ آپ سوچتے ہوں گے جب یہ مرنے کے لئے اتنی بے قرار ہے

تو اب تک زندہ کیوں رہی۔ اس کا سبب میں آپ کو کیا بتاؤں۔ جب مجھے ہوش آیا اور میں نے اپنے سامنے دو آدمیوں کو زمین پر تڑپتے دیکھا تو ڈر گئی۔ مجھے کچھ سوجھ ہی نہ پڑا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد بھائیوں بہنوں کی شرافت اور محبت نے مجھے گرویدہ کر لیا اور اب تک میں اپنے کو اس دھوکے میں ڈالے ہوئے ہوں کہ شاید میرے منہ کی کالک چھوٹ گئی اور مجھے اپنی دوسری بہنوں کی طرح عزت اور نیک نامی ملے گی۔ لیکن من کی مٹھائی سے کسی کا پیٹ بھرا ہے۔ آج اگر سرکار مجھے چھوڑ بھی دے یہ سب بھائی بہن میرے گلے میں پھولوں کی مالا بھی ڈالدیں، مجھ پر اشرفیوں کی برکھا بھی کیجائے تو کیا یہاں سے میں اپنے گھر جاؤں گی؟ میں بال بچے والی عورت ہوں۔ میرا ایک چھوٹا سا بچہ ہے کیا میں اس بچے کو اپنا کہہ سکتی ہوں؟ کیا اپنے شوہر کو منہ دکھا سکتی ہوں؟ ہرگز نہیں۔ بچہ مجھے دیکھ کر میری گود کے لئے ہاتھ پھیلائے گا لیکن میں اس کے ہاتھوں کو ہٹا دوں گی اور آنکھوں میں آنسو بھرے منہ پھیر کر چلی جاؤں گی۔ میرا شوہر مجھے معاف بھی کر دے۔ میں نے اس کے ساتھ کوئی فریب نہیں کیا ہے۔ میں اب بھی اس کے قدموں سے لپٹ کر رونا چاہتی ہوں لیکن میں اس کے سامنے آنکھیں نہیں اٹھا سکتی وہ مجھے زبردستی کھینچ لے جائے تب بھی میں اس گھر میں قدم نہ رکھوں گی۔ اس خیال سے میرے دل کو تشفی نہیں ہوتی کہ میرے دل میں گناہ نہ تھا۔ اس طرح اپنے من کو وہ سمجھائے جسے جینے کی آرزو ہو۔ میرے دل سے تو یہ خیال کسی طرح دور نہیں ہو سکتا کہ میں اچھوت ہوں، ناپاک ہوں۔ کوئی کچھ کہے، کوئی کچھ سنے مجھے پروا نہیں۔ آدمی کو جان کیوں پیاری ہوتی ہے؟ اس لئے نہیں کہ وہ سکھ بھوگتا ہے۔ جو ہمیشہ دکھ بھوگا کرتے ہیں اور روٹیوں کو ترستے

ہیں انھیں بھی جان کچھ کم پیاری نہیں ہوتی۔ ہمیں جان اس لئے پیاری ہوتی ہے کہ ہمیں اپنوں سے محبت اور غیروں سے عزت ملتی ہے۔ جب مجھے ان دو میں سے ایک کی بھی ملنے کی امید نہیں تو جینے کی ہوس کیوں کروں اپنے چاہے اب بھی مجھ سے محبت دکھائیں لیکن وہ رحم ہوگا محبت نہیں۔ دوسرے اب میری عزت کریں لیکن وہ بھی رحم ہوگا عزت نہیں وہ عزت اور محبت اب مجھے موت کے بعد ہی مل سکتی ہے۔ زندگی میں تو میرے سے رسوائی اور بدنامی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہاں میری جتنی بہنیں اور جتنے میرے بھائی ہیں۔ ان سب سے میں یہی بھیک مانگتی ہوں کہ میری مکتی کے لئے ایشور سے دعا کریں۔"

بھکارن کا بیان ختم ہوگیا۔ عدالت کے اس وسیع کمرے میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف دو چار عورتوں کی سسکیاں سنائی دیتی تھیں۔ عورتوں کے چہرے غرور سے منور ہو رہے تھے۔ مردوں کے چہرے شرم سے جھکے ہوئے تھے۔ امرکانت سوچ رہا تھا۔ گوروں کو یہ شرارت تو اسی لئے سوجھی کہ وہ اپنے کو اس ملک کا حاکم سمجھتے ہیں۔ شانتی کمار نے دل میں ایک تقریر کر ڈالی تھی جس کا مضمون تھا عورتوں پر مردوں کی زیادتیاں سکھدا سوچ رہی تھی کہ یہ عورت چھوٹ جاتی تو میں اسے اپنے گھر میں رکھتی اور اس کی خدمت کرتی۔ راما اس کے نام پر ایک زنانہ دواخانہ کھولنے کی تجویز کر رہی تھی، سکھدا کے قریب ہی جج کی بیوی بیٹھی ہوئی تھی وہ بڑی دیر سے اس مقدمے کے متعلق کچھ گفتگو کرنے کے لئے بے قرار ہو رہی تھی۔ لیکن اپنے قریب بیٹھی ہوئی عورتوں کا نامہربانہ انداز دیکھ کر اسے منہ کھولنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ آخر اس سے نہ رہا گیا۔ سکھدا سے بولی

"یہ عورت بالکل بے قصور ہے۔"

سکھدا نے چٹکی لی "جب جج صاحب بھی ایسا سمجھیں۔"

"میں تو آج ان سے صاف صاف کہدوں گی کہ اگر تم نے اس عورت کو سزا دی تو میں سمجھوں گی تم نے اپنے آقاؤں کا منہ کیا۔"

جج صاحب نے کھڑے ہو کر جوری کو تھوڑے سے لفظوں میں اس مقدمے میں اپنی رائے دینے کی درخواست کی اور خود کچھ کاغذات دیکھنے لگے۔ جوری نے اپنی رائے دیدی۔ ان کے خیال میں ملزمہ بے قصور تھی جج صاحب کے لبوں پر ایک خفیف تبسم نظر آیا۔ اور کل فیصلہ سنانے کا وعدہ کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔

(۱۱)

سارے شہر میں کل کے لئے دونوں طرح کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ہائے ہائے کی بھی اور واہ واہ کی بھی۔ سیاہ جھنڈیاں بھی بنیں اور پھولوں کی ڈالیاں بھی جمع کی گئیں۔ مگر من چلے کم تھے، بے حیا زیادہ۔ گوروں کا خون ہوا ہے۔ جج ایسے معاملے میں بھلا کیا انصاف کرے گا۔ شانتی کمار اور سلیم تو علانیہ کہتے پھرتے تھے کہ جج نے ملزمہ کو پھانسی کی سزا دے دی۔ کوئی خبر لاتا تھا۔ فوج کی ایک پوری رجمنٹ کل عدالت میں طلب کی گئی ہے۔ کوئی فوج تک نہ جا کر مسلح پولیس تک رہ جاتا تھا۔ امرکانت کو فوج کے بلائے جانے کا کامل یقین تھا۔

دس بجے رات کو امرکانت سلیم کے گھر پہنچا۔ ابھی یہاں سے گھنٹے ہی بھر پہلے گیا تھا۔ سلیم نے متفکر ہو کر پوچھا۔ کیسے لوٹ پڑے بھئی! کیا کوئی

نئی بات ہوگئی ؟"

امر نے کہا "پھانسی کی سزا پر خاموش رہ جانا تو بے غیرتی ہے۔ کچلو صاحب کو سبق دینے کی ضرورت ہوگی۔ تاکہ انھیں بھی معلوم ہو جائے کہ نوجوان ہند انصاف کا خون دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتا۔ سوشل بائیکاٹ کر دیا جائے بچا کو پانی بھی نہ ملے۔ جدھر سے نکلیں اُدھر تالیاں پٹیں۔"

سلیم نے مسکرا کر کہا "سوچتے سوچتے سوچی بھی تو وہی لین دین کی بات۔"

"مگر اور کر ہی کیا سکتے ہو؟"

"اس بائیکاٹ سے کیا ہوگا ؟"

"دو چار دن پریشان تو ہوں گے حضرت۔"

"بالکل فضول سی بات ہے، اگر سبق ہی دینا ہے تو ایسا سبق دو جو کچھ دن حضرت کو یاد رہے۔ ایک آدمی ٹھیک کر لیا جائے جو عین اس وقت جب حضرت فیصلہ سنا کر بیٹھنے لگیں ایک جوتا ایسے نشانے کر دے کہ منہ پر پڑے۔"

امر کانت نے قہقہہ مار کر کہا "بڑے مسخرے ہو یار۔"

"اس میں مسخرے پن کی کیا بات ہے ؟"

"تو کیا سچ مچ تم جوتا لگوانا چاہتے ہو ؟"

"جی ہاں۔ اور کیا مذاق کر رہا ہوں۔"

امر کانت نے سوچا بیہودگی تو ہے ہی مگر برائی کیا ہے۔ لاتوں کے بھوت کبھی باتوں سے مانتے ہیں۔ بولا "اچھی بات ہے۔ دیکھی جائے گی۔ مگر ایسا آدمی کہاں ملے گا ؟"

سلیم نے اس کی سادگی پر مسکرا کر کہا "آدمی تو ایسے مل سکتے ہیں جو سرِ عام

گردن کاٹ لیں۔ پاپوش بازی کون سی بڑی بات ہے۔ کسی بدمعاش کو راضی کر لو۔ کالے خاں کیسا رہے گا؟"

"اچھا۔ وہ، اُسے تو میں ایک بار اپنی دوکان پر پھٹکار چکا ہوں"

"تمھاری حماقت تھی ایسے دو چار آدمیوں کو ملائے رکھنا چاہیے۔ وقت پر ان سے بڑے کام نکلتے ہیں۔ میں اور سب باتیں طے کر لوں گا مگر روپے کی فکر تم کرنا۔ میں تو اپنا بجٹ پورا کر چکا"

"ابھی تو مہینہ شروع ہوا ہے بھائی!"

"جی ہاں۔ یہاں شروع ہی میں ختم ہو جاتے ہیں۔ پھر نوچ کھسوٹ چلتی ہے۔ کہیں اماں سے دس روپے اڑائے۔ کہیں ابا جان سے کتاب کے بہانے دس پانچ اینٹھ لئے۔ مگر دو سو کی تھیلی ذرا بڑی مشکل سے ٹوٹے گی۔ ہاں تم انکار کر دو گے تو مجبور ہو کر اماں کا گلا دباؤں گا"

امر نے کہا "روپے کا کوئی غم نہیں۔ میں جا کر لئے آتا ہوں"

سلیم نے اتنی رات گئے روپے منگوانا مناسب نہ سمجھا۔ مسئلہ کل کے لئے ملتوی ہو گیا۔ علی الصباح امر روپے لائے گا اور کالے خاں سے پکا وعدہ کر لیا جائے گا۔

امر گھر پہنچا تو ساڑھے دس بج رہے تھے۔ دروازے پر بجلی جل رہی تھی۔ لالہ جی دیوان خانے میں دو تین پنڈتوں کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ امر کانت کو خوف ہوا کہ اتنی رات گئے یہ جاگ کس لئے ہے کوئی نیا شگوفہ تو نہیں کھلا۔

لالہ جی نے اُسے دیکھتے ہی ڈانٹ کر کہا "تم کہاں گھوم رہے ہو جی! دس بجے کے نکلے نکلے آدھی رات کو لوٹے ہو۔ ذرا جا کر لیڈی ڈاکٹر کو بلا لاؤ۔

وہی جو بڑے اسپتال میں رہتی ہے۔ ساتھ لیتے آنا۔"

امر کانت نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "کیا کسی کی طبیعت ....."

سمر کانت نے قطع کلام کر کے تند لہجے میں کہا "کیا فضول بکتے ہو۔ میں جو کہتا ہوں وہ کرو۔ تم لوگوں نے ناحق دنیا میں جنم لیا۔ یہ مقدمہ کیا ہوا۔ سارے گھر کے سر پر جیسے بھوت سوار ہو گیا۔ فوراً جاؤ۔"

امر کو پھر کچھ پوچھنے کا یارا نہ ہوا۔ گھر میں بھی نہ جا سکا۔ آہستہ سے سڑک پر آیا اور سائیکل پر بیٹھ ہی رہا تھا کہ اندر سے سلونی نکل آئی۔ امر کو دیکھتے ہی بولی "اے بھیا سنو کہاں جاتے ہو؟ بہو جی بہت بے حال ہیں۔ کب سے تمہیں بلا رہی ہیں۔ سارا بدن پسینے سے تر ہو رہا ہے۔ دیکھو بھیا میں سونے کی کنٹھی لوں گی پیچھے سے حیلہ حوالہ نہ کرنے لگنا۔"

امر کانت اس معمے کو سمجھ گیا۔ بائیسکل سے اتر پڑا اور برقی رفتار سے اندر جا پہنچا۔ وہاں ایک دائی، پروس کی ایک برہمنی اور نینا بیٹھی ہوئی تھیں بیچ میں ایک ڈھول رکھا ہوا تھا۔ کمرے میں سکھدا درد سے ہائے ہائے کر رہی تھی۔

نینا نے دوڑ کر امر کا ہاتھ پکڑ لیا اور روتی ہوئی بولی "تم کہاں تھے، بھیا! بھابی بڑی دیر سے بے چین ہیں۔" امر کے دل میں آنسوؤں کی ایسی لہر اٹھی کہ آنکھیں لبریز ہو گئیں۔ کمرے کے دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا مگر اندر قدم نہ رکھ سکا اس کا دل پھٹا جا رہا تھا۔

سکھدا نے بے کسانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا "اب نہیں بچوں گی ہائے پیٹ میں جیسے کوئی برچھی چبھو رہا ہے۔ میرا کہا سنا معاف کرنا۔"

رامانے دوڑ کر امر کانت سے کہا "بیٹا تم یہاں سے جاؤ۔ تمہیں دیکھ کر

وہ اور بھی گھبرائے گی۔ کسی کو بھیج دو کہ وہ لیڈی ڈاکٹر کو بلا لائے۔ جی کڑا کر دو سمجھ دار ہو کر روتے ہو۔"

سکھدا بولی "نہیں اماں ان سے کہدو ذرا یہاں بیٹھ جائیں۔ اب بچوں کی ہائے ایشور۔"

رآما نے امر کو ڈانٹ کر کہا "میں تم سے کہتی ہوں یہاں سے چلے جاؤ اور تم کھڑے رو رہے ہو۔ جا کر لیڈی ڈاکٹر کو بلا لاؤ۔"

امر کانت روتا ہوا باہر نکلا اور رزما نے اسپتال کی طرف چلا۔ لیکن راستے بھر رہ رہ کر اس کے کلیجے میں ہوک اٹھتی رہی۔ شدت درد سے تڑپتی ہوئی سکھدا کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے ناچتی رہی۔ ایسا کرب تو اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ اپنے کو نفریں کر رہا تھا گویا سکھدا کی اس حالت کا خطاوار وہ خود ہے۔

لیڈی ڈاکٹر مس ہوپر کو اکثر ناوقت بلاوے آتے رہتے۔ رات کو اس کی فیس دوگنی تھی۔ امر کانت ڈر رہا تھا کہ کہیں ناراض نہ ہو کہ اتنی رات کو کیوں آئے لیکن مس ہوپر نے خندہ پیشانی سے اس کا خیر مقدم کیا اور موٹر لانے کا حکم دے کر اس سے باتیں کرنے لگی۔

"یہ پہلا ہی بچہ ہے؟"

امر کانت نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "جی ہاں۔"

"آپ روئیں نہیں۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ پہلی بار عام طور پر زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ بہت دبلی تو نہیں ہیں؟"

"آج کل بہت دبلی ہو گئی ہیں۔"

"آپ کو اور پہلے آنا چاہئے تھا۔"

امر کی جان سوکھ گئی۔ وہ کیا جانتا تھا آج یہ آفت آنے والی ہے۔ نہیں کچہری سے سیدھا گھر آتا۔

مس ہوپر نے پھر کہا "آپ لوگ اپنی لیڈیوں کو کوئی ورزش نہیں کرواتے اسی لئے درد زیادہ ہوتا ہے۔ اندر کی رگیں بندھی رہ جاتی ہیں"

امر کانت نے مسکرا کر کہا "میڈم۔ اب تو آپ ہی کا بھروسہ ہے"

"میں تو چلتی ہوں۔ لیکن شاید سول سرجن کو بلانا پڑے"

امر نے مضطرب ہو کر کہا "کہئے تو ان کو بھی لیتا چلوں"

مس ہوپر نے اس کی طرف نگاہ ترحم سے دیکھا "نہیں ابھی نہیں پہلے مجھے چل کر دیکھ لینے دو"

امر کانت کو کچھ تشفی ہوئی، تشویشناک لہجے میں بولا "میڈم اگر اسے کچھ ہوگیا تو میں بھی مر جاؤں گا"

میم نے فکرمند ہو کر پوچھا "تو کیا حالت اچھی نہیں ہے؟"

"بڑی شدت کا درد ہے"

"حالت تو اچھی ہے؟"

"چہرہ زرد پڑ گیا ہے"

"ہم پوچھتے ہیں حالت کیسی ہے؟ اس کا جی تو نہیں ڈوب رہا ہے؟ دل تو نہیں بیٹھ رہا ہے؟ ہاتھ پاؤں تو نہیں ٹھنڈے ہو گئے ہیں؟"

امر نے معذرت کے انداز سے کہا "یہ تو میں نہیں دریافت کر سکا"

موٹر تیار ہوگئی۔ میم صاحب نے امر کو بھی موٹر میں بٹھا لیا اور سائیکل اٹھوا کر برآمدے میں رکھوا دی۔ موٹر چلی۔

امر نے بڑے انکسار کے ساتھ کہا "کہئے تو سول سرجن کے پاس ہوتا آؤں

نئے بازار میں لالہ سمر کانت کا مکان سڑک ہی پر ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔"

میم صاحب تو ادھر چلیں۔ امر کانت سول سرجن کو بلانے چلا۔ گیارہ بج گئے تھے۔ آمد و رفت بند ہو گئی تھی اور پورے تین میل کی منزل تھی۔ سول سرجن نئی دہلی میں رہتا تھا۔ راستے میں کوئی سواری بھی نہ ملی۔ وہاں پہنچتے پہنچتے بارہ بج گئے۔ صدر پھاٹک کھلوانے پھر صاحب کو اطلاع کرانے میں ایک گھنٹے سے زیادہ لگ گیا۔ صاحب اُٹھے تو جامے سے باہر۔ گرجتے ہوئے بولے "ہم اس وقت نہیں جا سکتا۔"

"امر نے بے خوف ہو کر کہا۔ آپ اپنی فیس ہی تو لیں گے۔"

"ہماری رات کی فیس سو روپیہ ہے۔"

"کوئی ہرج نہیں۔"

"تم فیس لایا ہے؟"

امر نے ڈانٹ بتائی "کیا آپ ہر ایک سے پیش گی فیس لیتے ہیں۔ لالہ سمر کانت ان آدمیوں میں نہیں ہیں جن پر سو روپیہ کا بھی اعتبار نہ کیا جا سکے وہ اس شہر کے سب سے بڑے ساہوکار ہیں۔ میں ان کا لڑکا ہوں۔"

صاحب کچھ نرم پڑے۔ امر نے انھیں ساری کیفیت سنائی تو چلنے کو تیار ہو گئے۔ موٹر آئی امر صاحب کے ساتھ موٹر میں جا بیٹھا۔ پندرہ منٹ میں موٹر گھر آ پہنچی۔ امر کو دور ہی سے کچھ شہنائی کی آواز سنائی دی۔ پھر بندوق چھوٹنے کی آواز آئی۔ اس کا دل مسرت سے شگفتہ ہو گیا۔ دروازے پر موٹر رکی تو لالہ سمر کانت نے آ کر ڈاکٹر کو سلام کیا اور بولے "حضور کے اقبال سے سب خیریت ہے۔ بھگوان نے پوتا دیا ہے۔"

ڈاکٹر اور مس ہوپر میں کچھ باتیں ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب نے فیس لی اور چلدئے۔ ان کے جانے کے بعد لالہ جی نے امرکانت کو آڑے ہاتھوں لیا مفت میں سو روپئے کی چپت پڑی۔

امرکانت نے جھلا کر کہا: "آپ مجھ سے روپئے لے لیجئے گا۔ ایسے موقع پر روپیہ کا منہ نہیں کیا جاتا۔"

کسی دوسرے موقع پر امرکانت یہ جھڑکیاں سنکر گھنٹوں بسورتا۔ مگر اس وقت اس کا دل تشکر و امتنان کے جذبے سے پر تھا۔ ایک ایک عضو مسرت سے کھلا ہوا تھا۔ بھری ہوئی گیند پر ٹھوکروں کا کیا اثر۔ اس کے جی میں تو آرہا تھا اس وقت کیا لٹا دوں۔ اب وہ ایک لڑکے کا باپ ہے۔ اب کون اس سے ہیکڑی جتا سکتا ہے۔ وہ طفل نوزائیدہ گویا جنت سے اس کے لئے امید اور بقا کی دعائیں لے کر آیا ہے۔ اُسے دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرنے کے لئے وہ بے قرار ہو رہا تھا۔ اور ہو انھیں آنکھوں سے وہ نئے دیوتا کے درشن کرے گا۔

مس ہوپر نے اسے منتظر آنکھوں سے تکتے دیکھ کر کہا: "آپ یوں بچے کو نہیں دیکھ سکیں گے۔ آپ کو کوئی بڑا انعام دینا پڑے گا۔"

امرکانت نے امیرانہ انکسار کے ساتھ کہا: "بچہ تو آپ کا ہے میم صاحب۔ میں تو محض آپ کا خادم ہوں۔ زچہ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"بہت اچھی، ابھی سو گئی ہیں۔"

"بچہ خوب تندرست ہے؟"

"ہاں۔ اچھا ہے، بہت خوبصورت، گلاب کا پتلا سا۔"

یہ کہہ کر وہ زچہ خانہ میں چلی گئی۔ عورتیں تو گانے بجانے میں مگن تھیں۔

محلے کی پچاسوں عورتیں جمع ہوگئیں تھیں اور ان کی ملی ہوئی آوازیں گویا ایک رسی کی طرح دبیز ہو کر امر کے گلے کو باندھے لیتی تھیں۔ اُسی وقت مس ہوپر نے بچے کو گود میں لے کر اُسے زچہ خانہ کی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ امر امنگ سے بھرا ہوا چلا۔ لیکن یکایک اس پر ایک نامعلوم دہشت غالب آگئی۔ وہ آگے نہ بڑھ سکا وہ گناہوں سے بھرا ہوا دل لئے اس نعمت عظمیٰ کو کیسے اپنے دامن میں لے سکے گا۔ وہ اس نظر کرم کے قابل ہے ہی کب، اس نے اس کے لئے کون سا ریاض کیا ہے۔ یہ ایشور کا فیض بیکراں ہے جس نے یہ نعمت اسے عطا کی۔ یہ اس کی کریمی کا صدقہ ہے۔ تم کیسے رحیم ہو ایشور!

نیلگوں افق کے پردے سے نکلنے والی سنہری شعاعوں کی طرح امر کانت کو اپنے دل کی ساری کثافتوں، ساری خباثتوں کے اندر سے ایک تجلی سی نکلتی ہوئی معلوم ہوئی جس نے اس کی زندگی کو روشن کر دیا۔ چراغوں کی روشنی میں، گیتوں کی آوازوں میں، آسمان کے ستاروں میں اُسی بچے کی دلفریبی تھی۔ اُسی کا جادو تھا، اسی کی معصومیت تھی۔

سلو آکر رونے لگی۔ امر نے پوچھا "تجھے کیا ہوا ہے تو کیوں روتی ہے؟"

سلو بولی "میم صاحب نے مجھے بھیا کو نہیں دیکھنے دیا۔ کیا میں بچے کو نجر لگا دیتی؟ میرے بھی بچے تھے۔ میں نے بھی بچے پالے ہیں۔ میں جرا دیکھ لیتی تو کیا ہوتا"

امر نے ہنس کر کہا "تو کیسی پگلی ہے سلو۔ اس نے تجھے اس لئے نہ دکھایا ہوگا کہ کہیں بچے کو ہوا نہ لگ جائے۔ لیڈی ڈاکٹروں کے نخرے کچھ نرالے ہوتے ہیں لیکن ان کا راج تو آج ہی کے دن ہے نہ۔ پھر تو اکیلی دائی رہجائے گی۔ تو ہی تو بچے کو پالے گی۔ دوسرا کون بیٹھا ہوا ہے"

سلّو کی آنسو بھری آنکھیں مسکرا پڑیں۔" بولی۔ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا بالکل تم کو پڑا ہے۔ ہاں رنگ بہو جی کا ہے۔ میں کنٹھی لے لوں گی۔ کہے دیتی ہوں۔"

ہو، دو بج رہے تھے اسی وقت لالہ سمر کانت نے امر کو بلا کر کہا۔" نیند تو اب کیا آئے گی۔ بیٹھ کر کل کے جشن کا ایک تخمینہ بنا لو۔ تمہاری دفعہ ہاتھ تنگ تھا۔ نینا لڑکی تھی پچیس سال کے بعد بھگوان نے یہ دن دکھایا ہے۔ کچھ لوگ ناچ مجرے کو معیوب سمجھتے ہیں۔ مجھے تو اس میں کوئی برائی نہیں نظر آتی۔ خوشی کے یہی موقعے ہیں۔ چار بھائی بند، یار دوست آتے ہیں، گانا بجانا سنتے ہیں اور دعوت میں شریک ہوتے ہیں۔ یہی زندگی کی راحت ہے اور اس دنیا میں کیا رکھا ہے۔"

امر نے اعتراض کیا۔" لیکن رنڈیوں کا ناچ تو ایسے سعید موقع پر کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ لالہ جی نے اس کی تردید کی۔ تم اپنے اصولوں کو یہاں نہ گھسیڑو میں تم سے صلاح نہیں پوچھ رہا ہوں۔ ہمارے جتنے رسوم ہیں ان کی کوئی نہ کوئی بنیاد بھی ہے۔ سری رام چندر کے جشن ولادت میں اپسراؤں کا ناچ ہوا تھا ہمارے سماج میں ناچ کو شگون سمجھتے ہیں۔"

امر کانت نے پھر عذر کیا۔" انگریزوں کے یہاں تو یہ رواج نہیں ہے۔"

سمر کانت کو وار کرنے کا موقع ملا۔" انگریزوں کے یہاں رنڈیاں نہیں ہیں گھر کی بہو بیٹیاں ناچتی ہیں۔ جیسا ہمارے یہاں چماروں میں ہوتا ہے۔ بہو بیٹیوں کو نچانے سے تو یہ کہیں اچھا ہے کہ رنڈیاں ناچیں۔ کم سے کم میں اور میری طرح کے اور بڈھے اپنی بہو بیٹیوں کو نچانا کبھی پسند نہ کریں گے۔"

امر کانت کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ اس ولادت کی خوشی نے ناچ کو اس کی نظروں میں کچھ کم مکروہ بنا دیا تھا۔ سلیم اور دوسرے احباب جمع ہوں گے۔ خاصی چہل پہل رہے گی۔ اس نے ضد بھی کی تو کیا نتیجہ لالہ جی ماننے کے نہیں۔ پھر وہ

اکیلا کر ہی کیا سکتا ہے۔
وہ بیٹھ کر تخمینہ لکھنے لگا۔ ۱۴/۱۰/۰

(۱۲)

سلیم نے معمول سے کچھ قبل اٹھ کر کالیخاں کو بلایا اور رات کی تجویز اس کے سامنے پیش کی۔ دو سو کی رقم حقیر نہ تھی۔ کالے خاں نے چھاتی ٹھونک کر کہا "بھیا ایک دو جوتے کی کیا بات ہے کہو تو اجلاس پر پچاس گن کر لگا دوں۔ چھ مہینے سے بیشی تو ہوتی نہیں۔ دو سو بال بچوں کے کھانے پینے کے لئے بہت ہے"۔ سلیم نے سوچا امر کانت روپئے لئے آتا ہوگا۔ مگر آٹھ بجے، نو کا عمل ہوا امر کا کہیں پتہ نہیں۔ آیا کیوں نہیں؟ کہیں بیمار تو نہیں پڑ گیا۔ روپئے کا انتظام کر رہا ہوگا۔ اللہ سمرکانت تو ایک کوڑی نہ دیں گے۔ ساس کی خوشامد کرے گا تب جا کر ملیں گے۔ آخر دس بج گئے۔ وہ امر کانت کے پاس چلنے کو تیار ہوا کہ پروفیسر شانتی کمار آ پہنچے۔ سلیم نے دروازے تک جا کر ان کی تعظیم کی۔ ڈاکٹر صاحب نے کرسی پر لیٹے ہوئے پنکھا چلانے کا اشارہ کر کے کہا "تم نے کچھ سنا امر کے گھر میں بچہ ہوا ہے۔ وہ آج کچہری نہ جا سکے گا۔ اس کی ساس بھی وہیں ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا آج کا انتظام کیسے ہوگا۔ امر کے بغیر تو ہم کسی طرح کا مظاہرہ نہ کر سکیں گے۔ رامادیوی آجاتیں تو غنیمت تھی۔ مگر انھیں بھی آج فرصت نہیں ہے"۔

سلیم نے کالے خاں کی طرف دیکھ کر کہا "یہ تو آپ نے بری خبر سنائی۔ اس بھلے آدمی کے گھر میں آج ہی لڑکا بھی ہونا تھا۔ بولو کالیخاں اب؟"

کالیخاں نے دلیرانہ لہجے میں کہا "تو کوئی ہرج نہیں ہے بھیا! تمہارا کام میں کر دوں گا۔ روپئے کہیں بھاگے جاتے ہیں۔ میں ادھر ہی سے کچہری چلا جاؤں گا

جوں ہی تم اشارہ کروگے بس ....."

وہ چلا گیا تو ڈاکٹر صاحب نے شبہہ آمیز لہجے میں پوچھا: "یہ کیا کہہ رہا تھا میں کچھ نہ سمجھا"

سلیم نے اس انداز سے کہا۔ گویا اس معاملے پر متانت سے غور کرنے کی ضرورت نہیں ہے: "کچھ نہیں۔ ذرا کالے خاں کی جوانمردی کا تماشا دیکھنا ہے امرکانت کی یہ صلاح ہے کہ جج صاحب بہادر آج فیصلہ سُنا چکیں تو اُن کی کچھ مدارات کردی جائے۔"

ڈاکٹر صاحب نے تیز نظروں سے دیکھ کر کہا: "تو یہ کہو تم لوگ بدمعاشی پر اُتر آئے۔ زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ امرکانت کی صلاح ہے۔ وہ تو یہاں ہے نہیں مگر تم اس صلاح میں شریک ہو اور تمھارے اوپر بھی اس کی اتنی ہی ذمہ داری ہے۔ میں ایسے فعل کو کمینہ پن سمجھتا ہوں۔ تمھیں یہ خیال کر لینے کا کوئی حق نہیں ہے کہ جج صاحب اپنے افسروں کو خوش کرنے کے لئے انصاف کا خون کردیں گے جو آدمی علم میں، عقل میں، تجربے میں، عزت میں تم سے کوسوں آگے ہے اس میں انصاف کا احساس تم سے کم نہیں ہوسکتا۔ مجھے اس لئے اور بھی زیادہ رنج ہے کہ میں تم دونوں کو شریف اور بے لوث سمجھتا ہوں۔"

سلیم کا منہ ذرا سا نکل آیا۔ ایسی لتاڑ اس نے اپنی عمر میں کبھی نہ سنی تھی اس کے پاس اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے ایک بھی دلیل، ایک بھی لفظ نہ تھا اس کی ذمہ داری امرکانت کے سر ڈالنے کی نیت سے بولا: "میں نے تو امرکانت کو منع کیا تھا۔ مگر جب وہ نہ مانیں تو میں کیا کرتا۔"

ڈاکٹر صاحب کو اعتبار نہ آیا۔ بولے: "تم جھوٹ بولتے ہو۔ یہ سب تمھاری شرارت ہے۔"

"آپ کو میرا یقین ہی نہ آئے تو کیا علاج"

"امر کانت کے دل میں ایسا خیال پیدا ہی نہیں ہو سکتا"

سلیم چپ ہو گیا، کیونکہ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کا یہ جواب ہوتا کہ اگر امر نے یہ تجویز کی تو تم نے اسے مان کیوں لیا۔ اس کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا ایک لمحے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے گھڑی دیکھ کر کہا "آج اس لونڈے پر ایسا غصہ آ رہا ہے کہ گن کر پچاس ہنٹر جماؤں۔ اتنے دنوں تک اس مقدمے کے پیچھے سر پٹکتا پھرا اور آج جب فیصلے کا دن آیا تو ولادت کا جشن منانے بیٹھ گیا نہ جانے کب ہم لوگوں میں اپنی ذمہ داری کا احساس پیدا ہو گا۔ پوچھو اس جشن میں کیا تھا۔ دلیروں کا کام ہے میدان عمل میں جمے رہنا۔ خوشیاں منانا تو تنگ ظرفوں کا کام ہے۔ میں نے پھٹکار سنائی تو ہنسنے لگا۔ آدمی وہ ہی جو زندگی میں ایک اصول بنا لے اور زندگی بھر اس پر قائم رہے۔ کبھی فرض سے منہ نہ موڑے۔ یہ کیا کہ کٹے ہوئے پتنگ کی طرح جدھر ہوا اڑا لے گئی اُدھر اُڑ گئے۔ تم تو کچہری چلنے کو تیار ہو۔ ہمیں اور کچھ نہیں کرنا ہے۔ اگر فیصلہ موافق ہے تو بھکارن کو جلوس کے ساتھ جمنا کنارے تک لانا ہو گا۔ وہاں سب لوگ اشنان کریں گے اور اپنے گھر کی راہ لیں گے۔ سزا ہو گئی تو اسے مبارکباد کے ساتھ رخصت کرنا ہو گا آج ہی شام کو اصلاح تعلیم پر میری تقریر ہو گی۔ اس کی بھی فکر کرنا ہے۔ تم بھی کچھ بولو گے؟"

سلیم نے مسکرا کر کہا "میں ایسے مسئلے پر کیا بول سکوں گا"

"کیوں؟ میرے خیالات تمہیں معلوم ہیں۔ یہ کرایہ کی تعلیم ہمارے کیرکٹر کو تباہ کیے ڈالتی ہے۔ ہم نے تعلیم کو بھی ایک روزگار بنا لیا ہے اور اسی اعتبار سے اس کے عیب و ہنر کی جانچ کرتے ہیں۔ زیادہ سرمایہ خرچ کرو، زیادہ نفع

ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ بہترین تعلیم سب کے لئے معاف ہو۔ تاکہ غریب سے غریب آدمی بھی اونچی سے اونچی لیاقت حاصل کر سکے۔ اور اونچے سے اونچا کام کر سکے۔ میں یونیورسٹی کے دروازے ہر شخص کے لئے کھلے رکھنا چاہتا ہوں سارا خرچ گورنمنٹ کے ذمہ ہونا چاہیئے۔ ملک کو تعلیم کی اس سے کہیں زیادہ ضرورت ہے جتنی فوج کی۔"

سلیم نے اعتراض کیا "فوج نہ ہو تو ملک کی حفاظت کون کرے؟"

ڈاکٹر صاحب نے سنجیدگی سے جواب دیا "ملک کی حفاظت کریں گے ہم اور تم۔ اور ملک کے دس کروڑ جوان جو اب بھی دلیری اور ہمت میں دنیا کی کسی قوم سے پیچھے نہیں ہیں۔ اسی طرح جیسے ہم اور تم رات کو چوروں کے آجانے پر پولیس کو نہیں پکارتے بلکہ اپنی اپنی لکڑیاں لے کر گھروں سے نکل پڑتے ہیں۔"

سلیم نے پیچھا چھڑانے کے لئے کہا "میں بول تو نہ سکوں گا مگر آؤں گا ضرور۔"

سلیم نے موٹر منگوائی اور دونوں آدمی کچہری چلے۔ آج وہاں غیر معمولی ہجوم تھا۔ لیکن جیسے بن دولھا کی برات ہو۔ کہیں کوئی ترتیب نہ تھی۔ سو سو پچاس پچاس کی ٹولیاں جا بجا بیٹھی یا کھڑی گپ شپ کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کو دیکھتے ہی ہزاروں آدمی ان کی طرف دوڑے۔ ڈاکٹر صاحب خاص خاص کارپردازوں کو ضروری ہدایتیں دے کر وکالت خانے میں پہنچے تو دیکھا لالہ سرکانت سب کو نوید تقسیم کر رہے ہیں۔ اس وقت یہاں وہ جشن ہی دلچسپیوں کا مرکز بنا ہوا تھا لوگ بڑے اشتیاق سے پوچھ رہے تھے۔ کون کون سے طائفے بلائے گئے ہیں۔ بھانڈ بھی ہیں یا نہیں؟ گوشت خوروں کے لئے بھی کچھ انتظام ہے؟ ایک جگہ دس بارہ آدمی ناچ پر بحث کر رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو دیکھتے

ہی ایک صاحب نے پوچھا آپ تو اس جشن میں آئیں گے ضرور، کہ آپ کو اعتراض ہے؟"

ڈاکٹر صاحب نے بے اعتنائی سے کہا "میرے پاس اس سے زیادہ ضروری کام ہے۔"

ایک صاحب نے پوچھا "آخر آپ کو ناچ پر کیوں اعتراض ہے؟"

ڈاکٹر صاحب نے دل آزارانہ انداز سے کہا "اس لئے کہ ہم اور آپ ناچنا عیب سمجھتے ہیں۔ ناچنا نفس پروری کی چیز نہیں۔ روحانیت اور تہذیب کی چیز ہے مگر ہم نے اسے شرمناک بنا رکھا ہے۔ مستورات کو عیش اور حظ کی چیز بنانا اپنی ماں اور بہنوں کی توہین کرنا ہے۔ ہم حقیقت سے اتنی دور پہنچ گئے ہیں کہ ہمیں اس کی اصلی صورت بھی نظر نہیں آتی۔"

دفعتاً ایک نوجوان نے قریب آکر ڈاکٹر صاحب کو سلام کیا۔ ایک لمبا سا دُبلا پتلا آدمی تھا۔ چہرہ خشک اور مغموم، کپڑے میلے اور بوسیدہ، بالوں پر گرد پڑی ہوئی، آنکھوں میں ایک دردناک بیکسی، اس کی گود میں ایک سال بھر کا بچہ تھا۔ بڑا شوخ لیکن کچھ ڈرا ہوا۔

ڈاکٹر صاحب نے پوچھا "تم کون ہو۔ مجھ سے کچھ کام ہے؟"

جوان نے اِدھر اُدھر مشتبہ انداز سے دیکھا گویا ان آدمیوں کے روبرو وہ اپنے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا اور بولا "میں تو ٹھاکر ہوں۔ یہاں سے چھ سات کوس پر ایک گاؤں ہے وہیں رہتا ہوں۔"

ڈاکٹر صاحب نے قیافے سے اُسے پہچان لیا اور بولے "اچھا وہی گاؤں جو سڑک کے پچھم طرف ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔"

ڈاکٹر صاحب اُسے لئے ہوئے قریب کے باغیچے میں چلے گئے۔ اور بنچ

پر بیٹھ کر اس کی طرف ایسی نظر سے دیکھا کہ اب وہ اس کی داستان سننے کے لئے تیار ہیں۔

جوان نے جھجکتے ہوئے کہا: "اس مقدمے میں جو عورت ہے وہ اس بچے کی ماں ہے۔ گھر میں ہم دو آدمیوں کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ میں کھیتی باڑی کرتا ہوں۔ وہ بازار سے کبھی کبھی سودا سلف لانے چلی جاتی تھی۔ اس دن وہ بازار سے لوٹ رہی تھی جب یہ واردات ہوئی۔ بس اُس دن سے وہ گھر نہیں گئی ورنہ ہم دونوں میں سے ایک یا دونوں کی جان جاتی۔ اس بچے کے لئے مجھے زیادہ فکر تھی۔ بار بار ماں ماں پکارتا تھا لیکن میں اسے بہلاتا رہتا تھا۔ پہلے تو معلوم ہوتا تھا بچے گا ہی نہیں۔ ایشور کی مرضی تھی۔ رفتہ رفتہ ماں کو بھول گیا۔ پہلے میں اس کا باپ تھا اب تو ماں باپ دونوں میں ہی ہوں۔ باپ کم۔ ماں زیادہ میں نے دل میں سمجھ لیا تھا۔ وہ کہیں ڈوب مری ہوگی۔

جس دن مجھے خبر ملی کہ لالہ سمرکانت کی دوکان پر ایک عورت نے دو گوروں کو مار ڈالا تو میں تاڑ گیا کہ یہ وہی ہے۔ اس دن سے ہر پیشی پر آتا ہوں اور سب سے پیچھے کھڑا رہتا ہوں۔ کسی سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ آج میں نے سمجھا اس سے سدا کے لئے ناتا ٹوٹ رہا ہے۔ اس لئے بچے کو لیتا آیا کہ اسے دیکھنے کی اُسے آرزو نہ رہ جائے۔ آپ لوگوں نے تو کوئی بات اٹھا نہیں رکھی لیکن بھاگ میں جو لکھا تھا وہ کیسے ٹلتا۔ آپ سے بس اتنی ہی عرض ہے کہ جج صاحب فیصلہ سنا چکیں تو اس سے ایک چھن کے لئے میری ملاقات کرا دیجئے گا۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں بابو جی! اگر وہ بری ہو جائے تو میں اس کے چرن دھو دھو کر پیوں۔ اور اُسے اپنے گھر کی دیوی سمجھوں۔ بھائی بند اب بھی ناک سکوڑیں گے مگر جب آپ ایسے بڑے بڑے آدمی میرے ساتھ ہیں تو مجھے برادری کی پروا

نہیں"

شانتی کمار نے پوچھا "جس دن اس کا بیان ہوا تم وہاں تھے؟"

نوجوان نے پرنم آنکھوں سے جواب دیا: "ہاں بابو جی تھا۔ سب کے پیچھے دروازے پر کھڑا رو رہا تھا۔ یہی جی میں آتا تھا کہ دوڑ کر اس کے قدموں سے لپٹ جاؤں اور کہوں منی میں تیرا خادم ہوں۔ تو اب تک میری عورت تھی آج سے میری دیوی ہے۔ منی نے میرے بزرگوں کا نام روشن کر دیا بابو جی اور کیا کہوں"

شانتی کمار نے پھر پوچھا: "مان لو آج وہ چھوٹ جائے تو تم اسے اپنے گھر لے جاؤ گے؟"

نوجوان نے دردناک لہجے میں کہا: "یہ تو پوچھنے کی بات نہیں ہے۔ میں اسے آنکھوں پر بٹھا کر لیجاؤں گا اور جب تک زندہ رہوں گا اس کا غلام بنا رہوں گا"

ایک لمحے کے بعد اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا کیا چھوٹنے کی کچھ آشا ہے بابو جی؟"

شانتی کمار نے کہا: "اوروں کو تو نہیں ہے پر مجھے ہے"

نوجوان ڈاکٹر صاحب کے پیروں پر گر کر رونے لگا۔ چاروں طرف مایوسیوں کا شکار ہونے کے بعد آج اسے امید کی صورت نظر آئی۔ اور اس کے دل کی ساری کیفیتیں گویا مسرت کے نغمے گانے لگیں اور مسرت جب دل میں نہیں سماتی تو گویا آنکھوں میں آنسو بن کر نہیں نکل آتی۔

مورکا ہارن سنتے ہی دونوں نے کچہری کی طرف دیکھا۔ جج صاحب آ گئے خلقت کا وہ سمندر چاروں طرف سے امنڈ کر اجلاس کے سامنے جا پہنچا پھر بھکارن عدالت میں لائی گئی۔ خوشی کے نعرے بلند ہوئے۔ وکیل، بیرسٹر

پولیس، عمال، حکام سبھی آکر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

جج صاحب نے ایک اڑتی ہوئی نگاہ سے مجمع کو دیکھا۔ چاروں طرف خاموشی طاری ہوگئی۔ انگنت آنکھیں جج صاحب کی طرف تاکنے لگیں۔ گویا کہہ رہی تھیں۔ آپ ہی ہماری قسمت کے مالک ہیں۔

جج صاحب نے صندوق سے ٹائپ کیا ہوا فیصلہ نکالا اور پڑھنے لگے مجمع اور قریب آگیا۔ بیشتر لوگ فیصلہ کا ایک حرف بھی نہ سمجھتے تھے مگر کان سبھی لگائے ہوئے تھے۔ اور سب کے دل دھک دھک کر رہے تھے کہ دیکھو جج صاحب اس کی قسمت کا کیا فیصلہ کرتے ہیں۔

کوئی پندرہ منٹ تک جج صاحب فیصلہ پڑھتے رہے اور مجمع ہمہ تن گوش بنا سنتا رہا۔

آخر میں جج کے منہ سے نکلا یہ ثابت ہے کہ منی نے ارتکاب جرم کیا۔

کتنوں ہی کے دل بیٹھ گئے۔ ایک دوسرے کی طرف خطا وار نظروں سے دیکھنے لگے۔

جج نے جملے کو پورا کیا "لیکن یہ بھی ثابت ہے کہ اس نے یہ خون فتور عقل کی حالت میں کیا۔ اس لئے میں اسے رہا کرتا ہوں"

فیصلے کا آخری لفظ مسرت کے طوفانی ولولے میں ڈوب گیا۔ خوشی مہینوں قید فکر میں پڑے رہنے کے بعد آج جو چھوٹی تو چھوٹے ہوئے بچھڑے کی طرح قلانچیں مارنے لگی۔ لوگ متوالے ہو ہو کر ایک دوسرے کے گلے ملنے لگے۔ احباب میں دھول دھپا ہونے لگا۔ کتنوں ہی نے اپنی اپنی ٹوپیاں ہوا میں اچھالدیں۔ جو مسخرے تھے انھیں جوتے اچھالنے کی سوجھی۔ دفعتاً منی ڈاکٹر شانتی کمار کے ساتھ متانت آمیز تبسم سے جگمگاتی ہوئی باہر نکلی۔ گویا کوئی رانی اپنے وزیر کے ساتھ

آرہی ہو۔ مجسمے کی وہ ساری مدہوشی اور وحشت غائب ہو گئی۔ رانی کے سامنے کون بے ادبی کر سکتا ہے۔

جشن کا نقشہ پہلے ہی سے تیار تھا۔ گل باری کے بعد منی کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالنا تھا۔ یہ فخر جج صاحب کی بی بی کو حاصل ہوا جو اس فیصلے کے بعد مسجود عوام بن چکی تھیں۔ پھر بینڈ بجنے لگا۔ سیوا سمتی کے دو سو جوان کیسرئے باتے پہنے ہوئے جلوس کے ساتھ چلنے کو تیار تھے۔ قومی انجمن کے خادم بھی خاکی وردیاں پہنے جھنڈیاں لئے جمع ہو گئے۔ دیویوں کی تعداد ایک ہزار سے کم نہ تھی۔ تجویز کی گئی تھی کہ جلوس جمنا کے کنارے تک جائے۔ وہاں ایک عظیم الشان جلسہ ہو۔ منی کو شہر کی طرف سے ایک بیش قرار تھیلی نذر کیجائے اور جلسہ برخاست ہو جائے منی کچھ دیر تک تو سکون کے عالم میں یہ ہنگامہ دیکھتی رہی۔ پھر شانتی کمار سے بولی "ڈاکٹر صاحب آپ لوگوں نے میری جتنی عزت کی میں اس کے لائق نہیں تھی۔ اب میری آپ سے یہی درخواست ہے کہ مجھے ہردوار یا کسی دوسرے تیرتھ استھان میں بھیج دیجئے۔ وہاں بھیک مانگ کر اور جاتریوں کی خدمت کر کے دن کاٹوں گی۔ یہ جلوس اور یہ دھوم دھام مجھ جیسی بدنصیب عورت کے لئے سوبھا نہیں دیتا۔ ان سبھی بھائی بہنوں سے کہہ دیجئے اپنے اپنے گھر جائیں میں خاک میں پڑی ہوئی تھی آپ لوگوں نے مجھے آسمان پر پہنچا دیا۔ اب اس کے اوپر جانے کی مجھ میں طاقت نہیں ہے۔ میرے سر میں چکر آجائے گا۔ مجھے یہیں سے اسٹیشن روانہ کیجئے۔ آپ کے پیروں پڑتی ہوں۔"

شانتی کمار اس انکسار پر حیرت میں آکر بولے "یہ کیسے ممکن ہے بہن منی! اتنے مرد عورت جمع ہیں ان کی عقیدت اور محبت کا تو کچھ لحاظ کیجئے۔ ان کی کتنی دل شکنی ہو گی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ لوگ آپ کو چھوڑ کر کبھی نہ جائیں گے۔"

"آپ لوگ میرا سوانگ بنا رہے ہیں۔"

"ایسا نہ کہو بہن۔ تمہاری عزت کر کے ہم خود عزت پا رہے ہیں اور تمہیں ہردوار جانے کی ضرورت کیا ہے تمہارا شوہر تمہیں اپنے ساتھ لینے کے لئے آیا ہوا ہے۔"

منی نے ڈاکٹر صاحب کی طرف تعجب سے دیکھا "میرا شوہر مجھے اپنے ساتھ لیجانے کے لئے آیا ہوا ہے۔ آپ نے کیسے جانا؟"

"مجھ سے تھوڑی دیر پہلے ملا تھا۔"

"کیا کہتا تھا؟"

"یہی کہ میں اُسے اپنے ساتھ لیجاؤں گا اور اُسے اپنے گھر کی دیوی سمجھوں گا۔"

"اُس کے ساتھ کوئی بچہ بھی تھا؟"

"ہاں۔ تمہارا چھوٹا بچہ اس کی گود میں تھا۔"

"بچہ بہت دُبلا ہو گیا ہو گا؟"

"نہیں۔ ایسا دُبلا تو نہیں تھا۔"

"خوش بھی تھا؟"

"ہاں خوب ہنس رہا تھا۔"

"اماں اماں تو نہ کرتا ہو گا؟"

"میرے سامنے تو رویا نہیں"

"اب تو جاہے پانوں پانوں چلنے لگا ہو گا۔"

"باپ کی گود میں تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چلتا ہو گا۔"

"اچھا ان کی کیا حالت تھی بہت دُبلے ہو گئے ہیں؟"

"ہاں بہت پریشان نظر آتے تھے۔ یہیں کہیں ہوں گے۔ کہو تو تلاش کروں شاید خود آتے ہوں۔"

منی نے ایک لمحے کے بعد دردناک لہجے میں کہا "نہیں انھیں میرے پاس نہ آنے دیجئے گا۔ میں آج ہی یہاں سے چلی جاؤں گی۔ شوہر اور بیٹے کی الفت میں پڑکر اُن کا ستیاناس نہ کروں گی۔ یہ دھوم دھام دیکھ کر میرے شوہر مجھے ساتھ لیجانے پر تیار ہوگئے ہوں گے۔ لیکن ان کے دل میں کیا ہے میں جانتی ہوں۔ وہ اب میرے ساتھ رہ کر خوش نہیں رہ سکتے۔ میں اسی قابل ہوں کہ کسی ایسی جگہ چلی جاؤں جہاں مجھے کوئی نہ جانتا ہو۔ وہیں مزدوری کرکے یا بھیک مانگ کر اپنا پیٹ پالوں گی۔"

وہ ایک لمحہ چپ رہی۔ شاید دیکھتی تھی کہ ڈاکٹر صاحب کیا جواب دیتے ہیں۔ جب انھوں نے کوئی جواب نہ دیا تو اس نے کانپتی ہوئی لیکن بلند آواز میں مجمع کو مخاطب کیا۔

"بہنو اور بھائیو! آپ نے جتنی میری آؤ بھگت کی ہے اس کے لئے میں آپ کی کہاں تک بڑائی کروں۔ آپ نے ایک ابھاگنی کی لاج رکھ لی۔ اب مجھے جانے دیجئے۔ میں اسی لائق ہوں کہ اپنا کالا منہ چھپائے کسی کونے میں پڑی رہوں اس لائق نہیں ہوں کہ میری درگت کا ہاتھم کیا جائے۔"

مجمع نے بہت شور وغل مچایا۔ دیویوں نے سمجھایا۔ معززین نے اصرار کیا لیکن منی جلوس پر راضی نہ ہوئی۔ آخر مجبور ہوکر ڈاکٹر صاحب نے مجمع کو رخصت کیا اور منی کو موٹر میں بٹھایا۔

منی نے کہا "اب مجھے کسی دور کے اسٹیشن پر لے چلئے۔ جہاں ایک بھی آدمی نہ ہو۔"

ڈاکٹر صاحب نے اِدھر اُدھر منتظر آنکھوں سے دیکھ کر کہا "اتنی جلدی نہ کرو بہن، تمہارا شوہر آتا ہی ہوگا۔ جب یہ لوگ رخصت ہوجائیں گے تو وہ ضرور

آئے گا۔"

منی نے دل شکن انداز سے کہا "اب ان سے نہیں ملنا چاہتی بابوجی۔ کبھی نہیں۔ انھیں اپنے سامنے دیکھتے ہی شاید مارے شرم کے میری جان نکل جائے میں سچ کہتی ہوں میں مرجاؤں گی۔ آپ مجھے یہاں سے جلدی لے چلئے۔ اپنے بچے کو دیکھ کر میرے دل میں ایک ایسی آندھی اٹھے گی کہ دھرم اور بچار سب اس میں اڑ جائیں گے۔ اس موہ میں بھول جاؤں گی کہ میرا کلنک اس کی زندگی برباد کردے گا۔ میرا جی نہ جانے کیسا ہو رہا ہے۔ آپ مجھے یہاں سے جلد لے چلئے میں ان آنکھوں سے اُسے نہیں دیکھنا چاہتی۔"

شانتی کمار نے موٹر چلا دی مگر دس ہی بیس گز گئے ہوں گے کہ منی کا شوہر بچے کو گود میں لئے دوڑتا اور "موٹر روکو! موٹر روکو!!" پکارتا چلا آتا تھا۔ منی کی اس پر نظر پڑی۔ اس نے موٹر کی کھڑکی سے سر نکال کر ہاتھ سے منع کرتے ہوئے چلا کر کہا۔ "نہیں نہیں تم مت آؤ۔ میرے پیچھے مت آؤ۔ ایشور کے لئے مت آؤ۔"

پھر اُس نے دونوں بازو پھیلا دئے گویا بچے کو گود میں لے رہی ہو اور غش کھا کر گر پڑی۔ موٹر تیزی سے چلا جا رہا تھا۔ نوجوان ٹھاکر بچے کو لئے کھڑا رو رہا تھا اور کئی ہزار آدمی موٹر کی طرف تک رہے تھے۔

(۱۳)

منی کے بری ہونے کی خبر آناً فاناً سارے شہر میں پھیل گئی۔ ایسے خاطر خواہ فیصلے کی امید بہت کم آدمیوں کو تھی۔ کوئی کہتا تھا کہ جج صاحب کی بیوی نے شوہر سے لڑ کر یہ فیصلہ کرایا ہے۔ روٹھ کر میکے چلی جا رہی تھی۔ بیوی جب کسی

بات پر اڑ جائے تو شوہر مجبور ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا سرکار نے جج صاحب کو حکم دے کر یہ فیصلہ لکھوایا ہے کیونکہ بھکارن کو سزا دینے سے شہر میں فساد ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ امرکانت اس وقت جشن اور دعوت کے انتظام میں مصروف تھا مگر یہ خبر پاکر ذرا دیر کے لئے سب کچھ بھول گیا۔ اور اس فیصلہ کی ساری کارگذاری خود لینے لگا۔ گھر میں جاکر رامادیوی سے بولا "آپ نے دیکھا اماں جی۔ میں کہتا نہ تھا کہ منی کو بری کرا کے دم لوں گا وہی ہوا۔ وکیلوں اور گواہوں کے ساتھ کتنا سر مغز ن کرنا پڑا ہے کہ میرا دل ہی جانتا ہے" باہر آکر دوستوں سے اور سامنے کے دوکانداروں سے بھی اس نے یہی ڈینگ ماری۔

ایک دوست نے کہا "مگر عورت ہے بڑی دھن کی پکی۔ شوہر کے ساتھ نہ گئی نہ گئی۔ بیچارہ پیروں پڑتا رہ گیا"۔ امرکانت نے بزرگانہ گلہ مندی کے ساتھ کہا "جو کام خود نہ دیکھو وہی چوپٹ ہو جاتا ہے۔ میں تو ادھر پھنس گیا اُدھر کسی سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ اس عورت کو سمجھاتا۔ میں ہوتا تو مجال تھی کہ یوں چلی جاتی میں جانتا کہ یہ حال ہوگا تو سارے کام چھوڑ کر جاتا اور اُسے سمجھاتا۔ میں تو سمجھا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اور بیسوں آدمی ہیں میرے نہ رہنے سے ایسا کیا گھی کا گھڑا لڑھکا جاتا ہے۔ لیکن وہاں کسی کو کیا پروا۔ نام تو ہو گیا۔ کام ہو یا جہنم میں جائے"۔

لالہ سمرکانت نے جشن اور دعوت میں بڑی فیاضی سے کام لیا۔ وہی امرکانت جو ان دور از کار رسوم کی برائیاں کرتے کبھی نہ تھکتا تھا اب منہ تک نہ کھولتا تھا بلکہ اُلٹے اور بڑھاوے دیتا تھا۔ جو اہل مقدرت ہیں وہ ایسے موقعوں پر نہ خرچ کریں تو کب کریں۔ دولت کی زینت یہی ہے۔ ہاں گھر پھونک کر تماشا دیکھنا چاہیئے۔

امرکانت کو اب گھر سے خاص دلبستگی ہوتی جاتی تھی۔ یونیورسٹی تو جانے

لگا تھا لیکن جلسوں اور سبھاؤں سے جی چراتا تھا۔ اب اُسے لین دین پر اتنا اعتراض نہ تھا۔ شام سویرے دوکان پر آ بیٹھتا اور بڑی تندہی سے کام کرتا۔ طبیعت جز رسی کی جانب مائل ہوگئی تھی۔ خستہ حالوں پر اُسے اب بھی رحم آتا تھا لیکن اب وہ دوکان کی بندھی ہوئی کوڑیوں سے تجاوز نہ کرتا۔ اس نخلے سے شیر خوار نے اونٹ کی ننھی سی نکیل کی طرح اس کی زندگی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تھی۔ شمع ضمیر کے سامنے ایک پتنگے نے آکر اس کے شعاعوں پر پردہ ڈال دیا تھا۔

تین مہینے گذر گئے۔ شام کا وقت تھا۔ بچہ پالنے میں سو رہا تھا۔ سکھدا ہاتھ میں پنکھا لئے ایک مونڈھے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ زرد رو لاغر اندام حاملہ مادریت کے شگفتہ جلال سے جیسے کھل اٹھی تھی۔ اس کے حسن میں دوشیزگی کی شوخی نہ تھی ماں کا متین، آسودہ اور پرغرور انداز تھا۔

امر کانت کالج سے سیدھا گھر آیا اور بچے کو فکرمند نظروں سے دیکھ کر بولا "اب تو بخار نہیں ہے؟"

سکھدا نے آہستہ سے بچے کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "نہیں اس وقت تو نہیں معلوم ہوتا۔ ابھی گود میں سو گیا تھا تو میں نے لٹا دیا۔"

امر نے اپنے کرتے کا بٹن کھولتے ہوئے کہا "میرا تو آج وہاں بالکل جی نہ لگا۔ میں تو ایشور سے یہی دعا کرتا ہوں کہ مجھے دنیا کی کسی چیز کی آرزو نہیں ہے بس یہ بچہ خیریت سے رہے۔ دیکھو کیسا مسکرا رہا ہے۔"

سکھدا نے میٹھی سرزنش کے ساتھ کہا "تمہیں نے دیکھ دیکھ کر نظر لگا دی ہے۔"

"میرا جی تو چاہتا ہے اس کا بوسہ لے لوں۔"

"نہیں سوتے ہوئے بچوں کا بوسہ نہیں لینا چاہیئے۔"

دفعتاً کسی نے ڈیوڑھی میں آکر پکارا۔ امر نے جاکر دیکھا تو بڑھیا پٹھانی لٹھیا کے سہارے کھڑی ہے۔ بولا آؤ بڑی بی۔ تم نے سنا ہوگا گھر میں بچہ ہوا ہے۔"

بڑھیا نے اندر آکر کہا: "اللہ کرے جگ جگ جیے اور میری عمر پائے کیوں بیٹا سارے شہر کو نیوتا ہوا اور ہم پوچھے تک نہ گئے۔ کیا ہمیں سب سے غیر تھے۔ اللہ جانتا ہے جس دن یہ خوش خبری سنی دل سے یہی دعا نکلی کہ بچے کی عمر دراز ہو۔"

امر نادم ہوکر بولا: "ہاں یہ غلطی مجھ سے ہوئی پٹھانی معاف کرو۔ آؤ بچے کو دیکھو آج اسے نہ معلوم کیوں بخار آگیا ہے۔"

بڑھیا دبے پاؤں آنگن سے ہوتی ہوئی سامنے کے برآمدے میں پہنچی اور بہو کو دعائیں دیتی ہوئی بچے کو دیکھ کر بولی "کچھ نہیں بیٹا نظر کا فساد ہے۔ میں ایک تعویذ دے دیتی ہوں۔ اللہ چاہے گا تو ہنسنے کھیلنے لگے گا۔"

سکھدا نے انکسار سے بڑھیا کے پیروں کو آنچل سے چھوا اور بولی "چار دن بھی اچھا نہیں رہتا ماتا۔ گھر میں کوئی بڑی بوڑھی تو ہے نہیں میں کیا جانوں کیسے کیا ہوتا ہے۔ میری اماں ہیں مگر وہ روز تو یہاں نہیں آسکتیں۔ نہ میں ہی روز ان کے پاس جاسکتی ہوں۔"

بڑھیا نے پھر دعائیں دیں اور بولی جب کوئی ضرورت پڑے مجھے بلا لیا کرو بیٹا! میں اور کس دن کے لئے جیتی ہوں۔ ذرا تم میرے ساتھ چلے چلو بھیا تعویذ دے دوں۔"

بڑھیا نے اپنے سلوکے کی جیب سے ایک ریشمی کرتا اور ٹوپی نکالی اور بچے کے سرہانے رکھتی ہوئی بولی: "یہ میرے لال کی نذر ہے، بہو اسے منظور کرو۔"

میں اور کس لائق ہوں۔ سکینہ کئی دن سے سی کر رکھے ہوئے تھی۔ چلا نہیں جاتا تھا۔ آج بڑی ہمت کر کے آئی ہوں۔"

سکھدا کے پاس رشتے داروں کے یہاں سے بدھاوے میں آئے ہوئے اچھے اچھے کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ لیکن اس پر خلوص تحفے سے اس کے دل کو جو مسرت حاصل ہوئی اور کسی سے بھی نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ اس میں امارت کا غرور، نمود کی خواہش یا رواج کی خشکی نہ تھی۔

بڑھیا چلنے لگی تو سکھدا نے ایک پوٹلی میں اُسے تھوڑی سی مٹھائی دی، پان کھلائے اور بروٹھے تک اُسے رخصت کرنے آئی۔ امر کانت نے باہر آ کر ایک یکہ لیا اور بڑھیا کے ساتھ بیٹھ کر تعویذ لینے چلا۔ گنڈے، تعویذ، جنتر منتر پر اُسے اعتقاد نہ تھا۔ لیکن بزرگوں کی دعا پر تھا اور اس تعویذ کو وہ محض دعا سمجھ رہا تھا۔

راستے میں بڑھیا نے کہا: "میں نے تم سے کچھ کہا تھا بیٹا وہ تم بھول گئے؟"

امر سچ مچ بھول گیا تھا۔ شرماتا ہوا بولا: "ہاں اماں مجھے یاد نہیں آئی معاف کرو۔"

"وہی سکینہ کے بارے میں۔"

امر نے ہاتھ ٹھونک کر کہا: "بالکل خیال نہ رہا اماں بالکل۔"

"تو اب خیال رکھنا بیٹا! میرے اور کون بیٹھا ہوا ہے جس سے کہوں۔ اِدھر سکینہ نے اور کئی رومال بنائے ہیں۔ کئی ٹوپیوں کے پلے بھی کاڑھے ہیں مگر جب چیز بکتی نہیں تو دل نہیں بڑھتا۔"

"مجھے وہ چیزیں دیدو۔ میں بکوا دوں گا۔"

"تمہیں تکلیف ہوگی۔"

"کوئی تکلیف نہیں اس میں کاہے کی تکلیف۔"

بڑھیا امرکانت کو گھر کے اندر نہ لے گئی۔ ادھر اس کی حالت اور بھی خراب ہو گئی تھی۔ روٹیوں کے بھی لالے تھے۔ گھر کی ایک ایک انگل زمین پر افلاس کا نقش کھنچا ہوا تھا۔ ایسے گھر میں امر کو کیا لے جائے۔ بڑھاپا بے تکلف ہونے پر بھی بے شرم نہیں ہوتا۔ وہ اسے یکے پر چھوڑ کر اندر گئی اور ایک لمحے میں تعویذ اور رومالوں کی بقچی لے کر آ پہنچی۔

"تعویذ اس کے گلے میں باندھ دینا پھر کل مجھ سے حال کہنا۔"

"کل میری تعطیل ہے۔ دو چار دوستوں سے تذکرہ کروں گا۔ ممکن ہوا تو شام تک آجاؤں گا۔"

گھر آ کر امر نے تعویذ بچے کے گلے میں باندھا اور دوکان پر جا کر بیٹھا۔

لالہ جی نے پوچھا کہاں گئے تھے؟ دوکان کے وقت کہیں مت جایا کرو۔"

امر نے معذرت کی۔ "آج پٹھانی آگئی تھی اس نے بچے کے لئے ایک تعویذ دینے کو کہا تھا وہی لینے چلا گیا تھا۔ لالہ جی نے اس کی طرف مطمئن نظروں سے دیکھا اور مزہ لے کر بولے "اب تو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ بدمعاش نے میری مونچھیں پکڑ کر کھینچ لیں۔" میں نے بھی بچا کو کس کر ایک گھونسا دیا۔ ہاں خوب یاد آئی تم بیٹھو میں ذرا شاستری کے پاس سے جنم پتر لیتا آؤں۔ آج انھوں نے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ لالہ جی چلے گئے تو امرکانت گھر میں جا پہنچا اور بچے کو گود میں لے کر بولا "کیوں جی تم ہمارے باپ کی مونچھیں اکھاڑتے ہو؟ خبردار جو پھر ان کی مونچھیں چھوئیں۔ نہیں تو دانت توڑ دوں گا۔"

بچے نے اس کی ناک پکڑ لی اور جیسے ہنومان نے سورج کو نگل لیا تھا اسی طرح اُسے نگل جانے کی کوشش کرنے لگا۔

سکھدا ہنس کر بولی "پہلے اپنی ناک بچاؤ پھر باپ کی مونچھیں بچانا۔"

سلیم نے اتنے زور سے پکارا کہ سارا گھر ہل اٹھا۔

امر کانت نے باہر آکر کہا: "تم بڑے شیطان ہو یار۔ ایسا چلائے کہ میں گھبرا گیا۔ کدھر سے آرہے ہو آؤ۔ کمرے میں چلو"

دونوں بغل والے کمرے میں گئے۔ سلیم نے رات میں ایک غزل کہی تھی وہی سنانے آیا تھا۔ غزل کہہ لینے کے بعد جب تک وہ امر کو سنا نہ لے اُسے چین نہ آتا تھا۔

امر نے کہا: "مگر میں تعریف نہ کروں گا سمجھ لو"

سلیم نے ہاتھ دکھا کر کہا: "شرط تو جب ہے کہ تم تعریف نہ کرنا چاہو جب بھی کرو"

یہی دنیائے الفت میں ہوا کرتا ہے ہوتے دو
تمھیں ہنسنا مبارک ہو کوئی روتا ہے رونے دو

امر نے جھوم کر کہا: "لاجواب شعر ہے بھئی۔ بناوٹ نہیں دل سے کہتا ہوں کتنی مجبوری و مایوسی ہے واہ"

سلیم نے دوسرا شعر پڑھا۔

قسم لے لو جو شکوہ ہو تمھاری بیوفائی کا
کئے کو اپنے روتا ہوں مجھے جی بھر کے رونے دو

امر نے کہا: "غضب کا درد ہے۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اسی طرح سلیم نے پوری غزل سنائی اور امر نے جھوم جھوم کر سنی۔

پھر باتیں ہونے لگیں۔ امر نے پٹھانی کے رومال دکھانے شروع کئے۔

"ایک بڑھیا رکھ گئی ہے۔ غریب عورت ہے۔ جی چاہے دو چار لے لو"

سلیم نے رومالوں کو دیکھ کر کہا: "چیز تو اچھی ہے یار۔ لاؤ ایک درجن لیتا جاؤں۔ کس نے بنائے ہیں؟"

"اسی بڑھیا کی ایک پوتی ہے۔"

"اچھا وہی تو نہیں جو ایک بار کچہری میں پگلی کے مقدمے میں گئی تھی۔ یار مشوق تم نے اچھا چھانٹا۔"

امرکانت نے اپنی صفائی پیش کی "قسم لے لو جو میں نے اس کی طرف دیکھا بھی ہو۔"

"مجھے قسم لینے کی ضرورت۔ تمھیں وہ مبارک ہو۔ میں تمھارا رقیب نہیں بننا چاہتا۔ رومال کتنے درجن کے ہیں؟"

"جو مناسب سمجھو دے دو۔"

اس کی قیمت کاریگر پر منحصر ہے۔ اگر اُس حسینہ نے بنائے ہیں تو فی رومال پانچر روپئے۔ بڑھیا نے یا کسی اور نے بنائے ہیں تو فی رومال چار آنے۔

"تم مذاق کرتے ہو۔ تمھیں لینا منظور نہیں۔"

"پہلے یہ بتلاؤ کس نے بنائے ہیں؟"

"بنائے تو ہیں سکینہ ہی نے۔"

"اچھا ان کا نام سکینہ ہے۔ تو میں فی رومال پانچ روپئے دیدوں گا۔ شرط یہ ہے کہ تم مجھے ان کا گھر دکھا دو۔"

"ہاں شوق سے۔ لیکن تم نے کوئی شرارت کی تو میں تمھارا جانی دشمن ہو جاؤں گا۔ ہمدرد بن کر چلنا ہو تو چلو۔ میں تو چاہتا ہوں اس کی کسی بھلے مانس سے شادی ہو جائے۔ ہے کوئی تمھاری نگاہ میں ایسا آدمی؟ بس یہی سمجھ لو کہ اس کی تقدیر کھل جائے گی۔ میں نے ایسی حیادار اور سلیقہ شعار لڑکی نہیں دیکھی۔"

سلیم نے مسکرا کر کہا "معلوم ہوتا ہے تم خود اس پر ریجھ چکے ہو مگر حسن میں

وہ تمھاری بیوی کے تلوے کے برابر بھی نہیں۔"

امرکانت نے مبصرانہ انداز سے کہا "عورت میں صورت ہی سب سے زیادہ قابل تعریف چیز نہیں ہے بھائی جان! میں تم سے سچ کہتا ہوں اگر میری شادی نہ ہوئی ہوتی اور مذہب ہمارے درمیان حائل نہ ہوتا تو میں اس سے شادی کرکے اپنے کو خوش نصیب سمجھتا۔"

آخر اُس میں ایسی کیا بات ہے جس پر تم اتنے لٹو ہو؟"

"یہ تو میں خود نہیں سمجھ رہا ہوں۔ شاید اس کا بھولا پن ہو۔ تم خود کیوں نہیں کر لیتے۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کے ساتھ تمھاری زندگی جنت بن جائے گی۔"

سلیم نے مشتبہ انداز سے کہا "میں نے اپنے دل میں جس عورت کا نقشہ کھینچ رکھا ہے وہ کچھ اور ہی ہے۔ شاید ویسی عورت میرے خیالی دنیا کے باہر کہیں ہو گی بھی نہیں۔ میری نگاہ میں ایسا کوئی آدمی آئے گا تو بتاؤں گا۔ اس وقت تو یہ رومال لئے لیتا ہوں۔ پانچ روپئے سے کم کیا دوں۔ سکینہ سلائی کا کام بھی تو کر لیتی ہوگی؟ مجھے امید ہے میرے گھر سے اُسے کافی کام مل جائے گا۔ اور تمھیں بھی ایک دوستانہ صلاح دیتا ہوں۔ میں تم سے بدگمان نہیں ہوں لیکن وہاں زیادہ آمد و رفت نہ رکھنا۔ ورنہ بدنام ہو جاؤ گے، تم چاہے کم بدنام ہو اس غریب کی تو زندگی ہی خراب ہو جائے گی۔ ایسے بھلے آدمیوں کی یہاں کمی نہیں ہے جو اس معاملے کو مذہبی رنگ دے کر تمھارے پیچھے پڑ جائیں گے۔ اس کی مدد تو کوئی نہ کرے گا لیکن تمھارے اوپر انگلی اٹھانے والے بھتیرے نکل آئیں گے۔"

امرکانت کے مزاج میں حد درجہ تحمل تھا لیکن اس وقت وہ برہم ہو گیا۔ بولا "مجھے ایسے کمینے آدمیوں کی پروا نہیں ہے۔ اپنا دل صاف ہو تو کسی بات کا غم نہیں۔"

سلیم نے ذرا بھی برا نہ مان کر کہا "تم ضرورت سے زیادہ سیدھے ہو یار! مجھے خوف ہے کسی آفت میں نہ پھنس جاؤ۔"

دوسرے دن امر کانت نے دوکان بڑھائی اور جیب میں پانچ روپے رکھے پٹھانی کے گھر جا پہنچا۔ وہ سوچ رہا تھا سکینہ روپے پاکر کتنی خوش ہوگی۔

اندر سے آواز آئی "کون ہے؟"

امر کانت نے اپنا نام بتلایا۔

دروازہ فوراً کھل گیا اور امر کانت نے اندر قدم رکھا۔ مگر چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ پوچھا "آج چراغ نہیں جلایا اماں!"

سکینہ بولی "اماں تو ایک جگہ سلائی کا کام لینے گئی ہیں۔"

"اچھا تم اکیلی ہو۔ اندھیرا کیوں ہے۔ کیا چراغ میں تیل نہیں ہے؟"

سکینہ آہستہ سے بولی "تیل تو ہے۔"

"پھر چراغ کیوں نہیں جلاتیں۔ کیا دیا سلائی نہیں ہے؟"

"دیا سلائی بھی ہے۔"

"تو پھر چراغ جلاؤ۔ کل جو رومال لے گیا تھا وہ پانچ روپے میں بک گئے ہیں یہ روپے لے لو۔ جھٹ پٹ چراغ جلاؤ۔"

سکینہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی سسکیوں کی آواز سنائی دی۔

امر نے چونک کر پوچھا "کیا بات ہے سکینہ! تم روکیوں رہی ہو۔"

سکینہ نے سسکتے ہوئے کہا۔ "کچھ نہیں آپ جائیے میں اماں کو روپے دے دوں گی۔"

امر نے بے قرار ہو کر کہا "جب تک تم بتا نہ دوگی میں نہ جاؤں گا۔ تیل نہ ہو میں لا دوں۔ دیا سلائی نہ ہو میں لا دوں۔ کل ایک لیمپ لیتا آؤں گا۔ ڈبیا کے سامنے

بیٹھ کر کام کرنے سے آنکھیں خراب ہو جاتی ہیں۔ چلتے وقت یاد ہی نہ رہی ورنہ ٹارچ لیتا آتا۔ گھر کے آدمی سے کیا پردہ۔ میں تمھیں غیر سمجھتا تو اس طرح بار بار کیوں آتا۔"

سکینہ سامنے کے سائبان میں جا کر بولی "میرے کپڑے گیلے ہیں۔ آپ کی آواز سن کر میں نے چراغ بجھا دیا۔"

"تو گیلے کپڑے کیوں پہن رکھے ہیں؟"

"کپڑے میلے ہو گئے تھے۔ صابن لگا کر رکھ دیئے تھے۔ اب اور کچھ نہ پوچھیے کوئی دوسرا ہوتا تو میں دروازہ نہ کھولتی۔"

امر کانت کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔ اُف! اتنا افلاس۔ پہننے کو کپڑے تک نہیں اور کل پٹھانی اس کے یہاں بدھاوے میں ریشمی کرتا لے گئی تھی۔ اس افلاس میں یہ وضعداری۔ دو روپئے سے کم کیا خرچ ہوئے ہوں گے۔ دو روپئے میں دو پاجامے بن سکتے تھے۔ ان غریبوں کا حوصلہ کتنا بلند ہے۔ دل کتنا وسیع۔ رسوم کے لئے بھی کس حد تک قربانیاں کرنے کو تیار رہتے ہیں۔

اس نے درد سے کانپتے ہوئے لہجے میں سکینہ سے کہا "تم چراغ جلالو میں ابھی آتا ہوں۔"

چوک تک وہ ہوائی رفتار سے گیا مگر بازار بند ہو چکا تھا۔ اب کیا کرے سکینہ اب تک گیلے کپڑے پہنے بیٹھی ہوگی۔ آج دوکانداروں نے اتنی جلد کیوں دوکانیں بند کر دیں۔ ابھی تو ایسی دیر نہیں ہوئی۔

وہ اسی رفتار سے اپنے گھر چلا۔ سکھدا کے پاس پچاسوں ساڑیاں ہیں کیا ان میں سے وہ دو ساڑیاں نہ دے دے گی۔ مگر وہ پوچھے گی کیا کرو گے۔

تو وہ کیا جواب دے گا۔ صاف صاف کہنے سے تو شاید وہ بدگمان ہو جائے نہیں اس وقت صفائی پیش کرنے کا موقع نہ تھا۔ سکینہ اس وقت گیلے کپڑے پہنے اُس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ سکھدا نیچے تھی وہ دبے پاؤں اوپر چلا گیا صندوق کھولا اور اس میں سے چار ساڑیاں نکال کر دبے پاؤں چلدیا۔

سکھدا نے پوچھا "اب کہاں جا رہے ہو۔ کھانا کیوں نہیں کھا لیتے"

امر نے برد سٹھے میں آکر جواب دیا "ابھی آتا ہوں"

کچھ دور جانے پر اس نے سوچا۔ کل کہیں سکھدا نے اپنا صندوق کھولا اور اُسے ساڑیاں نہ ملیں تو بڑی مشکل پڑے گی۔ نوکروں کے سر جائے گی۔ کیا اس وقت وہ یہ کہنے کے لئے تیار ہو جائے گا کہ وہ ساڑیاں میں نے ایک غریب عورت کو دیدیں۔ نہیں اس میں اتنی جرأت نہیں ہے۔ تو کیا ساڑیاں لیجا کر رکھدے؟ مگر وہاں سکینہ گیلے کپڑے پہنے بیٹھی ہوگی۔ پھر خیال آیا سکینہ ان ساڑیوں کو پا کر کتنی خوش ہو جائے گی۔ اس خیال نے اسے متوالا کر دیا وہ جلد جلد قدم بڑھاتا ہوا سکینہ کے گھر جا پہنچا۔

سکینہ نے اس کی آواز سنتے ہی دروازہ کھولدیا۔ چراغ جل رہا تھا۔ سکینہ نے اتنی دیر میں آگ جلا کر کپڑے خشک کر لئے تھے اور کرتہ پاجامہ پہنے اوڑھنی اوڑھے کھڑی تھی۔ امر نے ساڑیاں چارپائی پر رکھدیں۔ اور بولا "بازار میں تو نہ ملیں گھر جانا پڑا۔ ہمدردوں سے پردہ نہ رکھنا چاہئے"

سکینہ نے ساڑیوں کو لے کر دیکھا اور شرماتی ہوئی بولی "بابو جی آپ ناحق ساڑیاں لائے۔ اماں دیکھیں گی تو جل اٹھیں گی۔ پھر شاید آپ کا آنا ہی مشکل ہو جائے۔ آپ کی شرافت اور ہمدردی کی اماں جتنی تعریف کرتی تھیں اُس سے میں نے کہیں زیادہ پایا۔ مگر مناسب یہی ہے کہ آپ یہاں زیادہ

نہ آیا کریں۔ نہیں خواہ مخواہ لوگوں کو شبہ ہوگا۔ میری وجہ سے کوئی آپ پر شبہ کرے۔ یہ مجھے گوارہ نہیں۔"

آواز کتنی میٹھی تھی۔ انداز میں کتنا انکسار، کتنا اعتماد، کتنا اپنا پن۔ اور اس کے ساتھ ہی کتنی دور اندیشی۔ لیکن اگر بڑھیا اس بے لوث ہمدردی کو شبہ کی نظر سے دیکھے تو یقیناً اس کا آنا جانا بند ہو جائے گا۔ اس نے اپنے دل کو ٹٹول کر دیکھا۔ اس قسم کے شبہ کا کوئی سبب ہے۔ اس کا دل صاف تھا نفس کی تحریک کا شائبہ بھی نہ تھا۔ پھر بھی اس دروازے کا بند ہو جانا ایک ایسا امکان تھا جس نے اُسے متوحش کر دیا۔ اس کی پامال اور محکوم بشریت یہیں اپنی فطری صورت میں نمودار ہو سکتی تھی۔ سکھدا کی شوکت، امارت اور آزادروی جیسے اس کے سر پر سوار رہتی تھی۔ وہ اس کے روبرو اپنے کو دبائے رکھنے پر مجبور تھا۔ دل میں جو ایک طرح کی خود نمائی کی ہوس ہوتی ہے وہ وہاں اظہار کا راستہ نہ پاتی تھی۔ سکھدا اس پر حاوی رہتی تھی۔ اس کے برعکس سکینہ اس کی خودداری کو متحرک کرتی تھی۔ اس کا حسن عمل سکینہ کی معصومیت کو اس طرح اپنے سایہ میں لینا چاہتا تھا کہ اسے ہوا بھی نہ لگے۔ سکھدا اس کا دفتر تھی۔ سکینہ گھر۔ وہاں وہ خادم تھا یہاں مخدوم۔ اس نے ساڑیاں اٹھالیں اور درد مند لہجے میں بولا "اگر یہ اندیشہ ہے تو میں ان ساڑیوں کو لئے جاتا ہوں لیکن کہہ نہیں سکتا مجھے اس کا کتنا رنج ہے۔ رہا میرا آنا جانا۔ اگر تمھاری منشا یہ ہے کہ میں نہ آؤں تو میں بھول کر بھی نہ آؤں گا۔ لیکن دوسروں کی انگشت نمائیوں کی مجھے پروا نہیں۔"

سکینہ نے عاجزی کے ساتھ کہا "بابوجی میں ہاتھ جوڑتی ہوں آپ میری جانب سے بدگمان نہ ہوں۔ آپ کی عنایتوں نے مجھ میں ایک ایسی طاقت

ایک ایسی امنگ بھر دی ہے جسے میں ایک طرح کا نشہ کہہ سکتی ہوں۔ اُن سے میری تاریک زندگی میں رونق پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن بدگوئی سے تو ڈرنا ہی پڑتا ہے۔"

"میں بدگوئی سے نہیں ڈرتا سکینہ! ارتی بھر بھی نہیں۔"

لیکن ایک لمحے میں وہ صورت حال سمجھ گیا۔ بولا "مگر تم ٹھیک کہتی ہو۔ دنیا چاہے اور کچھ نہ کرے مگر بدنام تو کر ہی سکتی ہے۔"

دونوں ایک منٹ تک خاموش بیٹھے رہے۔ تب امر نے کہا "تھوڑے سے اور رومال بنا لینا۔ میں کپڑا بھجوا دوں گا۔" اس نے ساڑیاں اٹھا لیں اور باہر نکل آیا۔ سکینہ نے اس کا چہرہ دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا رو دیا ہی چاہتا ہے۔ اس کے جی میں آیا ساڑیاں اس کے ہاتھ سے لے کر چھاتی سے لگا لے۔ مگر شرم نے ہاتھ نہ اٹھانے دیا۔ امر یوں لڑکھڑاتا ہوا دروازے سے باہر نکلا گویا اب گرا اب گرا۔

(۱۴)

امرکانت کی طبیعت پھر گھر سے اچاٹ ہونے لگی۔ سکینہ اس کی آنکھوں میں بسی ہوئی تھی۔ سکینہ کے یہ الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے "میں اپنے دل میں ایسی طاقت، ایسی امنگ پاتی ہوں۔" یہ الفاظ اس کے مردانہ احساس کو غرور آمیز مسرت سے پُر کر دیتے تھے۔ اُس کی طبیعت پھر دوکان سے نفرت کرنے لگی۔ ایک حسینہ کی بے نفس دلجوئیوں اور جاں نثارانہ انکسار کا مزہ پا جانے کے بعد اب سکھدا کی مصلحت اندیشیاں اُسے بوجھ سی معلوم ہوتی تھیں۔ وہاں ہرے ہرے پتوں میں روکھی سوکھی چیزیں تھیں یہاں

سونے چاندی کے تھالوں میں انواع و اقسام کی لطیف غذائیں۔ پر اس میں خلوص تھا اور اس میں نمود و نمائش۔ وہ خلوص اسے اپنی جانب کھینچتا تھا۔ یہ نمائش اُسے اپنی طرف سے ہٹاتی تھی۔ بچپن ہی میں وہ ماں کی محبت سے محروم ہو گیا تھا۔ زندگی کے پندرہ سال اس نے ناخوش گوار حالات میں بسر کئے تھے۔ کبھی ماں ڈانٹتی، کبھی باپ بگڑتا۔ محض نینا کی ہمدردی اس کے مجروح دل پر مرہم رکھتی تھی۔ سکھ ابھی آئی تو وہی تحکم اور تمکنت لے کر آمر کا تشنہ کام دل کسی پیاسے طائر کی طرح محبت کا یہ ٹھنڈا سایہ دیکھ کر اس کے نیچے آ بیٹھا۔ اور وہاں ٹھنڈا سایہ بھی تھا، پانی بھی تھا۔ طائر وہیں رم جائے تو تعجب کیا۔

اس دن سکینہ کا دل شکن افلاس دیکھ کر اس کے دل کو چوٹ لگی تھی۔ وہ شورش جو ادھر کچھ دنوں سے فرو ہو گئی تھی پھر بیدار ہوئی۔ وہ دھرم کے پیچھے لاٹھی لے کر دوڑنے لگا۔ ثروت کی سخت گیریوں کا اسے بچپن ہی سے تجربہ ہوتا آتا تھا۔ مذہب کی بندشیں اس سے کہیں سخت کہیں ناقابل برداشت اور کہیں مہمل تھیں۔ مذہب کا کام دنیا میں اتحاد اور اتفاق پیدا کرنا ہونا چاہئے یہاں مذہب نے عناد اور افتراق پیدا کر دیا ہے۔ کھانے پینے میں، رسم و رواج میں مذہب کیوں مداخلت کرتا ہے۔ میں چوری کروں، خون کروں، دغا کروں، مذہب مجھ سے باز پرس نہیں کر سکتا۔ اچھوت کے ہاتھ سے پانی لے لوں، مذہب کی نگاہ میں گناہ گار ہو گیا۔ اچھا مذہب ہے۔ ہم مذہب کے دائرے کے باہر کسی سے روحانی تعلق بھی قائم نہیں کر سکتے۔ اس مذہب نے روح کے ساتھ اخلاص و محبت کو بھی جکڑ رکھا ہے۔ یہ مذہب نہیں، مذہب کا سوانگ ہے۔

امر کانت اسی اُدھیڑ بن میں پڑا رہتا۔ بڑھیا ہر مہینے اور کبھی کبھی مہینے میں دو تین بار رومالوں کی پوٹلیاں بنا کر لاتی اور امر اُسے منہ مانگے دام دے کر لے لیتا۔ راما دیوی اس کے جیب خرچ کے لئے جو روپے دیتیں وہ سب انھیں رومالوں کی نذر ہوتے۔ سلیم بھی اس کاروبار میں اس کا شریک تھا۔ اُن کے دوستوں میں ایسا کوئی نہ تھا جس نے ایک آدھ درجن رومال نہ خریدے ہوں سلیم کے گھر سے سلائی کا کام بھی مل جاتا۔ بڑھیا کا سکھدا اور راما سے بھی ربط ضبط ہو گیا تھا۔ ان سے چکن کی ساڑیاں اور چادریں بنانے کا کام بھی ملنے لگا۔ لیکن اس دن سے امر بڑھیا کے گھر نہ گیا۔ کئی بار مضبوط ارادہ کر کے گھر سے چلا لیکن آدھے راستے سے لوٹ آیا۔

کالج میں ایک بار مذہب پر مباحثہ ہوا۔ امر نے اُس موقع پر جو تقریر کی اس نے سارے شہر میں دھوم مچا دی۔ وہ انقلاب ہی میں ملک کی نجات سمجھتا تھا۔ ایسے انقلاب میں جو عالمگیر ہو۔ جو زندگی کے غلط اصولوں کا، مہلک رسوم کا، اور مہمل بندشوں کا خاتمہ کر دے۔ جو ایک نئے دور کا حامل ہو۔ ایک نئی دنیا آباد کرے، جو مٹی کے انگنت دیوتاؤں کو توڑ پھوڑ کر زمین دوز کر دے جو انسان کو ثروت اور مذہب کی بنیادوں پر مٹنے والے نظام حکومت سے آزاد کر دے۔ اس کے جسم کے ایک ایک ذرّے سے انقلاب انقلاب کی صدا نکلتی رہتی تھی۔ لیکن اصلح پسند ہندو سماج اس وقت تک کسی سے روک ٹوک نہیں کرتا جب تک اس کے معاشری نظام پر علانیہ ضرب نہ پہنچائی جائے۔ کوئی انقلاب نہیں، انقلاب کے باوا کی تعلیم کیوں نہ دے اُسے خبر نہیں ہوتی، لیکن تقریر کی حدود سے باہر عمل کے میدان میں کسی نے پاؤں بھی نکالا اور مذہب نے اُس کی گردن پکڑی۔ امر کا انقلاب ابھی تک تقریروں اور تحریروں تک

محدود تھا۔ ڈگری کا امتحان ختم ہوتے ہی وہ میدان عمل میں اترنا چاہتا تھا۔ لیکن ابھی امتحان میں ایک مہینہ باقی ہی تھا کہ ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے اُسے میدان عمل میں آنے پر مجبور کر دیا۔ یہ سکینہ کا نکاح تھا۔

ایک دن شام کے وقت امر کانت دوکان پر بیٹھا ہوا تھا کہ بڑھیا سکھیا کی چکن کی ساڑی لے کر آئی اور امر سے بولی "بیٹا اللہ کی مہربانی سے سکینہ کا نکاح طے ہو گیا۔ آٹھویں کو نکاح ہو جائے گا۔ میں نے اور سب سامان جمع کر لیا ہے مگر کچھ روپیوں سے مدد کرنا۔"

امر کی رگوں میں جیسے خون ہی خشک ہو گیا۔ وحشت کے عالم میں بولا "سکینہ کا نکاح! ایسی کیا جلدی تھی؟"

"کیا کرتی بیٹا۔ میری زندگی کا کیا بھروسہ۔ پھر جوان لڑکی بدنامی بھی تو ہے۔"

"سکینہ بھی راضی ہے؟"

بڑھیا نے اُس کے اس طفلانہ سوال پر مسکرا کر کہا "لڑکیاں کبھی اپنے منہ سے کہتی ہیں بیٹا۔ وہ تو نہیں نہیں کئے جاتی ہیں۔"

امر نے تیز لہجے میں کہا "پھر بھی تم اس کی شادی کئے دیتی ہو۔"

پھر سنبھل کر بولا "روپے کے لئے دادا سے کہو۔"

"تم میری طرف سے سفارش کر دینا، کہہ تو میں آپ لوں گی۔"

"میں سفارش کرنے والا کون ہوتا ہوں۔ دادا تمھیں جتنا جانتے ہیں اتنا میں نہیں جانتا۔"

بڑھیا کو وہیں کھڑے چھوڑ کر امر بدحواس سلیم کے پاس پہنچا۔ سلیم نے اس کی بوکھلائی ہوئی صورت دیکھ کر پوچھا "خیر تو ہے۔ پریشان کیوں ہو؟"

امر نے دل کو قابو میں لا کر کہا "میں پریشان نہیں ہوں تم خود پریشان ہو گے۔"

"اچھا تو آؤ میں تمھیں اپنی تازہ غزل سناؤں۔ ایسے ایسے شعر نکالے ہیں کہ پھڑک نہ جاؤ تو میرا ذمہ۔"

امر کا نت کی طبیعت اس وقت شعر و سخن کی جانب مائل نہ تھی لیکن کرے کیا۔ سلیم نے مطلع پڑھا۔

شعر
بہلا کے سو یرا کرتے ہیں، اس دل کو اُن کی باتوں میں
دل جلتا ہے اپنا جن کی طرح، برسات کی بھیگی راتوں میں

امر نے اوپری دل سے کہا "اچھا شعر ہے۔"

سلیم مایوس نہ ہوا۔ دوسرا شعر پڑھا۔

شعر
کچھ میری نظر نے اُٹھ کے کہا۔ کچھ ان کی نظر نے جھک کے کہا
جھگڑا جو برسوں میں چکتا طے ہو گیا باتوں باتوں میں

امر فکر مند ہونے پر جھوم اُٹھا "خوب کہا بھئی۔ لاؤ قلم چوم لوں۔"

سلیم نے تیسرا شعر پڑھا۔

شعر
یہ یاس کا سناٹا تو نہ تھا۔ جب آس لگائے سنتے تھے
مانا کہ تھا دھوکا ہی دھوکا۔ اُن میٹھی میٹھی باتوں میں

امر نے کلیجہ تھام لیا "غضب کا درد ہے بھئی، دل تڑپ اٹھا۔"

سلیم نے چھیڑا "یہ غزل لیجاؤ ذرا اپنی معشوقہ کو سنا دینا۔ کیا بات ہے اِدھر ایک مہینے سے کوئی رومال نہیں بھیجا؟"

امر نے لاپروائی سے کہا "اب اس کی شادی ہونے والی ہے، رومال کون بناتا۔ ایک ہی ہفتہ تو اور ہے۔"

"تو تم دلہن کی طرف سے بارات میں جانا۔ میں دولھا کی طرف سے جاؤں گا۔"

امر یکایک تیز ہو گیا۔ اس کا چہرہ تمتما اٹھا آنکھیں نکال کر بولا "لیکن میرے جیتے جی یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ میں تم سے کہتا ہوں سلیم! میں سکینہ کے دروازے پر جان دیدوں گا۔ سر پٹک کر مر جاؤں گا۔"

سلیم نے گھبرا کر پوچھا "یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو بھائی جان! کیا سچ مچ میرا گمان صحیح تھا؟ میں تو شاعری ہی تک رہ گیا تم تو معلوم ہوتا ہے حقیقت تک جا پہنچے۔"

امر نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا "میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میری ایسی حالت کیوں ہو رہی ہے سلیم، لیکن جب سے میں نے یہ خبر سنی ہے۔ میرے جگر پر جیسے آرا سا چل رہا ہے۔"

"آخر تم چاہتے کیا ہو۔ تم اس سے شادی تو نہیں کر سکتے؟"

"کیوں نہیں کر سکتا۔"

"بالکل بچے نہ بن جاؤ ذرا عقل سے کام لو۔"

"تمہارا یہی منشا تو ہے کہ وہ مسلمان ہے، میں ہندو ہوں۔ میں محبت کے سامنے مذہب کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا۔ مطلق نہیں۔"

سلیم نے اُسے قائل کرنے کی کوشش کر کے کہا۔ تمہارے خیالات تقریروں میں سن چکا ہوں، اخباروں میں پڑھ چکا ہوں، ایسے خیالات بہت اونچے اور پاکیزہ ہیں اور کتنے ہی آدمیوں نے ان کا اظہار کر کے دنیا میں ناموری حاصل کی ہے۔ لیکن علمی بحث دوسری چیز ہے۔ اس پر عمل کرنا دوسری چیز۔ بغاوت پر علمی بحث کیجئے لوگ شوق سے سنیں گے۔ بغاوت کے لئے تلوار اٹھائیے ..... گورنمنٹ ..... دشمن ہو جائے گی۔ علمی بحث سے کسی کو چوٹ نہیں لگتی۔ بغاوت

سے گردنیں کٹتی ہیں۔ مگر تم نے سکینہ سے بھی پوچھا اس کے کیا ارادے ہیں؟"

امر کچھ سمجھا۔ یہ نکتہ اس کے ذہن ہی میں نہ آیا تھا۔ اس نے شاید دل میں سمجھ لیا تھا۔ میرے کہنے کی دیر ہے وہ تو راضی ہی ہے۔

"مجھے یقین ہے کہ وہ راضی ہے۔"

"کیسے یقین ہوا؟"

"اس نے ایسی گفتگو کی ہے جس کا منشا اس کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔"

"تم نے اس سے کہا۔ کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں؟"

"اس سے پوچھنے کی میں کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔"

"تو ایسی گفتگو کو جو تم سے اس نے محض ہمدردانہ طور پر کی تھی تم نے شادی کا وعدہ سمجھ لیا۔ واہ رے آپ کی سمجھ۔ میں کہتا ہوں تم بھنگ تو نہیں کھا گئے ہو۔ یا بہت پڑھنے سے تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا ہے۔ پری سے زیادہ حسین بی بی، چاند سا بچہ اور دنیا کی ساری نعمتوں کو آپ چھوڑ دینے پر تیار ہیں۔ اُس جولاہی کی نگین اور شاید سلیقہ دار چھوکری کے لئے۔ تم نے اسے بھی کوئی تقریر یا مضمون سمجھ رکھا ہے، سارے شہر میں تہلکہ پڑ جائے گا، بھونچال آجائے گا۔ شہر ہی میں نہیں سارے صوبہ میں۔ بلکہ سارے شمالی ہندوستان میں آپ ہیں کس پھیر میں۔ جان سے ہاتھ دھونا پڑے تو تعجب نہیں۔"

امر کانت ان ساری مشکلات کا قیاس کر چکا تھا۔ ان سے اُس کے فیصلے پر مطلق اثر نہ ہوا تھا اگر اس قصور کے لئے دنیا اُسے سزا دیتی ہے تو اُسے پروا نہیں۔ دنیا اس کی زندگی کو تباہ کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتی۔ بولا "میں یہ سب جانتا ہوں سلیم، لیکن میں اپنے ضمیر کو کسی کا غلام بنانا نہیں چاہتا۔ نتیجہ جو کچھ بھی ہو میں اس کے لئے تیار ہوں۔ یہ معاملہ میرے اور سکینہ کے درمیان ہے۔

سوسائٹی کو ہمارے بیچ میں دخل دینے کا کوئی مجاز نہیں ہے۔"

سلیم نے فکرمندانہ انداز سے سر ہلا کر کہا "سکینہ کو اگر تم سے محبت ہے تو کبھی وہ تم سے شادی کرنا منظور نہ کرے گی۔ ہاں اگر وہ تمہاری محبت کا تماشا دیکھنا چاہتی ہے تو شاید منظور کرلے۔ مگر میں پوچھتا ہوں اس میں ایسی کیا خوبی ہے جس کے لئے تم خود اتنی بڑی قربانی کرنے اور کئی زندگیوں کو خاک میں ملانے پر آمادہ ہو۔"

امر کو یہ تقریر ناگوار گذری۔ ناک سکوڑ کر بولا "میں کوئی قربانی نہیں کر رہا ہوں اور نہ کسی کی زندگی کو خاک میں ملا رہا ہوں۔ میں صرف اس راستے پر جا رہا ہوں جدھر میرا ضمیر مجھے لیجا رہا ہے۔ میں کسی رشتے یا دولت کو اپنے گلے کی زنجیر نہیں بنا سکتا۔ میں اُن آدمیوں میں نہیں ہوں جو زندگی کی زنجیروں ہی کو زندگی سمجھتے ہیں۔ میں زندگی کی آرزوؤں کو زندگی سمجھتا ہوں مجھے زندہ رکھنے کے لئے ایک ایسے دل کی ضرورت ہے جس میں آرزوئیں ہوں، تخیل ہو، درد ہو اور سودا ہو۔ جو میرے ساتھ رو سکتا ہو، میرے ساتھ جل سکتا ہو۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میری زندگی میں روز بروز زنگ لگتا جا رہا ہے۔ ان چند سالوں میں میرا کتنا روحانی زوال ہوا ہے۔ اسے میں ہی سمجھتا ہوں۔ سکینہ ہی مجھے ان زنجیروں سے آزاد کر سکتی ہے، اُسی کے ساتھ میں روحانی بلندیوں پر اُڑ سکتا ہوں، اُسی کے ساتھ میں اپنے کو پا سکتا ہوں۔ تم کہتے ہو پہلے اس سے پوچھ لو۔ تمہارا خیال ہے وہ کبھی منظور نہ کرے گی مجھے یقین ہے محبت جیسی انمول چیز پاکر کوئی اُسے ٹھکرا نہیں سکتا۔"

سلیم نے پوچھا "بالفرض وہ کہے تم مسلمان ہو جاؤ۔"

"وہ ایسا نہیں کہہ سکتی۔"

"مان لو کہے تو؟"

"تو میں اُسی وقت ایک مولوی کو بلا کر کلمہ پڑھ لوں گا۔ مجھے اسلام میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جسے میرا ضمیر قبول نہ کرتا ہو۔ سارے مذہبوں کی حقیقتیں ایک ہیں۔ حضرت محمدؐ کو خدا کا رسول مان لینے میں مجھے کوئی عذر نہیں جس خدمت، ایثار، رحم اور تہذیب نفس پر ہندو مذہب کی بنیاد قائم ہے۔ اسلام مجھے بدھ۔ کرشن اور رام کا احترام کرنے سے نہیں روکتا۔ پھر اس وقت میں اپنی خوشی سے ہندو نہیں ہوں، بلکہ اس لئے کہ ہندو خاندان میں پیدا ہوا ہوں۔ پھر بھی اسلام کی طرف اپنا طبعی میلان نہیں پاتا۔ ہاں سکینہ کی مرضی کے سامنے سر جھکا لوں گا۔ مگر اپنا ایمان یہ ہے کہ مذہب روح کے لئے ایک بندش ہے۔ میری عقل جسے قبول کرے وہی میرا مذہب ہے باقی سب خرافات ہے"

سلیم اس جواب کے لئے تیار نہ تھا۔ اس جواب نے اُسے لاجواب کر دیا۔ ایسے جذبات نے اس کے باطن کو کبھی ہیجان میں نہ ڈالا تھا۔ محبت کو وہ محض نفس پروری سمجھتا تھا۔ اُس ذراسی دلبستگی کو اتنا مبالغہ آمیز رنگ دیکر اس کے لئے اتنی قربانیاں کرنا۔ ساری دنیا میں رسوا اور ذلیل ہونا اور چاروں طرف ایک طوفان برپا کر دینا اُسے جنون معلوم ہوتا تھا۔

اُس نے سر ہلا کر کہا "سکینہ کبھی منظور نہ کرے گی"

امر نے بے صبر ہو کر پوچھا "تم ایسا کیوں سمجھتے ہو؟"

"اس لئے کہ اُسے اگر ذرا بھی عقل ہے تو وہ ایک خاندان کو کبھی تباہ نہ کرے گی"

"اس کے یہ معنی ہیں کہ اُسے میرے خاندان کی محبت مجھ سے زیادہ ہے

پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میرا خاندان کیوں تباہ ہو جائے گا۔ دادا کو اور سکھدا کو دولت مجھ سے زیادہ پیاری ہے بچے کو میں اسی طرح تب بھی پیار کر سکتا ہوں زیادہ سے زیادہ اتنا ہی ہوگا کہ میں گھر میں نہ جاؤں گا اور اُن کے گھڑے منکے نہ چھوؤں گا۔"

سلیم نے پوچھا۔ "ڈاکٹر شانتی کمار سے بھی اس کا ذکر کیا ہے؟"

امر نے جیسے سلیم کی کوتاہ فہمی پر مایوس ہو کر کہا۔ "نہیں۔ میں نے ان سے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ تم سے بھی میں صلاح لینے نہیں آیا ہوں صرف دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے آیا ہوں۔ میرا ارادہ پختہ ہو چکا ہے۔ اگر سکینہ نے مایوس کر دیا تو زندگی کا خاتمہ کر دوں گا۔ راضی ہو گئی تو ہم دونوں چپکے سے کہیں چلے جائیں گے کسی کو خبر بھی نہ ہوگی۔ دو چار مہینے بعد گھر والوں کو اطلاع دیدونگا نہ کوئی تہلکہ مچے گا نہ کوئی طوفان آئے گا۔ یہ ہے میرا پروگرام۔ میں اسی وقت اس کے پاس جاتا ہوں۔ اگر اس نے منظور کر لیا تو لوٹ کر پھر نہیں آؤں گا اور انکار کر دیا تو تم میری صورت نہ دیکھو گے۔"

یہ کہتا ہوا وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے سکینہ کے گھر کی طرف چلا۔ سلیم اُسے روکنے کا ارادہ کر کے بھی نہ روک سکا۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ اس وقت اس کے سر پر بھوت سوار ہے کسی کی نہ سُنے گا۔

ماگھ کی رات، کڑاکے کی سردی، آسمان پر دھواں چھایا ہوا امرکانت ایک محویت کے عالم میں چلا جا رہا ہے۔ اُسے سکینہ پر غصہ آنے لگا خط تک نہ لکھا کسی سے کہلوایا تک نہیں۔ پھر یکایک اس کے دل پر ایک عجیب وحشت کا غلبہ ہوا۔ سکینہ کہیں برا نہ مان جائے۔ ممکن ہے بڑھیا نے اس کی رضامندی سے نکاح طے کیا ہو۔ ممکن ہے اُس آدمی کی اس کے یہاں آمد و رفت بھی ہو

غالباً وہ اس وقت وہاں بیٹھا بھی ہو۔ اگر ایسا ہوا تو امر وہاں سے چپ چاپ چلا جائے گا۔ کہیں بڑھیا آ گئی ہو تو اور بھی مشکل پڑے۔ اس کے روبرو سکینہ سے شاید کچھ کہہ ہی نہ سکے۔ وہ سکینہ سے تخلیہ میں بات کرنے کا موقع چاہتا تھا۔

سکینہ کے دروازے پر پہنچا تو اس کا دل ڈھڑک رہا تھا۔ اس نے ایک لمحہ کان لگا کر سنا کسی کی آواز نہ سنائی دی۔ آنگن میں روشنی تھی۔ شاید سکینہ اکیلی ہے۔ منہ مانگی مراد ملی۔ آہستہ سے زنجیر کھٹکھٹائی۔ سکینہ نے پوچھ کر فوراً دروازہ کھولدیا اور بولی "اماں تو آپ ہی کے یہاں گئی ہوئی ہیں"

امر نے کھڑے کھڑے جواب دیا "ہاں، مجھ سے ملی تھیں اور انھوں نے جو خبر سنائی وہ ایک بم کے گولے کی طرح میرے سر پر پھٹ پڑی۔ میں بالکل اپنے ہوش میں نہیں ہوں۔ ابھی تک میں نے اپنے دل کا راز تم سے چھپایا تھا۔ اور سوچا تھا اُسے کچھ دن اور چھپائے رہوں گا۔ لیکن اس خبر نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ یہ راز تم سے کہوں۔ تم سُن کر جو فیصلہ کرو گی اسی پر میری زندگی کا دار و مدار ہے نہیں کہہ سکتا کہ یہ آگ میرے دل میں کیونکر لگی۔ لیکن جس دن تمھیں پہلی بار دیکھا اُسی دن سے ایک چنگاری سی اندر بیٹھ گئی اور اب وہ ایک شعلہ بن گئی ہے اگر اُسے جلد بجھایا نہ گیا تو مجھے جلا کر خاک کر دے گی۔ میں نے بہت ضبط کیا ہے سکینہ! گھٹ گھٹ کر رہ گیا ہوں۔ تمھارے قدموں پر میں اپنا سب کچھ قربان کر چکا ہوں"

وہ اپنی محبت کی داستان نہ جانے کتنی دیر تک سناتا رہا۔ جیسے تناسب اور توازن کا حس ہی اُس میں فنا ہو گیا ہو۔ جو باتیں کہنی چاہیئے تھیں وہ بھی کہیں اور جو نہ کہنی چاہیئے تھیں وہ بھی کہہ ڈالیں، اپنا گھر اب اس کے لئے جیل خانے سے بدتر تھا۔ اس کی حسین بی بی اس کے لئے سنگ مرمر کی خوبصورت مورت

تھی جس میں دل نہیں، درد نہیں، سکینہ کو پا کر اس کی ساری آرزوئیں پوری ہو جائیں گی۔

سکینہ جیسے گھبرا گئی۔ جہاں اس نے ایک چٹکی آٹے کی امید کی تھی وہاں سخی نے اس کے سامنے بورے کھول کر رکھ دیے۔ اس کے چھوٹے سے قلب میں اتنا ظرف کہاں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان نوازشوں کو کیسے سمیٹے۔ آنچل اور دامن سب کچھ بھر جانے پر بھی تو وہ اُسے سمیٹ نہ سکے گی۔ اس کی آنکھیں آبگوں ہو گئیں۔ دل ایک بار اچھلا پھر بیٹھ گیا۔ سر جھکا کر شرماتی ہوئی بولی "بابوجی، خدا جانتا ہے میرے دل میں آپ کی کتنی عزت اور محبت ہے۔ میں نے آپ کو اب تک اپنے محسن کے روپ میں دیکھا ہے اور چاہتی ہوں کہ ہمیشہ اُسی روپ میں دیکھتی رہوں۔ بھکارن راج نہیں چاہتی۔ اُسے تو ایک ٹکڑا چاہیئے۔ سوچیئے میں کون ہوں۔ ایک غریب عورت جو مزدوری کر کے اپنی زندگی بسر کرتی ہے۔ وہ آپ کی محبت کے قابل نہیں، صرف رحم کے قابل ہے۔ میرے باعث آپ کی رسوائی ہو اس سے پہلے میں اپنی زندگی کا خاتمہ کر دوں گی۔"

ایسے موقعوں پر ہمارے خیالات میں شاعرانہ رنگ پیدا ہو جایا کرتا ہے جذبات کی گہرائی شاعری کے لئے مخصوص ہے اور عام بول چال میں اس کا اظہار نہیں ہو سکتا۔

امر نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "اس خیال سے تو مجھے تسکین نہ ہو گی سکینہ تم اس خیال کو دل سے نکال ڈالو کہ میں تو بہت بڑا آدمی ہوں اور تم ناچیز ہو۔ میں اپنا سب کچھ تمہارے قدموں پر نثار کر چکا اور میں اب تمہارے پوجا ری کے سوا اور کچھ نہیں۔"

سکینہ اس کا کیا جواب دیتی۔ جذبات کا ایک دریا اس کے دل میں امنڈا ہوا تھا۔ وہ کتنی خوش نصیب ہے۔ اس کے پاس اپنے جذبات کے اظہار کے لئے آنسو کے چند قطروں کے سوا الفاظ نہیں ہیں۔ وہ نہیں جانتی اس کی زندگی کس طرف جائے گی۔ لیکن جو کچھ بھی ہو۔ اس کے جسم پر چاہے کسی کا قبضہ ہو جائے وہ دل ہمیشہ امر کا رہے گا۔ وہ اپنی محبت کو غرض سے پاک رکھنا چاہتی ہے۔ وہ اس روحانی محبت میں دنیا کو نہیں آنے دے گی۔"

اس کے لئے صرف اتنا یقین کافی ہے کہ امر کے گوشۂ دل میں اس کے لئے ایک حقیر سی جگہ ہے۔ اس یقین نے اس کے دل کو اتنا مضبوط کر دیا ہے کہ وہ بڑی سے بڑی مصیبتوں کو بھی ہنس کر جھیل سکتی ہے۔ اس نے امر کو اپنے یہاں آنے سے روکا تھا۔ امر کی بدنامی کے سوا اُسے اپنی بدنامی کا خوف بھی تھا۔ مگر اب اسے مطلق خوف نہیں ہے۔ دنیا اس کے لئے اب امیدوں اور نعمتوں سے بھری ہوئی نظر آ رہی ہے۔

امر نے کہا تمہاری قسمت کسی غیر سے وابستہ ہو یہ میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔"

"میں انکار کر دوں گی، میں کہہ دوں گی اگر تم نے میری شادی کا نام بھی لیا تو میں زہر کھا لوں گی۔"

دفعتاً پٹھانی نے دروازہ کھولا۔ امر نے بات بنائی: "میں تو سمجھا تھا تم کب کی گھر آ گئی ہوں گی۔ بیچ میں کہاں رہ گئیں؟"

بڑھیا نے شکوہ آمیز لہجے میں کہا: "تم نے تو آج ایسا روکھا جواب دیا بیٹا کہ میں رو پڑی۔ تمہارا ہی تو مجھے بھروسہ تھا اور تم نے مجھے یہ جواب دیا مگر اللہ کا فضل ہے، بہوجی نے مجھ سے وعدہ کیا کہ مجھے جتنے روپے درکار ہوں گے

وہ مجھے دیدیں گی۔ وہیں دیر ہوگئی۔ کیا تم مجھ سے کسی بات پر ناراض ہو بیٹا!"
امر نے اس کی دلجوئی کی "نہیں اماں، آپ سے بھلا کیا ناراض ہوتا۔
اُس وقت دادا سے ایک بات پر جھگڑا ہو گیا تھا۔ اسی کا خمار تھا۔ میں بعد کو خود
شرمندہ ہوا اور تم سے معافی مانگنے دوڑ آیا۔ میری خطا معاف کرتی ہو؟"
بڑھیا رو کر بولی، بیٹا۔ تمھارے ٹکڑوں پر تو زندگی کٹی۔ تم سے ناراض ہو کر
خدا کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ اس کھال سے تمھارے پاؤں کی جوتیاں بنیں تو بھی
دریغ نہ کروں۔"
"بس مجھے تسکین ہو گئی اماں، اسی لئے آیا تھا۔"
امر دروازے پر پہنچا تو سکینہ نے دروازہ بند کر کے کہا "کل ضرور آنا۔"
امر پر ایک لین کا نشہ چڑھ گیا "بولا ضرور آؤں گا۔"
"میں تمھاری راہ دیکھتی رہوں گی۔"
"کوئی چیز تمھاری نذر کروں تو ناراض تو نہ ہو گی؟"
سکینہ مسکرائی۔ دل سے بڑھ کر بھی کوئی نذر ہو سکتی ہے۔
امر اس طرح اکڑتا ہوا جا رہا تھا، گویا دنیا کی بادشاہی پا گیا ہے۔
سکینہ نے دروازہ بند کر کے دادی سے کہا "تم ناحق دوڑ دھوپ کر رہی
ہو اماں، میں شادی نہ کروں گی۔"
"تو کیا یوں ہی بیٹھی رہے گی؟"
"ہاں جب میری مرضی ہو گی کر لوں گی۔"
"تو کیا میں ہمیشہ بیٹھی رہوں گی؟ بھلا یہ تو سوچ دنیا کیا کہے گی، نکاح طے
ہو چکا۔ سارا انتظام کر چکی، اور اب تو کہتی ہے شادی نہ کروں گی۔"
"اُن لوگوں سے کہہ دو لڑکی راضی نہیں ہے۔ شادی کے خیال ہی سے

میری روح فنا ہوتی ہے۔ تمہارے بغیر میں کیسے رہ سکوں گی۔ یہ خیال ہی نہیں کر سکتی اگر تم مجھے کوئی بلا سمجھتی ہو جسے سر سے ٹالنا ضروری ہے تو شادی کرنے سے کہیں اچھا ہے کہ مجھے زہر دیدو۔"

پٹھانی نے انگیٹھی کے سامنے بیٹھ کر سر پر ہاتھ رکھ لیا اور سوچنے لگی۔ اسی لئے یہ چھوکری اتنے دن منہ پھلائے بیٹھی تھی۔ یہ چپکے چپکے رونا دھونا اسی لئے تھا۔ مگر اب اسے خود معلوم ہو رہا تھا کہ سکینہ کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ وہی تو اس کی تاریک زندگی کا چراغ تھی۔ اس محبت کے خیال میں اس کی ساری تشویش غائب ہو گئی۔

سکینہ باجرے کی روٹیاں مسور کی دال کے ساتھ رغبت سے کھا کر ٹوٹی کھاٹ پر لیٹی اور پرانے پھٹے ہوئے لحاف میں مارے سردی کے پاؤں سکیڑ لئے مگر اس کا دل مسرت سے لبریز تھا۔ آج اُسے جو نعمت ملی تھی اس کے سامنے کونین کی ساری دولت حقیر تھی۔

(۱۵)

امرکانت کی زندگی میں ایک نئی تحریک رونما ہونے لگی۔ اب تک گھر والوں نے اس کے ہر ایک کام کی تحقیر کی تھی۔ سبھی اس کی لگام کھینچتے رہتے تھے۔ گھوڑے میں نہ وہ دم رہا تھا نہ جوش۔ لیکن اب ایک ایسا آدمی آگیا تھا جو اُسے بڑھاوے دیتا تھا، اس کی گردن پر ہاتھ پھیرتا تھا۔ جہاں نا ہمدردی یا زیادہ سے زیادہ ایک تکلف آمیز ظاہرداری تھی وہاں اب ایک حسینہ کی حوصلہ انگیزیاں تھیں جو مردوں میں بھی جان ڈال سکتی ہیں۔ اس کا طبعی میلان جو پابندیوں میں پڑ کر مفلوج سا ہو گیا تھا، محبت کا اشتعال پا کر متحرک اور مضطرب ہو گیا ہے۔

اپنے اندر ایسی روحانی طاقت کا احساس اُسے کبھی نہ ہوا تھا۔ سکینہ اپنی محبت کی بارشوں سے اس کے میدان عمل کو سیراب کرتی رہتی ہے۔ وہ خود اپنی کفیل نہیں ہو سکتی مگر اس کی محبت اُس فقیر کی دعا ہے جو خود بھیک مانگ کر بھی دوسروں کو نعمتوں سے مالا مال کر سکتا ہے۔ امر بغیر کسی ضرورت کے سکینہ کے پاس نہیں جاتا۔ اس میں اب وہ شوریدہ سری بھی نہیں رہی۔ موقع محل دیکھ کر کام کرتا ہے۔ جن درختوں کی جڑیں گہری ہوتی ہیں انھیں بار بار سینچنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ زمین سے ہی رطوبت کھینچ کر بڑھتے اور پھولتے پھلتے ہیں۔

ڈگری کا امتحان ہوا لیکن امر کانت اس میں بیٹھا نہیں۔ پروفیسروں کو یقین تھا کہ اُسے امتیاز ملے گا۔ مگر وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ "زندگی کی تکمیل کے لئے تعلیم کی ضرورت ہے ڈگری کی نہیں، ہماری ڈگری ہے ہمارا اخلاق، ہماری سیرت، ہمارا لطف حیات، ہمارا جوش عمل۔ اگر یہ ڈگری نہیں ملی، اگر ہمارا ضمیر بیدار نہیں ہوا تو حروف تہجی کے دم چھلے بے سود ہیں۔" اسے اس تعلیم سے ہی نفرت ہو گئی تھی۔ جب وہ اپنے پروفیسروں کو فیشن کی غلامی کرتے غرض کے لئے ناک رگڑتے، کم سے کم کام کر کے زیادہ سے زیادہ فائدے کے لئے ہاتھ پھیلاتے دیکھتا تو اس کا جی جل جاتا تھا انھیں حضرات کے ہاتھوں میں قوم کی باگ ڈور ہے، یہی قوم کے معمار ہیں۔ انھیں اس کی پروا نہیں کہ ہندوستان کی خلقت دو آنے پیسوں پر گذر کرتی ہے۔ آمدنی کی اوسط فی کس پچیس روپیہ سالانہ سے زیادہ نہیں۔ مگر یہ ہمارے پروفیسر ہیں جنھیں پچاس روپیہ روز چاہئیں۔ اُس ماضی کی یاد آتی ہے جب ہمارے اتالیق جھونپڑیوں میں رہتے تھے مگر وہ بات سے دور، خود غرضیوں سے الگ، بے لوث زندگی کے نمونے، بے غرض خدمت کے مجاور۔ وہ کم سے کم لے کر زیادہ سے زیادہ دیتے تھے۔ وہ حقیقی دیوتا تھے

اور ایک یہ پروفیسر ہیں جو معمولی بیوپاری یا دفتری عملوں سے بہتر نہیں۔ ان میں بھی وہی تنگ دلی ہے، وہی دولت کا غرور ہے، وہی اختیار کی ہوس ہے ہماری تعلیم گاہیں کیا ہیں دفتری حکومت کے صیغے ہیں اور ہمارے پروفیسر اُس حکومت کے پرزے ہیں۔ وہ خود گمراہ ہیں، تاریک ہیں، روشنی کیا پھیلائیں گے۔ جیسے وہ خود نفس کے غلام ہیں۔ اسی طرح اپنے شاگردوں کو بھی غلامی میں ڈالتے ہیں۔ امر کی سلف پرستی زمانے کے حالات کے تغیر کو بالکل بھول جاتی اس کے خیالی نظام میں عملے خدمت کے پتلے ہوتے۔ اتالیق جھونپڑوں میں رہنے والے، رعایا حرص اور حسد سے خالی، نہ یہ آئے دن کے قضیئے نہ بکھیڑے۔ اتنی عدالتوں کی ضرورت کیا، اتنے محکمے کس لئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے غریبوں کی لاش نوچنے والے گدوں کا غول ہے۔ جس کی جتنی ہی اونچی تعلیم ہے، اس کی حرص بھی اُسی مناسبت سے بڑھی ہوئی ہے۔ یا حرص اور غرض پروری ہی تہذیب و تکمیل کی علامتیں ہیں؟ غریبوں کو روٹیاں نہ میسر ہوں، بچارے کپڑوں کو ترستے ہوں مگر ہمارے روشن خیال بھائیوں کو شان سے زندگی بسر کرنے کی سہولتیں ملنی ضروری ہیں۔ اگر اس دنیا کو انسان نے بنایا ہے تو انصاف کا خون کیا ہے۔ خدا نے بنایا ہے تو اُسے کیا کہیں؟

وہ علی الصباح اُٹھ کر شانتی کمار کے سیوا آشرم میں پہنچ جاتا اور دوپہر تک لڑکوں کو پڑھاتا رہتا۔ یہ مدرسہ ڈاکٹر صاحب کے بنگلے ہی میں تھا نو بجے تک ڈاکٹر صاحب خود پڑھاتے تھے۔ اگرچہ یہاں فیس بالکل نہ لیجاتی تھی اور تعلیم کے بہترین اور جدید اصول کی پابندی کی جاتی تھی پھر بھی لڑکوں کی تعداد بہت کم تھی۔ سرکاری مدرسوں میں جہاں فیس، جرمانے اور چندوں کی بھرمار رہتی تھی، لڑکوں کے بیٹھنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ یہاں کوئی جھانکتا بھی

نہ تھا۔ مشکل سے دو ڈھائی سو لڑکے آتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بھولے بھالے معصوم بچوں کا فطری نشوونما کیسے ہو، وہ کیسے باہمت، قناعت پسند سچے خادم بن سکیں یہی اس کا خاص مقصد تھا۔ احساس حسن کو جو انسانی فطرت کا خاص جزو ہے کیونکر غیر مستحسن حالات سے الگ رکھا جائے کہ وہ تکمیل کے درجے پر پہنچے۔ مقابلے کے بجائے ہمدردی کی تحریک کیونکر ہو۔ دونوں دوست انھیں مسئلوں کو سوچتے رہتے تھے۔ اُن کے پاس تعلیم کا کوئی دستور العمل تیار نہ تھا۔ غائت کو سامنے رکھ کر ہی وہ طریق کار کا فیصلہ کرتے تھے۔ ان کے دو معاون اور تھے۔ ایک آتما نند سنیاسی تھے جو دنیا سے منہ موڑ کر خدمت میں اپنی زندگی کو وقف کر چکے تھے۔ دوسرے ایک موسیقی کے ماہر تھے جن کا نام تھا برج ناتھ۔ ان دونوں آدمیوں کے آجانے سے اُس مدرسے کو بہت تقویت ہو گئی تھی۔ ایک دن امر نے شانتی کمار سے کہا۔ آپ آخر کب تک پروفیسری کرتے چلے جائیں گے۔ جس درخت کو ہم جڑ سے کاٹنا چاہتے ہیں اُسی سے چمٹے رہنا تو آپ کے شایان شان نہیں"

شانتی کمار نے مسکرا کر کہا۔ میں خود یہی سوچ رہا تھا بھئی، تامل یہی ہے کہ روپئے کہاں سے آئیں گے۔ خرچ بہت کم ہے پھر بھی پانسو میں تو کلام ہی نہیں"

"آپ اس کی فکر نہ کیجئے۔ روپئے کہیں نہ کہیں سے آ ہی جائیں گے"

"میں امیدوں پر دیوار کھڑی نہیں کرتا۔ آخر مکان کا کرایا ہے، لڑکوں کے لئے دلچسپی کے سامان ہیں۔ موسیقی کے ساز ہیں۔ اور بیسیوں ہی خرچ ہیں"

"ہم لڑکوں کو کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر پڑھا سکتے ہیں۔ مکان کی کیا ضرورت ہے"

"تم پرواز کی دھن میں عملی رُخ کا بالکل لحاظ نہیں کرتے۔ کوری پروازِ خیالی پلاؤ ہے۔"

امر نے کہا "میں تو سمجھتا تھا آپ بھی معیار پسند ہیں۔"

شانتی کمار نے گویا اس چوٹ کو ڈھال پر روک کر کہا: "میری معیار پسندی میں عمل کا حصہ غالب ہے۔"

اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ قول و فعل میں توازن ضروری نہیں سمجھتے۔"

"جب تک مجھے روپیے کہیں سے نہ ملیں میں کس اعتبار پر استعفا دیدوں۔ مدرسہ میں نے کھولا ہے۔ اس کے جاری رکھنے کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ اگر تم روپیے کا کوئی مستقل انتظام کر سکتے ہو تو میں آج استعفا دے سکتا ہوں۔ محض امید پر میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

امر کانت نے ابھی اصولوں کے ساتھ سمجھوتا کرنا نہ سیکھا تھا۔ میدانِ عمل میں کچھ دن رہ جانے اور دنیا کے تلخ تجربے ہو جانے کے بعد ہماری فطرت میں جو پس و پیش پیدا ہو جایا کرتا ہے اُس کا اُسے سابقہ نہ پڑا تھا۔ نو مریدوں کو اصولوں پر جو اٹل اعتقاد ہوتا ہے وہ اس میں بھی تھا۔ ڈاکٹر صاحب پر اُسے جو اعتقاد تھا۔ اس میں کچھ جنبش پیدا ہوئی۔ اسے معلوم ہوا یہ محض زبان کے شیر ہیں جس کا صریح الفاظ میں یہ مطلب ہے کہ وہ دنیا کو دھوکا دیتے ہیں ایسے آدمی کے ساتھ وہ کیسے اشتراکِ عمل کر سکتا ہے۔

"تو آپ استعفا نہیں دے سکتے؟"

"اُس وقت تک نہیں، جب تک روپیے کا کوئی معقول انتظام نہ ہو جائے۔"

"ایسی حالت میں میں یہاں کام نہیں کر سکتا۔"

ڈاکٹر صاحب نے مفاہمت کے انداز سے کہا "دیکھو امر کانت مجھے

دنیا کا تم سے زیادہ تجربہ ہے۔ میری اتنی عمر نئے تجربات ہی میں گذری ہے۔ میں نے اس سے جو حقیقت دریافت کی ہے وہ یہ ہے کہ ہماری زندگی سمجھوتوں ہی پر قائم ہے۔ ابھی تم مجھے جو چاہے سمجھو مگر ایک زمانہ آئے گا کہ تمھاری آنکھیں کھلیں گی اور تمھیں معلوم ہوگا کہ زندگی میں واقعیت کا درجہ مثال سے کم نہیں۔"

امر نے آسمان میں اڑتے ہوئے کہا "اصول پر قربان ہو جانا، اس سے کہیں اچھا ہے کہ اُسے دھوکا دیا جائے" اور اُسی وقت وہاں سے چل دیا۔

پہلے سلیم سے ملاقات ہوئی۔ سلیم اس مدرسے کو مداری کا تماشا کہا کرتا تھا۔ جہاں جادو کی لکڑی چھوا دینے ہی سے سونا بن جاتی ہے۔ وہ ایم۔ اے کی تیاری میں مصروف تھا۔ اس کی آرزو تھی کہ کوئی اچھی سی ملازمت مل جائے اور فراغت سے زندگی بسر ہو۔ اصلاح اور تنظیم اور قومی تحریکوں سے اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی اس نے یہ خبر سنی تو خوش ہو کر بولا "تم نے بہت اچھا کیا نکل آئے۔ میں ڈاکٹر صاحب کو خوب جانتا ہوں۔ وہ اُن لوگوں میں ہیں جو دوسروں کے گھر میں آگ لگا کر اپنا ہاتھ سینکتے ہیں۔ قوم کے نام پر جان تو دیتے ہیں مگر زبان سے۔"

سکھدا بھی خوش ہوئی۔ امر کانت کا اس مدرسے کے پیچھے پاگل ہو جانا اُسے بُرا لگتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب سے اُسے چڑ تھی۔ وہی امر کو انگلیوں پر نچا رہے ہیں۔ اُنھیں کے پھیر میں پڑ کر وہ دوبارہ گھر سے بیزار ہو گیا ہے۔

لیکن جب شام کے وقت امر نے سکینہ سے اس کا ذکر کیا تو اس نے ڈاکٹر صاحب کی حمایت کی۔ "میں سمجھتی ہوں ڈاکٹر صاحب کا خیال درست ہے بھوکے پیٹ خدا کی یاد بھی نہیں ہو سکتی۔ جس کے سر روزی کی فکر سوار ہے وہ قوم کی خدمت کیا کرے گا۔ اور کرے گا تو امانت میں خیانت کرے گا۔ مانا کہ درختوں کے نیچے ہی لڑکوں کی تعلیم ہو سکتی ہے لیکن وہ باغ ہے کہاں؟ مکان کے اندر

بستی میں بیٹھ کر بھی لڑکوں کو پڑھایا جا سکتا ہے۔ لیکن باغ جب تک بہت وسیع نہ ہو اور بستی سے بالکل باہر، لڑکوں کی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ ایسی جگہ شہر میں کہاں ہے، اور شہر سے باہر جائے گا کون، سوچو جو آدمی اپنے اصول کے خلاف نوکری کر کے بھی ایک کام کی بنیاد ڈالتا ہے وہ اس کے لئے کتنی بڑی قربانی کر رہا ہے۔"

پٹھانی نے کہا "تم اس چھوکری کی باتوں میں نہ آؤ بیٹا، جا کر گھر کا دھندا دیکھو۔ جس سے گرہستی کا نباہ ہو۔ یہ سیلانی پن ان لوگوں کے لئے ہے جو گھر کے نکھٹو ہیں۔ تمھیں اللہ نے عزت دی ہے۔ مرتبہ دیا ہے، بال بچے دئے ہیں تم ان خرافاتوں میں نہ پڑو۔"

امر کو اب ٹوپیاں بیچنے سے فرصت مل گئی تھی۔ بڑھیا کو رامادیوی کے ذریعے چکن کا کام اتنا زیادہ مل جاتا تھا کہ ٹوپیاں کون کاڑھتا۔ سلیم کے گھر سے بھی کچھ نہ کچھ کام آتا ہی رہتا تھا۔ سکینہ کے گھر میں کچھ خوشحالی نظر آنے لگی ہے۔ گھر میں سفیدی ہو گئی ہے۔ دروازے پر نیا پردہ پڑ گیا ہے۔ دو چارپائیاں نئی آ گئی ہیں۔ چارپائیوں پر دریاں بھی نئی ہیں اور کئی نئے برتن بھی آ گئے ہیں۔ اردو کا ایک اخبار بھی آنے لگا ہے۔ پٹھانی کو اپنے اچھے دنوں میں بھی اتنی فارغ البالی نصیب نہ ہوئی تھی۔ بس اُسے اگر کوئی غم ہے تو یہ کہ سکینہ شادی پر رضامند نہیں۔

امر یہاں سے چلا تو اپنی غلطی پر نادم تھا۔ سکینہ کے ایک ہی جملے نے اس کے دل کے سارے شکوک کا ازالہ کر دیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب سے اُسے پھر وہی عقیدت ہو گئی تھی۔ سکینہ کی دور اندیشی، معاملہ فہمی اور صاف گوئی نے اسے متحیر اور فریفتہ کر لیا تھا۔ سکینہ سے اس کا تقرب جتنا زیادہ ہوتا جاتا اتنا ہی

اس کا احترام بھی زیادہ بڑھتا جاتا تھا۔ سکھدا اپنی بے نیازی اور خود پروری سے اس پر حکومت کرتی تھی۔ وہ حکومت اُسے ناگوار تھی۔ سکینہ اپنے انکسار اور شیریں زبانی سے اس پر حکومت کرتی تھی وہ حکومت اُسے قبول تھی۔ سکھدا میں اختیار کا غرور تھا، سکینہ میں تسلیم کی عاجزی، سکھدا اپنے کو شوہر سے زیادہ عقلمند سمجھتی تھی۔ سکینہ سمجھتی تھی میں اُن کے آگے ہیچ ہوں۔

ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر پوچھا: تو تمھارا یہی فیصلہ ہے کہ میں استعفا دیدوں حق یہ ہے کہ میں نے استعفا لکھ رکھا ہے اور کل دیدوں گا۔ میں تمھارا شریک نہیں کھو سکتا۔ میں اکیلا کچھ بھی نہ کر سکوں گا۔ تمھارے جانے کے بعد میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ میں بیکار ہوس میں پڑا ہوا ہوں۔"

امرکانت بھی مسکرایا "نہیں میں نے جو غور کیا تو معلوم ہوا میں غلطی پر تھا۔"

ڈاکٹر صاحب نے کہا: "تم مذاق کر رہے ہو۔"

"نہیں، میں بے ادبی کر بیٹھا تھا اُسے معاف کیجئے۔"

(۱۶)

ادھر کچھ دنوں سے امرکانت میونسپل بورڈ کا ممبر ہو گیا تھا۔ لالہ سمرکانت کا شہر میں اتنا اقتدار تھا، اور لوگوں میں امرکانت اتنا ہر دلعزیز تھا کہ وہ بلا دھیلا خرچ کئے انتخاب میں آ گیا۔ اس کے مقابلے میں ایک نامی وکیل صاحب کھڑے تھے انھیں اس کے چوتھائی ووٹ بھی نہ ملے۔ سکھدا اور لالہ سمرکانت دونوں ہی نے امرکانت کو باز رکھنا چاہا۔ دونوں اسے گھر کے کاموں میں پھنسانا چاہتے تھے اب وہ فارغ التحصیل ہو چکا تھا اور لالہ جی اس کے سر سارا بار ڈال کر خود الگ ہو جانا چاہتے تھے۔ امرکانت ان متفرق کاموں میں پڑ گیا تو گھر کا کام کیا خاک کریگا

ایک دن گھر میں چھوٹا موٹا طوفان برپا ہوگیا۔ لالہ جی اور سکھدا ایک طرف تھے امر کانت دوسری طرف اور نینا ثالث تھی۔

لالہ جی نے توند پر ہاتھ پھیر کر کہا "دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا۔ صبح ہوتے ہی مدرسے جاؤ، شام ہو تو کانگریس میں بیٹھو۔ اب یہ نئی زحمت مول لینے کو تیار ہو گئے۔ گھر میں لگا دو آگ"۔ سکھدا نے تائید کی "ہاں اور کیا، اب تمھیں گھر کا کام دھندا دیکھنا چاہیئے یا ان فضول کاموں میں پھنسنا۔ اب تک تو یہ تھا کہ پڑھ رہے ہیں۔ اب تو پڑھ چکے؟ آخر گھر دیکھنے والا بھی کوئی چاہیئے۔ یہ روگ تو وہ پالے جس کے گھر میں دو چار آدمی ہوں۔ یہاں گھر ہی کا کام کیا تھوڑا ہے کہ یہ بیگار بھی لے بیٹھے"۔

امر نے کہا "جسے آپ روگ اور بیگار اور دردسر کہہ رہے ہیں۔ میں اسے ذاتی معاملات سے کم نہیں سمجھتا۔ پھر جب تک آپ ہیں مجھے کیا غم، اور سچ تو یہ ہے کہ میں اس کام کے لئے بنایا ہی نہیں گیا۔ آدمی اسی کام میں سرسبز ہوتا ہے جس سے اُسے دلچسپی ہوتی۔ لین دین، خرید و فروخت میں میرا جی بالکل نہیں لگتا۔ مجھے خوف ہوتا ہے کہ کہیں میں بنا بنایا کام بگاڑ نہ بیٹھوں"۔

لالہ جی کو یہ دلیل عذر لنگ معلوم ہوئی۔ پوپلے منہ سے پان چباتے ہوئے بولے "یہ سب تمھاری مٹر دی ہے اور کچھ نہیں۔ میں نہ ہوتا تو کیا تم اپنے بال بچوں کی پرورش نہ کرتے۔ مگر تم مجھ ہی کو پینا چاہتے ہو۔ ایک لڑکے وہ ہوتے ہیں جو گھر سنبھال کر باپ کو آزاد کر دیتے ہیں، ایک تم ہو کہ باپ کی ہڈیاں تک پیس ڈالنا چاہتے ہو"۔

بات بڑھنے لگی، سکھدا نے دیکھا معاملہ طول پکڑ رہا ہے تو چپ ہو گئی۔ نینا انگلیوں سے کان بند کر کے اوپر جا بیٹھی۔ یہاں دونوں پہلوانوں میں زور

آزمائی ہونے لگی۔ پیٹھے میں چستی تھی، پھرتی تھی، لچک تھی۔ بوڑھے میں پچ تھا، دم تھا اور تجربہ تھا۔ پرانا پھکیت بار بار اُسے دبانا چاہتا تھا مگر جوان پٹھا نیچے سے کھسک جاتا تھا۔ اس پر کوئی وار کارگر نہ ہوتا تھا۔ آخر لالہ جی نے غضب ناک ہو کر کہا "تو یا تم اپنے بال بچے لے کر الگ ہو جاؤ، میں تمہارا بوجھ نہیں سنبھال سکتا اس گھر میں رہو گے تو ما ہوار کرایہ اور گھر میں جو کچھ خرچ ہو گا اس کا آدھا چلکے سے نکال کر رکھ دینا پڑے گا۔ میں نے تمہاری زندگی بھر کا ٹھیکہ نہیں لیا ہے۔ گھر کو اپنا سمجھو تو تمہارا سب کچھ ہے۔ ایسا نہیں سمجھتے تو تمہارا یہاں کچھ نہیں جب میں مر جاؤں تو جو کچھ ہے آ کر لے لینا"

امر کانت پر بجلی سی گر پڑی۔ جب تک بچہ نہ ہوا تھا اور وہ گھر سے کچھ بیزار سا رہتا تھا اس وقت اُسے دو ایک بار اس امکان کا اندیشہ ہوا تھا۔ لیکن بچہ کی ولادت کے بعد سے لالہ جی کے مزاج اور برتاؤ میں ایک خوش گوار تغیر ہو گیا تھا اب امر کو ایسے بیدردانہ حملے کا بالکل خوف نہ تھا۔ لالہ جی کو جس کھلونے کی تمنا تھی انھیں وہ کھلونا دے کر وہ بے فکر ہو گیا تھا۔ لیکن آج اسے معلوم ہوا کہ وہ کھلونا ہوس کی زنجیر کو نہ توڑ سکا۔ والد اپنے لڑکے کی سہل انکاری یا تضیع اوقات پر ناراض ہوا لعن طعن کرے، منہ پھیلائے یہ تو اس کی سمجھ میں آتا تھا۔ لیکن والد اپنے ہی لڑکے سے گھر کا کرایہ اور روٹی کا خرچ مانگے یہ تو بے پناہ ہوس پروری کی انتہا تھی۔ اس کا ایک ہی جواب تھا کہ وہ آج ہی سکھدا اور بچے کو لے کر کوئی دوسرا مکان تلاش کرے اور پھر باپ سے کوئی علاقہ نہ رکھے اور اگر سکھدا معترض ہو تو اس سے بھی ترک تعلق کر لے۔ اس نے مطمئن انداز سے کہا۔ "اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو یہی سہی"

لالہ جی نے کچھ کھسیانے ہو کر کہا "ساس کے بل پر کودتے ہو گے"

امر کانت نے دردناک لہجے میں کہا "دادا آپ زخم پر نمک نہ چھڑکیں جس باپ نے پیدا کیا جب اس کے گھر میں میرے لئے ٹھکانا نہیں ہے تو کیا آپ سمجھتے ہیں میں ساس اور سسر کی روٹیاں توڑوں گا آپ کی دعا سے اتنا بے غیرت نہیں ہوں، میں مزدوری کر سکتا ہوں اور اپنی محنت کی کمائی کھا سکتا ہوں۔ میں کسی فرد بشر سے رحم کی بھیک مانگنا اپنی خودداری کے خلاف سمجھتا ہوں۔ ایشور نے چاہا تو میں آپ کو دکھا دوں گا کہ میں مزدوری کر کے بھی خدمت خلق کر سکتا ہوں"

امر کانت سمجھ گئے ابھی اس کا نشہ نہیں اترا، دو چار مہینے خانہ داری کے چرخے میں پڑے گا تو آنکھیں کھلیں گی۔ چپ چاپ باہر چلے گئے اور امر کانت اسی وقت طیش کے عالم میں ایک مکان کی تلاش میں چلا۔

اس کے چلے جانے کے بعد لالہ جی پھر اندر آئے۔ انھیں امید تھی کہ سکھدا ان کے زخم پر مرہم رکھے گی۔ لیکن سکھدا انھیں اپنے دروازے کے سامنے دیکھ کر بھی باہر نہ نکلی۔ امر کانت کے لاابالی پن سے اسے کوفت ہوتی تھی لیکن آج لالہ جی کی یہ انسانیت سے بعید بد دماغی دیکھ کر اسے امر سے ہمدردی ہو گئی تھی وہ اس کا قیاس بھی نہ کر سکتی تھی کہ کوئی باپ اتنا سنگ دل ہو سکتا ہے آخر یہ لاکھوں کی دولت کس کام آئے گی۔ امر گھر سے لاپروا رہتا ہے یہ سکھدا کو خود برا معلوم ہوتا تھا۔ لالہ جی اس کے لئے لڑکے کی تنبیہہ کرتے ہیں یہ بھی مناسب ہی تھا۔ لیکن گھر کا کرایہ اور روٹیوں کا خرچ مانگنا یہ تو ناتا ہی توڑنا تھا۔ تو جب وہ ناتا ہی توڑنے پر تلے ہوئے ہیں تو وہ ان کی خوشامد کیوں کرے۔ اس نے اپنے سارے زیور اتار ڈالے۔ آخر یہ زیور بھی تو لالہ جی ہی کے عطیے ہیں، ماں کی دی ہوئی چیزیں بھی اس نے اتار پھینکیں۔ ماں نے بھی جو کچھ دیا تھا جہیز میں ہی دیا تھا۔

اُسے بھی لالہ جی نے اپنی بہی میں ٹانک لیا ہوگا، وہ اس گھر سے محض ایک ساڑی پہن کر جائے گی۔ خدا اس کے بچے کو سلامت رکھے اُسے کس کی پروا ہے۔ یہ لعل بے بہا تو اس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔

امر کی جانب سے اس کی ساری شکایتیں مٹ گئیں، آخر میونسپلٹی کے لئے کھڑے ہونے میں کیا بُرائی ہے۔ اعزاز اور امتیاز کس کو پیارا نہیں ہوتا۔ اس ممبری کے لئے لوگ لاکھوں خرچ کرتے ہیں، کیا یہاں جتنے ممبر ہیں سب گھر کے نکھٹو ہی ہیں۔ امر اگر دنیاداری سے گریز کرتا ہے تو کوئی ایسا بُرا نہیں کرتا جس کی سزا اتنی سخت ہو۔ کوئی دوسرا آدمی بیٹے کی اس جوش خدمت پر خوش ہوتا اور اپنے کو خوش نصیب سمجھتا۔

یکایک امر نے آکر کہا "تم نے آج دادا کی باتیں سُن لیں۔ اب کیا صلاح ہے؟"

"صلاح کیا ہے آج ہی یہاں سے رخصت ہو جانا چاہئے۔ اس پھٹکار کے بعد تو میں اس گھر میں پانی پینا بھی حرام سمجھتی ہوں۔ کوئی مکان ٹھیک کر لو۔"

"مکان تو ٹھیک کر آیا، چھوٹا سا مکان ہے۔ صاف ستھرا پہاڑی دیہ پر دس روپیہ کرایہ ہے۔"

"میں بھی تیار ہوں۔"

"تو ایک تانگہ لاؤں؟"

"کوئی ضرورت نہیں پاؤں پاؤں چلیں گے۔"

"کچھ سامان تو لے چلنا ہی پڑے گا۔"

"اس گھر میں ہمارا کچھ نہیں ہے۔ میں نے تو اپنے گہنے تک اتار دئے۔

مزدوروں کی عورتیں گہنے پہن کر نہیں بیٹھا کرتیں۔"

سکھدا کی یہ غیرت مندی دیکھ کر امر کانت حیرت میں آگیا۔ بولا۔ لیکن گہنے تو تمہارے ہیں۔ ان پر کسی کا دعویٰ نہیں۔ پھر آدھے سے زیادہ تو تم اپنے ساتھ لائی تھیں۔"

"ماں نے جو کچھ جہیز میں دیا۔ لالہ جی نے جو کچھ دیا وہ یہ سمجھ کر دیا کہ گھر ہی میں تو رہیں گے۔ اب تو ہمارا اسی چیز پر دعویٰ ہوگا جو ہم اپنی کمائی سے بنوائیں گے۔"

امر فکر کے بوجھ سے دب گیا۔ یہ تو اس طرح ناتا توڑ رہی ہے کہ ایک تار بھی باقی نہ رہے۔ زیور عورتوں کو کتنے پیارے ہوتے ہیں یہ وہ جانتا تھا۔ بیٹے اور شوہر کے بعد انھیں اگر کوئی چیز پیاری ہوتی ہے تو وہ گہنے ہیں۔ کبھی کبھی تو گہنوں کے لئے وہ بیٹے اور شوہر سے بھی تن بیٹھتی ہیں۔ ابھی زخم تازہ ہے درد نہیں ہے۔ دو چار دن کے بعد یہ بے نیازی نالۂ درد بن جائے گی۔ پھر تو بات بات پر طعنے ملیں گے۔ بات بات پر تقدیر پر رونا ہوگا۔ گھر میں رہنا مشکل ہو جائیگا بولا۔ میں تو تمھیں یہ صلاح نہ دوں گا سکھدا۔ جو چیز اپنی ہے اسے اپنے ساتھ لے چلنے میں کوئی برائی نہیں سمجھتا۔"

سکھدا نے شوہر کی طرف پرغرور نظروں سے دیکھا اور بولی "تم سمجھتے ہوگے میں زیوروں کے لئے ماتم کروں گی، اور اپنے کو کوسوں گی۔ تم نہیں جانتے کہ عورتیں موقع پڑنے پر کتنی بڑی قربانی کر سکتی ہیں۔ اس تحقیر کے بعد میں ان زیوروں کی طرف دیکھنا بھی گناہ سمجھتی ہوں پہنا تو دور رہا۔ اگر تم ڈرتے ہو کہ میں کل ہی سے تمھاری جان کھانے لگوں گی تو میں تمھیں یقین دلاتی ہوں کہ اگر گہنوں کا نام بھی میری زبان پر آجائے تو زبان کاٹ لینا۔ میں یہ بھی کہے دیتی ہوں کہ تمھارے

بھروسے پر نہیں جا رہی ہوں۔ میں خود اپنی فکر کر سکتی ہوں اور کروں گی، روٹیوں میں زیادہ خرچ نہیں ہوتا۔ خرچ ہوتا ہے تکلفات میں۔ ایک بار امارت کی شان دل سے نکال ڈالو پھر چار آنے پیسے کافی ہیں۔"

نینا بھاوج کو گہنے اتار کر رکھتے دیکھ چکی تھی۔ اس کی روح فنا ہو رہی تھی کہ اکیلے اس قلعے میں کیسے رہے گی۔ بچے کے بغیر وہ تو ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتی اسے اپنے باپ، بھائی، بھاوج سبھی پر غصہ آ رہا تھا۔ دادا کو کیا سوجھی اتنے روپئے تو گھر میں بھرے ہوئے ہیں وہ کیا ہوں گے، بھائی صاحب بھی اگر گھڑی بھر دوکان پر بیٹھا کرتے تو ایسی کیا قیامت آ جاتی۔ بھائی کو بھی نہ جانے کیا سنک سوار ہو گئی۔ وہ نہ جاتیں تو بھیا دو چار دن میں ضرور ہی لوٹ آتے بھابی کے ساتھ اگر وہ بھی چلی جائے تو دادا کے لئے کھانا کون پکائے گا۔ وہ بھائی کو سمجھانا چاہتی تھی لیکن کیسے سمجھائے۔ یہ دونوں تو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہی نہیں۔ بھیا نے ابھی سے آنکھیں پھیر لیں۔ بچہ بھی کتنا خوش ہے۔ غریب نینا کا دل درد سے پھٹا جاتا ہے۔

اس نے جا کر لالہ جی سے کہا "دادا بھابی تو سب گہنا اتار کر رکھے جاتی ہیں۔"

لالہ جی متفکر تھے۔ کچھ بولے ہی نہیں، شاید سنا ہی نہیں۔

نینا نے ذرا زور سے کہا "بھابی اپنے سب گہنے اتار کر رکھے دیتی ہیں۔"

لالہ جی نے بے رخی کے ساتھ کہا۔ "تو میں کیا کروں۔؟"

"تم ان سے جا کر کہتے کیوں نہیں۔"

"وہ نہیں پہننا چاہتیں تو میرا کیا اختیار ہے۔"

"تمہیں نے ان سے کہا ہوگا، گہنے مت لیجانا۔ کیا تم ان کے بیاہ کے بھی گہنے لے لوگے۔؟"

"ہاں۔ میں سب لے لوں گا۔ اس گھر میں اس کا کچھ نہیں ہے۔"

"یہ تمہاری ہٹ دھرمی ہے۔"

"جا اندر بیٹھ، بک بک مت کر۔"

"تم جا کر انھیں سمجھاتے کیوں نہیں۔"

"تجھے بڑا قلق ہے تو تو ہی کیوں نہیں سمجھاتی۔"

"میں کون ہوتی ہوں سمجھانے والی۔ تم اپنے گہنے لے رہے ہو تو وہ میرے کہنے سے کیوں پہننے لگیں۔"

دونوں ایک لمحہ خاموش رہے۔ پھر نینا نے کہا "مجھ سے یہ بے انصافی نہیں دیکھی جاتی۔ تم ان کے گہنے ان سے نہیں لے سکتے۔ ایسا قانون نہیں ہے۔"

"تو یہ قانون کب سے جان گئی؟ معلوم ہوتا ہے بھائی سے یہی وِدیا سیکھتی ہے۔"

"اگر سیکھتی ہوں تو کیا بُرا کرتی ہوں۔"

"اچھا بھائی سرمت کھا۔ کہدیا اندر جا۔ میں کسی کو منانے سمجھانے نہیں جاتا۔ میرا گھر ہے اس میں جو کچھ ہے وہ میرا ہے۔ میں نے ان چیزوں کے لئے جان کھپائی ہے، اپنا خون جلایا ہے۔ کسی کو کیوں لے جانے دوں۔"

نینا نے سر جھکا لیا اور جیسے دل پر زور ڈال کر بولی۔ تو پھر میں بھی بھابی کے ساتھ چلی جاؤں گی۔"

لالہ جی کا چہرہ تمتما اٹھا۔ "چلی جاؤ میں نہیں روکتا۔ ایسی اولاد سے بے اولاد ہی رہنا اچھا خالی کر دے میرا گھر۔ آج ہی۔ اب خوب ٹانگیں پھیلا کر سوؤں گا۔ یہ فکر تو نہ ہوگی آج یہ نہیں ہے کل وہ نہیں ہے۔ تمہارے رہنے سے مجھے کونسی راحت ملتی تھی؟"

نینا سرخ آنکھیں کئے جاکر سکھدا سے بولی "بھابی میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی"

سکھدا کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ بولی "ہمارے ساتھ! ہمارا تو ابھی گھر بار نہیں ہے۔ نہ پاس پیسے ہیں، نہ برتن بھانڈے، نہ نوکر چاکر۔ ہمارے ساتھ کیسے چلو گی۔ پھر اس محل میں کون رہے گا"

نینا کی آنکھیں بھر آئیں۔ جب سکھدا ہی جا رہی ہے تو اس گھر میں اس کا کیا رکھا ہے۔

پگلی سلو زور سے قہقہہ مار کر بولی "تم سب جنے چلے جاؤ اب میں اس گھر کی رانی بنوں گی۔ اس کمرے میں اسی پلنگ پر مزے سے سوؤں گی۔ کوئی بھکاری دروازے پر آئے گا تو جھاڑو لے کر دوڑوں گی"

امر پگلی کے دل کی باتیں سمجھ رہا تھا۔ نینا بھی چلے گی، سلو بھی چلے گی۔ مگر اس گھر میں ایک ہی تو رہنے کے قابل کمرہ ہے۔ وہاں نینا کہاں رہے گی اور پگلی کے نخرے تو جینا محال کر دیں گے۔ نینا سے بولا "تم ہمارے ساتھ چلو گی تو دادا کو کون پکا کر کھلائے گا نینا، پھر ہم کہیں دور تو نہیں جاتے ہیں وعدہ کرتا ہوں ایک بار روز تم سے مل جایا کروں گا۔ تم اور سلو دونوں یہیں رہو۔ ہمیں جانے دو"

نینا رو پڑی "تمہارے بغیر میں اس گھر میں کیسے رہوں گی بھیا، سوچ دن بھر پڑے پڑے کیا کروں گی۔ مجھ سے تو چھن بھر بھی نہ رہا جائے گا۔ منو کو یاد کر کر کے رویا کروں گی۔ دیکھتی ہو بھابی، میری طرف دیکھتا بھی نہیں"

امر نے کہا "تو منو کو چھوڑ جاؤں، کیا ہرج ہے تیرے ہی پاس رہے گا"

سکھدا نے مداخلت کی، "واہ کیسی باتیں کر رہی ہو، رو رو کر جان دیدیگا پھر میرا جی بھی نہ مانے گا۔"

شام کو تینوں آدمی گھر سے نکلے۔ پیچھے پیچھے سلو بھی ہنستی چلی جاتی تھی۔ سامنے کے دوکانداروں نے سمجھا یہ لوگ کہیں نیوتے جا رہے ہیں۔ مگر کیا بات ہے کہ کسی کے پاس کوئی سامان نہیں۔ لالہ سمرکانت اپنے کمرے میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے، آنکھیں اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ اٹھے۔ صدر دروازے پر تالا ڈال دیا اور پھر کمرے میں جا کر لیٹ رہے۔ ایک دوکاندار نے آکر پوچھا "بھیا اور بی بی کہاں گئے لالہ؟"

لالہ جی نے منہ پھیر کر جواب دیا "مجھے نہیں معلوم۔ میں نے سب کو گھر سے نکال دیا، میں نے دولت اس لئے نہیں پیدا کی ہے کہ لوگ موج اڑائیں، جو پیسے کو پیسا سمجھے اسے موج اڑانے کا حق ہے جو پیسے کو مٹی سمجھے اسے پیسے دینا جرم ہے۔ میں آج بھی اٹھارہ گھنٹے روز کام کرتا ہوں اس لئے نہیں کہ لڑکے دولت کو مٹی سمجھیں۔ میری ہی گود کے لڑکے مجھے آنکھیں دکھائیں۔ دولت کی دولت دوں اوپر سے دھونس بھی سہوں بس زبان نہ کھولوں، چاہے کوئی گھر میں آگ لگا دے۔ گھر کا کام چولھے میں جائے تمہیں سیر سپاٹوں اور جلسوں میں مزا آتا ہے تو جاؤ جلسوں سے اپنا نباہ بھی کرو۔ ایسوں کے لئے میرا گھر نہیں ہے۔ لڑکا وہی ہے جو کہنا مانے جب لڑکا اپنے من کا ہو گیا تو کیسا لڑکا۔"

رامامو کو جوں ہی سلو نے خبر دی۔ وہ بدحواس دوڑی آئی۔ گویا بیٹی اور داماد پر کوئی بڑی مصیبت آپڑی ہے۔ وہ کیا غیر تھی، اس سے کوئی ناتا

ہی نہیں اور الگ مکان لے لیا۔ واہ یہ بھی کوئی لڑکوں کا کھیل ہے۔ دونوں ہی بلکے یہ چھوکری تو ایسی نہ تھی۔ مگر اس لونڈے کے ساتھ اس کا بھی سر پھر گیا۔

رات کے آٹھ بج گئے تھے۔ ہوا ابھی تک گرم تھی۔ راما پہنچی تو تینوں جلا وطن کوٹھے کی ایک چارپائی برابر چھت پر من مارے بیٹھے تھے۔ سارے گھر میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بیچاروں پر خانہ داری کی نئی مصیبت پڑی تھی، پاس ایک پیسہ بھی نہیں، کچھ نہ سوجھتا تھا کیا کریں۔ امر نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ ارے تمھیں کیسے خبر مل گئی اماں جی، اچھا اس چڑیل سلونے جاکر کہا ہوگا کہاں ہے ابھی خبر لیتا ہوں۔"

راما اندھیرے میں زینے پر چڑھنے سے ہانپ گئی تھی۔ چادر اتارتی ہوئی بولی "میں کیا دشمن تھی کہ مجھ سے اس نے کہہ دیا تو برائی کی۔ کیا میرے گھر نہ تھا یا میرے گھر میں روٹیاں نہ تھیں۔ میں یہاں چھن بھر تو رہنے نہ دوں گی۔ وہاں پہاڑ سا گھر پڑا ہوا ہے۔ یہاں تم سب ایک بل میں گھسے بیٹھے ہو۔ اٹھو ابھی ننھا سا بچہ مارے گرمی کے کملا گیا۔ یہاں چارپائیاں بھی تو نہیں ہیں اور اتنی سی جگہ میں سو دو کے کیسے؟ تو تو ایسی نہ تھی سکھدا، تجھے کیا ہو گیا، بڑے بوڑھے دو بات کہیں تو غم کھانا ہوتا ہے کہ گھر سے نکل کھڑے ہوتے ہیں کیا ان کے ساتھ تیری عقل بھی گھاس کھا گئی۔"

سکھدا نے ساری داستان کہہ سنائی اور اس پر رائے ہیں کہ راما کو بھی لالہ سمرکانت ہی کی زیادتی معلوم ہوئی۔ "انھیں اپنی دولت کا غرور ہے تو اسے لئے بیٹھے رہیں۔ مرنے لگیں تو ساتھ لیتے جائیں۔"

امر نے کہا "دادا کو یہ خیال نہ ہوگا کہ یہ سب کے سب گھر سے چلے جائیں گے۔"

سکھدا کا غصہ اس قدر جلد فرو ہونے والا نہ تھا۔ بولی "چلو، انھوں نے صاف کہا۔ تمھارا یہاں کچھ نہیں ہے۔ کیا وہ ایک دفعہ بھی آکر نہ کہہ سکتے تھے کہ تم لوگ کہاں جاتے ہو، ہم گھر سے نکلے اور وہ کمرے میں بیٹھے ٹکر ٹکر دیکھا کئے بچے پر بھی انھیں رحم نہ آیا۔ جب انھیں اتنا غرور ہے تو یہاں کیا آدمی ہی نہیں ہیں وہ اپنا محل لے کر رہیں، ہم اپنی محنت مزدوری کر لیں گے۔ ایسا حریص آدمی تم نے کبھی دیکھا تھا اماں؟ بی بی لیئں تو انھیں بھی ڈانٹ بتائی بیچاری روتی چلی آئیں۔

رامانے نینا کا ہاتھ پکڑ کر کہا: "اچھا جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا۔ اب یہاں سے چلو دیر ہو رہی ہے۔ میں مہراجن سے کھانا پکانے کو کہہ آئی ہوں۔ کھائیں بھی نکلوالی ہیں۔ لالہ سسر کا گھر نہ اجڑتا تو میرا گھر کیسے بستا؟"

نیچے روشنی ہوئی، سلونے کڑوے تیل کا چراغ جلا دیا تھا۔ رامانے کو یہاں پہنچا کر بازار دوڑ گئی۔ چراغ، تیل اور ایک جھاڑو لائی۔ چراغ جلا کر گھر میں جھاڑو لگا رہی تھی۔ سکھدا نے بچے کو رامانی کی گود میں دے کر کہا: "آج تو معاف کرو اماں! آئندہ دیکھا جائے گا۔ لالہ جی کو یہ کہنے کا موقع کیوں دیں کہ آخر سسرال ہی میں ٹھکانا ملا۔ انھوں نے پہلے ہی تمھارے گھر کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ ہمیں دو چار دن یہاں رہنے دو پھر ہم تمھارے پاس چلے آئیں گے۔ ذرا ہم بھی تو دیکھ لیں کہ ہم اپنے بوتے پر رہ سکتے ہیں یا نہیں۔"

امر کی نانی مر رہی تھی۔ اپنے لئے تو اُسے کوئی فکر نہ تھی سلیم یا ڈاکٹر کہیں چلا جائے گا۔ یہاں سکھدا اور دونوں بغیر چارپائی کے کیسے سوئیں گی۔ کل ہی کہاں سے ہن برس جائے گا کہ سارے سامان آجائیں گے۔ مگر سکھدا کی بات کیسے کاٹے۔

راما نے بچے کی مچھلیاں لے کر کہا: "بھلا دیکھ لینا جب میں مر جاؤں۔ ابھی تو میں جیتی ہوں۔ وہ بھی تو تیرا ہی ہے یا کسی اور کا، چل جلدی کر۔"

سکھدا نے خودداری کے ساتھ کہا: "اماں جب تک ہم اپنی کمائی سے اپنا گذر بسر نہ کرنے لگیں گے تمھارے گھر نہ جائیں گے۔ جائیں گے مگر مہمان کی طرح گھنٹے دو گھنٹے بیٹھے اور چلے آئے۔"

راما نے امر سے اپیل کی: "دیکھتے ہو بیٹا، اس کی باتیں۔ یہ مجھے بھی غیر سمجھتی ہے۔"

سکھدا نے بادل درد مند کہا: "اماں بُرا نہ ماننا۔ آج دادا جی کا برتاؤ دیکھ کر مجھے معلوم ہو گیا کہ امیروں کو اپنی دولت کتنی پیاری ہوتی ہے۔ کون جانے کبھی تمھارے دل میں بھی ایسے ہی خیالات پیدا ہوں، تو ایسا موقع آنے ہی کیوں دیا جائے۔ جب ہم مہمان کی طرح۔"

امر نے بات کاٹی، راما کی طبع نازک پر کتنا بے رحمانہ حملہ تھا۔

"تمھارے جانے میں تو کوئی ایسا حرج نہیں ہے سکھدا، تمھیں یہاں بڑی تکلیف ہو گی۔"

سکھدا نے ترشی کے ساتھ کہا: "تو کیا تکلیفیں تمھی جھیل سکتے ہو، ہم نہیں جھیل سکتی۔ تم اگر تکلیفوں سے ڈرتے ہو تو جاؤ۔ میں تو ابھی کہیں نہیں جاؤں گی۔"

نتیجہ یہ ہوا کہ راما نے سلّو کو گھر بھیج کر اپنے بستر منگوائے۔ کھانا پک چکا تھا وہ بھی منگوا لیا گیا۔ چھت پر جھاڑو دی گئی اور جیسے دھرم شالے میں مسافر ٹھہرتے ہیں اسی طرح ان لوگوں نے کھانا کھا کر رات کاٹی۔ بیچ بیچ میں مذاق بھی ہوتا جاتا تھا۔ مصیبت میں جو چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے یہاں وہ کیفیت نہ تھی۔ تارا کا تھا، لیکن وقت یہ کی مصیبت تھی، مگر سر پر نہیں، سر ول کے نیچے۔

دوسرے دن سویرے راما گھر چلی گئی۔ اس نے پھر سب کو ساتھ لے چلنے کے لئے اصرار کیا مگر سکھدا راضی نہ ہوئی۔ کپڑے لتے، برتن بھانڈے، تخت یا پلنگ کوئی چیز لینے پر راضی نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ راما ناراض ہو گئی اور امرکانت کو بھی ناگوار گذرا۔ سکھدا اس پریشان حالی میں بھی اس پر حکومت کر رہی تھی۔

راما کے جانے کے بعد امر سوچنے لگا، روپئے پیسے کا کیا انتظام ہو، وہ وقت مدرسے جانے کا تھا۔ وہاں جانا لازمی تھا۔ سکھدا ابھی خواب سحر میں مگن تھی اور نینا متفکر بیٹھی سوچ رہی تھی۔ کیسے گھر کا کام چلے گا۔ اسی وقت امر مدرسے چلا گیا۔ پر آج وہاں اس کا ذرا بھی جی نہ لگا۔ کبھی باپ پر غصہ آتا کبھی سکھدا پر کبھی اپنے آپ پر۔ اس نے اپنی خانہ ویرانی کے متعلق ڈاکٹر صاحب سے کوئی ذکر نہ کیا، وہ کسی کی ہمدردی کا طالب نہ تھا، آج وہ اپنے دوستوں میں سے کسی کے پاس نہ گیا۔ اسے خوف ہوا لوگ اس کا حال سن کر دل میں ہی سمجھیں گے میں ان سے کچھ مدد چاہتا ہوں۔ دس بجے وہ گھر لوٹا تو دیکھا سلو آٹا گوندھ رہی ہے اور نینا چوکے میں بیٹھی ترکاری پکا رہی ہے، کچھ پوچھنے کی ہمت نہ پڑی۔ پیسے کہاں سے آئے۔ نینا نے آپ ہی کہا "سنتے ہو بھیا، آج سلو نے ہماری دعوت کی ہے، لکڑی۔ گھی، آٹا، دال سب بازار سے لائی ہے۔"

سلو بول اٹھی "میں دعوت نہیں کرتی، میں اپنے پیسے جوڑ کر لونگی"

نینا ہنستی ہوئی بولی "یہ بڑی دیر سے مجھ سے لڑ رہی ہے۔ یہ کہتی ہے میں پیسے لے لوں گی۔ میں کہتی ہوں تو تو دعوت کر رہی ہے۔ بتاؤ بھیا، دعوت ہی تو کر رہی ہے؟"

"ہاں اور کیا دعوت تو ہے ہی"

سلو کا پوپلا منہ کھل گیا۔ جیسے وہ اپنی ہی نگاہ میں اونچی ہو گئی ہے، گویا

اس کی زندگی منور ہوگئی ہے۔ اس کا افسردہ چہرہ گویا زندہ دلی میں نہا اٹھا۔ اس نے ہاتھ دھو کر امرکانت کے لئے لوٹے میں پانی رکھدیا تو اس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔

امر کو ابھی تک امید تھی کہ دادا شاید سکھدا اور نینا کو بلا بھیجیں مگر ابھی تک کوئی بلانے نہ آیا اور نہ وہ خود آئے تو اس کا جی کھٹا ہوگیا۔

وہ جلدی سے نہایا مگر یاد آیا دھوتی تو ہے نہیں گلے کی چادر پہن لی۔ کھانا کھایا اور رزق کی تلاش میں نکلا۔

سکھدا نے منہ لٹکا کر پوچھا "تم ایسے بے فکر ہو کر بیٹھ رہے گویا یہاں سارا انتظام مکمل ہوگیا ہے۔ بس یہاں لا کر بٹھانا ہی جانتے ہو، صبح سے غائب ہوئے تو دوپہر کو لوٹے، کسی سے کام دھندے کے لئے کچھ کہا۔ یا خدا چھپر پھاڑ کر دیگا یوں کام نہ چلے گا سمجھ گئے؟"

چوبیس گھنٹے کے اندر ہی سکھدا کے جذبات میں یہ انقلاب دیکھ کر امر رنجیدہ ہوگیا۔ کل کتنی بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہی تھی۔ آج شاید پچھتا رہی ہے کہ کیوں گھر سے نکلے۔"

بے اعتنائی سے بولا۔ ابھی تو کسی سے کچھ نہیں کہا۔ اب جاتا ہوں کام کی تلاش میں۔"

"میں بھی ذرا بج صاحب کی بیوی کے پاس جاؤں گی۔ ان سے کسی ملازمت کی درخواست کروں گی۔ اُن دنوں تو بڑی خاطر کرتی تھیں۔"

امر کچھ نہیں بولا۔ ہاں اُسے معلوم ہوگیا کہ اس کی سخت آزمائش کے دن آگئے۔ امرکانت کا بازار کے سبھی دوکانداروں سے یارانہ تھا۔ اس نے ایک کھدر کی دوکان سے کمیشن پر بیچنے کے لئے کئی تھان کھدر، کھدر کی ساڑیاں

جمپر، کرتے، چادریں وغیرہ وغیرہ لے لیں اور انھیں خود اپنی پیٹھ پر لاد کر بیچتے چلا۔

ایک دوکاندار نے کہا "یہ کیا کرتے ہو بابو جی، ایک مجور لے لو۔ لوگ کیا کہیں گے" بھدا معلوم ہوتا ہے" امر کے سینے میں انقلاب کا طوفان اٹھ رہا تھا اس کا بس چلتا تو آج مالداروں کا خاتمہ کر دیتا جو دنیا کو جہنم بنائے ہوئے ہیں۔ وہ بوجھ اٹھا کر دکھانا چاہتا تھا، میں مزدوری کر کے نباہ کرنا اس سے کہیں اچھا سمجھتا ہوں کہ حرام کی کمائی کھاؤں۔ تم سب موٹی توند والے حرام خور ہو، پکے حرام خور ہو۔ تم مجھے حقیر سمجھتے ہو؟ اس لئے کہ میں اپنی پیٹھ پر بوجھ لادے ہوئے ہوں کیا یہ بوجھ تمہاری بے ایمانی اور بے رحمی اور دغابازی کے بوجھ سے زیادہ شرمناک ہے۔ جو تم اپنے سر پر لادے پھرتے ہو اور شرماتے ذرا بھی نہیں، الٹے اور دون کی لیتے ہو"

اس وقت اگر کوئی صاحب ذرا مرکانت کو چھیڑ دیتے تو اس کی شامت ہی آجاتی۔ وہ سر سے پاؤں تک بارود بنا ہوا تھا۔ یا بجلی کا زندہ تار۔

(۱۷)

امر کانت کھادی بیچ رہا ہے، تین بجے ہوں گے۔ لو چل رہی ہے، بگولے اٹھ رہے ہیں، دوکاندار دوکانوں پر سو رہے ہیں۔ رئیس محلوں میں سو رہے ہیں، مزدور پیڑوں کے نیچے سو رہے ہیں اور امر کھادی کا گٹھا لادے پسینے سے تر، چہرہ سرخ، آنکھیں لال، گلی گلی پھر رہا ہے۔

ایک وکیل صاحب نے خس کا پردہ اٹھا کر دیکھا اور بولے "ارے بابو یہ کیا غضب کرتے ہو۔ میونسپل کمشنری کی تو لاج رکھتے۔ کیا کوئی مزدور نہیں ملتا تھا؟"

امر نے ترش رو ہو کر کہا: "مزدوری کرنے سے میونسپل کمشنری کی شان میں بٹہ نہیں لگتا۔ بٹہ لگتا ہے دھوکے، فریب کی کمائی کھانے سے۔"

"وہاں دھوکے، فریب کی کمائی کھانے والا کون ہے بھائی! کیا وکیل ڈاکٹر، پروفیسر، ساہوکار، ٹھیکہ دار دھوکے دھڑی کی کمائی کھاتے ہیں؟"

"یہ ان کے دل سے پوچھئے میں کسی کو برا کیوں کہوں۔"

"آخر آپ نے کچھ سمجھ ہی کر تو یہ فقرہ چست کیا۔"

"اگر آپ مجھ سے پوچھنا ہی چاہتے ہیں تو میں کہوں گا ہاں کھاتے ہیں۔ ایک آدمی دس روپئے میں گذر کرتا ہے، دوسرے کو دس ہزار کیوں چاہئے۔ یہ دھاندھلی اسی وقت تک چلے گی جب تک پبلک کی آنکھیں بند ہیں۔ معاف کیجئے گا ایک آدمی پنکھے کی ہوا کھائے اور خس خانے میں بیٹھے اور دوسرا دوپہر کی دھوپ میں تپے۔ یہ نہ انصاف ہے نہ انسانیت، یہ دھاندلی ہے۔"

"چھوٹے بڑے تو بھائی صاحب ہمیشہ رہے ہیں اور رہیں گے۔ اخوت اور مساوات کا اصول تو کبھی خیال کے دائرے سے باہر نہیں نکلا۔"

"میں دنیا کا ٹھیکہ نہیں لیتا۔ اگر انصاف اچھی چیز ہے تو وہ اس لئے خراب نہیں ہو سکتی کہ لوگ اس پر عمل نہیں کرتے۔"

"اس کا منشا یہ ہے کہ آپ انفرادیت کے قائل نہیں۔ اشتراکیت کے قائل ہیں۔"

"میں کسی "یت" کا قائل نہیں صرف انصاف کا پجاری ہوں۔"

"تو کیا سیٹھ جی سے الگ ہو گئے؟"

"انھوں نے میری زندگی کا ٹھیکہ نہیں لیا ہے۔"

"تو لائیے دیکھیں آپ کے پاس کیا کیا چیزیں ہیں۔"

امرکانت نے ان کے ہاتھ دس روپئے کے کپڑے بیچے۔

امرکانت ان دنوں بڑا زود رنج، بڑا تند مزاج، بڑا صاف گو ہو گیا ہے اس کی تلوار ہمیشہ میان کے باہر رہتی ہے۔ گاہکوں سے بات بات پر الجھتا ہے پھر بھی اس کی بکری اچھی ہوتی ہے۔ زاہد دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جنھیں ترک میں روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے، جو ترک کو ہی روحانی تکمیل کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ جن کے لئے ترک انسانیت، اخلاق اور مروت ہے، دوسرے وہ جو دل جلے زاہد ہوتے ہیں جن کا زہد محض حالات و معاملات سے بیزار ہوتا ہے، جو اپنے زہد کی قیمت دنیا سے لینا چاہتے ہیں، جو خود جلتے ہیں، اسی لئے دوسروں کو بھی جلاتے ہیں۔ امرکانت اسی طرح کا زاہد بنا ہوا تھا۔

تندرست آدمی اگر نیم کی پتیاں چاتا ہے تو اپنی صحت کو بڑھانے کے لئے وہ شوق سے پتیاں توڑ لاتا ہے، شوق سے انھیں پیستا ہے اور شوق سے پیتا ہے لیکن مریض وہی پتیاں پیتا ہے تو ناک سکوڑ کر، منہ بنا کر اور جھنجھلا کر اور اپنی تقدیر کو رو کر۔

سکھدا جج صاحب کی بیوی کی سفارش سے لڑکیوں کے ایک مدرسے میں پچاس روپئے پر نوکر ہو گئی ہے۔ امر دو بدو تو کچھ کہہ نہیں سکتا مگر دل میں جلتا رہتا ہے۔ گھر کا سارا کام، بچے کو سنبھالنا، رسوئیں پکانا، ضروری چیزیں بازار سے منگوانا یہ سب اس کے متھے ہے۔ سکھدا ان کاموں کے قریب نہیں جاتی امر آم کہتا ہے تو سکھدا املی کہتی ہے۔ دونوں میں ہمیشہ کھٹ پٹ ہوتی رہتی ہے سکھدا اس خستہ حالی میں بھی اس پر حکومت کر رہی ہے۔ امر کہتا ہے آدھ سیر دودھ کافی ہے۔ سکھدا کہتی ہے سیر بھر آئے گا اور سیر بھر ہی منگاتی ہے۔ وہ خود دودھ نہیں پیتا۔ یہ بھی ایک مسئلہ متنازعہ ہے۔ وہ کہتا ہے ہم غریب

ہیں، ہم مزدور ہیں۔ ہمیں مزدوروں کی طرح رہنا چاہیئے۔ وہ کہتی ہے ہم مزدور نہیں ہیں اور نہ مزدوروں کی طرح رہیں گے۔ امرا سے اپنے حقیقی نشو و نما میں سدِ راہ سمجھتا ہے اور اس کو ہٹا نہ سکنے کے باعث اندر ہی اندر کڑھتا ہے۔

ایک دن بچے کو کھانسی ہوگئی۔ امر بچے کو لے کر ایک ہومیوپیتھ کے پاس جانے کو تیار ہوا۔ سکھدا نے کہا، بچے کو مت لے جاؤ ہوا لگے گی۔ ڈاکٹر کو بلا لاؤ، فیس ہی تو لے گا۔ امر کو مجبور ہو کر ڈاکٹر کو بلانا پڑا۔ تیسرے دن بچہ اچھا ہو گیا۔

ایک دن خبر ملی لالہ سمر کانت کو بخار آگیا ہے۔ امر کانت اس مہینے بھر میں ایک بار بھی گھر نہ گیا تھا۔ یہ خبر سن کر بھی نہ گیا۔ وہ مریں یا جئیں، اس سے کوئی سروکار نہیں، انھیں اپنی دولت پیاری ہے تو اسے اپنے سینے پر رکھے رہیں اور انھیں کسی کی ضرورت ہی کیا۔

لیکن سکھدا ضبط نہ کر سکی وہ اسی وقت نینا کو ساتھ لے کر چلدی۔

سمر کانت گھر والوں کے سوا اور کسی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہیں کھاتے تھے۔ کئی دن تو انھوں نے دودھ پی کر کاٹے۔ کئی دن پھل کھا کر بسر کیے۔ لیکن روٹی دال کے لئے دل ترستا رہتا تھا۔ انواع و اقسام کی چیزیں بازار میں موجود تھیں لیکن روٹیاں کہاں، ایک دن ان سے نہ رہا گیا۔ روٹیاں پکائیں اور ہوکے میں آکر کچھ زیادہ کھا گئے۔ بدہضمی ہوگئی، ایک دن دست آئے دوسرے دن بخار آگیا۔ فاقوں سے کچھ تو پہلے ہی گھل چکے تھے دو دن کی بیماری نے اور پست کر دیا۔

سکھدا کو دیکھ کر بولے "ابھی آنے کی کیا جلدی تھی بہو، دو چار دن اور

دیکھ لیتیں، تب تک یہ خزانے کا سانپ اڑ گیا ہوتا۔ وہ لونڈا سمجھتا ہے مجھے دولت بال بچوں سے زیادہ پیاری ہے۔ لیکن یہ جوڑا تھا کس کے لئے؟ اپنے لئے؟ تو بال بچے پیدا کیوں کئے۔ اسی لونڈے کو جو آج میرا دشمن بنا ہوا ہے چھاتی سے لگائے کیوں اوجھے، سیانے، ویدوں اور حکیموں کے پاس دوڑتا پھرا، خود کبھی اچھا نہیں کھایا، اچھا نہیں پہنا۔ کس کے لئے؟ کنجوسی کی، بے ایمانی کی خوشامد کی، اپنے ضمیر کی ہستیا کی کس کے لئے؟ جس کے لئے چوری کی وہی آج مجھے چور کہتا ہے؟"

سکھدا سر جھکائے روتی رہی۔

لالہ جی نے پھر کہا "میں جانتا ہوں جسے ایشور نے ہاتھ دئے ہیں وہ دوسروں کا محتاج نہیں رہتا۔ اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔ لیکن ماں باپ کی آرزو تو یہی ہوتی ہے کہ ان کی اولاد کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ جس طرح انھیں مرنا پڑے۔ جس طرح انھیں دھکے کھانے پڑے۔ جائز و ناجائز سب کچھ کرنا پڑے، وہی دقتیں اس کی اولاد کو نہ جھیلنی پڑیں۔ دنیا انھیں حریص، خود غرض اور بخیل کہتی ہے۔ ان کو پروا نہیں ہوتی۔ لیکن جب اپنی ہی اولاد اپنی تحقیر کرے تو سوچو بد نصیب باپ کے دل پر کیا گذرتی ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے ساری زندگی غارت ہو گئی جو شاندار عمارت ایک ایک اینٹ جوڑ کر کھڑی کی تھی، جس کے لئے کوار کی دھوپ اور ماگھ کی بارش برداشت کی وہ ڈھے گئی، زمین دوز ہو گئی اور اس کے اینٹ پتھر سامنے بکھرے پڑے ہیں۔ وہ گھر نہیں ڈھے گیا۔ وہ زندگی ڈھے گئی۔ ساری زندگی کی آرزوئیں ڈھے گئیں۔"

سکھدا نے بچے کو نینا کی گود سے لے کر سسر کی چارپائی پر سلا دیا اور پنکھا جھلنے لگی۔ بچے نے بڑی بڑی جاندار آنکھوں سے بوڑھے دادا کی مونچھیں

دیکھیں اور ان کے یہاں رہنے کی کوئی خاص ضرورت نہ دیکھ کر انھیں اکھاڑ پھینکنے کے لئے آمادہ ہو گیا۔ دونوں ہاتھوں سے مونچھیں پکڑ کر کھینچیں۔ لالہ جی نے سی سی تو کی لیکن بچے کو ہٹایا نہیں۔ ہنومان نے بھی اتنی بے رحمی سے لنکا کے باغچوں پر دست برد نہ کیا تھا۔ پھر بھی لالہ جی نے بچے کے ہاتھوں سے مونچھیں نہ چھڑائیں ان کی تمنائیں جو بے جان پڑی تھیں اس کشاکش سے گویا زندہ ہو گئیں۔ ان شریر انگلیوں میں کوئی ایسی دعا، کوئی ایسا اعجاز تھا! ان کے روئیں روئیں میں سمایا ہوا بچہ جیسے مٹھ جانے پر مکھن کی طرح صورت پذیر ہو گیا ہو۔

دو دن سکھدا اپنے نئے گھر نہ گئی۔ مگر امر کانت باپ کی پرسش کے لئے ایک دن بھی نہ آیا۔ سلوبھی سکھدا کے ساتھ چلی گئی تھی۔ شام کو آتا، روٹیاں پکاتا۔ کھاتا اور کانگریس کے دفتر یا نوجوان سبھا میں چلا جاتا۔ کبھی کسی عام جلسے میں بولتا، کبھی چندہ جمع کرتا۔

تیسرے دن لالہ جی اٹھ بیٹھے۔ سکھدا دن بھر تو ان کے پاس رہی۔ شام کے وقت اس نے جانے کی اجازت مانگی۔ لالہ جی نے پر محبت نظروں سے دیکھ کر کہا: "میں جانتا ہوں کہ تم میری تیمارداری ہی کے لئے آئی ہو تو دس پانچ دن اور پڑا رہتا ہوں، میں نے تو جان بوجھ کر کوئی خطا نہیں کی۔ لیکن کوئی خطا ہوئی ہو تو اسے معاف کرو۔" سکھدا کے جی میں آیا اپنی ضد ترک کر دے لیکن اتنی تکلیف اٹھانے کے بعد جب اس کی گرہستی کچھ کچھ جم چلی تھی۔ پھر یہاں لوٹ آنا کچھ اچھا نہ لگتا تھا۔ علاوہ بریں وہاں وہ خود مختار تھی۔ خانہ داری کا انتظام اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہاں کی ایک ایک چیز میں اپنا پن بھرا ہوا تھا۔ ایک ایک چیز پر اس کی کاوش اور جدت منقوش تھی۔ ایک ایک چیز پر اس کی شخصیت کی مہر لگی ہوئی تھی۔ یہاں کی کوئی چیز اس کے لئے غرور کا باعث نہ تھی۔ یہاں سب کچھ ہونے

پر بھی اس کے جذبہ اقتدار کو تسکین نہ ہوتی تھی۔ لیکن لالہ جی کو سمجھانے کے لئے کسی بہانے کی ضرورت تھی۔ بولی "یہ آپ کیا کہتے ہیں دادا۔ ہم لوگ آپ کے بچے ہیں، آپ ہمیں جو کچھ تعلیم یا نصیحت دیں گے وہ ہماری بھلائی کے لئے دیں گے میرا تو جی جانے کو بالکل نہیں چاہتا۔ لیکن تنہا میرے چلے آنے سے کیا ہوگا مجھے خود شرم آتی ہے کہ ہمیں الگ دیکھ کر دنیا کیا کہہ رہی ہوگی۔ جتنی جلد ہو سکے گا میں سب کو گھسیٹ لاؤں گی۔ جب تک آدمی کچھ دن ٹھوکریں نہیں کھا لیتا اُسے اپنے اوپر اعتبار نہیں ہوتا۔ آپ نے ایک طرح سے ہمیں ایک موقع عطا کر دیا میں ایک بار روز آکر آپ کا کھانا پکا جایا کروں گی۔ میں نہ آسکوں گی تو بی بی کو بھیج دوں گی"

اس دن سے سکھدا کا یہ معمول ہو گیا۔ وہ سویرے یہاں چلی آتی اور لالہ جی کا کھانا پکا کر لوٹ جاتی۔ پھر خود کھانا کھا کر مدرسے چلی جاتی۔ تیسرے پہر جب امرکانت کھادی بیچنے چلا جاتا تو وہ نینا کو لے کر پھر آجاتی۔ اس کی غیرت میں اب وہ جلن نہ تھی۔ وہ یہ نہ دیکھ سکتی تھی کہ اس کے رہتے بوڑھے باپ کو کوئی تکلیف ہو۔

ان دنوں اسے سب سے زیادہ جو بات کھٹکتی تھی وہ امرکانت کا سر پر کھادی لے کر چلنا تھا۔ وہ کئی بار اس معاملے پر اس سے جھگڑا کر چکی تھی۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ سمجھانے سے وہ اور ضد پکڑ لیتا ہے تو اس نے بولنا چھوڑ دیا مگر ایک دن گھر جاتے وقت اس نے امرکانت کو کھادی کا بقچہ لئے دیکھ لیا اس وقت محلے کی ایک عورت بھی اس کے ساتھ تھی۔ سکھدا گویا زمین میں گڑ گئی۔

امر جوں ہی گھر آیا، اس نے یہ معاملہ چھیڑ دیا "معلوم تو ہو گیا تم بڑے

غیرت دار ہو۔ دوسروں کے لئے بھی کچھ رہنے دو گے، یا سب اپنی ہی جیب میں رکھ لو گے۔ اب تو دنیا پر مشقت کی عظمت ظاہر ہو گئی۔ اب تو بقیہ لادنا چھوڑو تمھیں شرم نہ آتی ہو لیکن تمھاری عزت کے ساتھ ہماری عزت بھی تو بندھی ہوئی ہے۔ تمھیں کوئی حق نہیں کہ تم مجھے یوں ذلیل کرو۔"

امر تو کمر کسے تیار ہی تھا بولا "یہ تو میں جانتا ہوں کہ میرا کچھ اختیار نہیں ہے۔ لیکن کیا یہ پوچھ سکتا ہوں کہ تمھارے اختیاروں کی بھی کوئی حد ہے۔ یا ان کی کوئی حد ہی نہیں؟"

"میں ایسا کوئی کام نہیں کرتی جس میں تمھاری بدنامی ہو۔"

"اگر میں کہوں کہ جس طرح میرے مزدوری کرنے سے تمھاری توہین ہوتی ہے اسی طرح تمھاری نوکری کرنے سے میری توہین ہوتی ہے، تو شاید تمھیں یقین نہ آئے گا۔"

"تمھاری نیک نامی اور بدنامی کی ترازو ساری دنیا سے نرالی ہو تو میں ناچار ہوں۔"

"میں دنیا کا غلام نہیں ہوں۔ اگر تمھیں غلامی پسند ہے تو شوق سے کرو۔ تم مجھے مجبور نہیں کر سکتیں۔"

"نوکری نہ کروں تو تمھارے روپے بیس آنے روز میں کیا ہو گا۔"

"میرا خیال ہے کہ اس ملک میں نوے فیصدی آدمیوں کو اس سے بھی کم میں گذر کرنا پڑتا ہے۔"

"میں ان نوے فیصدی والوں میں نہیں۔ باقی دس فیصدی والوں میں ہوں۔ میں نے تم سے آخر بار کہہ دیا کہ تمھارا یہ بچے ڈھونا میرے لئے ناقابل برداشت ہے اور اگر تم نے نہ مانا تو میں اپنے ہاتھوں سے وہ بچہ زمین پر گرا دوں گی۔"

اس سے زیادہ میں تم سے کچھ کہنا سننا نہیں چاہتی۔"

ادھر ڈیڑھ مہینے سے امر کانت سکینہ کے گھر نہ گیا تھا۔ یاد تو اس کی روز آتی لیکن جانے کا موقع نہ ملتا۔ ایک عشرہ گذر جانے کے بعد اُسے شرم آنے لگی کہ وہ پوچھے گی اتنے دن کیوں نہیں آئے تو کیا جواب دوں گا۔ اس شرمساری میں وہ ایک مہینہ اور نہ گیا۔ یہاں تک کہ آج سکینہ نے اسے ایک کارڈ لکھ کر خیریت دریافت کی تھی اور بشرط فرصت اُسے دس منٹ کے لئے بلایا تھا۔ آج اماں جان برادری کی کسی تقریب میں جانے والی تھیں۔ بات چیت کرنے کا اچھا موقع تھا۔ ادھر امر کانت بھی اس زندگی سے اکتا گیا تھا۔ ان ڈیڑھ دو مہینوں میں اسے اس کا بھی کافی ثبوت مل چکا تھا کہ سکھدا کے ساتھ وہ کبھی خوش نہیں رہ سکتا یہ زندگی اسے قید سی معلوم ہوتی تھی۔ وہ جو کچھ ہے وہی رہے گا۔ اس کی فطرت میں زیادہ تغیر کی امید نہیں۔ سکھدا بھی جو کچھ ہے وہی رہے گی۔ اس کی فطرت بھی نہیں تبدیل کیجا سکتی، تو زندگی میں راحت کیسے نصیب ہو۔ دونوں کی زندگی کی رفتار الگ، نصب العین الگ، ارادے الگ، خواہشیں الگ محض رسوم اور ظاہر داریوں کی خاطر وہ اپنی زندگی خاک میں نہیں ملا سکتا، اپنی روحانی ترقی کو نہیں روک سکتا۔ حیات انسانی کا مقصد کچھ اور بھی ہے۔ محض کمانا کھانا اور مر جانا نہیں۔

وہ آج کھانا کھا کر کانگریس کے دفتر نہ گیا۔ آج اسے اپنی زندگی کے سب سے اہم مسئلے کو حل کرنا تھا۔ اسے اب زیادہ نہیں ٹال سکتا تھا بدنامی کی اسے کوئی فکر نہیں۔ دنیا اندھی ہے اور دوسروں کو اندھا بنائے رکھنا چاہتی ہے جو خود اپنے لئے نئی راہ نکالتا ہے اس پر دنیا کے تنگ خیال ہنستے ہیں تو کیا تعجب اس نے کھدر کی دو ساڑیاں اس کی نذر کرنے کے لئے نکال لیں اور پکا ہوا جا پہنچا

سکینہ اس کے انتظار میں تھی۔ کنڈی کھٹکتے ہی دروازہ کھولدیا اور اس کا ہاتھ پکڑکر بولی۔ "واہ بابوجی، تم تو مجھے بھول ہی گئے۔ اسی کا نام محبت ہے؟"

امر نے شرمندہ ہوکر کہا۔ "یہ بات نہیں ہے سکینہ، ایسا شاید ہی کوئی لمحہ گذرا ہو کہ تمھاری یاد نہ آئی ہو۔ لیکن ادھر بڑی پریشانیوں میں پھنسا رہا۔"

سکینہ نے دردمندانہ انداز سے کہا۔ "میں نے سنا تھا اماں جان کہتی تھیں، مجھے یقین نہ آتا تھا۔ تم سیٹھ جی سے کیسے علیحدہ ہوگئے۔ پھر یہ بھی سنا کہ تم سر پر کھدر لاد کر بیچتے ہو۔ میں ہوتی تو تمھیں کبھی سر پر بوجھ نہ لادنے دیتی میں وہ گٹھڑی اپنے سر پر رکھ لیتی اور تمھارے پیچھے پیچھے چلتی۔ میں یہاں آرام سے پڑی تھی اور تم اس کڑی دھوپ میں کپڑے لادے پھرتے تھے۔ میرا دل تڑپ کر رہ جاتا تھا۔"

کتنے پیارے، کتنے میٹھے الفاظ تھے، کتنے دلگداز، کتنے الفت میں ڈوبے ہوئے۔ سکھدا کی زبان سے بھی ایسے الفاظ کبھی نکل سکتے تھے وہ تو محض تحکم جتانا جانتی ہے۔ امرکانت کو اپنے اندر ایک ایسی طاقت کا احساس ہوا کہ اُس بچھے کا چوکنا بوجھ لے کر چل سکتا ہے۔ لیکن وہ سکینہ کے دل نازک کو چوٹ نہ پہنچائیگا آج سے وہ گٹھر لاد کر نہ چلے گا۔ بولا۔ دادا کی خودغرضی پر دل جل رہا تھا سکینہ وہ سمجھتے تھے میں ان کی دولت کا بھوکا ہوں۔ میں انھیں اور ان کے دوسرے مالدار بھائیوں کو دکھا دینا چاہتا ہوں کہ میں کڑی سے کڑی محنت کر سکتا ہوں اور کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا شرمناک سمجھتا ہوں۔ سکھدا اس دن میرے ساتھ چلی آئی تھی۔ لیکن ایک دن دادا نے جھوٹ موٹ کہلا دیا مجھے بخار آگیا ہے بس وہاں پہنچ گئیں۔ تب سے دونوں وقت ان کا کھانا پکانے جاتی ہیں۔"

سکینہ نے سادگی سے کہا۔ "تو کیا یہ بھی تمھیں بُرا لگتا ہے؟ بوڑھے آدمی

تنہا گھر میں پڑے رہتے ہیں، اگر بہو ان کا کھانا پکانے چلی جاتی ہیں تو کیا گناہ کرتی ہیں، ان کی اس حرکت سے تو میرے دل میں ان کی عزت ہو گئی۔"

امر نے خفیف ہو کر کہا "یہ شرافت نہیں ہے سکینہ، نہ انسانیت ہے، یہ ان کی دولت کی کشش ہے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں، جس نے کبھی مجھ سے جھوٹوں نہیں پوچھا کہ تمہاری طبیعت کیسی ہے وہ ان کی بیماری کی خبر پاتے ہی بیقرار ہو جائے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ ان کی دولت کی کشش ہے اور کوئی بات نہیں۔ میں اب اس تصنع کی زندگی سے تنگ آ گیا ہوں سکینہ، کبھی کبھی تو جی میں آتا ہے سب کو چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جاؤں۔ ایسی جگہ بھاگ جاؤں، جہاں لوگوں میں آدمیت ہو۔ تمہیں آج فیصلہ کرنا پڑے گا۔ چلو کہیں چھوٹی سی کٹیا بنا لیں اور خود غرضی کی دنیا سے الگ، محنت مزدوری کر کے زندگی بسر کریں۔ تمہیں اپنا رفیق زندگی بنا کر پھر مجھے کسی اور چیز کی آرزو نہ رہے گی۔ میری روح محبت کے لئے تڑپ رہی ہے اس محبت کے لئے جس میں دلسوزی ہے، دلدہی ہے اور دلداری ہے۔ میں بوتل کی سرخ شراب پینا چاہتا ہوں۔ شاعروں کی خیالی شراب نہیں۔"

اس نے سکینہ سے ہم آغوش ہونے کے لئے اپنی باہیں پھیلا دیں۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور پٹھانی اندر آئی۔ دونوں سمٹ کر ایک ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔ مگر خاموشی سے شبہہ کے اور پختہ ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ سکینہ سے تو کچھ نہ بن پڑا، امرکانت نے بات بنائی "آج تم کہاں گئی تھیں اماں، میں یہ ساڑیاں دینے آیا تھا۔ تمہیں یہ تو معلوم ہو گا ہی کہ میں آج کل کھدر بیچتا ہوں۔"

پٹھانی نے ساریوں کا جوڑا لینے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ اس کا سوکھا اور پچکا ہوا چہرہ تمتما اٹھا۔ ساری جھرّیاں گویا اندرونی حرارت سے تن اٹھیں آنکھیں نکال کر بولی "ہوش میں آ چھوکرے، یہ ساڑیاں لے جا۔ اپنی بی بی اور [illegible] کو

پہنا۔ یہاں تیری ساڑیوں کے بھوکے نہیں ہیں۔ تجھے شریف زادہ اور صاف دل سمجھ کر تجھ سے اپنی مصیبت کی داستان کہتی تھی۔ یہ نہ جانتی تھی کہ تو ایسے شریف باپ کا بیٹا ہو کر شہدا پن کریگا۔ بس اب منہ نہ کھولنا، چپ چاپ چلا جا، نہیں آنکھیں نکال لوں گی، تو ہے کس گھمنڈ میں۔ ابھی ایک اشارہ کر دوں تو سارا محلہ اکٹھا ہو جائے ہم غریب ہیں، مصیبت کے مارے ہیں، روٹیوں کو محتاج ہیں، جانتا ہے کیوں، اس لئے کہ ہمیں آبرو پیاری ہے۔ خبردار جو کبھی ادھر کا رُخ کیا۔"

امر کانت پر فالج گر گیا۔ بجلی گر پڑی۔ ان فقروں سے ہم اس کے جذبات دل کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ جن میں قوت فکر ہے، تخیل ہے، وہی اس کا کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔ وہ اس طرح ششدر رہ گیا گویا اس کے اعصاب کی حرکت بند ہو گئی۔ ایک منٹ تک وہ اسی عالم میں کھڑا رہا۔ پھر دونوں ساڑیاں اٹھالیں اور گولی کھائے ہوئے جانور کی طرح سر لٹکائے ہوئے لڑکھڑاتا ہوا دروازے کی طرف چلا۔ دفعتاً سکینہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے چھوڑے کہاں جاتے ہو امرؑ میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ جنھیں اپنی آبرو پیاری ہے وہ اپنی آبرو لے کر رہیں۔ میں بے آبرو ہی رہوں گی۔"

امر کانت نے ہاتھ چھڑا لیا اور آہستہ سے بولا۔ "زندہ رہیں گے تو پھر ملیں گے سکینہ، اس وقت جانے دو۔ میں اپنے ہوش میں نہیں ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے کچھ سمجھ کر دونوں ساڑیاں سکینہ کے ہاتھ پر رکھدیں اور باہر چلا گیا۔

سکینہ نے سسکیاں لیتے ہوئے پوچھا۔ "تو اب کب آؤ گے؟"

امر نے پیچھے پھر کہا۔ "جب یہاں مجھے لوگ شہدا اور کمینہ نہ سمجھیں گے۔"

امر چلا گیا اور سکینہ ہاتھ میں ساڑیاں لئے دروازے پر کھڑی فضائے تاریک

میں نکتی رہی۔

دفعتاً بڑھیا نے پکارا "اب آکر بیٹھے گی کہ دروازے ہی پر کھڑی رہے گی منہ تو کالا کرا ہی دیا۔ اب اور کیا کرنے پر تلی ہوئی ہے۔"

سکینہ نے آتشیں نظروں سے دیکھ کر کہا "اماں عاقبت سے ڈرو کیوں کسی بھلے آدمی پر تہمت لگاتی ہو، تمھیں ایسی بات منہ سے نکالتے شرم نہیں آتی ان کی نیکیوں کا یہ بدلا دیا ہے تم نے۔ تم دنیا میں چراغ لے کر ڈھونڈ آؤ ایسا شریف آدمی تمھیں نہ ملے گا۔"

پٹھانی نے ڈانٹ بتائی "چپ رہ بے حیا کہیں کی، شرماتی نہیں اوپر سے زبان چلاتی ہے، آج گھر میں کوئی مرد ہوتا تو سر کاٹ لیتا۔ میں ابھی جا کر لالہ سے کہتی ہوں۔ جب تک اس پاجی کو شہر سے نہ نکلوا دوں گی میرا کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوگا میں اس کی زندگی غارت کر دوں گی۔"

سکینہ نے بے باکانہ انداز میں کہا "اگر ان کی زندگی غارت ہوئی تو میری بھی زندگی غارت ہوگی۔ اتنا سمجھ لو۔"

سکینہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ بڑھیا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اتنی زور سے اپنی طرف کھینچا کہ وہ گرتے گرتے بچی اور اسی وقت گھر سے باہر نکل کر دروازے کی کنڈی لگا دی۔

سکینہ بار بار پکارتی رہی مگر بڑھیا نے پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھا۔ وہ بے جان بڑھیا جسے ایک ایک قدم رکھنا دشوار تھا۔ اس وقت مجنونانہ جوش کے ساتھ دوڑتی ہوئی لالہ سمرکانت کے پاس چلی جا رہی تھی۔

*

(۱۸)

امرکانت گلی کے باہر نکل کر سڑک پر آیا، کہاں جائے۔ پٹھانی اسی وقت دادا کے پاس جائے گی، ضرور جائے گی۔ کتنی قیامت برپا ہو گی، کیسا کہرام مچے گا کوئی دھرم کے نام پر رووے گا، کوئی خاندانی وقار کا ماتم کرے گا۔ دغا فریب، حرام کی کمائی جعل سب معاف ہو سکتا ہے۔ نہیں ان حرکتوں کی تعریف ہوتی ہے، ایسے ہی حضرات قوم کے پیشوا بنے ہوئے ہیں۔ عیاشوں اور نفس پرستوں کے سامنے لوگ سجدے کرتے ہیں۔ لیکن خلوص اور عقیدت کے ساتھ محبت کرنا قابل مذمت ہے، ناقابل معافی ہے، نہیں، امر اب گھر نہیں جا سکتا۔ گھر کے دروازے اس کے لئے بند ہیں۔ اور وہ گھر تھا ہی کب۔ محض کھانے اور سونے کی جگہ تھی۔ اس کا پرسان حال کون ہے۔

وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹک گیا۔ سکینہ اس کے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہے تو کیوں نہ اسے ساتھ لے لے۔ پھر لوگ جی بھر کر روئیں پیٹیں اور کوسیں۔ آخر یہی تو اس کا منشا رہا تھا۔ لیکن پہلے دور سے جو پہاڑ ٹیلہ سا نظر آتا تھا اب اسے سامنے دیکھ کر اس پر چڑھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ سارے ملک میں تہلکہ مچ جائے گا، ایک میونسپل کمشنر ایک مسلمان لڑکی کو لے کر بھاگ گیا۔ ہر ایک زبان پر یہی چرچے ہوں گے، دادا شاید زہر کھا لیں۔ مخالفوں کو تالیاں پیٹنے کا موقع مل جائے گا۔ اسے ٹولسٹائے کا ایک افسانہ یاد آیا جس میں ایک آدمی اپنی محبوبہ کو لے کر بھاگ جاتا ہے لیکن اس کا نتیجہ کتنا دلخراش ہوتا ہے۔ امر خود کسی کے متعلق ایسی خبر سنتا تو اس سے نفرت کرتا۔ نہیں اب وہ گھر نہیں جا سکتا۔

یکایک بچے کی یاد آ گئی، اس کی تاریک زندگی میں وہی ایک شمع تھی۔ اس کا

بے قرار دل اسی شمع کی طرف لپکا۔ بچے کی دلفریب صورت سامنے آکر کھڑی ہوگئی
کسی نے پکارا "امرکانت یہاں کیسے کھڑے ہو"؟

امر نے پیچھے پھر کر دیکھا تو سلیم۔ سلیم کا آنا اس وقت اُسے بُرا معلوم ہوا وہ کسی گوشے میں بیٹھ کر اپنے طرزِ عمل کا فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ بے رخی سے بولا۔ کچھ نہیں یوں ہی ایک ضرورت سے آگیا تھا۔ تم کدھر؟"

"ذرا چوک کی طرف گیا تھا۔ یہاں کیسے کھڑے ہو۔ کیا ادھر کا قصد ہے؟"

سلیم کے لہجے میں تمسخر کا پہلو تھا۔ امرکانت نے اس سے پیچھا چھڑانے کے ارادے سے کہا "یہ تو کوئی ایسی مذاق کی بات نہ تھی"۔

ان الفاظ میں مایوسی اور درد کا ایک دریا بھرا ہوا تھا۔ سلیم نے اس کے چہرے کی طرف پُرسوال نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "اور آپ کیا چاہتے ہیں؟ میں آپ کے ساتھ ہمدردی کروں"۔

امر اس کے ساتھ جانے کی خواہش نہ ہوتے ہوئے بھی اضطراری طور پر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ سلیم اس کی متفکر اور مغموم صورت دیکھ کر سمجھ گیا۔ آج ضرور کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آیا ہے۔ ہمدردانہ انداز سے بولا کیا مجھ سے بھی پردہ داری کی ضرورت ہے"

امرکانت کو اب اس کے لہجے میں ہمدردی کا احساس ہوا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں لیکن کچھ بول نہ سکا۔

سلیم نے محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "شاید تم سمجھتے ہو میں تمہارے اعتماد کے قابل نہیں ہوں؟"

"یہ تو میں نے کبھی نہیں کہا"۔

"دل میں تو سمجھتے ہو۔ حالانکہ مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی"۔

امر رقت آمیز لہجے میں بولا۔ "میں تم سے اس لئے کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ تم میرے

زخم پر مرہم رکھنے کے بجائے اس پر نمک چھڑکو گے اور اگر سننا ہی چاہتے ہو تو سنو، کہ آج وہ رازِ طشت از بام ہو گیا اور میرے لئے ڈوب مرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ پٹھانی اس وقت دادا کے پاس ہو گی اور واویلا مچ رہا ہو گا۔"

سلیم نے تشفی دیتے ہوئے کہا: "یہ تو کوئی ایسا سانحہ نہیں ہے جس کے لئے تم اس قدر مایوس ہو رہے ہو۔ چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ بڑھیا کو وہاں سے ذلیل کر کے نکلوانہ دوں تو کہنا۔ مگر یار ہو تم احمق پن اور کیا کہوں۔ بچھو کا منتر تو جانتے نہیں۔ سانپ کے منہ میں انگلی ڈالنے چلے۔ کہتا تھا ادھر زیادہ آیا جایا نہ کرو۔ آخر ہوئی وہی بات۔ خیریت ہوئی کہ بڑھیا نے محلے والوں سے فریاد نہیں کی ورنہ غضب ہو جاتا۔"

امر نے حقارت آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا: "ایسی نصیحتیں میں تمہیں بھی دے سکتا ہوں بھائی جان، مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ تم میرے دل کی حالت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ نہ جانے وہ کونسی قوت ہے جو مجھے اس وقت سنبھالے ہوئے ہے۔ ورنہ دل میں تو یہی آتا ہے کہ ساری دنیا سے الگ کسی گوشے میں جا بیٹھوں اور ایک دن فنا ہو جاؤں۔ مجھ میں اخلاقی جرات کی اس قدر کمی ہے یہ میں نے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ سکینہ میرے ساتھ آنے پر آمادہ تھی لیکن میری پست ہمتی نے ..... کیا کہوں۔"

"اس وقت میرے گھر چلو وہاں ڈاکٹر صاحب کو بلا لیں اور آپس میں کوئی مشورہ کریں۔ میرا خیال ہے کہ معاملہ اس قدر طول نہ کھینچے گا۔"

"مجھے تو خیال آتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب سے اس معاملے میں صلاح لینا بالکل فضول ہے جس نے اس کوچہ میں کبھی قدم ہی نہیں رکھا وہ اس معاملے میں کیا صلاح دے سکتا ہے۔ اصل میں میں بدنصیب ہوں، مجھے زندگی میں کبھی خوشی نصیب

نہیں ہوئی اور نہ شاید کبھی نصیب ہو گی۔ معلوم نہیں اس وقت اس کے دل پر کیا گذر رہی ہو گی۔ گود ڑ میں یہ لعل کہاں سے آ گیا یہ تو خدا ہی جانے لیکن میری غم نصیب زندگی میں وہی چند لمحے یادگار ہیں جو اس کے ساتھ گذرے۔ میری وحشت مجھے کدھر لیجائے گی کچھ کہہ نہیں سکتا۔ تم سے صرف اتنی التجا ہے کہ ہر ممکن صورت سے سکینہ کی امداد کرتے رہنا۔ اس وقت دل کی جو کیفیت ہے وہ بیان نہیں کر سکتا۔ نہیں جانتا زندہ رہوں گا یا مروں گا۔ کشتی پر بیٹھ گیا ہوں یہ کہاں جاتی ہے کچھ خبر نہیں۔ کب کہاں یہ ناؤ کنارے لگے گی، مجھے خبر نہیں۔ بہت ممکن ہے منجھدار ہی میں ڈوب جائے۔ اگر اس زندگی میں کوئی حقیقت نظر آئی تو یہ کہ دنیا میں کسی عادل اور رحیم خدا کا وجود نہیں۔ جو چیز جسے ملنی چاہئے اسے نہیں ملتی۔ اس کا الٹا ہی ہوتا ہے۔ ہم زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ہاتھ پاؤں نہیں ہلا سکتے ہمیں ایک چیز دیدی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے اس کے ساتھ تمہیں زندگی بھر نباہ کرنا ہو گا۔ ہمارا فرض ہے کہ اس چیز پر قناعت کریں۔ چاہے ہمیں اس سے نفرت ہی کیوں نہ ہو۔ اگر ہم اپنی زندگی کے لئے کوئی دوسری راہ نکالتے ہیں تو ہماری گردن پکڑ لیجاتی ہے ہمیں کچل دیا جاتا ہے۔ اسی کو دنیا انصاف کہتی ہے۔ کم سے کم میں اس دنیا میں رہنے کے قابل نہیں ہوں۔"

سلیم بولا: "تم لوگ بیٹھے بٹھائے اپنی جان کو زحمت میں ڈالنے کی تدبیریں سوچتے رہتے ہو۔ گویا زندگی ہزار دو ہزار سال کی ہے۔ گھر میں روپے بھرے ہوئے ہیں، سارا گھر تمہارے اوپر نثار ہونے کو تیار۔ پری جیسی بی بی۔ اور آپ ایک جولاہے کی لڑکی کے پیچھے گھر بار چھوڑے بھاگے جا رہے ہیں، زہر کھانے کو تیار ہیں۔ میں تو اسے جنون کہتا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ یہی تو ہو گا کہ تم دنیا میں کچھ نام کر جاؤ گے۔ میں یوں ہی گمنام پڑا رہوں گا۔ مگر انجام دونوں کا ایک ہے۔"

امر نے جواب دیا "جس طرح تمھاری زندگی گذری ہے اس طرح میری زندگی بھی گذرتی تو شاید میں بھی زندگی کو انھیں ظریفانہ نظروں سے دیکھتا۔ میں وہ درخت ہوں جسے کبھی پانی نہیں ملا۔ زندگی کی وہ عمر جب انسان کو محبت کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے بچپن ہے۔ اس وقت پودے کو تری مل جائے تو ہمیشہ کے لئے اس کی جڑیں مضبوط ہو جاتی ہیں۔ اس وقت خوراک نہ پاکر اس کی حیات کی نمی خشک ہو جاتی ہے۔ میری ماں کا اسی زمانے میں انتقال ہوا اور تب سے میری روح کو اس کی غذا میسر نہ ہوئی۔ وہی بھوک میری زندگی ہے۔ مجھے جہاں محبت کا ایک ریزہ بھی ملے گا میں بے اختیار اس کی طرف دوڑوں گا۔ یہ فطرت کا اٹل قانون ہے۔ اس کے لئے اگر کوئی مجھے خطاوار کہے تو کہے۔ میں اپنی خطا تسلیم نہیں کرتا۔"

باتیں کرتے کرتے سلیم کا مکان آگیا۔ سلیم نے کہا "کہ گھر سے قطع تعلق کر لینا تو اس مسئلے کو حل کرنا نہیں ہے۔"

امر اپنے خیالوں میں اس قدر محو تھا کہ شاید سلیم کے الفاظ اس کے کانوں تک پہنچے ہی نہیں۔ اسی رو میں بولا "یہاں اپنا کون بیٹھا ہوا ہے جسے میرا درد ہو۔ دادا کو میری پروا نہیں۔ شاید اور خوش ہوں کہ اچھا ہوا بلا ٹلی۔ سکھدا میری صورت سے بیزار ہے۔ میرے اور اس کے اصولوں میں کوئی مناسبت ہی نہیں۔ دو ستوں میں لے دے کے ایک تم ہو۔ تم سے کبھی کبھی ملاقات ہوتی رہے گی۔ ماں ہوتی تو شاید اس کی محبت مجھے کھینچ لاتی۔ تب میری زندگی کی یہ رفتار ہی کیوں ہوتی۔ دنیا میں سب سے بدنصیب وہ ہے جس کی ماں بچپن میں مر گئی ہو۔"

امر کانت ماں کو یاد کر کے رو پڑا۔ اسے اب عالم طفلی کے دن یاد آئے جب ماں اسے روتے دیکھ کر گود میں اٹھا لیتی تھی اور وہ ماں کے آنچل میں منہ

چھپا کر نہال ہو جاتا تھا۔

سلیم نے اندر جا کر چپکے سے اپنے نوکر کو لالہ سمرکانت کے پاس بھیجا کہ انھیں اپنے ساتھ لوا لائے۔ پھر باہر آ کر اس نے امرکانت کو باتوں میں لگایا۔ "لیکن تم نے یہ بھی سوچا ہے۔ تمھاری دیوی کا کیا حال ہوگا۔ مان لو وہ بھی اپنی دل بستگی کا کوئی انتظام کرلے۔ برا نہ ماننا۔"

امر نے اسے ان ہوئی بات سمجھتے ہوئے کہا۔ "ہندو عورت اتنی بے شرم نہیں ہوتی۔"

سلیم ہنسا۔ "بس آ گیا ہندوپن۔ ارے بھائی جان ان معاملات میں ہندو اور مسلمان کا کیا ذکر۔ اپنی اپنی طبیعت ہے۔ ہندوؤں میں بھی دیویاں ہیں، مسلمانوں میں بھی دیویاں ہیں، ہر جائیاں بھی دونوں ہی میں ہیں۔ پھر تمھاری بی بی تو نئے خیال کی عورت ہے۔ پڑھی لکھی آزاد خیال۔ سیر سپاٹے کرنے والی، سینما کی شوقین اور آرائش کی دلدادہ۔ ایسی عورت سے خدا کی پناہ۔ یہ یورپ کی برکت ہے آج کل کی دیویاں جو کچھ نہ کر گذریں وہ تھوڑا ہے۔ پہلے لونڈے پیش قدمی کیا کرتے تھے، مردوں کی طرف سے چھیڑ چھاڑ ہوا کرتی تھی۔ اب زمانہ بدل گیا ہے اب عورتوں کی طرف سے چھیڑ چھاڑ ہوتی ہے۔"

امرکانت بے شرمی سے بولا "اس کی فکر اسے ہو جسے زندگی میں کچھ آرام ہو۔ جو زندگی سے بیزار ہے اس کے لئے کیا فکر۔ جس کی خوشی ہو رہے جس کی خوشی ہو جائے۔ میں نہ کسی کا غلام ہوں نہ کسی کو اپنا غلام بنانا چاہتا ہوں۔"

سلیم نے قائل ہو کر کہا۔ "تو پھر حد ہو گئی۔ پھر کیوں نہ عورتوں کا مزاج آسمان پر چڑھ جائے۔ میرا خون تو اس خیال ہی سے ابل اٹھتا ہے۔ عورتوں اور مردوں کے مزاج میں، جسم کی بناوٹ میں، دل کے جذبات میں فرق ہے

عورت ایک کی ہو کر رہنے کے لئے بنائی گئی ہے۔ مرد آزاد رہنے کے لئے۔"

"یہ مردوں کی خود غرضی ہے۔"

"جی نہیں، یہ حیوانی زندگی کا اصول ہے۔"

بحث میں شائستگی نکلتی گئیں۔ شادی کا مسئلہ پیش ہوا۔ پھر بے کاری کے مسئلے پر غور ہونے لگا۔ اس کے بعد کھانا آ گیا۔ دونوں کھانے بیٹھے۔

ابھی دو چار ہی لقمے کھائے ہوں گے کہ ملازم نے لالہ سمرکانت کے آنے کی خبر دی۔ امرکانت جھٹ میز پر سے اٹھ بیٹھا، کلی کی، اپنی پلیٹ میز کے نیچے چھپا کر رکھ دی اور بولا۔ "انھیں کیسے معلوم ہوا میں یہاں ہوں؟"

سلیم مسکرا رہا تھا۔

امر نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔ "یہ تمھاری شرارت معلوم ہوتی ہے۔ اسی لئے تم مجھے یہاں لائے تھے۔ آخر کیا نتیجہ ہوا مفت کی ذلت ہوگی میری۔ مجھے ذلیل کرانے سے تمھیں کچھ مل جائے گا؟ میں اسے دوستی نہیں دشمنی کہتا ہوں۔"

سلیم کوئی جواب نہ دینے پایا تھا کہ لالہ سمرکانت نے کمرے میں قدم رکھا تینوں ایک منٹ تک خاموش کھڑے رہے۔ سلیم کو خیال آیا۔ شاید میری موجودگی اس خموشی کا باعث ہے۔ اس نے لالہ جی کو اس نظر سے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو، یہاں رہوں یا جاؤں؟ لالہ جی نے اس کے دل کی بات تاڑ کر کہا۔ نہیں تم سے کوئی بات پردہ کی نہیں ہے۔ ہماری اور حافظ جی کی پرانی دوستی ہے۔ میں سب کچھ سن چکا ہوں۔ للو پٹھانی میرے پاس آئی تھی۔ میں نے اسے بڑی بری طرح پھٹکارا۔ میں نے کہدیا مجھے تیری بات کا یقین نہیں آتا جس کی عورت کبھی کا

روپ ہو وہ کیوں کر چڑیلوں کے پیچھے اپنی عزت گنوائے گا۔ لیکن اگر کوئی بات ہے ہی تو اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ غلطی کس سے نہیں ہوتی۔ اپنی عمر میں ہم سبھوں نے بڑے بڑے تماشے کئے ہیں۔ بڑھیا کو دو چار سو روپے دے دئے جائیں گے۔ لڑکی کی کسی بھلے گھر میں شادی کر دی جائے گی، چلو قصہ تمام ہوا۔ تمھیں گھر سے بھاگنے کی کیا ضرورت ہے۔ میری پروا مت کرو لیکن تمھیں ایشور نے بال بچے دئے ہیں۔ سوچو تمھارے چلے جانے سے کتنی زندگیاں تباہ ہو جائیں گی۔ عورت تو عورت ہی ہے۔ بہن ہے رو رو کر مر جائے گی۔ رما دیوی بھی تمھیں لوگوں کی محبت سے یہاں پڑی ہوئی ہیں۔ جب تمھیں نہ رہو گے تو وہ سکھدا کو لے کر چلی جائیں گی۔ میرا گھر تباہ ہو جائے گا۔ بیٹا سلیم، میں کچھ برا تو نہیں کہہ رہا ہوں؟ جو کچھ ہو گیا ہو گیا۔ آئندہ کے لئے احتیاط رکھو۔ تم خود سمجھ دار ہو۔ میں تمھیں کیا سمجھاؤں۔ نفس کو زنجیروں سے باندھ کر رکھنا پڑتا ہے نہیں تو آدمی کو نہ جانے کہاں کہاں لئے پھرے۔ تمھیں ایشور نے سب کچھ دیا ہے۔ کچھ گھر کا کام دیکھو، کچھ باہر کا کام دیکھو۔ مارے مارے پھرنے سے کیا فائدہ۔"

امر اس طرح بیٹھا رہا گویا کوئی دیوانہ بک رہا ہے۔ آج تم ان میٹھی میٹھی باتوں سے مجھے فریب دینا چاہتے ہو۔ میری زندگی تمھیں نے برباد کی۔ تمھارے ہی ہاتھوں میری یہ حالت ہوئی۔ تم نے کبھی مجھے اپنے گھر کو گھر نہ سمجھنے دیا تم مجھے چکی کا بیل بنانا چاہتے ہو۔ امر اپنے باپ کا اتنا ادب نہ کرتا تھا جتنا ان سے دبتا تھا۔

جوں ہی لالہ جی خاموش ہوئے اس نے گستاخانہ لہجے میں کہا۔ "دادا آپ کے گھر میں میری اتنی عمر برباد ہو گئی۔ اب میں اسے اور برباد نہیں کرنا

چاہتا۔ آدمی کی زندگی کا منشا محض کھانا اور مرجانا نہیں ہے۔ نہ دولت کمانا ہی اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ میری حالت اب ناقابل برداشت ہو رہی ہے میں اب ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے جا رہا ہوں۔ جہاں مزدوری شرم کی چیز نہیں۔ جہاں عورت اپنے شوہر کو پستی اور زوال کی طرف نہیں لے جاتی۔ بلکہ اس کی زندگی کو مسرت سے معمور کرتی ہے۔ میں رسوم اور خاندانی وقار کا غلام بن کر نہیں رہنا چاہتا۔ آپ کے گھر میں مجھے ہمیشہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور اسی کشمکش میں میری زندگی ختم ہو جائے گی۔ آپ ٹھنڈے دل سے کہہ سکتے ہیں آپ کے گھر میں سکینہ کے لئے جگہ ہے۔"

لالہ جی نے پرخوف نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔ "کس صورت میں؟"

"میری بی بی کی صورت میں۔"

"نہیں، ایک بار نہیں اور سو بار نہیں۔"

"تو پھر میرے لئے بھی آپ کے گھر میں جگہ نہیں ہے۔"

"اور تو کچھ نہیں کہنا ہے؟"

"جی نہیں۔"

لالہ جی کرسی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھے، پھر پلٹ کر بولے، "بتا سکتے ہو کہاں جا رہے ہو؟"

"ابھی تک کچھ طے نہیں کر سکا۔"

"جاؤ ایشور تمہیں خوش رکھے۔ اگر کبھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے لکھنے میں تامل نہ کرنا۔"

"مجھے امید ہے کہ میں آپ کو کوئی تکلیف نہ دوں گا۔"

لالہ جی نے آب گوں نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "چلتے چلتے زخم پر نمک نہ چھڑکو"

دوسرا حصہ

(۱)

شمال کے کوہستانی سلسلوں کے بیچ میں ایک چھوٹا سا ہرا بھرا گاؤں ہے۔ سامنے گنگا کسی دوشیزہ کی طرح ہنستی، اچھلتی، ناچتی، گاتی چلی جا رہی ہے۔ گاؤں کے پیچھے ایک اونچا پہاڑ کسی بوڑھے جوگی کی طرح جٹا بڑھائے سیاہ، متین خیال میں محو کھڑا ہے۔ یہ موضع گویا اس کی طفلی کی یاد ہے۔ خوشیوں اور دلچسپیوں سے پُر۔ یا کوئی عالم شباب کا سنہرا خواب۔ اس گاؤں میں مشکل سے بیس پچیس جھونپڑے ہوں گے۔ پتھر کے ناہموار ٹکڑوں کو اوپر نیچے رکھ کر دیواریں بنالی گئی ہیں۔ ان پر چھپر ڈالدیے گئے ہیں۔ دروازوں پر بنکٹ کی ٹٹیاں ہیں۔ انھیں کابکوں میں اس گاؤں کی مخلوق اپنے گائے، بیل، بھیڑ اور بکریوں کو لئے خدا جانے کب سے آباد ہے۔

ایک دن شام کے وقت ایک سانولا سا لاغر اندام نوجوان، موٹا کرتا اونچی دھوتی اور چمردھے جوتے پہنے، کندھے پر لٹیا ڈور رکھے، بغل میں ایک بقچی دبائے اس گاؤں میں آیا اور ایک بڑھیا سے بولا، کیوں ماتا، یہاں ایک پردیسی کو رات بھر رہنے کا ٹھکانا مل جائے گا؟

بڑھیا سر پر لکڑی کا ایک گٹھار رکھے ایک بوڑھی گائے کو مرغزار کی طرف سے ہانکتی چلی آتی تھی۔ نوجوان کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پسینے میں تر، سر

اور منہ پر گرد جمی ہوئی، چہرے پر مایوسی، آنکھوں میں تشنگی، گویا زندگی میں کوئی جائے امن ڈھونڈھتا ہو۔ بولی "یہاں تو ریدا اس رہتے ہیں بھیا۔"

امرکانت اسی طرح مہینوں سے دیہاتوں کی خاک چھانتا چلا آرہا ہے اس اثنا میں سیکڑوں گاؤں کا دورہ کر لیا ہے۔ کتنے ہی آدمیوں سے اس کا ربط ضبط ہو گیا ہے کتنے ہی اس کے معاون اور کتنے ہی مداح بن گئے ہیں۔ شہر کا وہ نازک بدن نوجوان دبلا تو ہو گیا ہے لیکن دھوپ اور لو، آندھی اور مینہ، بھوک اور پیاس سہتے سہتے اس کی مردانگی گویا اندر سے نکل پڑی ہے۔ یہی اس کی آنے والی زندگی کی تیاری ہے۔ وہ دیہاتیوں کی سادگی اور نیک دلی، اُنس اور قناعت سے روز بروز متاثر ہوتا رہتا ہے۔ ایسے سیدھے سادے، بے لوث، آزاد منش آدمیوں پر آئے دن جو مظالم ہوتے رہتے ہیں ان نظاروں نے اس کے مزاج میں تلخی پیدا کر دی ہے۔ جس پرسکون زندگی کی امید اسے دیہاتوں کی طرف کھینچ لائی تھی۔ اس کا وہاں نام بھی نہ تھا ظلم اور بیداد کا راج تھا اور امر کی روح اس راج کے خلاف جھنڈا اٹھائے پھرتی تھی۔

امرکانت نے انکسار کے ساتھ کہا "میں ذات پات نہیں مانتا ماتا جی۔ جو سچا ہو وہ چمار بھی ہو تو عزت کے لائق ہے۔ جو دغاباز، جھوٹا اور مکار ہو وہ برہمن بھی ہو تو عزت کے لائق نہیں۔ لاؤ لکڑی کا گٹھا میں لیتا چلوں۔" اس نے بڑھیا کے سر سے لکڑی کا گٹھا اتار کر اپنے سر پر رکھ لیا۔

بڑھیا نے دعا دے کر پوچھا "کہاں جاؤ گے؟"

"یوں ہی مانگتا کھاتا چلا آتا ہوں۔ آنا جانا کہیں نہیں ہے۔ رات کو سونے کو تو جگہ مل جائے گی؟"

"جگہ کی کون کمی ہے بھیا۔ مندر کے چبوترے پر سو رہنا۔ کسی سادھو سنت کے بھیس میں تو نہیں پڑ گئے ہو؟ میرا ابھی ایک لڑکا ان کے جال میں پھنس گیا پھر کچھ پتہ نہ چلا، اب تک تو کئی لڑکوں کا باپ ہوتا۔"

دونوں گاؤں میں پہنچ گئے۔ بڑھیا نے اپنی جھونپڑی کی ٹٹی کھولتے ہوئے کہا "لاؤ لکڑی یہاں رکھدو۔ تھک گئے ہوگے، تھوڑا سا دودھ رکھا ہے پی لو، اور سب جانور تو مر گئے یہی گائے رہ گئی ہے۔ پاؤ بھر دودھ دیتی ہے کھانے کو تو پاتی نہیں دودھ کہاں سے دے۔ میرے گھر کا دودھ تو پی لوگے نہ؟"

امر ایسی مادرانہ محبت کے تبرک کو رد نہ کر سکا۔ بڑھیا کے ساتھ جھونپڑی میں گیا تو اس کا دل کانپ اٹھا۔ گویا افلاس چھاتی پیٹ پیٹ کر رو رہا ہو۔ اور ہمارا اونچا طبقہ عیش میں ڈوبا ہوا ہے۔ اُسے رہنے کو بنگلہ چاہیئے۔ کھانے کو نعمت اور پہننے کو ریشم۔ غریب فاقے کریں۔ وہ دولت کے انبار لگائے گا۔ تکلفات میں دو پیسے اُڑائے گا، ایسی دنیا غارت کیوں نہیں ہو جاتی۔

بڑھیا نے ایک پیتل کے کٹورے میں دودھ انڈیل دیا اور آپ گھڑا اٹھا کر پانی لانے چلی۔ امر نے کہا "میں کھینچے لاتا ہوں ماتا، رسی تو کنوئیں پر ہوگی؟"

"نہیں بیٹا، تم کہاں جاؤ گے پانی بھرنے۔ ایک رات کے لئے آ گئے تو میں تم سے پانی بھروا ؤں؟"

بڑھیا ہائیں ہائیں کہتی رہ گئی۔ امر کانت نے گھڑا اس کے ہاتھ سے لے لیا اور کنوئیں پر جا پہنچا۔ بڑھیا بھی محبت کی زنجیر میں بندھی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے گئی۔

کنوئیں پر کئی عورتیں پانی کھینچ رہی تھیں۔ امرکانت کو دیکھ کر ایک حسینہ نے پوچھا "کوئی مہمان ہیں کیا سلونی کاکی؟"

بڑھیا نہال ہو کر بولی "مہمان نہ ہوتے تو پانی بھرنے کیسے آتے، تیرے گھر بھی ایسے مہمان آتے ہیں؟"

حسینہ نے ترچھی نظروں سے امر کو دیکھ کر کہا "ہمارے مہمان تو اپنے ہاتھ سے پانی بھی نہیں پیتے کاکی۔ ایسے بھولے بھالے مہمان کو تو میں اپنے گھر لے جاؤں گی۔"

امرکانت کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ یہ حسینہ وہی منی تھی جو خون کے مقدمے میں بری ہو گئی تھی۔ وہ اتنی لاغر اندام، اتنی مغموم نہیں نظر آتی۔ اس کا حسن شگفتہ ہو گیا ہے اور جسم میں ایک دلکش تناسب پیدا ہو گیا ہے مسرت ہی زندگی کی حقیقت ہے۔ وہ ماضی کی پروا نہیں کرتا۔

لیکن شاید منی نے امرکانت کو نہیں پہچانا۔ اس کی صورت اتنی تبدیل ہو گئی تھی۔ چہرے پر نفاست کی جگہ مزدوروں کی سی بیکسی چھائی ہوئی تھی۔

امر نے جھینپتے ہوئے کہا "میں مہمان نہیں ہوں دیوی، پردیسی ہوں، آج اس گاؤں میں آ نکلا۔ اس رشتے سے گاؤں بھر کا مہمان ہوں۔"

حسینہ نے مسکرا کر کہا "تب ایک دو گھڑوں سے گلا نہ چھوٹے گا۔ دو سو گھڑے بھرنے پڑیں گے۔ نہیں تو گھڑا ادھر بڑھا دو۔ جھوٹ تو نہیں کہتی کاکی؟"

اس نے امرکانت کے ہاتھ سے گھڑا لے لیا اور جھٹ پھندا لگا، کنوئیں میں ڈال، بات کی بات میں گھڑا کھینچ لیا۔

امرکانت گھڑا لے کر چلا گیا تو منی نے سلونی سے کہا "کیسی بھلے گھر کا آدمی ہے کاکی، دیکھا کتنا شرماتا تھا۔ میرے یہاں سے اچار منگوا بھیجو۔ آٹا واٹا

تو ہے ؟

سلونی نے کہا "باجرے کا ہے، گیہوں کہاں سے لاتی۔"

" تو میں آٹا لئے آتی ہوں۔ نہیں چلو دے دوں۔ وہاں کام دھندے میں پھنس جاؤ گی تو بھول جاؤں گی۔"

تین سال قبل منی کو گاؤں کے کھیا کا لڑکا ہردوار سے لایا تھا۔ تین ہفتے سے ایک دھرم شالا کے دروازے پر خستہ حال پڑی ہوئی تھی۔ بڑے بڑے آدمی دھرم شالے میں آتے تھے۔ سینکڑوں ہزاروں خیرات کرتے تھے پر اس بیکس پر کسی کو رحم نہ آتا تھا۔ کھیا کا جوان لڑکا جوتے بیچنے گیا تھا۔ اسے دیکھ کر اُسے رحم آ گیا۔ گاڑی پر لاد کر گھر لایا۔ دوا دارو ہونے لگی۔ چودھری بگڑے یہ مردہ کیوں لایا۔ مگر وہ نوجوان شب و روز دوڑ دھوپ کرتا رہا۔ وہاں ڈاکٹر وید کہاں تھے۔ بھبوت اور دعا کا بھروسہ تھا۔ ایک اوجھے کی تعریف سنی مردوں کو جلا دیتا ہے۔ رات کو اسے بلانے چلا۔ چودھری نے کہا دن ہوتے دو تب جانا۔ نوجوان نے نہ مانا۔ رات ہی کو چل دیا۔ گنگا بڑھی ہوئی تھی اس کو پار کر کے جانا تھا۔ سوچا تیر کر نکل جاؤں گا۔ کون بہت چوڑا پاٹ ہے سینکڑوں ہی بار اسی طرح آ جا چکا تھا۔ بے خوف پانی میں دھس پڑا مگر لہریں تیز تھیں پاؤں اکھڑ گئے۔ دوسرے دن دو کوس پر اس کی لاش ملی۔ ایک چٹان سے چمٹی پڑی تھی۔ اس کے مرتے ہی منی جی اٹھی اور تب سے یہیں ہے یہاں اس کی قدر ہے، عزت ہے۔ یہی اس کا گھر ہے۔ وہ اپنی ذات بھول گئی، وہ طور طریق بھول گئی اور اونچی ذات کی ٹھکرائن اچھوتوں کے ساتھ اچھوت بن کر یہاں آرام سے رہنے لگی۔ وہ گھر کی مالکن تھی۔ باہر کا سارا کام وہ کرتی۔ رسوئیں، پانی، کوٹنا پیسنا اس کی دونوں دیورانیوں

کے سپرد تھا۔ وہ اب غیر نہ تھی۔ چودھری کی بڑی بہو ہو گئی تھی۔

سلونی کو لیجا کر منی نے ایک تھال میں آٹا، اچار اور دہی رکھ کر دیا۔ مگر سلونی کو یہ تھال لے کر گھر میں جاتے شرم آتی تھی۔ وہاں دروازے پر بیٹھا ہوا وہ سوچیگا اس کے گھر میں آٹا تک نہیں ہے۔ ذرا اور اندھیرا ہو جائے تو جاؤں

منی نے پوچھا "کیا سوچتی ہو کا کی؟"

"سوچتی ہوں ذرا اور اندھیرا ہو جائے تو جاؤں۔ اپنے من میں کیا کہیگا۔"

"چلو میں پہنچا دیتی ہوں۔ کہے گا گیا۔ کیا سمجھتا ہے یہاں دھنا سیٹھ بستے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں وہ باجرے کی ہی روٹیاں کھائے گا۔ گیہوں کی چھوئے گا بھی نہیں۔"

دونوں پہنچیں تو دیکھا امر دروازے پر جھاڑو دے رہا ہے۔ وہاں مہینوں سے جھاڑو نہیں دی گئی تھی۔ زمین ایسی معلوم ہونے لگی تھی۔ گویا ایسے بکھرے بالوں میں کنگھی کر دی گئی ہو۔

سلونی تھالی لے کر جلدی سے اندر چلی گئی۔ منی نے کہا "اگر ایسی مہمانی کرو گے تو یہاں سے کبھی نہ جانے پاؤ گے۔" اس نے امر کے پاس جا کر اس کے ہاتھ سے جھاڑو چھین لی۔ امر نے کوڑے کو پیروں سے ایک جگہ بٹور کر کہا۔ "دیکھو تو کیسا اچھا لگنے لگا۔"

"کل چلے جاؤ گے تو یہ باتیں یاد آئیں گی۔ پردیسی کا کیا اعتبار پھر ادھر کیوں آنے لگے۔"

منی کا چہرہ اداس ہو گیا۔ امر نے پرخلوص لہجے میں کہا "جب کبھی ادھر آنا ہو گا تو تمہارا درشن کرنے ضرور آؤں گا۔ ایسا خوبصورت گاؤں میں نے نہیں دیکھا۔ ندی، پہاڑ، جنگل اس کا تو سماں ہی نرالا ہے۔ جی چاہتا ہے یہیں

رہ جاؤں اور کہیں جانے کا نام نہ لوں۔"

منی نے اشتیاق سے کہا "تو رہ کیوں نہیں جاتے۔"

مگر پھر کچھ سوچ کر بولی "تمہارے گھر میں اور لوگ بھی تو ہوں گے وہ تمہیں یہاں کیوں رہنے دیں گے؟"

"میرے گھر میں ایسا کوئی نہیں ہے جسے میرے مرنے جینے کا غم ہو۔ میں دنیا میں بالکل اکیلا ہوں۔"

منی مصر ہو کر بولی "تو یہیں رہ جاؤ۔ کون بھائی ہو تم؟"

"یہ تو میں بالکل بھول گیا۔ جو بلا کر پریم سے ایک روٹی کھلا دے وہی میرا بھائی ہے۔"

"تو کل مجھے آ لینے دینا تب جانا، ایسا نہ ہو چپکے سے بھاگ جاؤ۔"

امرکانت جھونپڑی میں آ کر دیکھا تو بڑھیا چولھا جلا رہی تھی۔ گیلی لکڑی سے چولھا نہ جلتا تھا، پوپلے منہ میں پھونک بھی نہ تھی۔ امر کو دیکھ کر بولی "تم یہاں دھوئیں میں کہاں آ گئے بیٹا۔ جا کر باہر بیٹھو، یہ چٹائی اٹھا لیجاؤ۔"

امر نے چولھے کے پاس جا کر کہا "تم ہٹ جاؤ میں آگ جلائے دیتا ہوں۔"

سلونی نے محبت آمیز سختی سے کہا "تو باہر کیوں نہیں جاتا بھائی، مردوں کا تو اس طرح رسوئیں میں گھسنا اچھا نہیں لگتا۔" بڑھیا ڈر رہی تھی کہ کہیں امرکانت دو قسم کے آٹے نہ دیکھ لے۔ شاید اسے دکھانا چاہتی تھی کہ میں بھی گیہوں کا آٹا کھاتی ہوں۔ امر یہ راز کیا سمجھے۔ بولا "اچھا تو آٹا نکالدے میں گوندھ دوں۔"

سلونی نے حیران ہو کر کہا "تو کیسا لڑکا ہے، بھائی جا کر باہر کیوں نہیں بیٹھتا۔"

اُسے اپنے وہ دن یاد آئے جب اسے اپنے بچے اماں اماں کہہ کر گھیر لیتے تھے۔ اس اجڑے ہوئے گھر میں آج کتنے دنوں کے بعد دیا جلا تھا مگر کل

پھر وہی اندھیرا ہو جائے گا، وہی سناٹا۔ نہ جانے کیوں امر کانت کی طرف اس کی طبیعت مائل ہو رہی تھی۔ کون جانے کہاں سے آیا ہے۔ کہاں جائے گا۔ مگر یہ جانتے ہوئے بھی وہ امر کو پیار کر رہی تھی۔ شاید اس کی طفلانہ حرکتیں۔ بار بار گھر میں آنا اور ہر ایک کام میں دخل دینا۔ اس کے مادرانہ جذبات کو جو مدتوں سے خشک ہو گئے تھے سینچتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ گویا اپنے ہی بچوں کی آوازیں خاموشی کی اتھاہ گہرائیوں سے اس کے کانوں میں آ رہی ہیں۔

ایک لڑکا لالٹین لئے، ایک دری کندھے پر رکھے آیا اور دونوں چیزیں اس کے پاس رکھ کر بیٹھ گیا۔

امر نے پوچھا "دری کہاں سے لائے؟"

"کاکی نے تمہارے لئے بھیجا ہے، وہی کاکی جو ابھی آئی تھیں۔"

امر نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا "اچھا تم ان کے بھتیجے ہو، تمہاری کاکی تم کو مارتی تو نہیں؟"

لڑکے نے سر ہلا کر کہا "کبھی نہیں، وہ تو ہمیں کھلاتی ہے، درجن کو نہیں کھلاتی، وہ بڑا بدمعاش ہے۔"

امر نے مسکرا کر پوچھا "کہیں پڑھنے جاتے ہو؟" لڑکے نے نیچے کا ہونٹ سکوڑ کر کہا کہاں جائیں۔ ہمیں کون پڑھائے۔ مدرسے میں تو کوئی جانے نہیں دیتا ایک دن دادا ہم دونوں کو لے کر گئے تھے۔ پنڈت جی نے نام لکھ لیا مگر ہمیں سب سے الگ بٹھاتے تھے۔ سب لڑکے ہمیں چمار چمار کہہ کر چڑھاتے تھے دادا نے نام کٹا لیا۔"

امر کی خواہش ہوئی کہ چودھری سے جا کر ملے، کوئی خوددار آدمی معلوم ہوتا ہے۔ پوچھا "تمہارے دادا کیا کر رہے ہیں؟"

بچے نے لالٹین سے کھیلتے ہوئے کہا: "بوتل لئے ہوئے بیٹھے ہیں، بھنے چنے رکھے ہیں، بس ابھی بک جھک کریں گے۔ خوب چلائیں گے، کسی کو ماریں گے، کسی کو گالیاں دیں گے۔ دن بھر کچھ نہیں بولتے۔ جہاں بوتل چڑھائی کہ بک چلی۔"

امر نے اس وقت ان سے ملنا مناسب نہ سمجھا۔

سلونی نے پکارا "بھیا، روٹی تیار ہے۔ آؤ گرم گرم کھا لو۔"

امر کانت نے ہاتھ دھوئے اور اندر پہنچا۔ پیتل کی تھالی میں روٹیاں تھیں۔ پتھر کی پیالی میں دہی، پتے پر اچار، لوٹے میں پانی رکھا ہوا تھا۔ تھالی پر بیٹھ کر بولا "تم بھی کیوں نہیں کھاتیں؟"

"تم کھا لو بیٹا، میں پھر کھا لوں گی۔"

"نہیں یہ نہ ہوگا۔ میرے ساتھ کھا لو۔"

"رسوئیں جھوٹی ہو جائے گی کہ نہیں۔"

"ہو جانے دو، میں ہی تو کھانے والا ہوں۔"

"رسوئیں میں بھگوان رہتے ہیں، اُسے جھوٹا نہیں کرنا چاہیے۔"

"تو میں نہ کھاؤں گا۔"

"بھائی تو تو بڑا خراب لڑکا ہے۔"

رسوئیں میں دوسری تھالی کہاں تھی۔ سلونی نے ہتھیلی پر باجرے کی روٹیاں لے لیں اور رسوئیں کے باہر نکل آئی۔ امر نے باجرے کی روٹیاں دیکھ لیں۔ بولا "یہ نہ ہوگا کاکی مجھے تو پھلکے دے دے اور آپ مزے دار روٹیاں اڑا رہی ہو۔"

"تو کیا کھائے گا باجرے کی روٹیاں۔ ایک دن کے لئے آپڑا تو باجرے کی روٹیاں کھلاؤں؟"

"میں تو مہمان نہیں ہوں۔ یہی سمجھ لو کہ تمہارا کوئی کھویا ہوا لڑکا آگیا ہے۔"

"پہلے دن اس لڑکے کی بھی مہمانی کیجاتی ہے۔ مگر یہاں کاہے کی مہمانی نہ دارو نہ سکار۔"

"میں تو دارو سکار چھوتا ہی نہیں۔"

امرکانت نے باجرے کی روٹیوں کے لئے زیادہ اصرار نہ کیا۔ بڑھیا کو بخ ہوتا۔ بڑھیا بولی "اس عمر میں تو بھگتی اچھی نہیں لگتی بیٹا۔ یہی تو کھانے پینے کے دن ہیں۔ بھگتی تو بڑھاپے میں اچھی لگتی ہے۔"

"بھگت نہیں ہوں کاکی۔ میرا من ہی نہیں چاہتا۔"

"ماں باپ بھگت رہے ہوں گے؟"

"ہاں وہ دونوں جنے بھگت تھے۔"

امر نے چند لفظوں میں اپنا قصہ کہہ سنایا۔ بڑھیا نے پوچھا تو گھر سے روٹھ کر آئے ہو؟

"ایک بات پر دادا سے تکرار ہو گئی، میں چلا آیا۔"

"گھر والی تو رو رو کر مری جاتی ہوگی؟ کبھی اسے چٹھی پتر لکھتے ہو؟"

"اُسے میری پروا نہیں ہے کاکی، بڑے گھر کی لڑکی ہے، اپنے عیش و آرام میں مگن ہے میں کہتا ہوں چل کسی گاؤں میں کھیتی باڑی کریں۔ اسے شہر اچھا لگتا ہے۔"

امرکانت نے کھانا کھا چکنے کے بعد اپنی تھالی اٹھالی اور باہر آکر مانجنے لگا سلونی بھی پیچھے پیچھے آکر بولی "تمہاری تھالی میں مانج دیتی تو چھوٹی ہو جاتی؟"

امر نے ہنس کر کہا "تو کیا میں اپنی تھالی مانج کر چھوٹا ہو جاؤں گا؟"

"یہ تو اچھا نہیں لگتا کہ ایک دن کے لئے کوئی آئے تو تھالی مانجنے لگے اپنے

من میں سوچتے ہوگے کہاں اس بھکارن کے گھر میں ٹھہرے "
امرکانت کو ناگوار نہ گذرے اس لئے مسکرائی۔
امر کو بھکارن کی بے لوث پاکیزہ محبت میں جو راحت ملی وہ ماں کی گود کے سوا اور کہیں نہیں ملی تھی کاکی "
اس نے تھالی دھو دھا کر رکھدی، دری بچھا کر زمین پر لیٹنے ہی والا تھا کہ پندرہ بیس لڑکوں کی ایک جماعت آکر کھڑی ہوگئی۔ دو تین لڑکوں کے سوا اور کسی کے جسم پر ثابت کپڑے نہ تھے۔ امرکانت اٹھ بیٹھا گویا کوئی تماشا ہونے والا ہے۔
جو لڑکا ابھی دری لے کر آیا تھا، بولا "اتنے لڑکے ہیں ہمارے گاؤں میں، دو تین لڑکے نہیں آئے، کہتے ہیں وہ کان کاٹ لیں گے "
امرکانت نے اٹھ کر ان سبھوں کو ایک قطار میں کھڑا کیا اور ایک ایک کر کے نام پوچھا، پھر بولا "تم میں سے جو جو لڑکے روز ہاتھ منہ دھوتے ہوں اپنے ہاتھ اٹھائیں "
کسی لڑکے نے ہاتھ نہ اٹھایا۔ شاید یہ سوال ہی ان کی سمجھ میں نہ آیا۔
امر نے تعجب کا اظہار کر کے کہا "کیا تم میں سے کوئی روز ہاتھ منہ نہیں دھوتا ؟"
سبھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، دری والے لڑکے نے ہاتھ اٹھا دیا۔ اسے دیکھتے ہی دوسروں نے بھی ہاتھ اٹھا دیا۔
امر نے پھر پوچھا تم میں سے کون کون لڑکے روز نہاتے ہیں، ہاتھ اٹھائیں
اب کی بار پہلے کسی نے ہاتھ نہ اٹھایا۔ پھر ایک ایک کر کے سبھوں نے ہاتھ اٹھا دیا۔ اس لئے نہیں کہ سبھی روز نہاتے تھے بلکہ اس لئے کہ وہ دوسرے

سے گھٹ کر نہ رہے۔

سلونی کھڑی تھی۔ بولی "تو تو مہینے میں ایک بار بھی نہیں نہاتا رے جنگی، تو کیوں ہاتھ اٹھائے ہوسے ہے؟"

جنگی نے خفیف ہو کر کہا "تو گڈری کون روز نہاتے ہیں؟"

سبھی ایک دوسرے کی قلعی کھولنے لگے۔

امر نے ڈانٹا "اچھا آپس میں لڑو مت، میں ایک بات پوچھتا ہوں اس کا جواب دو۔ روز ہاتھ منہ دھونا اچھی بات ہے یا نہیں؟"

سبھوں نے کہا "اچھی بات ہے۔"

"اور نہانا؟"

سبھوں نے کہا "اچھی بات ہے۔"

"بس جاؤ میں دس پانچ دن میں پھر آؤں گا اور دیکھوں گا کہ کون کون سے لڑکے صفائی سے رہتے ہیں۔"

لڑکے چلے گئے تو امر لیٹا۔ تین مہینے کی متواتر بادیہ پیمائی سے اس کی طبیعت بیزار ہو گئی تھی۔ سکون کے لئے طبیعت بے قرار تھی۔ کیوں نہ وہ اسی گاؤں میں سکونت اختیار کرلے۔ یہاں اسے کون جانتا ہے؟ اور بس ایک لمحے میں یہیں اس کا ایک چھوٹا سا گھر بن گیا۔ سکینہ اس گھر میں آ گئی، گائے بیل بھی آئے اور آخر میں نیند بھی آ گئی۔

(۲)

امر کانت سویرے اٹھا۔ منہ ہاتھ دھو کر گنگا اشنان کیا اور چودھری سے ملنے چلا۔ چودھری کا نام گوڈر تھا۔ اس گاؤں میں کوئی زمیندار نہ رہتا تھا۔ گوڈر

کا دروازہ ہی چوپال کا کام دیتا تھا۔ امر نے دیکھا نیم کے درخت کے نیچے تخت پڑا ہوا ہے۔ دو تین بانس کی چارپائیاں، دو تین پیال کے گدے۔ گوڈر کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی۔ مگر ابھی ٹانٹا تھا۔ اس کے سامنے اس کا بڑا لڑکا پیاک بیٹھا جوتا سی رہا تھا۔ دوسرا لڑکا کاشی بیلوں کو سانی پانی کر رہا تھا۔ منی گوبر لگانے گئی تھی تیجا اور درجن دونوں دوڑ دوڑ کر کنوئیں سے پانی لا رہے تھے۔ ذرا پورب کی طرف ہٹ کر دو عورتیں برتن مانج رہی تھیں۔ یہ دونوں گوڈر کی بہوئیں تھیں۔

امر نے چودھری کو رام رام کیا اور پیال کی گدی پر بیٹھ گیا۔ چودھری نے پدرانہ شفقت سے اس کی آؤ بھگت کی "مزے میں بیٹھو بھیا، منی نے رات ہی کہا تھا۔ دو چار دن رہو پھر چلے جانا۔ منی تو کہتی تھی، تم کو کوئی کام مل جائے تو یہیں ٹک جاؤ گے۔"

امر نے شرماتے ہوئے کہا "ہاں کچھ ارادہ تو ایسا ہی ہے۔"

گوڈر نے ناریل سے دھواں نکال کر کہا "کام کی کون کمی ہے۔ گھاس ہی کر لو تو روپے روز کی مجوری ہو جائے۔ نہیں جوتے کا کام ہے۔ تلیاں بناؤ اچرسے بناؤ۔ محنت کرنے والا آدمی بھوکوں نہیں مرتا۔ دھیلی کی مجوری کہیں نہیں گئی ہے۔"

یہ دیکھ کر امر کو ان دونوں میں کوئی تجویز پسند نہیں آئی۔ اس نے ایک تیسری تجویز پیش کی "کھیتی باڑی کی مرضی ہو تو کھیتی کر لو۔ سلونی بھابی کے کھیت ہیں تب تک وہی جوتو۔"

بیاگ نے سوا چلاتے ہوئے کہا۔ کھیتی کے جھنجھٹ میں نہ پڑنا بھیا، چاہے کھیتی میں کچھ ہو یا نہ ہو لگان جرور دو۔ کبھی اولا پالا، کبھی سوکھا بوڑا ایک نہ ایک بلا سر پر سوار رہتی ہے۔ کہیں بیل مر گیا یا کھلیان میں آگ لگ گئی تو سب سوا ہا گھاس

سب سے اچھی نہ کسی کے نوکر نہ چاکر، نہ کسی کا لینا نہ دینا۔ سویرے کھرپی اٹھائی اور دوپہر تک لوٹ آئے۔"

کاشی بولا "مجوری مجوری ہے اور کسانی کسانی ہے۔ مجور لاکھ ہو تو مجور ہی کہلائے گا۔ سر پر گھاس لئے چلے جا رہے ہیں۔ کوئی ادھر سے پکارتا ہے او گھاس والے، کوئی ادھر سے۔ کسی کی مینڈ پر گھاس کر لو تو گالیاں ملیں۔ کسانی میں مرجاؤ ہے۔"

پاک کا سوا چلنا بند ہو گیا "مرجاوے کے چاؤ۔ ادھر ادھر سے کما کر لاؤ وہ بھی کھیتی میں جھونک دو۔"

چودھری نے فیصلہ کیا "گھاٹا نفع تو ہر روزگار میں ہے بھیا۔ بڑے بڑے سیٹھوں کا دیوالہ نکل جاتا ہے کھیتی کے برابر کوئی روجگار نہیں جو کمائی اور تقدیر اچھی ہو۔ تمہارے یہاں بھی بنجر بنجرانے کا یہی حال ہے بیٹا؟" امر بولا "ہاں دادا، سبھی جگہ یہی حال ہے۔ سبھی غریبوں کا لہو چوستے ہیں۔"

چودھری نے شک کا سہارا لیا "بھگوان نے چھوٹے بڑے کا فرق کیوں لگا دیا اس کا بھید سمجھ میں نہیں آتا۔ ان کے تو سبھی لڑکے ہیں تو سب کو ایک آنکھ کیوں نہیں دیکھتا۔"

پاک نے اس شک کا ازالہ کیا "پچھلے جنم کا پھل ہے۔ جس نے جیسے کرم کئے ویسے پھل پا رہا ہے۔" چودھری نے اس کی تردید کی "یہ سب من کو سمجھانے کی باتیں ہیں بیٹا، جس میں غریبوں کے آنسو پونچھے جائیں۔ لوگ سمجھتے رہیں کہ بھگوان نے ہم کو غریب بنا دیا تو آدمی کیا کرے۔ مگر یہ کوئی انصاف نہیں ہے کہ ہمارے بال بچے تک کام میں لگے رہیں اور پھر پیٹ بھر کھانا نہ ملے۔ اور ایک ایک پسر کو دس دس ہجار کی طلب ملے۔ دس تو ڑے روپئے ہوتے گدھے

سے بھی نہ اٹھیں۔"

امر نے مسکرا کر کہا۔"تم تو دادا ناستک (منکر) ہو۔"

چودھری نے عاجزی سے کہا۔"بیٹا چاہے ناستک کہو چاہے مورکھ مگر دل پر چوٹ لگتی ہے تو منہ سے آہ نکلتی ہے۔ تم تو پڑھے لکھے ہو گے؟"

"ہاں کچھ پڑھا تو ہے۔"

"انگریجی تو نہ پڑھی ہو گی؟"

"نہیں کچھ انگریزی بھی پڑھی ہے۔"

چودھری خوش ہو کر بولا۔"تب تو بھیا ہم تمہیں نہ جانے دیں گے، بال بچوں کو بلا لو اور یہیں رہو۔ ہمارے بال بچے بھی کچھ پڑھ جائیں گے۔ پھر شہر بھیجدیں گے۔ وہاں جات برادری کون پوچھتا ہے۔ کہدیں گے ہم چھتری ہیں۔"

امر مسکرایا۔"اور جو بعد میں کھل گیا؟"

چودھری کا جواب تیار تھا۔"تو ہم کہدیں گے ہمارے باپ دادا چھتری تھے۔ ابھی تو تم نے کچھ جل پان نہ کیا ہو گا؟ کہاں گیا تیجا۔ جا ہوسے کچھ کھانے کو مانگ لا۔ بھیا بھگوان کا نام لے کر یہیں ٹک جاؤ۔ تین چار بیگھے سلونی کے پاس ہیں، دہ بیگھے ہمارے ساجھے میں کر لینا۔ اتنا بہت ہے۔ بھگوان دے تو کھائے نہ چکے۔"

لیکن جب سلونی بلائی گئی اور اس سے یہ تجویز کی گئی۔ تو وہ بدک گئی۔ منہ بنا کر بولی۔"تمہارا من ہے اپنی جمین ان کے نام کر دو اور میں ہوا کھاؤں۔ یہی تو۔"

چودھری نے ہنس کر کہا۔"نہیں نہیں جمین تیرے ہی نام رہے گی پگلی۔ یہ تو تیرے اسامی رہیں گے۔ یہی سمجھ لے کہ تو ان کو بٹائی پر دے رہی ہے۔"

سلونی نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا" بھیا میں اپنی جمین کسی کے نام نہیں لکھتی۔ یوں ہمارے مہمان ہیں۔ دو چار دس دن رہیں۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکیگا ان کی خاطر کروں گی۔ تم بٹائی پر لیتے ہو تو لے لو۔ جس کو کبھی دیکھا نہ سنا، جان نہ پہچان اسے کیسے بٹائی پر دے دوں"

پاگ نے چودھری کی طرف ملامت آمیز نظروں سے دیکھ کر" دل بھر گیا جی یا ابھی نہیں"۔ کہتے ہو عورتیں مورکھ ہوتی ہیں۔ یہ بڑھیا چاہے تو ہم کو اور تم کو کھڑے کھڑے بیچ ڈالے۔ یہ منہ ہی کی میٹھی ہے"

سلونی تنک اٹھی" ہاں جی تمھارے کہنے سے اپنے باپ دادے کی جمین چھوڑ دوں۔ میرے ہی پیٹ کا لڑکا مجھی کو چرانے چلا ہے"

کاشی نے سلونی کی" حمایت کی۔ ٹھیک تو کہتی ہے۔ بے جانے سے آدمی کو اپنی جمین کیسے سونپ دے"

امر کانت کو اس مناظرے میں فلسفیانہ لطف آرہا تھا۔ مسکرا کر بولا" ہاں دادی تم ٹھیک کہتی ہو۔ پردیسی کا کیا بھروسہ"

منی بھی دروازے پر کھڑی یہ باتیں سن رہی تھی، بولی" پاگل ہو گئی ہو کاکی تمھارے کھیت کوئی سر پر اٹھا لیجائے گا۔ پھر ہم لوگ تو ہیں ہی۔ جب تمھیں کوئی دھوکا دے گا تو ہم پوچھیں گے نہیں"

کسی بھڑکے ہوئے جانور کو بہت سے آدمی گھیرنے لگتے ہیں تو وہ اور بھی بھڑک جاتا ہے۔ سلونی سمجھ گئی تھی کہ یہ سب کے سب مل کر مجھے لٹوانا چاہتے ہیں۔ ایک بار نہیں کر کے پھر ہاں نہ کی۔ جھجک کر چلی گئی۔

پاگ بولا" چڑیل ہے چڑیل"

امر نے خفیف ہو کر کہا" تم نے ناحق اس سے کہا دادا، مجھے کیا، یہ

گاؤں نہ سہی اور گاؤں سہی" منی کا چہرہ فق ہو گیا۔

کو ڈر بولے "نہیں بھیا کیسی باتیں کرتے ہو تم۔ میرے ساجھی دار بن کر رہو مہنت جی سے کہہ کر دو چار بیگھے کا بندوبست کرا دیں گے۔ تمہاری جھونپڑی الگ بنجائے گی۔ کھانے پینے کی کوئی بات نہیں۔ ایک بھلا آدمی تو گاؤں میں ہو جائیگا نہیں، کبھی ایک چپراسی گاؤں میں آ گیا تو سب کی سانس اوپر تلے ہونے لگتی ہے۔"

آدھ گھنٹے میں سلونی پھر لوٹی اور چودھری سے بولی "تمہیں میرے کھیت بٹائی پر کیوں نہیں لے لیتے" چودھری نے گھڑک کر کہا "مجھے نہیں چاہئے۔ دھرے رہ اپنے کھیت۔"

سلونی نے امر سے التجا کی۔ بھیا تمہیں سوچو میں نے کچھ بیجا کہا۔ انجان آدمی کو کوئی اپنی چیز دیتا ہے؟

امر نے دلجوئی کی "نہیں کاکی، تم نے بہت ٹھیک کیا۔ اس طرح اعتبار کر لینے سے دھوکا ہو جاتا ہے۔"

سلونی کو کچھ تشفی سی ہوئی "تم سے تو بھیا میری رات ہی بھر کی جان پہچان ہے نہ۔ جس کے پاس آجکل میرے کھیت ہیں وہ تو میرا ہی بھائی بند ہے۔ اس سے چھین کر تمہیں دیدوں تو وہ کیا کہے گا۔ تمہیں سوچو۔ اگر میں بیجا کہتی ہوں تو میرے منہ پر تھپڑ مارو۔ وہ میرے ساتھ بے ایمانی کرتا ہے یہ جانتی ہوں پر ہے تو اپنا ہی بھائی بند۔ اس کے منہ کی روٹی چھین کر تمہیں دیدوں تو تم مجھے بھلا کہو گے تمہیں بولو۔"

سلونی نے یہ دلیل خود سوچ نکالی تھی یا کسی اور نے سمجھا دی تھی۔ کون جانے۔ پر اس نے گوڈر کو لاجواب کر دیا۔

(۳)

دو مہینے گذر گئے۔

پوس کی ٹھنڈی رات کا لاکمبل اوڑھے پڑی ہوئی تھی۔ اونچا پہاڑ ستاروں کا تاج پہنے کھڑا تھا۔ جھونپڑیاں گویا اس کی وہ چھوٹی چھوٹی آرزوئیں تھیں جنھیں وہ ٹھکرا چکا تھا۔

امر کی جھونپڑی میں ایک لالٹین جل رہی ہے۔ مدرسہ کھلا ہوا ہے۔ پندرہ بیس لڑکے کھڑے ابھنو کا قصہ سن رہے ہیں۔ سب کے سب کتنے خوش ہیں۔ ان کے زرد چہرے چمک رہے ہیں۔ آنکھیں جگمگا رہی ہیں۔ شاید وہ بھی ابھنو ہی جیسے دلیر، ویسے ہی فرض شناس ہونے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ انھیں کیا خبر ایک دن انھیں درجودھنوں اور چراسندھوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑیں گے، ماتھے رگڑنے پڑیں گے۔ کتنی بار وہ غنیم کے نرغے سے بھاگنے کی کوشش کریں گے اور بھاگ نہ سکیں گے۔

گوڈر جودھری چوپال میں بوتل اور کجی لئے کچھ دیر تک تصورات میں ڈوبے بیٹھے رہے۔ پھر بجی پھینک دی۔ بوتل اٹھا کر طاق پر رکھدی اور منی کو پکار کر کہا "پردیسی سے کہہ آ کر کھانا کھا لیں۔ اس بھلے آدمی کو جیسے بھوک ہی نہیں لگتی۔ پھر رات گئی۔ ابھی تک کھانے پینے کی سدھ نہیں"

منی نے بوتل کی طرف دیکھ کر کہا۔ تم جب تک پی لو۔ میں نے تو اسی لئے نہیں بلایا"

گوڈر نے نفرت آمیز لہجے میں کہا "آج تو پینے کو جی نہیں چاہتا بیٹی! کون بڑی اچھی چیز ہے"

منی حیرت سے گوڈر کا منہ تکنے لگی۔ اسے یہاں آئے تین سال سے زیادہ ہوئے۔ کبھی چودھری کو ناغہ کرتے نہیں دیکھا۔ کبھی چودھری کے منہ سے ایسی زاہدانہ باتیں نہیں سُنیں۔ گھبرا کر بولی "آج تمھارا جی اچھا نہیں ہے کیا دادا؟"

چودھری نے ہنس کر کہا "جی کیوں نہیں اچھا ہے۔ منگائی تو تھی پینے ہی کے لئے۔ مگر اب جی نہیں چاہتا۔ پردیسی کی بات آج میرے من میں بیٹھ گئی کہتے ہیں جہاں سو میں اسی آدمی بھوکوں مرتے ہوں وہاں دارو پینا غریبوں کا لہو پینے کے برابر ہے۔ کوئی دوسرا کہتا تو نہ مانتا۔ مگر ان کی بات جیسے دل میں بیٹھ جاتی ہے۔"

منی متفکر ہو گئی "تم ان کے کہنے میں نہ آؤ دادا، اب چھوڑنا تمھیں نقصان کرے گا کہیں بدن میں درد نہ ہونے لگے۔"

چودھری نے مضبوط ارادے کے ساتھ کہا "چاہے درد، چاہے بائی ہو۔ اب پیوں گا نہیں۔ اپنی عمر میں ہجاروں روپئے کی دارو پی گیا۔ ساری کمائی نشے میں اڑا دی۔ اتنے روپئے سے کوئی پُن کا کام کرتا تو گاؤں کا بھلا ہوتا اور جس بھی ملتا۔ مورکھ کو اسی سے برا کہا ہے۔ سُنا ہے صاحب لوگ بہت پیتے ہیں مگر ان کی بات نرالی ہے۔ وہ یہاں کے راجہ ہیں۔ لوٹ کا دھن پاتے ہیں۔ وہ نہ پئیں تو کون پئے۔ دیکھتی ہے اب کاسی اور پیاک کو بھی کچھ لکھنے پڑھنے کا چسکا لگ رہا ہے۔"

مدرسہ بند ہوا۔ امر دونوں لڑکوں کو انگلی پکڑے ہوئے آکر چودھری سے بولا۔ "مجھے تو آج دیر ہو گئی دادا۔ تم نے کھانا لیا نہ؟"

چودھری کا دل محبت سے لبریز ہو گیا "ہاں اور کیا۔ میں ہی تو پہر رات سے جتا ہوا ہوں۔ میں ہی جوتے لے کر بزار گیا تھا۔ اس طرح بیان دوگے تو

مجھے تمھارا مدرسہ بند کرنا پڑے گا۔"

امر کے مدرسے میں اب لڑکیاں بھی پڑھنے لگی تھیں۔ اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

کھانا کھا کر چودھری لیٹے۔ امر چلنے لگا تو منی نے کہا "آج تو لالہ تم نے بڑا بھاری پالا مارا۔ دادا نے آج ایک گھونٹ بھی نہیں پی۔"

امر اچھل کر بولا "سچ، کچھ کہتے تھے؟"

"تمھارا جس گاتے تھے اور کیا کہتے۔ میں تو سمجھتی تھی کہ مر کر ہی چھوڑیں گے۔ مگر تمھاری نصیحت کام کر گئی۔"

امر کے دل میں کئی دن سے منی سے دریافت حال کی خواہش ہو رہی تھی لیکن موقع نہ پاتا تھا۔ آج موقع پا کر اس نے پوچھا "تم مجھے پہچانتی ہو منی؟ میں تو تمھیں خوب پہچانتا ہوں۔"

منی کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے جھجکتی ہوئی آنکھوں سے امر کو دیکھ کر کہا "تم نے کہدیا تو مجھے یاد آیا۔ میں نے تم کو کہیں دیکھا تھا۔"

"کاشی کے مقدمے کی بات یاد کرو۔"

"اچھا یاد آ گیا۔ تمھیں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ روپے جمع کرتے پھرتے تھے۔ مگر تم یہاں کیسے آ گئے؟"

"دادا سے لڑائی ہو گئی۔ تم یہاں کیسے پہنچیں؟ اور ان لوگوں کے بیچ میں کیسے آ پڑیں؟"

منی گھر میں جاتی ہوئی بولی "پھر کبھی بتاؤں گی۔ مگر تمھارے ہاتھ جوڑتی ہوں یہاں کسی سے کچھ نہ کہنا۔"

امر نے اپنی کوٹھری میں جا کر بچھاون کے نیچے سے دھوتیوں کا ایک جوڑا

نکالا اور سلونی کے گھر جا پہنچا۔ سلونی بھیتر پڑی نیند کو بلانے کے لئے ایک گیت گا رہی تھی۔ امر کی آواز سن کر ٹٹی کھولدی اور بولی "کیا ہے بیٹا۔ آج تو بڑا اندھیرا ہے۔ کھانا کھا چکے ہیں تو ابھی چرخا کات رہی تھی۔ پیٹھ میں درد ہونے لگا تو آ کر لیٹ گئی۔"

امر نے دھوتیوں کا جوڑا نکال کر کہا۔ "یہ دھوتیوں کا جوڑا لایا ہوں اسے لے لو تمہارا سوت پورا ہو جائے تو میں لے لوں گا۔"

سلونی اس دن امر سے بد گمان ہونے کے باعث اس سے شرماتی تھی ایسے شریف آدمی پر اس نے کیوں شک کیا۔ یہ خیال اُسے تکلیف دے رہا تھا۔ شرماتی ہوئی بولی۔ "ابھی تم کیوں لائے بھیا، سوت کت جاتا تو لاتے۔"

امر کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ بڑھیا نے جوڑا لے لیا اور اس کی تہیں کھول کر لالچائی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ دفعتاً اس نے تعجب سے کہا۔ "یہ تو دو ہیں بیٹا! میں دو لے کر کیا کروں گی۔ ایک تم لیتے جاؤ۔"

امر کانت نے کہا "ایک سے کیسے کام چلے گا۔ دونوں رکھ لو۔"

سلونی کو اپنی زندگی کے سنہرے دنوں میں دو دھوتیاں میسر نہ ہوئی تھیں شوہر اور بیٹے کے زمانے میں بھی ایک دھوتی سے زیادہ نہ ملی تھی اور آج ایسی خوبصورت دو دو ساڑیاں مل رہی ہیں۔ زبردستی دی جا رہی ہیں۔ اس کے قلب سے گویا دودھ کی دھاریں نکلنے لگیں۔ بیوہ کا غم اور غم نصیب ماں کی حسرت دعا بن کر اس کے ہر بُن مو سے نکلنے لگی۔

امر کانت کوٹھری سے باہر نکل آیا۔ سلونی روتی رہی۔

اپنی جھونپڑی میں آ کر امر کچھ شش و پنج کی حالت میں کھڑا رہا۔ پھر اپنا روزنامچہ لکھنے بیٹھ گیا۔ اسی وقت چودھری کے گھر کا دروازہ کھلا اور منی کلسالئے پانی بھرنے نکلی۔ ادھر لالٹین جلتی دیکھ کر وہ یہاں چلی آئی اور دروازے پر

کھڑی ہو کر بولی، "ابھی سوئے نہیں لالہ، رات تو بہت ہو گئی۔"
امر نے باہر نکل کر کہا، "ہاں ابھی نیند تو نہیں آئی۔ کیا پانی نہیں تھا؟"
"ہاں آج سب پانی اٹھ گیا۔ پیاس لگی تو کہیں ایک بوند پانی نہیں۔"
"لاؤ میں کھینچ لادوں تم اس اندھیری رات میں کیا جاؤ گی۔"
"اندھیری رات میں شہر والوں کو ڈر لگتا ہے ہم تو گاؤں کے ہیں۔"
"نہیں نہیں۔ میں تمھیں نہ جانے دوں گا۔"
"تو کیا میری جان تمھاری جان سے پیاری ہے؟"
"میری جیسی ایک لاکھ جانیں تمھاری جان پر نچھاور ہیں۔"
منی نے اس کی طرف مخمور نظروں سے دیکھ کر کہا "تمھیں بھگوان نے عورت کیوں نہیں بنا دیا لالہ؟ اتنا نازک دل تو کسی مرد کا نہیں دیکھا میں تو کبھی کبھی سوچتی ہوں تم یہاں نہ آتے تو اچھا ہوتا۔"
امر مسکرا کر بولا "میں نے تمھارے ساتھ کیا برائی کی ہے منی؟"
منی نے حسرت ناک لہجے میں کہا "برائی نہیں۔ جس بیکس بچے کو کوئی پوچھنے والا نہ ہو اسے گود، کھلونے اور مٹھائیوں کا چسکا ڈال دینا کیا برائی نہیں ہے یہ سکھ پاکر کیا وہ لاڈ پیار کے بغیر رہ سکتا ہے؟"
امر نے کہا "بیکس تو میں تھا منی۔ تم نے مجھے گود اور پیار کا چسکا ڈال دیا۔ میں نے تو رو رو کر تمھیں دق ہی کیا ہے۔"
منی نے کلساز مین پر رکھ دیا اور بولی "میں تم سے باتوں میں نہ جیتوں گی لالہ لیکن تم نہ تھے تو میں بڑے چین سے رہتی تھی۔ گھر کا دھندا کرتی تھی، روکھا سوکھا کھاتی تھی اور سو رہتی تھی۔ تم نے میری وہ بے فکری چھین لی۔ اپنے من میں کہتے ہوگے بڑی چنچل عورت ہے۔ کہو جب مرد عورت ہو جائے تو عورت کو مرد بننا

ہی پڑے گا۔ جانتی ہوں تم مجھ سے بھاگے بھاگے پھرتے ہو۔ مجھ سے گلا چھڑاتے ہو۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ میں تمھیں پا نہیں سکتی لیکن پھر بھی تمھارے پیچھے پیچھے پھرتی ہوں۔ میں تم سے اور کچھ نہیں مانگتی۔ بس اتنا ہی چاہتی ہوں کہ تم مجھ اپنی سمجھو مجھے معلوم ہو کہ میں بھی عورت ہوں۔ میرے سر پر بھی کوئی ہے۔ میری زندگی بھی کسی کے کام آسکتی ہے۔"

امر نے اب تک منی کو اس طرح دیکھا تھا جیسے ہر ایک جوان کسی حسینہ کو دیکھتا ہے۔ محبت سے نہیں محض رنگین مزاجی سے۔ مگر اس التجا نے اس کے آتش شوق کو بیدار کر دیا دودھار گائے کے بھرے ہوئے تھنوں کو دیکھ کر ہم خوش ہوتے ہیں۔ ان تھنوں میں کتنا دودھ ہوگا محض اس کی مقدار کا خیال ہمارے ذہن میں آتا ہے۔ ہم گائے کو پکڑ کر دوہنے کے لئے تیار نہیں ہو جاتے۔ لیکن دودھ کا سامنے کٹورے میں آجانا دوسری بات ہے۔ امر نے دودھ کے کٹورے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا "آؤ ہم تم کہیں چلے چلیں۔ منی وہاں میں کہوں گا یہ میری ۔۔۔۔"

منی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولی "بس اور کچھ نہ کہنا۔ مرد سب ایک سے ہوتے ہیں۔ میں کیا کہتی تھی اور تم کیا سمجھ گئے۔"

منی نے کلسا اٹھا لیا اور کنوئیں کی طرف چلی۔ امر منی کے اس التفات کے بعد یہ احتراز دیکھ کر حیران رہ گیا۔ واقعی حسینہ کا دل پہیلی ہے۔

دفعتاً منی نے پکارا۔ "لالہ تازہ پانی لائی ہوں۔ ایک لوٹا لاؤں؟"

امر کو پیاس لگی تھی مگر کہا۔ "ابھی تو پانی پینے کو جی نہیں چاہتا۔"

(۴)

تین مہینے تک امر نے کسی کو خط نہیں لکھا۔ کہیں بیٹھنے کی مہلت ہی نہ ملی سکینہ کا حال چال جاننے کے لئے دل تڑپ تڑپ کر رہ جاتا تھا۔ نینا کی یاد بھی اکثر آتی رہتی تھی۔ بیچاری رو رو کر مری جاتی ہوگی۔ بچے کا ہنستا ہوا پھول سا مکھڑا آنکھوں میں بسا رہتا تھا مگر کہیں اپنا پتہ ٹھکانا ہو تو خط لکھے۔ یہاں آنے کے کئی دن بعد اس نے تین خط لکھے۔ سکینہ، سلیم اور نینا کے نام۔ سکینہ کا خط سلیم کے لفافے میں ہی بند کر دیا تھا۔ آج جواب آگئے ہیں، ڈاکیا ابھی چٹھیاں دے گیا ہے امر لب دریا کی تنہائی میں جا کر ان خطوں کو پڑھ رہا ہے۔ وہ نہیں چاہتا بیچ میں کوئی خلل انداز ہو۔ لڑکے آ آ کر پوچھیں گے کس کا خط ہے۔

نینا نے لکھا ہے۔ بھلا آپ کو اتنے دنوں بعد میری یاد تو آئی۔ میں آپ کو اتنا سنگدل نہ سمجھتی تھی۔ آپ کے بغیر اس گھر میں کیسے رہتی ہوں۔ یہ آپ کیا جانیں کیونکہ آپ آپ ہیں اور میں میں۔ ساڑھے چار مہینے گذر جائیں اور آپ کا ایک خط نہ آئے آنکھوں سے کتنے آنسو نکل گئے کہہ نہیں سکتی۔ رونے کے سوا آپ نے اور کام ہی کیا چھوڑا ہے۔ آپ کے بغیر میری زندگی اتنی سونی ہو جائے گی یہ مجھے نہ معلوم تھا۔ آپ کی اتنے دنوں کی خاموشی کا سبب میں سمجھتی ہوں۔ مگر آپ کا وہ خیال غلط ہے۔ آپ میرے بھائی ہیں۔ میرے بیرن ہیں۔ راجا ہوں تو میرے بھائی ہیں، رنک ہوں تو میرے بھائی ہیں۔ دنیا آپ کا مذاق اڑائے سارے ملک میں آپ کی رسوائی ہو پھر بھی آپ میرے بھائی ہیں۔ آپ آج مسلمان یا عیسائی ہو جائیں تو کیا آپ میرے نہ ہوں گے، جو رشتہ بھگوان نے جوڑ دیا ہے کیا آپ اُسے توڑ سکتے ہیں۔ اتنا شور میں آپ کو نہیں سمجھتی اس

سے بھی پیارا کوئی رشتہ دنیا میں ہے میں تو نہیں سمجھتی۔ ماں میں ماتا ہے بہن میں کیا ہے نہیں جانتی، مگر وہ ماتا سے کہیں نازک تر ہے۔ ماں شرارتوں کی سزا بھی دیتی ہے بہن عفو کی مورتی ہے۔ بھائی انصاف کرے یا بے انصافی تحقیر کرے یا پیار کرے بہن کے پاس عفو کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ وہ صرف اس کی محبت کی بھوکی ہے۔ جب سے آپ گئے ہیں کتابوں کی طرف دیکھنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ چرخا بھی پڑا میرے نام کو رو رہا ہے۔ بس اگر دل بستگی کی کوئی چیز ہے تو وہ منو ہے۔ وہ میرے گلے کا ہار ہو گیا ہے۔ ایک لمحے کے لئے بھی نہیں چھوڑتا۔ اس وقت سو گیا ہے تب یہ خط لکھ سکی ہوں۔ نہیں اس نے مصور رسم الخط میں وہ خط لکھا ہوتا جسے بڑے بڑے عالم بھی نہ پڑھ سکتے بھابی کو اب اس سے اتنی محبت نہیں رہی۔ آپ کا ذکر کبھی ان کی زبان پر نہیں آتا۔ اب انھیں مذہبی کتابوں سے خاص دلچسپی ہو گئی ہے۔ مجھ سے بہت کم بولتی ہیں، راما دیوی انھیں لے کر لکھنؤ جانا چاہتی تھیں مگر نہیں گئیں ایک دن ان کی گائے کا بیاہ تھا۔ شہر کے ہزاروں دیوتاؤں کی دعوت ہوئی۔ ہم لوگ بھی گئے تھے۔ یہاں کے گئوشالے کے لئے انھوں نے دس ہزار کا عطیہ دیا ہے۔

اب دادا جی کا حال سنئے آج کل وہ ایک ٹھاکر دوارہ بنوا رہے ہیں۔ زمین تو پہلے ہی لے چکے تھے۔ پتھر جمع ہو رہا ہے۔ ٹھاکر دوارے کی بنیاد رکھنے کے لئے راجہ صاحب کو دعوت دی جائے گی۔ نہ جانے کیوں دادا اب کسی پر ناراض نہیں ہوتے۔ یہاں تک کہ زور سے بولتے بھی نہیں۔ دال میں نمک تیز ہو جانے پر وہ تھالی پٹک دیتے تھے۔ اب کتنا ہی نمک تیز ہو بولتے بھی نہیں سختی ہوں آسامیوں پر بھی اتنی سختی نہیں کرتے۔ جس دن بنیاد پڑے گی بہت سے

اسامیوں کی بقایا معاف کر دیں گے۔ پٹھانی کو اب پانچ کی جگہ پچیس ملنے لگے ہیں لکھنے کو تو بہت سی باتیں ہیں مگر لکھوں گی نہیں آپ اگر یہاں آئیں تو چھپ کر آئیے گا کیونکہ لوگ بہت برگشتہ ہو رہے ہیں، ہمارے گھر کوئی نہیں آتا جاتا۔"

دوسرا خط سلیم کا ہے: "میں نے سمجھا تھا کہ تم گنگا جی میں ڈوب مرے اور نام کو پیاز کی مدد سے دو تین قطرے آنسو بہا دئے تھے اور تمہاری روح کی نجات کے لئے ایک برہمن کو ایک کوڑی خیرات بھی کر دی تھی مگر اب یہ معلوم کر کے رنج ہوا کہ آپ زندہ ہیں اور میرا ماتم بے کار ہوا۔ آنسوؤں کا تو غم نہیں آنکھوں کو کچھ فائدہ ہی ہوا مگر اس کوڑی کا غم ضرور ہے۔ بھلے آدمی، کوئی پانچ پانچ مہینے تک یوں چپ سادھ لیتا ہے۔ خیریت یہ ہے کہ تم یہاں موجود نہیں ہو۔ بڑے قومی خادم کی دُم بنے ہو۔ جو آدمی اپنے پیارے دوستوں سے اتنی بیوفائی کرے وہ قوم کی خدمت کیا خاک کرے گا۔

×××

خدا کی قسم روز تمہاری یاد آتی تھی، کالج جاتا ہوں مگر جی نہیں لگتا۔ تمہارے ساتھ کالج کی رونق چلی گئی۔ ادھر ابا جان سول سروس کی رٹ لگا لگا کر اور بھی جان لئے لیتے ہیں۔ آخر کبھی آؤ گے بھی؟ یا کالے پانی کی سزا بھگتتے رہو گے؟

کالج کا حال بدستور سابق ہے۔ وہی تاش ہے، وہی لکچروں سے بھاگنا ہے۔ وہی میچ ہے۔ ہاں کانووکیشن کا رُخ اچھا رہا۔ وائس چانسلر نے سادہ معاشرت پر زور دیا۔ تم ہوتے تو اس کا مزہ اٹھاتے مجھے تو وہ پھیکا معلوم ہوتا تھا۔ سادہ زندگی کا سبق تو سب دیتے ہیں مگر کوئی نمونہ بن کر دکھاتا نہیں۔ یہ جو کوڑیوں لکچرار اور پروفیسر ہیں کیا سب کے سب سادہ زندگی کے نمونے ہیں، وہ زندگی کا معیار اونچا کر رہے ہیں تو پھر لڑکے بھی ان کی تقلید کیوں نہ کریں۔ وائس چانسلر صاحب معلوم نہیں سادگی کا سبق اپنے اسٹاف کو کیوں نہیں

پڑھاتے پروفیسر بھاٹیا کے پاس تیس جوڑے جوتے ہیں۔ بعض بعض پچاس روپئے کے ہیں۔ خیران کی بات چھوڑو۔ پروفیسر چکرورتی تو بڑے کفایت شعار مشہور ہیں۔ جورو نہ جاتا اللہ میاں سے ناتا۔ پھر بھی جانتے ہو کتنے نوکر ہیں، ان کے پاس! صرف بارہ، تو بھائی ہم لوگ تو نوجوان ہیں۔ ہمارے دلوں میں نیا شوق ہے، نئے ارمان ہیں گھر والوں سے مانگیں گے وہ نہ دیں گے تو لڑیں گے۔ دوستوں سے قرض لیں گے۔ دوکانداروں کی خوشامد کریں گے مگر شان سے رہیں گے ضرور وہ جہنم میں جا رہے ہیں تو ہم بھی جہنم میں جائیں گے مگران کے پیچھے پیچھے۔

سکینہ کا حال بھی کچھ سُنا چاہتے ہو۔ ماما کو بیسیوں ہی بار بھیجا۔ کپڑے بھیجے۔ روپئے بھیجے مگر کوئی چیز نہ لی۔ ماما کہتی ہے دن بھر میں ایک آدھ چپاتی کھالی تو کھالی نہیں چُپ چاپ پڑی رہتی ہے۔ دادی سے بول چال بند ہے کل تمھارا خط آتے ہی اس کے پاس بھیجدیا تھا۔ اس کا جواب جو آیا ہو بہو اس کی نقل بھیجتا ہوں اصلی خط اس وقت دیکھنے کو ملے گا جب یہاں آؤ گے۔"

"بابوجی، آپ کو مجھ بدنصیب کے کارن یہ سزا ملی۔ اس کا مجھے بڑا رنج ہے اور کیا کہوں جیتی ہوں اور آپ کو یاد کرتی ہوں۔ اتنا ارمان ہے کہ مرنے سے پہلے ایک بار آپ کو دیکھ لیتی۔ لیکن اس میں بھی آپ کی بدنامی ہی ہے اور میں تو بدنام ہو ہی چکی۔ کل آپ کا خط ملا تب سے کتنی ہی بار یہ سودا اُٹھ چکا ہے کہ آپ کے پاس چلی آؤں۔ کیا آپ ناراض ہوں گے؟ مجھے تو یہ خوف نہیں ہے مگر دل کو سمجھاؤں گی اور شاید ابھی مروں گی نہیں۔ کچھ دیر تک تو غصے کے مارے تمھارا خط نہ کھولا۔ مگر کب تک۔ خط کھولا، پڑھا، روئی، پھر پڑھا، پھر روئی۔ رونے میں اتنا مزہ ہے کہ جی نہیں بھرتا اور [انتظار کی تکلیف] نہیں سہی جاتی خدا آپ کو سلامت رکھے۔"

"دیکھا یہ خط کتنا دردناک ہے۔ میری آنکھوں میں بہت کم آنسو آتے ہیں لیکن یہ خط دیکھ کر ضبط نہ کر سکا۔ کتنے خوش ہو تم۔"

امر نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں نشہ تھا۔ وہ نشہ جس میں بے خبری نہیں حیات ہے، سرخی نہیں چمک ہے۔ جنون نہیں، خود فراموشی نہیں بے واری ہے اس کی فضائے دل میں کبھی ایسا زلزلہ نہ آیا تھا۔ اس کا دل کبھی اتنا فراخ، اتنا بلند، اتنا مسرور نہ تھا۔ آنکھوں کے سامنے دو مورتیں کھڑی ہو گئیں۔ ایک تکلفات میں ڈوبی ہوئی، جواہرات سے مرصع، غرور کے نشے میں چور۔ دوسری سادہ دل کشی سے مزین، شرم اور انکسار سے سر جھکائے ہوئے۔ اس کی تشنہ روح اس خوشگوار میٹھے شربت سے ہٹ کر اس میٹھے پانی کی طرف لپکی۔ اس نے خط کے اس حصے کو پھر پڑھا، پھر ایک ہیجان کے عالم میں دریا کے کنارے ٹہلنے لگا۔ سکینہ سے کیوں کر ملے۔ یہ دیہاتی زندگی اسے پسند آئے گی! کتنی نازک بدن ہے، کتنی نازک طبع۔ وہ اور یہ پر مشقت زندگی! کیسے جا کر اس کی دلجوئی کرے اس کی وہ صورت یاد آئی جب اس نے کہا تھا میں بھی چلتی ہوں، اُف کتنا ہنگامہ خیز تقاضا تھا۔ کسی مزدور کو گڑھا کھودتے کھودتے جیسے کوئی ہیرا مل جائے اور وہ اپنی نادانی سے اسے کانچ کا ٹکڑا سمجھتا رہے۔

اتنا ارمان ہے کہ مرنے سے پہلے آپ کو دیکھ لیتی۔ یہ جملہ جیسے اس کے دل پر نقش ہو گیا تھا۔ اس کا دل گویا دریائی لہروں پر تیرتا ہوا سکینہ کی طرف بہا جا رہا تھا۔ لہروں کی طرف محویت کے عالم میں تکتے تکتے اسے معلوم ہوا میں بھی بہا جا رہا ہوں۔ وہ چونک کر گھر کی طرف چلا۔ دونوں آنکھیں آنسوؤں سے تر، ناک کی نوک پر سرخی، اور دونوں گال مرطوب۔

(۵)

گاؤں میں ایک آدمی سگائی لایا ہے، اسی جشن میں ناچ گانا، دعوت ہو رہی ہے، اس کے دروازے پر نقارے بج رہے ہیں، سارے گاؤں کے مرد عورت بچے، جوان جمع ہیں۔ ناچ شروع ہو گیا ہے۔

پیاگ نے کہا۔ "چلو بھیا، تم بھی کچھ کرتب دکھاؤ۔ سنا ہے تمہارے دیس میں لوگ خوب ناچتے ہیں"

امرکانت نے معذرت سی کی۔ "بھائی مجھے تو ناچنا نہیں آتا"

اس کا جی چاہتا ہے کہ ناچنا آتا تو اس وقت سب کو حیرت میں ڈال دیتا

جوان مردوں اور عورتوں کے جوڑے بندھے ہوئے ہیں۔ ہر ایک جوڑا دس منٹ تھرک کر چلا جاتا ہے۔ رقص میں کتنا نشہ اور کتنی خوشی ہے، یہ امرکانت کو آج معلوم ہوا۔

ایک حسینہ گھونگھٹ بڑھائے میدان میں آتی ہے۔ ادھر سے پیاگ نکلتا ہے۔ دونوں ناچنے لگتے ہیں۔ حسینہ کے اعضا میں اتنی لچک ہے، اس کے جسم کی حرکتوں میں جذبات کا ایسا اظہار ہے۔ کہ لوگوں پر محویت کا عالم طاری ہے۔

اس جوڑے کے بعد دوسرا جوڑا آتا ہے۔ جوان گٹھیلے جسم کا آدمی ہے، سینہ فراخ، قبضے چڑھے ہوئے۔ کچھنی کاچھے، گلے میں سونے کی مہر ڈالے، حسینہ کو دیکھ کر امر چونک اٹھا۔ یہ تو منی ہے۔ آج منی نے گھیر دار لہنگا پہنا ہے۔ گلابی اوڑھنی اوڑھی ہے اور پاؤں میں گھونگھرو باندھے ہیں۔ گلابی گھونگھٹ میں دونوں لب دو پھولوں کی طرح کھلے ہوئے ہیں۔ دونوں آدمی

کبھی ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کبھی ایک دوسرے کی کمر پر ہاتھ رکھ کر، کبھی کولھوں کو تال سے مٹکا کر ناچنے میں محو ہیں۔ سبھی لوگ مفتون نگاہوں سے ان بازیگروں کے کرتب دیکھ رہے ہیں۔ کیا پھرتی ہے، کیا لچک ہے اور ان کی ایک ایک لچک میں، ایک ایک حرکت میں کتنی شعریت ہے اور کتنا جنون۔ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے تھرکتے ہوئے میدان کے اس سرے سے اس سرے تک چلے جاتے ہیں اور کیا مجال جو ایک جنبش بھی بے تال ہو۔

بیاگ نے کہا "دیکھتے ہو بھیّا، بھابی کیسا ناچ رہی ہے۔ اپنا جوڑ نہیں رکھتی۔"

امر نے بیدلی سے کہا "ہاں دیکھ تو رہا ہوں۔"

"جی چاہتا ہو تو اٹھو میں اُس لونڈے کو بلالوں۔"

"نہیں، مجھے نہیں ناچنا ہے۔"

منی ناچ رہی تھی کہ امر اٹھ کر گھر چلا آیا۔ یہ بے شرمی اب اُس سے نہیں دیکھی جاتی۔

ایک ہی لمحے کے بعد منی بھی وہاں پہنچ گئی اور بولی "تم چلے کیوں آئے لالہ، کیا ناچ اچھا نہ لگا؟"

امر نے منہ پھیر کر کہا "کیا میں آدمی نہیں ہوں کہ اچھی چیز کو بُرا سمجھوں۔"

منی اور قریب آکر بولی "تو پھر چلے کیوں آئے؟"

امر نے بے رُخی سے کہا "مجھے ایک پنچایت میں جانا ہے، لوگ بیٹھے میری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ تم نے کیوں ناچنا بند کر دیا۔"

منی بھولے پن سے بولی "تم چلے آئے تو ناچتی کیا؟"

امر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "سچے دل سے کہہ رہی

ہو منی ؟"

منی اس سے آنکھیں ملا کر بولی "میں تم سے جھوٹ کبھی نہیں بولتی؛

"میری ایک بات مانو پھر کبھی مت تاچنا"

منی رنجیدہ ہو کر بولی "تو تم اتنی ذرا سی بات پر روٹھ گئے۔ ذرا کسی سے پوچھو میں آج کتنے دنوں کے بعد ناچی ہوں۔ دو سال میں نگاڑے کے پاس نہیں گئی۔ لوگ کہہ کہہ کر ہار گئے۔ آج تمھیں مجھے لے گئے اور اب الٹے تمھیں ناراض ہوتے ہو"

منی گھر میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد کاشی نے آکر اس سے کہا۔ "بھابی تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ وہاں سب لوگ تمھیں بُلا رہے ہیں"

منی نے دردسر کا بہانا کیا۔

کاشی آکر امر سے بولا "تم کیوں چلے آئے بھیا، کیا گنواروں کا ناچ گانا اچھا نہ لگا ؟"

امر نے کہا "نہیں جی۔ ایک پنچایت میں جانا ہے، دیر ہو رہی ہے۔"

کاشی بولا "بھابی نہیں جا رہی ہیں۔ اس کے ناچ کے بعد اب دوسروں کا رنگ نہیں جم رہا ہے۔ تم چل کر کہہ دو تو شاید مان جائے۔ یہ دن روز روز تھوڑے ہی آتا ہے۔ برادری والی بات ہے۔ لوگ کہیں گے ہمارے یہاں کام آپڑا تو منہ چھپانے لگے"

امر نے شش و پنج میں پڑ کر کہا "تم نے سمجھا یا نہیں"۔ پھر اندر جا کر بولا کیا مجھ سے روٹھ گئی منی ؟"

منی آنگن میں آکر بولی "تم مجھ سے روٹھ گئے یا میں تم سے روٹھ گئی ؟"

"اچھا میرے کہنے سے چلو"

"جیسے بچے مچھلی کو کھلاتے ہیں اسی طرح تم مجھے کھلا رہے ہو لالہ جب چاہے رُلا دیا۔ جب چاہے ہنسا دیا۔ کیوں ؟"

"یہ میری غلطی تھی منی، معاف کرو"

"اب تو منی جبھی ناچے گی جب تم اس کا ہاتھ پکڑ کر کہو گے چلو ہم تم ناچیں اب وہ اور کسی کے ساتھ نہ ناچے گی"

"تو اب ناچنا سیکھوں ؟"

منی نے اپنی فتح کا احساس کر کے کہا "میرے ساتھ ناچنا چاہو گے تو آپ سیکھو گے۔"

"تم سکھا دو گی ؟"

"تم مجھے رونا سکھا رہے ہو۔ میں تمھیں ناچنا سکھا دوں گی"

"اچھا چلو"

یونیورسٹی کے جلسوں میں امر کئی بار ڈرامے کھیل چکا تھا۔ اسٹیج پر ناچا بھی تھا۔ مگر اس ناچ اور اس ناچ میں بڑا فرق تھا۔ وہ اہل مذاق کی مہذب تفریح تھی۔ یہ اہل مشقت کی رندانہ شوخیاں۔ اس کا دل سہما جاتا تھا۔

اس نے کہا "منی میں تم سے ایک درخواست کرتا ہوں"

منی نے ٹھٹک کر کہا "تو تم ناچو گے نہیں ؟"

"یہی درخواست تو تم سے کر رہا ہوں"

امر ٹھہرو! ٹھہرو! کہتا رہا مگر منی لوٹ پڑی۔

امر بھی اپنی کوٹھری میں چلا آیا اور کپڑے پہن کر پنچایت میں چلا گیا۔ اس کا وقار بڑھ رہا ہے۔ آس پاس کے موضعوں میں کوئی پنچایت ہوتی ہے

تو اسے ضرور مدعو کیا جاتا ہے۔

(۶)

سلونی نے اپنے گھر کی جگہ مدرسے کے لئے دے دی ہے۔ لڑکوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ سلونی سے کسی نے اس جگہ کا تقاضہ نہ کیا اس پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا گیا، بس ایک دن امر کانت اور چودھری بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ نیا مدرسہ کہاں بنایا جائے۔ گاؤں میں تو بیلوں کے باندھنے تک کی جگہ نہیں۔ سلونی ان کی باتیں سنتی رہی۔ تب یکایک بول اٹھی "میرا گھر کیوں نہیں لے لیتے۔ بیس ہاتھ آگے بیس ہاتھ پیچھے خالی جگہ پڑی ہوئی ہے۔ کیا اتنی زمین میں تمہارا کام نہ چلے گا؟"

دونوں آدمی حیرت میں آکر سلونی کا منہ تکنے لگے۔

امر نے پوچھا "اور تو رہے گی کہاں کاکی؟"

سلونی نے کہا "مجھے گھر دوار لے کر کیا کرنا ہے بیٹا! تمہاری کوٹھری میں آکر ایک کونے میں پڑ رہوں گی۔"

گوڈر نے دل میں حساب لگا کر کہا "زمین تو بہت نکل آئی۔"

امر نے سر ہلا کر کہا "میں کاکی کا گھر نہیں لینا چاہتا۔ مہنت جی سے مل کر گاؤں کے باہر مدرسہ بنواؤں گا۔"

کاکی نے آزردہ خاطر ہو کر کہا "کیا میری جگہ میں کوئی چھوت لگی ہے بیٹا؟"

گوڈر نے فیصلہ کر دیا۔ سلونی کا گھر مدرسے کے لئے لے لیا جائے۔ اسی میں ایک کوٹھری امر کے لئے بنا دی جائے۔ دوسری سلونی کے لئے ایک کنارے گائے باندھ لے گی، ایک کنارے پڑ رہے گی۔

آج سلونی جتنی خوش ہے اتنی شاید کبھی نہ خوش ہوئی ہو۔ وہی خبیث بڑھیا جس کے دروازے پر کوئی بیل باندھ دیتا تو لڑنے کو تیار ہو جاتی، جو بچوں کو اپنے دروازے پر گولیاں تک نہ کھیلنے دیتی۔ آج اپنے بزرگوں کی یادگار مدرسے کی نذر کرکے اپنے کو خوش نصیب سمجھ رہی ہے۔ یہ کچھ مہل سی بات ہے۔ لیکن بخیل ہی سخی ہو سکتا ہے۔ ہاں اس کی سخاوت کا مدعا ایسا ہونا چاہیئے جو اس کی جان سے پیاری دولت کے ہم وزن ہو۔

فوراً کام شروع ہو گیا۔ گھروں سے لکڑیاں نکل آئیں، مزدور نکل آئے پیسے نکل آئے۔ کسی سے آرزو منت نہ کرنی پڑی۔ یہ ان کا اپنا مدرسہ ہے انھیں کے بچے تو اس میں پڑھتے ہیں۔ اور ان تھوڑے سے دنوں میں ہی تعلیم کا کچھ کچھ اثر بھی نظر آنے لگا ہے۔ بچے اب صاف رہتے ہیں، جھوٹ کم بولتے ہیں۔ جھوٹے بہانے نہیں کرتے، گالیاں نہیں بکتے اور گھر سے کوئی چیز چرا کر نہیں لے جاتے۔ نہ اتنی ضد ہی کرتے ہیں۔ گھر کے معمولی کام شوق سے کرتے ہیں ایسے مدرسے کی کون مدد نہ کرے گا۔ پھاگن کی فرحت بخش صبح سنہرے کپڑے پہنے پہاڑ پر کھیل رہی تھی۔ امر کئی لڑکوں کے ساتھ اشنان کرکے لوٹا مگر یہ کیا بات ہے آج ابھی تک کوئی آدمی کام کرنے نہیں آیا۔ معمولاً تو اس کے اشنان کرکے لوٹنے کے پہلے ہی کام شروع ہو جاتا تھا۔ آج اتنی دیر ہو گئی اور کسی کا پتہ نہیں۔

دفعتاً منی سر پر کلسا رکھے آکر کھڑی ہو گئی۔ امر نے مسکرا کر کہا "وہ دیکھو سورج دیوتا تمھیں گھور رہے ہیں۔"

منی نے کلسا اتار کر ہاتھ میں لے لیا اور بولی "اور تم بیٹھے دیکھ رہے ہو۔"

پھر ایک لمحے کے بعد اس نے کہا "تم تو آج کل جیسے گاؤں میں رہتے ہی

نہیں ہو، مدرسہ کیا بنا تمھارے درشن ہی مشکل ہو گئے۔ میں ڈرتی ہوں کہیں تم سنک نہ جاؤ۔"

"میں تو دن بھر نہیں رہتا ہوں۔ تم البتہ نہ جانے کہاں غائب رہتی ہو آج یہ سب آدمی کہاں چلے گئے؟ ایک بھی نہیں آیا۔"

"گاؤں میں ہے ہی کون۔"

"کہاں چلے گئے سب؟"

"واہ تمھیں خبر ہی نہیں، پھر رات رہے سرومن پور کے ٹھاکر کی گائے مر گئی سب کے سب وہیں گئے ہیں۔ آج گھر گھر شکار پکے گا۔"

امر نے استکراہ کے انداز سے کہا۔ "مری ہوئی گائے۔"

"ہمارے یہاں بھی تو کھاتے ہیں یہ لوگ۔"

"کیا جانے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ تم تو....."

منی نے نفرت سے منہ بنا کر کہا۔ "میں تو ادھر نظر اٹھا کر دیکھتی بھی نہیں۔"

"سمجھاتی نہیں ان لوگوں کو۔"

"ہونہہ سمجھانے سے مانتے ہیں اور میرے سمجھانے سے۔"

امرکانت کے خاندان میں گوشت ممنوع چیز تھی، اسے اس کی بو سے بھی نفرت تھی۔ محض مردہ گوشت کے تذکرے ہی سے اس کا جی متلانے لگا۔ اس نے چھوت چھات اور افتراق و امتیاز کو دل سے نکال ڈالا تھا۔ مگر منہیات سے اُسے جو نفرت تھی اس میں ذرہ بھر بھی کمی نہیں ہوئی۔ اور وہ دس گیارہ مہینے سے انھیں مردہ خوروں کے گھر کھانا کھا رہا ہے۔

اس نے ناک سکوڑ کر کہا۔ "آج میں کھانا نہ کھاؤں گا منی!"

"میں تمھارا کھانا الگ پکا دوں گی۔"

"نہیں نہیں، جس گھر میں وہ چیز بکے گی اس گھر میں مجھ سے نہ کھایا جائیگا مجھے قے ہو جائے گی۔"

دفعتاً شور سن کر امر نے آنکھیں اٹھائیں تو دیکھا پندرہ بیس آدمی بانس کی بلیوں پر اس مردہ گائے کو لادے چلے آرہے ہیں۔ سامنے کئی لڑکے اچھلتے کودتے، تالیاں بجاتے چلے آرہے تھے۔

کتنا نفرت انگیز نظارہ تھا۔ امر وہاں کھڑا نہ رہ سکا، دریا کی طرف بھاگا

منی نے کہا "تمہارے بھاگ جانے سے کیا ہوگا۔ بھلا جاکر سمجھاتے تو کچھ اثر بھی ہوتا۔"

"میری بات کون سنے گا منی!"

"تمہاری بات نہ سنیں گے تو اور کس کی بات سنیں گے۔"

"اور جو کسی نے نہ مانا؟"

"اور جو مان گئے۔ آؤ کچھ بدلو۔"

"اچھا کیا بدتی ہو؟"

"مان جائیں تو مجھے ایک اچھی سی ساڑی لا دینا۔"

"اور نہ مانیں تو تم مجھے کیا دو گی؟"

"ایک کوڑی۔"

اتنی دیر میں وہ لوگ اور قریب آگئے چودھری سالار قافلہ کی طرح آگے آگے لپکے چلے آتے تھے۔

منی نے آگے بڑھ کر کہا "لا تو رہے ہو۔ لیکن لالہ بھاگے جارہے ہیں۔"

گوڈر نے حیرت میں آکر پوچھا "کیوں بھاگے جارہے ہیں۔ کیا ہوا؟"

"کہتے ہیں میں تم لوگوں کے ہاتھ کا پانی نہ پیوں گا"۔
پیاگ نے اکڑ کر کہا۔ "بکنے دو۔ ہمارے ہاتھ کا پانی نہ پئیں گے تو ہم چھوٹے نہ ہو جائیں گے۔"
کاشی بولا۔ "آج بہت دن کے بعد تو شکار ملا۔ اس میں بھی یہ آفت!"
گوڈر نے سمجھوتے کے انداز سے کہا۔ "آخر کہتے کیا ہیں؟"
منی جھنجھلا کر بولی۔ "انھیں سے جا کر پوچھو۔ جو چیز اونچی ذات والے نہیں کھاتے اسے ہم کیوں کھائیں اسی سے تو لوگ ہمیں نیچ سمجھتے ہیں۔"
پیاگ نے جوش میں آکر کہا۔ "تو ہم کیا کسی بامھن ٹھاکر کے گھر بیٹی بیاہتے جاتے ہیں۔ بامھنوں کی طرح کسی کے دروازے پر بھیک مانگنے تو نہیں جاتے یہ تو اپنا اپنا رواج ہے۔"
منی نے ڈانٹ بتائی۔ "یہ کوئی اچھی بات ہے کہ سب لوگ ہمیں نیچ سمجھیں محض زبان کی لذت کے لئے۔"
گائے وہیں رکھدی گئی۔ دو تین آدمی گنڈاسے لے کر دوڑے۔ امر کھڑا دیکھ رہا تھا کہ منی منع کر رہی ہے پر کوئی اس کی سن نہیں رہا ہے۔ اس نے ادھر سے منہ پھیر لیا گویا اسے قے ہو جائے گی۔ منہ پھیر لینے پر بھی وہی نظارہ اس کی آنکھوں میں پھرنے لگا۔ اس حقیقت کو وہ کیسے بھول جائے کہ اس سے پچاس قدم کے فاصلے پر مردہ گائے کی بوٹیاں کیجا رہی ہیں۔
گوڈر نے اسے گنگا کی طرف جاتے دیکھ کر تشویشناک لہجے میں کہا۔ "وہ تو سچ مچ گنگا کی طرف بھاگے جا رہے ہیں۔ بڑا سنکی آدمی ہے کہیں ڈوب نہ جائے"
پیاگ بولا۔ "تم اپنا کام کرو کوئی نہیں ڈوبے ڈابے گا۔ کسی کو اپنی جان اتنی بھاری نہیں ہوتی۔" منی نے اس کی طرف غصے کی نظروں سے دیکھا۔ "جان انھیں

پیاری ہوتی ہے جو کینے ہیں اور کینے بنے رہنا چاہتے ہیں۔ جس میں شرم ہے جو کسی کے سامنے سر نیچا نہیں کرنا چاہتا۔ وہ ایسی بات پر جان بھی دے سکتا ہے۔"

پیاگ نے طعنہ مارا۔ "ان کی بڑی حمایت کر رہی ہو بھابی، کیا سگائی ٹھہر گئی ہے کیا؟"

منی نے آزردہ خاطر ہو کر کہا "دادا تم ان کی باتیں سن رہے ہو اور منہ نہیں کھولتے۔ ان سے سگائی ہی کر لوں گی تو کیا تمہاری ہنسی ہو جائے گی۔ اور جو میرے من میں یہ بات آجائے گی تو روکنے والا ہی کون ہے۔ اب اسی بات پر میں دیکھتی ہوں کہ گھر میں کیسے مانس جاتا ہے۔ پہلے میری گردن پر گنڈاسا چلے گا۔"

منی بیچ میں گھس کر گائے کے پاس بیٹھ گئی اور للکار کر بولی۔ "اب جسے گنڈاسا چلانا ہو چلا دے، میں بیٹھی ہوں"

پیاگ نے مایوس ہو کر کہا۔ "ہتیا کے بل کھیت کھاتی ہو کیا۔"

منی بولی۔ "تمہیں جیسوں نے برادری کو اتنا بدنام کر دیا ہے۔ اس پر کوئی سمجھاتا ہے تو لڑنے کو تیار ہوتے ہو۔"

گوڈر چودھری خیال میں غرق کھڑے تھے۔ دنیا میں ہوا کا رُخ کدھر ہے اس سے وہ بے خبر نہ تھے۔ کئی بار اس معاملے پر امرکانت سے تبادلۂ خیالات کر چکے تھے۔ مدبرانہ انداز سے بولے۔ "بھائیو یہاں گاؤں کے سب آدمی جمع ہیں بتاؤ اب کیا صلاح ہے؟"

ایک بلند قامت نوجوان بولا۔ "صلاح جو تمہاری ہے وہ سب کی ہے چودھری تو تم ہو۔"

پیاگ نے اپنے والد کو ڈگمگاتے دیکھ کر دوسروں کو للکار کر کہا۔ "کھڑے

منہ تکتے ہو۔ اتنے آدمی تو ہو۔ کیوں نہیں منی کا ہاتھ پکڑ کر ہٹا دیتے۔ میں گنڈاسا لئے کھڑا ہوں۔"

منی نے طیش میں آکر کہا۔"میرا ہی مانس کھا جاؤ گے تو کیا ہرج ہے وہ بھی تو مانس ہی ہے"؟ اور کسی کو پیش قدمی نہ دیکھ کر پیاگ خود آگے بڑھا اور منی کا ہاتھ پکڑ کر اُسے وہاں سے گھسیٹنا چاہتا تھا کہ کاشی نے اُسے زور سے دھکا دیا اور لال آنکھیں کر کے بولا۔"بھیا اگر تم نے ان کے بدن پر ہاتھ رکھا تو خون ہو جائے گا۔ کہے دیتا ہوں۔ ہمارے گھر میں اس گئو ماس کی بوتک نہ جانے پائے گی۔ آئے وہاں سے بڑے بہادر بن کر۔"

ایک بلند قامت نوجوان ثالث بن کر بولا۔"مری گائے کے مانس میں ایسا کونسا مزہ رکھا ہے جس کے لئے سب لوگ مرے جا رہے ہو۔ اس کی کھال نکال لو اور لاش کو گڈھا کھود کر گاڑ دو۔ وہ بھی جب امر بھیا کی صلاح ہو۔ ہم کو تو انھیں کی صلاح پر چلنا ہے۔ ان کی رائے پر چل کر ہمارا بھلا ہوگا۔ ساری دنیا تو اسی لئے ہم کو اچھوت سمجھتی ہے کہ ہم دارو سراب پیتے، مردہ مانس کھاتے اور چمڑے کا کام کرتے ہیں۔ اور ہم میں کیا بُرائی ہے۔ دارو ہم نے چھوڑ دی ہم نے کیا چھوڑ دی، بھگوان نے چھڑا دی۔ پھر مردہ مانس میں کیا رکھا ہے۔ رہا چمڑے کا کام اسے کوئی برا نہیں کہہ سکتا۔ اور کہے بھی تو ہمیں اس کی پروا نہیں۔ چمڑا بنانا، بیچنا برا کام نہیں ہے۔"

گوڈر نے اُسے تحسین کی نظروں سے دیکھا۔"تم لوگوں نے بھورے کی بات سن لی۔ تو یہی سب کی صلاح ہے؟"

بھورے بولا۔"اگر کسی کو اُجر کرنا ہے تو کرے۔"

ایک بوڑھے نے کہا۔"ایک ہمارے تمہارے چھوڑ دینے سے کیا ہوتا ہے۔

ساری برادری تو کھاتی ہے ؟"

بھورے نے جواب دیا۔ "برادری کھاتی ہے تو کھانے دو۔ اپنا اپنا دھرم اپنے اپنے ساتھ ہے۔"

گوڈر نے بھورے کو مخاطب کر کے کہا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو بھورے، لڑکوں کا پڑھنا ہی لے لو۔ پہلے کوئی بھیجتا تھا اپنے لڑکوں کو۔ مگر جب ہمارے لڑکے پڑھنے لگے تو دوسرے گاؤں کے لڑکے بھی آ گئے۔"

کاشی بولا۔ "برادری ہمیں اس لئے سجا نہ دے گی کہ ہم مردار نہیں کھاتے اس کا میں جما لیتا ہوں۔ دیکھ لینا آج کی بات سانجھ تک چاروں طرف پھیل جائے گی اور وہ لوگ بھی ہماری دیکھا دیکھی مردار چھوڑ دیں گے۔ امر بھیا کا کتنا نام ہے کس کی مجال ہے کہ ان کی بات کاٹ دے۔"

پیاگ نے دیکھا اب دال نہ گلے گی تو جل کر بولا۔ "اب عورتوں کا راج ہے عورتیں جو کچھ نہ کریں وہ تھوڑا ہے۔"

یہ کہتا ہوا وہ گنڈاسا لئے گھر چلا گیا۔

گوڈر لپکے ہوئے گنگا کی طرف چلے اور ایک گولی کے پٹے سے امر کو پکار کر بولے۔ "وہاں کیا کھڑے ہو بھیا چلو گھر، سب جھگڑا طے ہو گیا۔"

امر خیالوں میں غرق تھا۔ آواز اس کے کانوں تک نہ پہنچی۔

چودھری نے اور قریب جا کر کہا۔ "یہاں کب تک کھڑے رہو گے بھیا!"

"نہیں دادا، مجھے یہیں رہنے دو۔ تم لوگ وہاں گنڈاسے چلاؤ گے مجھ سے دیکھا نہ جائے گا۔ جب تم فرصت پا جاؤ گے تب میں آ جاؤں گا۔"

"بہو کہتی تھی تم ہمارے گھر کھانے کو بھی نہیں کہتے ؟"

"ہاں دادا۔ آج تو نہ کھاؤں گا، مجھے تے ہو جائے گی۔"

"لیکن ہمارے یہاں تو آئے دن یہی دھندا لگا رہتا ہے۔"

"رفتہ رفتہ میری عادت بھی پڑ جائے گی۔"

"تم ہمیں اپنے من میں راچھس سمجھ رہے ہوگے؟"

امر نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا، "نہیں دادا، میں تو تم لوگوں سے کچھ سیکھنے تمہاری کچھ خدمت کر کے اپنی بھلائی کرنے آیا ہوں۔ یہ تو اپنی اپنی برادری کا رواج ہے۔ چین ایک بہت بڑا ملک ہے وہاں بہت سے آدمی بدھ بھگوان کو مانتے ہیں۔ ان کے گھر میں کسی جانور کو مارنا منع ہے۔ اس لئے وہ لوگ مردہ جانور ہی کھاتے ہیں سکتے، بلی، گیدڑ کسی کو بھی نہیں چھوڑتے۔ تو کیا وہ ہم سے نیچے ہیں۔ کبھی نہیں۔ ہمارے ہی ملک میں کتنے اچھتری گوشت کھاتے ہیں۔ وہ زبان کی لذت کے لئے جانوروں کو مارتے ہیں۔ تم ان سے تو کہیں اچھے ہو۔" گوڈر نے ہنس کر کہا۔ "بھیا تم بڑے بدھمان ہو۔ تم سے کوئی نہ جیتے گا۔ چلو اب گاؤں میں کوئی مردہ نہ کھائے گا۔ ہم لوگوں نے یہ طے کر لیا۔ ہم نے کیا طے کیا، بھوتوں نے طے کیا۔ مگر کھال تو پھینکنے دوگے؟"

امر نے خوش ہو کر کہا۔ "نہیں دادا، کھال کیوں پھینکو گے۔ جوتے بنانے سے بڑھ کر اور کونسا روزگار ہوگا۔ مگر کیا بھابی بہت بگڑی تھیں؟"

گوڈر بولا۔ "بگڑی ہی نہیں تھی بھیا۔ وہ تو جان تک دینے کو تیار تھی۔ گائے کے پاس بیٹھ گئی اور بولی۔ اب چلاؤ گنڈاسا۔ پہلا گنڈاسا میری گردن پر پڑے گا پھر کس کی ہمت تھی کہ گنڈاسا چلاتا۔"

امر کا دل جیسے چھلانگ مار کر متی کے قدموں پر لوٹنے لگا۔

(۷)

کئی مہینے گذر گئے۔ گاؤں میں پھر مردار گوشت نہ آیا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ دوسرے علاقہ کے چماروں نے بھی مردار کھانا چھوڑ دیا۔ عمل خیر کچھ متعدی ہوا کرتا ہے۔

امر کانت کا مدرسہ اب نئی عمارت میں آ گیا تھا۔ تعلیم سے لوگوں کو کچھ ایسی رغبت ہو گئی تھی کہ جوان تو کیا بوڑھے بھی آ بیٹھتے اور کچھ نہ کچھ حاصل کر لیتے امر دوسرے ملکوں کی تمدنی اور سیاسی ترقیاں، نئی نئی ایجادیں، نئے نئے خیالات بیان کرتا، غیر ملکوں کے رسم و رواج، طور طریق، عوام کی دلچسپی کے موضوع تھے۔ اُسے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ یہ حرف ناشناس جاہل پیچیدہ سیاسی مسائل کتنی آسانی سے سمجھ جاتے ہیں۔ سارے گاؤں میں ایک نئی زندگی نظر آتی تھی۔

دن بھر کی محنت کے بعد امر لیٹا ہوا ایک افسانہ پڑھ رہا تھا کہ منی آ کر کھڑی ہو گئی۔ امر پڑھنے میں اتنا محو تھا کہ منی کے آنے کی خبر نہ ہوئی۔ راجستھان کی دلیر راجپوتیوں کی جانبازیوں کی داستان تھی، اُن بے نظیر جانبازیوں کی جن کی دنیا کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ہے، جنھیں پڑھ کر آج بھی ہماری گردن غرور سے اونچی ہو جاتی ہے۔ زندگی کو کسی نے اتنا حقیر سمجھا ہو گا۔ حفظ ننگ کی ایسی نظیریں اور کہاں ملیں گی۔ آج کی عقلی دلیلیں اُن قربانیوں کی کتنی ہی تحقیر کریں۔ ہماری عقیدت تو ان دیویوں کے قدموں پر ہمیشہ سر جھکاتی رہے گی۔

منی چپ چاپ کھڑی امر کے چہرے کی طرف تکتی رہی۔ ابر کا وہ ننھا سا ٹکڑا جو آج ایک سال ہوئے اُس کی فضائے دل میں کسی طائر کی طرح اڑتا ہوا

آگیا تھا رفتہ رفتہ پورے آسمان پر مسلط ہوگیا تھا، ایام گذشتہ کی سوزشوں میں جھلسی ہوئی تمنائیں یہ طراوت پاکر پھر سرسبز ہوتی جاتی تھیں۔ وہ ویران زندگی کسی باغیچے کی طرح یہ ترشح پاکر برگ گل سی شگفتہ ہوگئی۔ اوروں کے لئے تو اس کی دیورانیاں کھانا پکاتی تھیں۔ امر کے لئے وہ خود پکاتی۔ بچارے دو روٹیاں تو کھاتے ہیں اور یہ گوارنیں موٹے موٹے روٹ بناکر رکھ دیتی ہیں۔ وہ ایک نئی جنت کی تشکیل کرنے لگی ہے ایک نئی مسرت کا خواب دیکھنے لگی ہے۔

ایک دن سلونی نے اس سے مسکراکر کہا "امر بھیا تیرے ہی بھاگ سے یہاں آگئے منی اب تیرے دن پھریں گے۔"

منی نے خوشی کو جیسے مٹھی میں دباکر کہا "کیا کہتی ہو کاکی، کہاں میں، کہاں وہ۔ مجھ سے کئی سال چھوٹے ہوں گے۔ پھر ایسے گیانی اور اتنے نیک، ان کی بدیا کا تو جیسے کوئی اور چھور ہی نہیں۔ میں تو ان کی جوتیوں کے برابر بھی نہیں۔"

کاکی نے کہا "یہ سب ٹھیک ہے منی، پر تیرا جادو اُن پر چل گیا ہے۔ یہ میں دیکھ رہی ہوں۔ شرمیلے آدمی ہیں۔ اس سے تجھ سے کچھ کہتے نہیں۔ مگر تو ان کے دل میں سما گئی ہے۔ کیا تجھے اتنا بھی نہیں سوجھتا۔"

منی کا چہرہ کھل اٹھا تھا "تمہاری دعا ہے کاکی، تو میرا منور تھ بھی پورا ہوجائے گا۔"

منی ایک لمحے تک امرکانت کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ تب اندر جاکر اس کی چارپائی نکال لائی۔ امر کا دھیان ٹوٹا۔ بولا "رہنے دو میں ابھی نکالے لیتا ہوں۔ تم میرا اتنا دُلار کروگی منی، تو میں آرام طلب ہوجاؤں گا۔ آؤ تمہیں ہندو دیویوں کی داستان سناؤں۔"

منی نے پوچھا "کوئی کہانی ہے کیا؟"

"نہیں کہانی نہیں ہے۔ سچے حالات ہیں۔"

امر نے مسلمانوں کے حملے، راجپوت سورماؤں کے کارنامے اور چھترانیوں کے جوہر کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا۔ "ان دیویوں کو آگ میں جل جانا منظور تھا۔ مگر یہ منظور نہ تھا کہ غیر کی نگاہ بھی ان پر پڑے۔ اپنی آن پر مرمٹتی تھیں۔ ہماری دیویوں کا یہ معیار تھا۔ آج یورپ کی کیا حالت ہے۔ جرمن فوجیں فرانس پر چڑھ آئیں اور فرانس کے مردوں سے گاؤں خالی ہو گئے تو فرانس کی عورتیں جرمنی کے سپاہیوں اور افسروں پر ہی مائل ہو گئیں۔"

منی ناک سکوڑ کر بولی۔ "فرانس کی عورتیں بڑی چنچل ہوں گی؟"

"نئے زمانے کی یہی رفتار ہے۔"

"ایسا زمانہ چولھے میں جائے۔ لیکن وہ چھترانیاں جیتے جی کیسے جلتی تھیں؟ ان کا کلیجہ بڑا مضبوط ہوتا ہوگا؟"

امر نے کتاب بند کر دی۔ "بڑا مشکل ہے منی، یہاں تو ذرا سی چنگاری لگ جاتی ہے تو بلبلا اٹھتے ہیں، جبھی تو آج ساری دنیا ان کی پوجا کرتی ہے۔ میں تو جب یہ داستان پڑھتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ جی چاہتا ہے کہ جس پاک زمین پر ان دیویوں کی چتائیں بنیں اس کی راکھ سر پر چڑھاؤں آنکھوں میں لگاؤں اور وہیں مر جاؤں۔"

منی کسی دوسرے خیال میں ڈوبی ہوئی زمین کی طرف تک رہی تھی۔

امر نے پھر کہا۔ "کبھی کبھی تو ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ مردوں کو اپنی طرف سے بے فکر کرنے کے لئے عورتیں لڑائی سے پہلے ہی جل مرتی تھیں۔ آدمی کو جان اتنی پیاری ہوتی ہے کہ زندہ درگور بوڑھے بھی نہیں مرنا چاہتے۔ بڑے بڑے مہاتما بھی موت کے نام سے کانپتے ہیں۔ مگر ان دیویوں کے لئے زندگی بھی کھیل تھی"

منی اب بھی خیال میں مستغرق تھی۔ اس کے چہرے پر کسی باطنی درد کی علامت نظر آ رہی تھی۔

امر نے پوچھا "کیا سوچ رہی ہو منی، چہرا کیوں اداس ہے؟"

منی خفیف تبسم کے ساتھ بولی "مجھ سے پوچھتے ہو، مجھے کیا ہوا ہے؟"

"کچھ بات تو ہے۔ مجھ سے چھپاتی ہو؟"

"نہیں جی کوئی بات نہیں"

ایک منٹ کے بعد اس نے پھر کہا "تم سے آج اپنا حال کہوں گی، سنو گے؟"

"بڑے شوق سے۔ میں نے تو تم سے کئی بار کہا۔ تم نے سنا ہی نہیں"

"میں تم سے ڈرتی ہوں۔ تم مجھے بے شرم اور نہ جانے کیا کیا سمجھنے لگو گے"

"اگر تم مجھے اتنا بے رحم سمجھتی ہو تو بہتر ہے مت کہو۔ لیکن مجھے یہ معلوم تھا کہ تم میری طرف سے اتنی بدگمان ہو"

منی نے معذرت آمیز لہجے میں کہا "تم تو ذرا ذرا سی بات پر چڑ جاتے ہو۔ جبھی عورت سے تمہاری نہیں پٹتی۔ اچھا لو سنو جو جی میں آوے سمجھنا۔ میں جب کاشی سے چلی تو تھوڑی دیر تک مجھے کچھ ہوش ہی نہ رہا۔ کہاں جاتی ہوں، کیوں جاتی ہوں، کہاں سے آئی ہوں یہ سب بھول گئی۔ میں گاڑی میں بیٹھ کر رونے لگی۔ اپنے پیاروں کی محبت ندی کی طرح دل میں امنڈ پڑی اور میں اس میں ڈوبنے اترنے لگی۔ اب معلوم ہوا میں کیا کچھ کھو کر چلی جا رہی ہوں۔ ایسا نظر آتا تھا کہ میرا بچہ میری گود میں آنے کے لئے ہمک رہا ہے۔ میں اس کو یاد کرنے لگی۔ اس کا ہنسنا اور رونا، اس کی توتلی باتیں، اس کا سنبھل سنبھل کر چلنا، اسے چپ کرنے کے لئے چندا ماموں کو دکھانا، اسے سلانے کے لئے لوریاں سنانا ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ میری وہ چھوٹی سی دنیا کتنی سکھ سے بھری ہوئی

تھی۔ اس لعل کو گود میں لے کر میں کتنی نہال ہو جاتی تھی۔ گویا دنیا کی دولت میرے پیروں کے نیچے ہے۔ گویا دل کی ساری آرزوئیں اسی بچے میں آکر جمع ہو گئی ہوں اپنا ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا، اپنے میلے کچیلے کپڑے، قرض دام کی فکر، اپنی غریبی، اپنی بدنصیبی یہ سبھی چبھنے والے کانٹے جیسے پھول بنجاتے تھے۔ اگر کوئی خواہش تھی تو یہ کہ میرا بچہ کبھی میری آنکھوں سے دور نہ ہو۔ اور آج اسی کو چھوڑ کر میں نہ جانے کہاں چلی جا رہی تھی۔ دل کی ساری یادگاریں سامنے دوڑنے والے درختوں کی طرح گویا میرے ساتھ دوڑتی چلی آ رہی تھیں اور انھیں کے ساتھ میرا بچہ بھی دوڑتا چلا آتا تھا۔ آخر میں آگے نہ جا سکی۔ دنیا ہنستی ہے ہنسے، برادری مجھے نکالتی ہے نکال دے۔ میں اپنے بچے کو چھوڑ کر نہ جاؤں گی۔ محنت مزدوری کر کے بھی تو گذر ہو سکتا ہے۔ اپنے لعل کو آنکھوں سے دیکھتی رہوں گی۔ اُسے میری گود سے کون چھین سکتا ہے۔ میں اس کے لئے مری ہوں۔ میں نے اُسے اپنے خون سے پالا ہے۔ وہ میرا ہے میں اسے نہیں چھوڑ سکتی۔

جوں ہی لکھنؤ آیا میں گاڑی سے اتر پڑی۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ لوٹتی ہوئی گاڑی سے بنارس لوٹ جاؤں گی۔ جو کچھ ہونا ہوگا ہوگا۔

میں کتنی دیر تک پلیٹ فارم پر کھڑی رہی معلوم نہیں۔ بجلی کی بتیوں سے سارا اسٹیشن جگمگا رہا تھا۔ میں بار بار قلیوں سے پوچھتی تھی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے ان کا جواب یاد نہ رہتا تھا۔ کیونکہ میں وہی سوال بار بار کرتی تھی خیر گاڑی آئی۔ میں نے اپنا سامان سنبھالا، دل دھڑکنے لگا، مسافر چڑھنے اترنے لگے۔ قلی نے آکر کہا۔ اسباب زنانے ڈبے میں رکھوں یا مردانے میں۔

میرے منہ سے آواز نہ نکلی۔

قلی نے میرے چہرے کی طرف تکتے ہوئے پوچھا، زنانے ڈبے میں

اسباب رکھدوں ؟

میرا ارادہ تبدیل ہوگیا۔ میں اس گاڑی سے نہ جانا چاہتی تھی۔
اب دوسری گاڑی دس بجے دن کو ملے گی۔
میں اسی گاڑی سے چلوں گی۔ "

امر نے پوچھا "تم اس گاڑی سے چلی کیوں نہ گئیں ؟ "

منی نے جواب دیا "نہ جانے کیسا جی ہونے لگا۔ جیسے کوئی میرے ہاتھ پاؤں باندھے لیتا ہو۔ ان ناپاک ہاتھوں سے اپنے لعل کو کیسے اٹھاؤں گی، مجھے اپنے شوہر پر غصہ آرہا تھا وہ میرے ساتھ آیا کیوں نہیں۔ اگر اُسے میری پروا ہوتی تو مجھے اکیلا کیوں آنے دیتا۔ اسی گاڑی سے وہ بھی آسکتا تھا۔ ضرور اس کی طبیعت بدل گئی۔ جب وہ مجھے نہیں چاہتا تو میں بھی اس کے پاس نہ جاؤں گی۔ اور نہ جانے کون کون سے خیالات ذہن میں آکر مجھے جبراً روکنے لگے۔ میں مسافر خانے میں من مارے بیٹھی تھی کہ ایک صاحب اپنی عورت کے ساتھ آکر میرے ہی قریب دری بچھا کر بیٹھ گئے۔ عورت کی گود میں ایک سال بھر کا بچہ تھا۔ ایسا پھول، بچہ، ایسا گلابی رنگ، ایسی کٹورا سی آنکھیں، ایسا مکھن سا جسم۔ میں اپنے کو بھول کر اسے دیکھنے لگی۔ اپنے پرائے کی سُدھ جاتی رہی۔ ایسا معلوم ہوا کہ میرا ہی بچہ ہے۔ لڑکا ماں کی گود سے اتر کر آہستہ آہستہ رینگتا ہوا میری طرف آیا۔ میں پیچھے ہٹ گئی۔ لڑکا اور آگے بڑھا۔ میں دوسری طرف چلی گئی۔ بچہ رونے لگا۔ پھر بھی میں اس کے قریب نہ آئی۔ اس کی ماں نے میری طرف شکوہ آمیز نظروں سے دیکھ کر بچے کو دوڑ کر اٹھا لیا مگر بچہ مچلنے لگا اور بار بار میری طرف ہاتھ بڑھانے لگا میں دور کھڑی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا میرے ہاتھ کٹ گئے ہیں۔ گویا میرا ہاتھ لگتے ہی وہ سونے سا بچہ کچھ اور ہو جائے گا۔ اس میں سے کچھ نکل جائے گا

عورت نے کہا۔ "لڑکے کو ذرا اٹھا لو دیوی! تم تو جیسے بھاگ رہی ہو۔ جو پیار کرتے ہیں ان کے پاس تو ابھاگا جاتا نہیں، جو منہ پھیر لیتے ہیں ان کی طرف دوڑتا ہے۔"

لالہ میں تم سے نہیں کہہ سکتی کہ ان باتوں نے میرے دل کو کتنی چوٹ پہنچائی اسے کیسے سمجھا دوں کہ میں روسیاہ ہوں، بدنصیب ہوں۔ اور یہ بات معلوم ہونے پر کیا وہ پھر مجھ سے اپنا بچہ اٹھا لینے کو کہے گی۔

میں نے قریب آکر بچے کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھا اور ڈرتے ڈرتے اُسے اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ یکایک بچہ چلا کر ماں کی طرف بھاگا۔ گویا اس نے کوئی خوفناک صورت دیکھ لی ہو۔ اب سوچتی ہوں تو سمجھ میں آتا ہے کہ بچوں کی یہی عادت ہے لیکن اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ سچ مچ میرا چہرہ کسی بھوتنی کا سا ہو گیا۔ میں شرم سے پانی پانی ہو گئی۔

ماں نے بچے سے کہا۔ "اب جاتا کیوں نہیں رے! بلا تو رہی ہیں۔ کہاں جاؤ گی بہن؟"

میں نے ہر دوار بتلایا۔ وہ دونوں بھی ہر دوار ہی جا رہے تھے۔ میں بڑی خوش ہوئی کہ ہر دوار تک تو ساتھ رہے گا۔ لیکن بچہ پھر میری طرف نہ آیا۔

تھوڑی دیر میں وہ میاں بی بی تو سو گئے لیکن میں بیٹھی رہی۔ ماں کے سینے سے چمٹا ہوا بچہ بھی سو رہا تھا۔ میرے دل میں طوفانی ولولہ اٹھا کہ بچے کو اٹھا کر پیار کروں لیکن دل کانپ رہا تھا کہ کہیں بچہ رونے لگے یا ماں جاگ جائے تو دل میں کیا کہے گی۔ میں بچے کا چاند سا مکھڑا دیکھ رہی تھی وہ شاید کوئی سپنا دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میری طبیعت قابو سے باہر ہو گئی۔ میں نے سوتے ہوئے بچے کو سینے سے لگا لیا۔ مگر ایک ہی لمحے میں مجھے ہوش آ گیا۔ میں نے بچے

کو پھر لٹا دیا۔ ماں نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا پھر بچے کو سینے سے لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس ایک لمحے کے پیار میں کتنی روحانی خوشی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرا ہی بچہ یہ روپ بدل کر میرے پاس آ گیا ہے۔

دیوی جی کا دل بہت سخت تھا۔ بات بات پر اس بچے کو جھڑک دیتیں کبھی کبھی مار بیٹھتی تھیں۔ مجھے اس وقت ایسا غصہ آتا تھا کہ اُسے خوب ڈانٹوں۔

جب دوسرے دن ہم لوگ ہردوار کی گاڑی میں بیٹھے تو بچہ میرا ہو چکا تھا میں تم سے کیا کہوں بابو جی، میری چھاتی میں دودھ بھی آ گیا لیکن بچے کو پلاتے ہوئے ڈرتی تھی۔

ہردوار میں ہم لوگ ایک دھرم شالے میں ٹھہرے۔ میں اس بچے کے دام محبت میں بندھی ہوئی اس کنبے کے پیچھے پیچھے پھرتی رہی۔ میں ان کی لونڈی تھی۔ بچے کی ساری خدمت میرے ذمے آ گئی۔ یہاں تک کہ میں اسے دودھ بھی پلانے لگی۔ ماں کا جیسے گلا چھوٹ گیا۔ لیکن میں اس خدمت پر خوش تھی۔ دیوی جی جتنی ہی آرام طلب اور مغرور تھیں ان کے شوہر اتنے ہی بامروت اور شریف تھے میری طرف کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے۔ اگر میں کمرے میں اکیلی ہوتی تو کبھی اندر نہ آتے کچھ کچھ تمھاری جیسی عادت تھی۔ مجھے ان پر رحم آتا تھا۔ اس عورت کے ساتھ ان کی زندگی اس طرح کٹ رہی تھی گویا چوہا بلی کے پنجے میں آ گیا ہو۔ وہ انھیں بات بات پر جھڑکتی۔ بیچارے کھسیانے ہو کر رہ جاتے۔

پندرہ دن گذر گئے تھے۔ دیوی جی نے گھر لوٹنے کے لئے کہا۔ ان کے شوہر ابھی کچھ دن اور وہاں رہنا چاہتے تھے۔ اسی بات پر تکرار ہو گئی۔ میں برآمدے میں بچے کو لئے کھڑی تھی۔ دیوی جی نے گرم ہو کر کہا تمھیں رہنا ہو تو رہو میں تو آج

جاؤں گی۔ تمھاری آنکھوں نے راستہ نہیں دیکھا ہے۔"

شوہر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔"یہاں دس پانچ دن رہنے میں ہرج ہی کیا ہے مجھے تو تمھاری صحت میں کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آتی۔"

دیوی جی نے آنکھیں مٹکا کر کہا۔"آپ میری صحت کی فکر چھوڑئیے۔ میں اتنی جلد نہیں مری جا رہی ہوں۔ تم قسم کھا سکتے ہو کہ میری صحت کے خیال سے یہاں ٹھہرے ہو۔"

شوہر نے پوچھا"اور کس لئے آیا تھا؟"

"آئے چاہے جس کام کے لئے ہو مگر تم میری صحت کے خیال سے نہیں ٹھہرے ہوئے ہو۔ یہ پٹیاں ان عورتوں کو پڑھانا جو تمھارے ہتھ کنڈے سمجھتی نہ ہوں۔ میں تمھاری نس نس پہچانتی ہوں۔ تم ٹھہرنا چاہتے ہو عیش کے لئے"

بابو جی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔"اچھا اب رہنے دو نی۔ خفیف نہ کرو۔ میں آج ہی چلنے کا انتظام کرتا ہوں۔"

دیوی جی اتنی آسان فتح پا کر خوش نہ ہوئیں۔ ابھی ان کے دل میں غبار بھرا ہوا تھا۔ بولیں"ہاں چلنے کا انتظام کیوں نہ کرو گے۔ یہی تو تم چاہتے تھے۔ یہاں پیسے خرچ ہوتے ہیں نہ۔ لیجا کر اسی کال کوٹھری میں ڈال دو۔ میں مروں یا جیوں تمھاری بلا سے۔ میں مر جاؤں گی تو دوسری آجائے گی۔ بلکہ اور نئی نویلی۔ تمھاری چاندی ہی چاندی ہے۔ سوچا تھا یہاں کچھ دن رہوں گی مگر جب رہنے بھی دو۔"

امر کانت نے پوچھا۔"اس شخص نے سچ مچ کچھ شرارت کی تھی یا جھوٹا الزام تھا۔"

منی نے منہ پھیر کر مسکراتے ہوئے کہا۔"تمھاری عقل بڑی موٹی ہے لالہ! وہ عورت مجھ پر شبہ کر رہی تھی۔ بچارے بابو جی دبے جاتے تھے کہ کہیں

وہ چڑیل بات کھول کر نہ کہدے۔ ہاتھ جوڑتے تھے منتیں کرتے تھے پر وہ کسی طرح نہ مانتی تھی۔ آنکھیں مٹکا کر بولی "ایشور نے مجھے بھی دو آنکھیں دی ہیں۔ اندھی نہیں ہوں۔ میں تو اندر پڑی پڑی کراہوں اور تم باہر عیش کرو۔ تمھیں تو دل بہلانے کو کوئی شغل چاہیئے۔"

رفتہ رفتہ مجھ پر کچھ حقیقت کھلنے لگی۔ دل میں ایسی جلن ہوئی کہ ابھی اس کا منہ نوچ لوں۔ بابوجی کا لحاظ نہ ہوتا تو میں ضرور اس بدگمانی کا مزہ چکھا دیا ہوتا جہاں سوئی نہ چبھے وہاں برچھی چبھائے دیتی تھی۔

آخر بابوجی کو بھی غصہ آیا۔

"تم بالکل جھوٹ بولتی ہو۔ سراسر جھوٹ"

"میں سراسر جھوٹ بولتی ہوں؟"

"ہاں۔ سراسر جھوٹ بولتی ہو"

"کھاجاؤ اپنے بیٹے کی قسم"

مجھے چپ چاپ وہاں سے ٹل جانا چاہیئے تھا۔ لیکن اپنے دل کو کیا کروں جس سے بے انصافی دیکھی نہیں جاتی۔ میرا چہرہ مارے غصے کے تمتما اٹھا۔ میں نے اس کے سامنے جاکر کہا۔ "بہوجی بس اب زبان بند کرو نہیں اچھا نہ ہوگا۔ میں طرح دیتی جاتی ہوں اور تم سر چڑھتی جاتی ہو۔ میں تمھیں شریف سمجھ کر تمھارے ساتھ ٹھہر گئی تھی۔ اگر جانتی کہ تم اتنی بدگمان ہو تو تمھارے سایہ سے بھاگتی۔ میں ہرجائی نہیں ہوں۔ ایشور نے مجھے بھی بال بچے دیے ہیں۔ قسمت کا کھیل ہے کہ یہاں اکیلی پڑی ہوں۔"

ابھی میرے منہ سے پوری بات نہ نکلنے پائی تھی کہ میرے شوہر میرے بچے کو گود میں لئے آنگن میں کھڑے ہو گئے اور مجھے دیکھتے ہی لپک کر میری طرف

چلے۔ میں دیکھ کر ایسی سہم اٹھی گویا کوئی شیر آ گیا ہو اور فوراً اپنی کوٹھری میں جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ چھاتی دھڑ دھڑ کر رہی تھی مگر کواڑ کے دراز سے آنکھیں لگا کر دیکھ رہی تھی۔ ان کا چہرہ سنولایا ہوا تھا بالوں پر گرد جمی ہوئی تھی، اور چہرے سے مایوسی جھلک رہی تھی۔ کندھے پر کمبل اور لٹیا ڈور رکھے ہاتھ میں لمبا لٹھ لئے ایک وحشت کے عالم میں کھڑے تھے۔

بابوجی نے باہر آ کر ان سے پوچھا۔ "اچھا آپ ہی ان کے شوہر ہیں! آپ خوب آئے۔ ابھی تو وہ آپ ہی کا ذکر کر رہی تھیں۔ آئیے آرام سے بیٹھئے۔ مگر بہن اندر کیوں بھاگ گئیں۔ یہاں پردیس میں کیسا پردہ؟"

میرے مالک کو تو تم نے دیکھا ہی ہے۔ ان کے سامنے بابوجی ایسے نظر آتے تھے جیسے سانڈ کے سامنے ناٹا بیل۔

انھوں نے بابوجی کو کوئی جواب نہ دیا۔ میرے دروازے پر آ کر بولے "منی یہ کیا ستم کر رہی ہو۔ میں تین دن سے تمھیں تلاش کر رہا ہوں۔ آج ملیں بھی تو اندر جا بیٹھی۔ ایشور کے لئے دروازہ کھول دو اور میری بپت کی کہانی سن لو۔ پھر تمھاری جو مرضی ہو وہ کرنا۔" میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ بچے کو گود میں لے لینے کے لئے دل بیتاب ہو رہا تھا۔ مگر نہ جانے اندر اس کونے میں کوئی بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا۔ خبردار جو بچے کو گود میں لیا۔ ایک من کہتا تھا کہ شوہر سے بے اعتنائی مت کر۔ ایشور نے بیوی اور ماں کا جو ناتا جوڑ دیا ہے وہ کیا کسی کے توڑے ٹوٹ سکتا ہے؟ دوسرا من کہتا تھا۔ تو اب اپنے شوہر کو شوہر اور بیٹے کو بیٹا نہیں کہہ سکتی۔ تو اب اس قابل نہیں رہی۔

بچے نے کواڑ کو اپنی ننھی ننھی ہتھیلیوں سے پیچھے ڈھکیلنے کے لئے زور لگا کر کہا "توال تھولو۔"

یہ تو تلے بول کتنے میٹھے تھے۔ جیسے سناٹے میں خوف طاری ہوجانے پر ہم گانے لگتے ہیں۔ اپنی ہی آواز سے ہمیں اپنے دو کیلے پن کا احساس ہوتا ہے اسی طرح میں بھی اس وقت اپنے امنڈتے ہوئے پیار کو روکنے کے لئے بول اٹھی "اب تم کیوں میرے پیچھے پڑے ہو؟ کیوں نہیں مجھ لیتے کہ میں مرگئی؟ مرد ہوکر اتنے دل کے کچے ہو۔ ایک خانہ خراب عورت کے لئے اپنی عزت میں کیوں داغ لگاتے ہو جاکر اپنی شادی کرلو۔ اس زندگی میں میرا اب تم سے ناتا نہیں ہے۔ ہاں ایشور سے یہی دعا مانگتی ہوں کہ دوسرے جنم میں تم پھر مجھے ملو۔ میری کیوں ٹیک توڑ رہے ہو۔ مجھ پر رحم کرو۔ آج ہی یہاں سے چلے جاؤ۔ نہیں میں زہر کھالوں گی۔ اس روسیاہ کے ساتھ تمہارا کوئی میل نہیں ہے۔"

میرے شوہر نے پُر درد لہجے میں کہا "تمہارے لئے میں سب کچھ جھیل لوں گا منی! مجھے بھائی بند، اپنے بیگانے کی پروا نہیں ہے۔ میں یا تو تمہیں لے کر جاؤں گا یا یہیں دریا میں ڈوب مروں گا۔ اگر میرے دل میں تمہاری طرف سے ذرا بھی میل ہو تو ایشور مجھے نرک کی آگ میں دھکیل دے۔ اگر تمہیں نہیں چلنا ہے تو تمہارا بچہ تمہیں سونپ کر میں جاتا ہوں۔ اسے مارو یا جلاؤ۔ میں پھر تمہارے پاس نہ آؤں گا اگر کبھی میری سُدھ آئے تو چلو بھر پانی دے دینا۔"

بابوجی سوچیے۔ میں کیسی مصیبت میں گرفتار تھی۔ میرے شوہر مجھے محض دھمکی نہیں دے رہے ہیں۔ یہ میں جانتی تھی۔ جان کو وہ کتنا ناچیز سمجھتے ہیں۔ یہ بھی مجھ سے پوشیدہ نہ تھا، پھر بھی میں اپنا دل سخت کئے اندر کھڑی رہی۔ ذرا بھی نرم پڑی اور ستیاناس ہوا۔ میں نے پتھر کا کلیجہ کرکے کہا "اگر تم بچے کو میرے پاس چھوڑ گئے تو اس کے ذمہ دار تم ہوگے کیونکہ میں اس کی دُرگت دیکھنے کے لئے زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ اس کی پرورش کا بار تمہارے اوپر ہے۔ میرے لئے

زندگی میں اگر کوئی تمنا تھی تو یہی کہ میرا لڑکا اور شوہر خیریت سے رہیں۔ تم یہ خوشی مجھ سے چھین لینا چاہتے ہو چھین لو۔"

میں نے دیکھا میرے شوہر نے میرے بچے کو اٹھا لیا۔ جیسا ایک لمحہ پہلے انھوں نے اسے گود سے اتار دیا تھا۔ اور الٹے پاؤں لوٹ پڑے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔

دیوی جی نے بھلنسی سے کام لے کر انھیں بٹھانا چاہا اور پوچھنے لگیں کیا بات ہے؟ کیوں روٹھے ہوئے ہو لیکن وہ مخاطب نہ ہوئے۔ بابو صاحب پھاٹک تک انھیں پہنچانے گئے۔ میرا دل اب بھی کانپ رہا تھا کہ کہیں کوئی نئی آفت نہ آجائے۔ دیویوں اور دیوتاؤں کی منوتیاں کر رہی تھی کہ میرے پیاروں کی حفاظت کرنا۔

جوں ہی بابو جی لوٹے۔ میں نے آہستہ سے کواڑ کھول کر پوچھا "کدھر گئے کچھ اور کہتے تھے۔"

بابو جی نے پُر ملامت نظروں سے دیکھ کر کہا "کہتے کیا۔ منہ سے آواز بھی تو نکلے۔ ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے جا کر روک لو۔ وہ دریا کی طرف گئے ہیں۔ تم اتنی رحم دل ہو کر بھی اتنی بے مروت ہو یہ مجھے آج معلوم ہوا بیچارہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔" میں بے کسی کے اُس درجے کو پہنچ گئی تھی جب انسان غیروں کو بھی اپنا سمجھنے لگتا ہے۔ تند لہجے میں بولی "پھر بھی تم یہاں دوڑے چلے آئے۔ اُن کے ساتھ اور کچھ دیر رہ جاتے تو کیا چھوٹے ہو جاتے۔ یا دیوی جی کو کوئی اٹھا لے جاتا۔ یہ جانتے ہو کہ اس وقت وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہیں۔ پھر بھی انھیں چھوڑ کر بھاگے چلے آئے۔"

دیوی جی بولیں "یہاں نہ دوڑ آتے تو کیا جانے میں کہیں بھاگ جاتی

لو آکر گھر میں بیٹھو۔ میں جاتی ہوں۔ پکڑ کر گھسیٹ نہ لاؤں تو اپنے باپ کی نہیں"

دھرم شالے میں بیسیوں ہی آدمی ٹھہرے ہوئے تھے سب اپنے اپنے دروازے پر کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ دیوی جی جوں ہی نکلیں چار پانچ آدمی ان کے ساتھ ہو لئے۔ پر آدھ گھنٹے میں سبھی ناکام لوٹے۔ معلوم ہوا کہ وہ اسٹیشن کی طرف چلے گئے۔

لیکن میں جب تک انھیں گاڑی پر سوار ہوتے نہ دیکھ لوں۔ مجھے چین کہاں گاڑی صبح جائے گی۔ رات بھر وہ اسٹیشن پر رہیں گے۔ جوں ہی اندھیرا ہو گیا میں اسٹیشن پر جا پہنچی۔ وہ ایک درخت کے نیچے کمبل بچھائے بیٹھے ہوئے تھے میرا بچہ لوٹے کو گاڑی بنا کر ڈور سے کھینچ رہا تھا۔ بار بار گرتا تھا اور پھر اٹھ کر کھینچنے لگتا تھا۔ میں ایک درخت کی آڑ میں کھڑی ہو کر یہ تماشا دیکھنے لگی طرح طرح کے خیالات دل میں آنے لگے۔ آخر مجھے کس کا ڈر ہے۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ یہاں رہنے لگوں تو برادری کیا کر سکتی ہے لیکن کیا اب میں وہ ہو سکتی ہوں جو پہلے تھی۔

ایک پل کے بعد پھر وہی خیالات۔ وہ صاف کہہ رہے ہیں۔ ان کا دل صاف ہے۔ گڑے مردے اکھاڑنے کی ان کی عادت نہیں، نہ وہ اتنے بدمزاج ہیں کہ مجھے جلانے میں انھیں مزا آتا ہے۔ ان کے دل میں اب بھی وہی محبت اور وہی خلوص ہے۔ میں ناحق شش و پنج میں پڑ کر اپنی اور ان کی زندگی برباد کر رہی ہوں۔ لیکن کیا اب میں وہ ہو سکتی ہوں جو پہلے تھی؟ وہ میری عزت پہلے سے زیادہ کریں گے یہ میں جانتی ہوں۔ میں گھی کا بھی گھڑا لڑھکا دوں گی تو وہ کچھ نہ کہیں گے۔ ان کے برتاؤ میں ذرا بھی فرق نہ ہو گا۔ لیکن وہ بات کہاں جو پہلے تھی اب تو میری حالت اس مریض کی سی ہو گی جسے کوئی غذا مرغوب

نہیں ہوتی۔ اب تو مجھے رسی بھی سانپ نظر آئے گی۔

تو پھر اب میں زندہ ہی کیوں رہوں۔ جب زندگی میں کوئی مسرت نہیں کوئی آرزو نہیں تو جینا بے سود ہے۔ کچھ دن اور رو لیا تو اس سے کیا حاصل کون جانے کیا کیا، ذلتیں سہنی پڑیں، کیا کیا رسوائیاں ہوں اس سے تو مرجانا کہیں اچھا ہے۔

یہ فیصلہ کرکے میں اٹھی۔ سامنے ہی وہ سو رہے تھے۔ بچہ بھی ان کی گود سے چمٹا ہوا تھا۔ آہ کتنا دل شکن نظارہ تھا۔ میری کائنات بخیل کی دولت کی طرح میرے سامنے پڑی ہوئی تھی۔ بخیل اسے خرچ نہیں کرتا، کسی کو دیتا بھی نہیں۔ اس کے لئے یہی خیال باعث تسکین ہے کہ اس کے پاس دولت ہے اس خیال ہی سے اُسے کتنی تقویت اور کتنا اطمینان ہوتا ہے۔ میں اسی رشتے کو توڑنے جا رہی تھی

میں ڈرتے ڈرتے گویا اپنی جان ہاتھوں میں لیے شوہر کے پاس گئی لیکن وہاں ایک لمحے بھی کھڑی نہ رہ سکی۔ جیسے لوہا کھنچ کر مقناطیس سے جا لپٹتا ہے اسی طرح میں بھی ان کی طرف کھنچی جا رہی تھی۔ میں نے اپنے ارادہ کا سارا زور لگا کر اپنے کو دور ہٹا لیا اور اسی عالم میں دوڑتے ہوئے دریا کے کنارے آگئی اور یکایک کود پڑی۔"

امرکانت نے درد سے بیتاب ہو کر کہا۔ "اب نہیں سنا جاتا منی پھر کبھی کہنا"

منی مسکرا کر بولی، "واہ اب رہ ہی کیا گیا۔ میں کتنی دیر پانی میں رہی کہہ نہیں سکتی جب ہوش آیا تو اسی گھر میں پڑی ہوئی تھی۔ میں بہتی چلی جاتی تھی۔ ترڑکے چودھری کا بڑا لڑکا سمیر اشنان کرنے گیا اور مجھے اٹھا لایا، تب سے میں یہیں ہوں۔"

اچھوتوں کی اس جھونپڑی میں مجھے جو آرام اور اطمینان میسر ہوا اس کی کیا تعریف کروں۔ افسوس سمیر اس دنیا میں نہیں ہے۔ میں ابھی اچھی طرح اٹھنے بیٹھنے

بھی نہ پائی تھی کہ اس نے جنت کی راہ لی۔"

امرکانت کے دل میں ایک کانٹا برابر کھٹک رہا تھا۔ وہ کچھ تو نکلا اور کچھ باقی تھا۔ جھجکتا ہوا بولا "سمیر کی نیت نہ جانے کیسی رہی ہو؟"

منی کے تیور بدل گئے "ہاں اسے مجھ سے محبت تھی اور بہت زیادہ محبت تھی تو اس میں میری کیا خطا اور تم نے مجھ سے یہ سوال پوچھا ہی کیوں خواہ مخواہ زخم پر نمک چھڑک رہے ہو۔ جاؤ اب میں اپنا قصہ نہیں کہتی۔"

امرکانت نے معذرت کے انداز سے کہا "نہیں نہیں میرا یہ منشا نہیں تھا تم بالکل غلط سمجھیں میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔"

منی نے پھر کہنا شروع کیا "بات یہ ہوئی کہ جب میں بھلی چنگی ہو گئی تو ایک دن اس نے مجھے چھیڑا۔ میں نے غصے کو ہنسی میں لپیٹ کر کہا۔ کیا تم اس طرح مجھ سے نیکی کا بدلا چاہتے ہو؟ اگر یہ بات ہے تو پھر تم لے جا کر مجھے دریا میں ڈبا دو اگر اس نیت سے میری جان بچائی تو تم نے میرے ساتھ بڑا ستم کیا۔ تم جانتے ہو میں کون ہوں؟ میں ٹھکرائی ہوں کبھی بھول کر بھی مجھ سے ایسی بات نہ کہنا۔ ورنہ دریا یہاں سے دور نہیں ہے" سمیر ایسا پشیمان ہوا کہ سر نہ اٹھا سکا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے اس برتاؤ نے اس کا دل توڑ دیا۔ اس دن سے اداس رہنے لگا ایک دن میری پسلیوں میں درد ہونے لگا۔ گاؤں والوں کو بھوت کا شبہ ہوا۔ سمیرا وجھا کو بلانے گیا۔ ندی چڑھی ہوئی تھی رات کو ناؤ نہ تھی۔ تیر کر اس پار جانا چاہا ڈوب گیا۔ مجھے اس کی موت کا اتنا صدمہ ہوا کہ شاید اتنا ہی اپنے سگے بھائی کے مرنے کا ہوتا۔ ان نیچوں میں بھی ایسے دیوتا ہوتے ہیں۔ اس کا مجھے یہیں آ کر پتہ لگا۔ کچھ دن اور جی جاتا تو اس گھر کے بھاگ جاگ جاتے۔"

امرکانت نے پوچھا "پھر تمھیں اپنے شوہر اور بیٹے کا کچھ حال نہ معلوم ہوا؟"

منی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ روتے روتے ہچکی بندھ گئی سسک سسک کر بولی۔ "ملا کیوں نہیں۔ سویرے وہ پھر دھرم شالے میں گئے جب انھیں معلوم ہوا کہ میں رات ہی سے غائب ہوں تو مجھے ڈھونڈھنے لگے۔ جدھر کوئی بتلا دیتا ادھر ہی چلے جاتے۔ ایک مہینے تک سارے علاقے میں مارے مارے پھرے۔ اس مایوسی اور رنج سے ان کے دماغ میں کچھ فتور آ گیا۔ پھر ہردوار آئے مگر اب کی دفعہ بچہ ان کے ساتھ نہ تھا۔ کوئی پوچھتا کہ تمھارا لڑکا کیا ہوا تو ہنسنے لگتے، جب میں اچھی ہو گئی تو جی میں آیا کہ ہردوار جا کر دریافت کروں کہ وہ کہاں گئے۔ ایک مہینے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ ملنے کی امید تو نہ تھی پر یہ بھی خیال تھا کہ ایک چٹھی لکھ کر چھوڑ آؤں گی۔ اس دھرم شالے کے سامنے پہنچی تو دیکھا بہت سے آدمی دروازے پر جمع ہیں۔ میں بھی چلی گئی بیچ میں ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔ لوگ کہہ رہے تھے، وہی پگلا ہے۔ وہی جو عورت کو کھوجتا پھرتا تھا میں پہچان گئی۔ وہی میرے مالک تھے سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ جس بات سے ڈرتی تھی وہی ہو گئی۔ جانتی کہ یہ شامت آنے والی ہے تو ان کے ساتھ ہی نہ چلی جاتی۔ لیکن آدمی بڑا بے حیا ہے۔ اب بھی مرتے نہ بنا۔ اب کس کے لئے مرتی۔ کھاتی پیتی بھی ہوں۔ ہنستی بھی ہوں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ بس یہی میری رام کہانی ہے۔"

تیسرا حصہ

(۱)

لالہ سمرکانت کی زندگی کے سارے منصوبے خاک میں مل گئے۔ انھوں نے خیال کیا تھا کہ زندگی کے آخری دنوں میں اپنا سب کچھ بیٹے کو سونپ کر اور بیٹی کی شادی کر کے کسی گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر ایشور کی یاد کریں گے۔ لیکن دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ یہ تو مانی ہوئی بات تھی کہ وہ آخری سانس تک آرام سے بیٹھنے والے آدمی نہ تھے۔ لڑکے کو عروج پر چڑھتے دیکھ کر ان کے حوصلے اور بھی بڑھتے لیکن کہنے کو ہو گیا۔ اس درمیان میں امرکانت کچھ ڈھرے پر آتا ہوا معلوم ہوتا تھا لیکن جب اس کی عقل ہی میں فتور آ گیا تو اب اس سے کیا امید کی جا سکتی تھی امرکانت میں اور چاہے جتنی برائیاں ہوں اس کے کردار کے متعلق کسی طرح کا اندیشہ نہ تھا۔ لیکن بری صحبت میں پڑ کر اس نے دھرم بھی کھویا۔ آبرو بھی کھوئی اور اطوار بھی کھوئے لالہ سمرکانت ناجائز تعلقات کو بہت معیوب نہ سمجھتے تھے۔ رئیسوں میں یہ رواج زمانہ قدیم سے چلا آتا ہے۔ وہ رئیس ہی کیا جو اس طرح کے ناٹک نہ کھیلے۔ لیکن دھرم چھوڑنے کو تیار ہو جانا کھلے خزانے، خاندانی روایات سے انحراف کرنا یہ تو جنون ہے بالکل گدھا پن۔

سمرکانت کی عملی زندگی ان کی مذہبی زندگی سے بالکل الگ تھی۔ دنیاوی

معاملات اور لین دین میں وہ دھوکے دھڑی، دغا اور فریب سب کچھ جائز سمجھتے تھے ان کے آئین تجارت میں سن یا کپاس میں کوڑا بھر دینا، گھی میں آلو یا گھیاں گیر دینا جواز کے دائرے سے باہر نہ تھا۔ مگر بغیر نہائے منہ میں پانی ڈالنا بھی ایسا گناہ تھا جس کا کوئی کفارہ نہ تھا ان چالیس برسوں میں شاید ہی کوئی دن ایسا ہوا ہو کہ انھوں نے شام کی آرتی نہ کی ہو اور تلسی دل ماتھے پر نہ چڑھایا ہو۔ خلاصہ یہ کہ ان کا مذہب نمائش کی چیز تھا جس کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا۔

سلیم کے گھر سے لوٹ کر پہلا کام جو انھوں نے کیا وہ سکھدا کو پھٹکار بتلانا تھا اس کے بعد نینا کی باری آئی۔ دونوں کو رلا کر وہ اپنے کمرے میں گئے اور خود رونے لگے۔

راتوں رات یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ اس پر لوگوں نے من مانے حاشئے چڑھائے۔ سمر کانت دن بھر گھر سے نہ نکلے۔ یہاں تک کہ آج اشنان کرنے بھی نہ گئے۔ کئی اسامی روپئے لے کر آئے۔ منیم تجوری کی کنجی مانگنے گیا۔ لالہ جی نے ایسا ڈانٹا کہ وہ چپکے سے باہر نکل آیا۔ اسامی روپئے لے کر لوٹ گئے۔

خدمت گار نے چاندی کا حقہ لا کر سامنے رکھ دیا۔ تمباکو جل گیا۔ لالہ جی نے منہ سے نہ لگایا۔ دس بجے سکھدا نے آکر پوچھا "آپ کیا کھائیں گے؟"

لالہ جی اُسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھ کر بولے "مجھے بھوک نہیں ہے۔"

سکھدا چلی گئی۔ دن بھر کسی نے کچھ نہ کھایا۔

نو بجے رات کو نینا نے آکر کہا "دادا آپ آرتی میں نہ جائیے گا؟"

لالہ جی چونکے "ہاں جاؤں گا کیوں نہیں۔ تم لوگوں نے کچھ کھایا یا نہیں؟"

نینا بولی کسی کو بھوک ہی نہ تھی کون کھاتا۔"

"تو کیا امر کے پیچھے سارا گھر جان دیدے گا؟"

سکھدا بھی آ پہنچی تھی، "بولی جب آپ ہی جان دے رہے ہیں تو دوسروں پر آپ کیوں بگڑتے ہیں۔"

لالہ جی چادر اوڑھ کر جاتے ہوئے بولے "میرا کیا بگڑا ہے کہ میں جان دوں یہاں تھا تو مجھے کون سا آرام دیتا تھا۔ میں نے بیٹے کا سکھ ہی نہ جانا تب بھی جلا رہا تھا اب بھی جلا رہا ہے۔ چلو کھانا پکاؤ میں آ کر کھاؤں گا۔ جو گیا اسے جانے دو۔ جو ہیں انھیں کو اس جانے والے کی کسر پوری کرنی ہے۔ میں کیوں جان دینے لگا۔ یہ گرہستی میں نے جوڑی ہے۔ اس کے چلانے کا بار بھی مجھ پر ہے، جب تک دم میں دم ہے اس چکی کو پیستا رہوں گا۔ آرام میری تقدیر ہی میں نہیں لکھا ہے مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس لونڈے کو یہ سوجھی کیا اس کی تو ایسی عادت نہ تھی اس کو ایشور کی لیلا کہتے ہیں۔"

ٹھاکر دوارے میں لوگ جمع ہو گئے تھے۔ لالہ سمرکانت کو دیکھتے ہی کئی صاحبوں نے پوچھا۔ "امر کہیں چلے گئے کیا سیٹھ جی! کیا بات ہوئی۔"

لالہ جی نے گویا اس وار کو رد کرتے ہوئے کہا: "کچھ نہیں اس کی بہت دنوں سے گھومنے گھامنے کی خواہش تھی چلا گیا۔ پچھلے جنم کا ہتسوی ہے۔ اس کا بس چلے تو میری ساری گرہستی ایک دن میں لٹا دے۔ مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا بس یہی جھگڑا ہے۔ میں نے غریبی کا مزہ بھی چکھا ہے۔ اس نے ابھی غریبی کا مزہ نہیں چکھا سال چھ مہینے دنیا کی ہوا کھائے گا تو آنکھیں کھل جائیں گی۔ تب اُسے معلوم ہو جائے گا کہ دنیا کی خدمت بھی وہی کر سکتا ہے جس کے پاس پیسے ہیں۔"

کسی کو اور کچھ پوچھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ مگر احمق پوجاری پوچھ ہی بیٹھا "سنا ہے

کسی جولاہے کی لڑکی سے پھنس گئے تھے۔"

یہ بیہودہ سوال سن کر لوگوں نے زبان کاٹ کر منہ پھیر لئے۔ لالہ جی نے پجاری کو قاتل نظروں سے دیکھا اور تند لہجے میں بولے "ہاں پھنس گئے تھے تو پھر؟ کرشن بھگوان نے ایک ہزار رانیوں کے ساتھ بھوگ کیا تھا؟ راجہ شانتنوں نے مچھوے کی لڑکی کے ساتھ نہیں شادی کی تھی۔ کون راجہ ہے جس کے محل میں سو دو سو عورتیں نہ ہوں۔ امر نے ایسا کیا تو کوئی نئی بات نہیں کی تم جیسے بھکاری اپنا ہی پیٹ نہیں پال سکتے تو کیا عورت کو رکھیں گے۔ تمھارے لئے یہی جواب ہے۔ سمجھداروں کے لئے یہ جواب ہے کہ جس کے گھر میں پری جیسی عورت بیٹھی ہو وہ کیوں جھوٹے پنل چاٹنے لگا۔"

یہ کہتے ہوئے لالہ جی مورت کے سامنے گئے۔ لیکن آج ان کے من میں عقیدت کا جوش نہ تھا۔ آفت کے مارے، امید سے ایشور کی پرستش کرتے ہیں قسمت کے پورے خوف سے آفت رسیدوں پر جتنی زیادہ مصیبتیں پڑتی ہیں ان کا اعتقاد بھی اتنا ہی زیادہ بڑھتا ہے۔ خوش نصیب پر جب آفت آتی ہے تو وہ باغی ہو جاتا ہے۔ وہ ایشور کو بھی اپنی دولت کے سامنے جھکانا چاہتا ہے۔ لالہ جی کا بے چین دل آج سونے اور ریشم سے جگمگاتی ہوئی مورت میں صبر اور تشفی کا پیغام نہ پا سکا۔ کل تک یہی مورت انھیں طاقت اور ہمت عطا کرتی تھی اسی مورت سے آج ان کا غم نصیب دل انحراف کر رہا تھا۔ ان کی پرستش کا یہی انعام ہے!!

وہ چلنے لگے تو برہم چاری جی بولے "لالہ جی اب کی یہاں سری بالمیکی جی کی کتھا کا بچار ہے۔"

لالہ جی نے پیچھے پھر کر کہا۔ "ہاں ہاں ہونے دو۔"

ایک بابو صاحب نے کہا۔"یہاں تو کسی میں اتنی مقدرت نہیں ہے آپ ہی مدد کریں تو کتھا بیٹھ سکتی ہے۔"

سمر کانت نے جوش کے ساتھ کہا۔"ہاں ہاں میں اس کی ساری ذمہ داری لینے کو تیار ہوں۔ بھگوت بھجن سے بڑھ کر دولت کا اور کیا مناسب خرچ ہو سکتا ہے۔"

ان کا یہ جوش دیکھ کر لوگ تعجب میں آ گئے۔ وہ بخیل تھے اور کسی مذہبی کام میں پیش قدمی نہ کرتے تھے۔ لوگوں نے سمجھا تھا ان سے دس بیس روپے ہی مل جائیں تو غنیمت ہے۔ انھیں یوں بازی مارتے دیکھ کر اور لوگ بھی گرمائے۔ سیٹھ دھنی رام نے کہا۔"آپ سے سارا بار لینے کو نہیں کہا جاتا لالہ جی، آپ صاحب مال سہی لیکن اوروں کو بھی تو عقیدت ہے۔ چندے سے ہونے دیجئے۔" سمر کانت بولے "تو اور لوگ آپس میں چندہ کر لیں۔ جتنی کمی رہ جائے گی میں پوری کر دوں گا۔"

دھنی رام کو خوف ہوا کہ کہیں یہ حضرت سستے نہ چھوٹ جائیں۔ بولے "آپ کو جتنا لکھنا ہو لکھ دیں۔"

سمر کانت نے کہا۔"پہلے آپ لکھئے۔"

کاغذ، قلم دوات لائی گئی۔ دھنی رام نے لکھا ایک سو ایک

سمر کانت نے برہم چاری جی سے پوچھا۔"آپ کا کیا تخمینہ ہے؟"

برہم چاری جی کا تخمینہ ایک ہزار کا تھا۔

سمر کانت نے آٹھ سو ننانوے روپے لکھ دئے اور وہاں سے چلے آئے سچی عقیدت کی کمی کو وہ دولت سے پورا کرنا چاہتے تھے۔ روحانی عقیدت میں جتنی کمی ہوتی ہے اتنا ہی نمائش میں اضافہ ہوتا ہے۔

(۲)

امرکانت کا خط لئے ہوئے نینا اندر گئی تو سکھدا نے پوچھا "کس کا خط ہے ؟"

نینا نے خط کا مضمون بتلا دیا۔

سکھدا نے کہا "اچھا ان کا خط ہے! کہاں ہیں ؟"

"ہردوار کے پاس کسی گاؤں میں ہیں"

آج پانچ مہینے سے دونوں میں امرکانت کا مطلق ذکر نہ آیا تھا گویا کوئی زخم تھا جسے چھوتے ہی دونوں کے دل کانپتے تھے۔ سکھدا نے پھر کچھ نہ پوچھا بچے کے لئے ایک فراک سی رہی تھی پھر اسی میں مصروف ہو گئی۔

نینا خط کا جواب لکھنے لگی۔ آج پانچ مہینے کے بعد آپ کو میری یاد آئی ہے۔ نہ جانے کیا کیا لکھنا چاہتی تھی۔ آخر کئی گھنٹوں کے بعد وہ خط تیار ہوا جو ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ خط لے کر وہ بھابی کو دکھانے گئی۔ سکھدا نے دیکھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

نینا نے دل شکستہ ہو کر پوچھا "تمہاری طرف سے بھی کچھ لکھ دوں؟"

"نہیں کوئی ضرورت نہیں"

"تمہیں اپنے ہاتھ سے لکھدو"

"مجھے کچھ لکھنا ہی نہیں ہے۔"

نینا رونی صورت لئے چلی گئی۔ خط ڈاک میں بھیجا گیا۔

سکھدا کو امر کے نام سے بھی چڑھ ہے۔ اس کے کمرے میں امر کی ایک تصویر تھی۔ اسے اس نے اتار کر رکھ ہی نہیں دیا بلکہ توڑ کر پھینکدیا۔ اب اس کے

پاس امر کی یاد دلانے والی کوئی چیز نہ تھی۔ یہاں تک کہ بچے سے بھی اس کا جی بھر گیا تھا۔ بچہ بیشتر نینا کے پاس رہتا تھا، مگر وہ شکستہ خاطر نہ تھی۔ اس کی خودپروری کئی گنی بڑھ گئی ہے۔ اس کی خود اعتمادی بھی کہیں زیادہ ہو گئی ہے۔ اور وہ اب کسی کی دست نگر نہیں رہنا چاہتی۔ محبت کے سوا اور کسی طرح کا دباؤ اس کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ اس کی تکلف پسندی گویا خودداری کے جنگل میں کھو گئی ہے۔

لیکن حیرت کا مقام تو یہ ہے کہ سکینہ سے اسے مطلق پرخاش نہیں ہے وہ اُسے بھی اپنی ہی طرح بلکہ اپنے سے کہیں زیادہ قابل رحم سمجھتی ہے۔ اس غریب مسلمان چھوکری کی کتنی رسوائی ہوئی۔ اور اب بے چاری اس سنگدل کے نام کو رو رہی ہے۔ حضرت کا وہ سارا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔ ایسے چھچھوروں کا اعتبار ہی کیا۔ وہاں کوئی دوسرا شکار تاک لیا ہوگا۔ سکینہ سے ملنے کا اُسے بار بار اشتیاق ہوتا تھا، مگر سوچ سوچ کر رہ جاتی تھی۔

ایک دن پٹھانی سے معلوم ہوا کہ سکینہ بہت بیمار ہے۔ اُس دن سکھدا نے اس سے ملنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ نینا کو بھی ساتھ لے لیا۔ پٹھانی نے راستے میں کہا "میں تمھیں گھر دکھا کر کہیں چلی جاؤں گی۔ بہوجی، مجھ سے تو جبھی سے اس سے بول چال بند ہے۔ ایسی اچھی شادی طے ہو رہی تھی اس نے منظور ہی نہ کی۔ میں بھی چپ ہوں دیکھوں کب تک اس کے نام پر بیٹھی رہتی ہے۔ میرے جیتے جی تو لالہ گھر میں قدم نہ رکھنے پائیں گے۔ ہاں مرنے کے بعد کی نہیں کہہ سکتی۔"

سکھدا نے چھیڑا "کسی دن ان کا خط آجائے اور سکینہ ان کے پاس چلی جائے تو کیا کرو گی؟"

بڑھیا آنکھیں نکال کر بولی "مجال ہے کہ اس طرح چلی جائے، خون پی ڈالوں"
سکھدا نے پھر چھیڑا "جب وہ مسلمان ہونے کو کہتے ہیں تب تمہیں کیا انکار ہے"
پٹھانی نے کان پر ہاتھ رکھ کر کہا "ارے بیٹا جس کا زندگی بھر نمک کھایا اس کا گھر اجاڑ کر اپنا گھر بساؤں، یہ شریفوں کا کام نہیں ہے۔ میری تو سمجھ ہی میں نہیں آتا اس چھوکری میں کیا دیکھ کر بھیا جی ریجھ پڑے۔"

اپنا گھر دکھا کر پٹھانی تو پڑوس کے گھر میں چلی گئی۔ دونوں عورتوں نے سکینہ کے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ سکینہ نے دروازہ کھولا تو دونوں کو دیکھ کر گھبرا سی گئی جیسے کہیں بھاگنا چاہتی ہو کہاں بٹھائے، کیا خاطر کرے۔

سکھدا نے ہمدردانہ لہجے میں کہا "تم پریشان نہ ہو بہن! ہم اس چارپائی پر بیٹھے جاتے ہیں۔ تم تو ایسی معلوم ہوتی ہو جیسے چھ مہینے کا مریض ہو۔ ایک بے وفا آدمی کے چکر میں پڑ کر کیا جان دے دو گی؟"

سکینہ کا زرد چہرہ زرد سے سرخ ہو گیا۔ اسے ایسا گمان ہوا کہ سکھدا اس سے جواب طلب کر رہی ہے۔ تم نے میرا بنا بنایا گھر کیوں اجاڑ دیا؟ اس کا سکینہ کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ سیلاب کچھ اس ناگہانی طور پر نازل ہوا کہ وہ اس کی رو میں بہہ گئی۔ پہلے بادل کا ایک ٹکڑا آسمان کے ایک کونے میں نظر آیا دیکھتے دیکھتے سارے آسمان پر بادل چھا گئے۔ اور ایسے زوروں کی بارش ہوئی کہ وہ خود اس میں بہہ گئی۔ وہ کیا بتائے کیسے کیا ہوا۔ بادل کے اس ٹکڑے کو کون کہہ سکتا تھا کہ سیلاب آرہا ہے۔

اس نے سر جھکا کر کہا "عورت کی زندگی اور ہے ہی کس لئے۔ بہن وہ اپنے دل سے ناچار ہے جس سے وفا کی امید کرتی ہے وہی دغا دیتا ہے اس میں کیا اختیار لیکن بے وفاؤں سے محبت نہ ہو تو محبت میں مزہ ہی کیا شکوہ

ایک رات میرے ساتھ گزارلو ۲۴ اسکا بعد محبت کی میں صدقے جاؤں گی

جی ہاں درست ہے

شکایت، بے تابی اور بے قراری ہی تو محبت کے مزے ہیں، پھر میں تو وفا کی امید بھی نہ کرتی تھی۔ اس وقت بھی جانتی تھی کہ یہ سیلاب دو چار گھڑی کا مہمان ہے۔ لیکن میری تسکین کے لئے تو اتنا ہی کافی تھا کہ جس آدمی کی میں دل میں سب سے زیادہ عزت کرتی تھی اس نے مجھے اس لائق تو سمجھا! میں اسی کاغذ کی ناؤ پر بیٹھ کر اس ساگر کو پار کر دوں گی۔ "خدا وہ دن کسی سے نہ دکھائے"

سکینہ کی یہ روانی بیان دیکھ کر سکھدا حیرت میں آ گئی کہیں جھجھک نہیں کہیں پردہ داری نہیں جو اس کے خلوص کا پتہ دے رہا تھا۔ لیکن ابھی اس کے دل کا غبار نہیں نکلا تھا۔ بولی "یہی تو مردوں کے ہتھ کنڈے ہیں۔ پہلے تو ایسے بن جائیں گے گویا ساری شرافت انھیں پر ختم ہے۔ پھر طوطوں کی طرح آنکھیں پھیر لیں گے"

سکینہ نے بے باکانہ لہجے میں کہا: "بہن بننے سے کوئی شریف نہیں بن جاتا شرافت انسان کے دل میں ہوتی ہے آپ کی عمر چاہے سال دو سال مجھ سے زیادہ ہو لیکن اس معاملے میں مجھے آپ سے کہیں زیادہ تجربہ ہے یہ میں غرور سے نہیں کہتی، شرم سے کہتی ہوں۔ خدا نہ کرے غریب کی لڑکی حسین ہو۔ غریبی میں حسن بلائے جان ہے۔ وہاں بڑوں کا تو کہنا ہی کیا، چھوٹوں کی رسائی بھی بڑی آسانی سے ہو جاتی ہے۔ اماں بڑی پارسا ہیں۔ مجھے پاک دامن سمجھتی ہوں گی۔ کسی آدمی کو دروازے پر کھڑا نہیں ہونے دیتیں لیکن اس وقت بات آ پڑی ہے تو کہنا ہی پڑتا ہے کہ مجھے مردوں کے دیکھنے اور پرکھنے کے کافی موقعے ملے ہیں: سبھی نے مجھے تفریح کی جنس سمجھا اور میری غربت سے اپنی ہوس پوری کرنی چاہی۔ اگر کسی نے مجھے عزت اور اعتماد کی نگاہ سے دیکھا تو وہ بابو جی تھے۔ میں خدا کو گواہ کر کے کہتی ہوں کہ انھوں نے مجھے ایک بار بھی ایسی نگاہوں سے نہیں دیکھا اور نہ ایک کلمہ بھی ایسا منہ سے نکالا جس سے

نفس پرستی کی بو آئی ہو۔ یہ ان کا خلوص تھا جس نے میرے دل پر اپنا گہرا نقش جما لیا۔ انھوں نے مجھے نکاح کی دعوت دی۔ میں نے اسے منظور کر لیا اب جب تک وہ خود دعوت کو رد نہ کریں۔ میں ان کی پابند ہوں چاہے مجھے عمر بھر یوں ہی رہنا پڑے۔ ان تھوڑی سی مختصر ملاقاتوں میں ہی مجھے ان پر اعتماد ہو گیا ہے کہ میں عمر بھر ان کے نام پر بیٹھی رہ سکتی ہوں، مجھے اب افسوس ہوتا ہے کہ کیوں نہ ان کے ساتھ چلی گئی۔ میرے رہنے سے کچھ تو انھیں آرام ہوتا کچھ تو ان کی خدمت کر سکتی۔ مجھ پر ان کی نگاہ پڑی یہ اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ ان پر رنگ روپ کا جادو نہیں چل سکتا۔ حور بھی آجائے تو اس کی طرف آنکھیں اٹھا کر نہ دیکھیں گے۔ لیکن خدمت اور احسان کا جادو بڑی آسانی سے ان پر چل سکتا ہے، یہی خوف ہے۔ میں آپ سے سچے دل سے کہتی ہوں ہیں میرے لئے اس سے بڑی خوشی کی بات اور نہیں ہو سکتی کہ آپ میں اور ان میں صفائی ہو جائے اور دلوں کی کدورت مٹ جائے کیونکہ میرا یہ بھی ارادہ تھا کہ میں آپ کی سوت نہ بنوں۔ میں ان کے ساتھ نہ گئی اس کا یہی سبب تھا۔ مجھ پر تو انھوں نے جو شفقت کی ہے وہی میرے لئے کافی ہے۔ لیکن برا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔؟"

سکھدا نے جواب دیا "تم جس صاف دلی سے باتیں کر رہی ہو اس سے مجھے تمہاری کوئی بات بھی بری نہ معلوم ہوگی۔ شوق سے کہو۔"

سکینہ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "اب تو ان کا پتہ معلوم ہو گیا ہے آپ ایک بار ان کے پاس چلی جائیں۔ وہ خدمت کے غلام ہیں اور خدمت سے ہی آپ انھیں اپنا بنا سکتی ہیں۔"

سکھدا نے پوچھا "بس یا اور کچھ؟"

"بس اور میں آپ کو کیا سمجھاؤں گی۔ آپ مجھ سے زیادہ سمجھدار ہیں۔"

سکھدا نے ترش ہو کر کہا "انھوں نے میرے ساتھ دغا کی ہے۔ میں ایسے کمینہ آدمی کی خوشامد نہیں کر سکتی۔ اگر آج میں کسی مرد کے ساتھ بھاگ جاؤں تو تم سمجھتی ہو وہ مجھے منانے جائیں گے۔ ہاں شاید میری گردن کاٹنے جائیں ہیں عورت ہوں اور اتنی سنگدل نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان کی خوشامد تو میں مرتے دم تک نہیں کر سکتی۔"

یہ کہتی ہوئی سکھدا اٹھ کھڑی ہوئی۔ سکینہ دل میں پچھتائی کہ کیوں ضرورت سے زیادہ بہنا پا جتا کر اس نے سکھدا کو ناراض کر دیا دروازے تک معافی مانگتے ہوئے آئی دونوں تانگے پر بیٹھیں تو نینا نے کہا "تمھیں غصہ بہت جلد آجاتا ہے بھابی۔"

سکھدا نے جل کر کہا تم تو ایسا کہو گی ہی۔ اپنے بھائی کی بہن ہو نا دنیا میں ایسی کون عورت ہے جو ایسے شوہر کو منانے جائے گی، ہاں شاید سکینہ چلی جاتی۔ اس لئے کہ اسے ایسی چیز مل گئی ہے جس کی اسے امید نہ تھی۔"

نینا نے کہا "وہ اپنے دل میں تمھیں کیا سمجھ رہی ہو گی؟"

سکھدا لاپروائی سے بولی "اس کی مجھے پروا نہیں ہے۔ مگر ایک بات مجھے معلوم ہو گئی اس چھوکری میں وہ سارے اوصاف موجود ہیں جو مردوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ ایسی ہی عورتیں مردوں کے دلوں پر راج کرتی ہیں۔ میرے دل میں تو کبھی تسلیم کی یہ کیفیت پیدا ہی نہ ہوئی۔ میں ان سے ہنس کر بولنے اور اپنے حسن و شباب کی نمائش میں ہی پڑی رہ گئی۔ نہ کبھی پریم کیا نہ کبھی پریم پایا۔ مجھے برسوں میں جو چیز نہ ملی وہ اسے گھنٹوں میں مل گئی۔ آج مجھے کچھ کچھ علم ہوا کہ مجھ میں کیا عیب ہے۔ سکینہ نے میری آنکھیں کھول دیں میں اس سے ہمدردی کرنے آئی مگر یہاں سے کچھ سبق لے کر جا رہی ہوں۔ لیکن انھیں تو میں کبھی معاف نہیں

*

کر سکتی اگر میں اپنا قصور مان بھی لوں تو وہ الزام سے بری نہیں ہو سکتے"
ہر لڑکی کی قیمت لڑکے استطاعت رکھتی ہے

(۳)

ایک مہینے سے ٹھاکر دوارے میں کتھا ہو رہی ہے۔ پنڈت مدھوسودن جی اس فن کے ماہر ہیں۔ ان کی کتھا میں ناٹک کا لطف بھی ہے اور نظم کا بھی۔ جتنی آسانی سے وہ خلقت کو رلا سکتے ہیں اتنی ہی آسانی سے ہنسا بھی سکتے ہیں۔ روایتوں کے تو وہ گویا دریا ہیں۔ اور بیان میں اتنے مشاق کہ جو تمثیل بیان کرتے ہیں اس کی تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ سارا شہر امڈا پڑا ہے۔ رامابائی تو شام ہی سے ٹھاکر دوارے میں آ پہنچی ہیں بیاس جی اور ان کے بھجن گانے والے سب انھیں کے مہمان ہیں۔ نینا بھی للو کو گود میں لے کر پہنچ جاتی ہے۔ صرف سکھدا کو کتھا میں دلچسپی نہیں ہے وہ نینا کے بار بار اصرار کرنے پر بھی نہیں آتی۔ اس کا سرکش دل گویا ساری دنیا کے مقابلہ کرنے کے لئے ننگی تلوار لئے کھڑا رہتا ہے کبھی کبھی تو اس کی طبیعت اتنی بیقرار ہو جاتی ہے کہ مذہب اور اخلاق کی ساری پابندیوں کو توڑ کر پھینک دے۔ ایسے نفس پرستوں کی یہی سزا ہے کہ ان کی عورتیں بھی انھیں کے نقش قدم پر چلیں تب ان کی آنکھیں کھلیں گی اور انھیں معلوم ہو گا کہ جلنا کسے کہتے ہیں۔ ایک وہ خاندانی عزت و وقار کے نام کو رونے لیکن یہ بے دادہیت دنوں نہ چلے گی اب کوئی اس گمان میں نہ رہے کہ شوہر چاہے جو کچھ کرے اس کی عورت اس کے پاؤں دھو دھو کر پیے گی، اسے اپنا مالک سمجھے گی۔ اس کے پاؤں دبائے گی۔ اور وہ اس سے ہنس کر بولے گا تو اپنے کو خوش نصیب سمجھے گی وہ دن لد گئے۔

آج نینا بحث کر بیٹھی "تم کہتی ہو مرد کے اطوار کی آزمائش کر لینی چاہئے

کیا آزمائش کرنے میں دھوکا نہیں ہوتا جن لوگوں میں آزمائش کا عام رواج ہے کیا ان کے یہاں آئے دن طلاقیں نہیں ہوتی رہتیں میں تو سمجھتی ہوں طلاق کی مثالیں انھیں کے یہاں زیادہ ترملتی ہیں۔"

سکھدا بولی۔"تو طلاق کو تم بُرا کیوں سمجھتی ہو۔ وہاں یہ تو نہیں ہوتا کہ مرد تو گلچھرّے اُڑائے اور عورت اس کے نام کو روتی رہے۔"

نینا نے جیسے رٹے ہوئے الفاظ دھرائے۔"جہاں محبت نہیں ہے وہاں مسرت بھی نہیں ہوسکتی۔ ان ظاہری بندشوں سے کچھ نہ ہوگا۔"

سکھدا نے جواب دیا۔"اگر دیکھ بھال کر شادی کرنے میں کبھی کبھی دھوکا ہوسکتا ہے تو آج کل اندھی شادیوں میں ہمیشہ ہی دھوکا ہوتا ہے۔ طلاق یہاں جاری ہوجانے دو تو معلوم ہوگا کہ ہماری زندگی کتنے آرام سے گذرتی ہے۔"

نینا اس کا کوئی جواب نہ دے سکی کل بیاس جی نے پچھم کی شادیوں کا مولوٹ ہندوستانی شادیوں سے کیا تھا۔ وہی دلیلیں نینا کو یاد تھیں۔ ان کے ختم ہوجانے کے بعد وہ بحث کو جاری نہ رکھ سکی۔ بولی۔"تمھیں کتھا میں چلنا ہے یا نہیں یہ بتاؤ۔"

"تم جاؤ میں نہیں جاتی۔"

نینا ٹھاکر دوارے میں پہنچی تو کتھا شروع ہوگئی تھی۔ آج بہت زیادہ ہجوم تھا۔ نوجوان سبھا کے طلبہ اور اتالیق بھی آئے ہوئے تھے۔ سادھو مون جی کہہ رہے تھے"رام راون کی کتھا اس دنیا کی اس زندگی کی سچی داستان ہے اسے چاہو تو سننا پڑے گا نہ چاہو تو سننا پڑے گا۔ ہمارے ہی اندر رام بھی ہیں راون بھی ہیں۔ سیتا بھی ہیں کیکئی بھی ہیں۔"

پکڑ پکڑ کر اٹھا رہے تھے اور زور زور سے گالیاں بک رہے تھے۔ ہنگامہ برپا ہوگیا۔ لوگ اِدھر اُدھر سے اٹھ کر وہاں جمع ہوگئے۔ کتھا بند ہوگئی۔

سمرکانت نے پوچھا "کیا بات ہے برھمچاری جی؟"

برھمچاری جی نے لال لال آنکھیں نکال کر کہا "بات کیا ہے یہاں لوگ بھگوان کی کتھا سننے آتے ہیں کہ اپنا دھرم بھرشٹ کرنے آتے ہیں۔ بھنگی چمار جسے دیکھو گھسا چلا آتا ہے۔ ٹھاکر جی کا مندر نہ ہوا سرائے ہوئی۔"

سمرکانت نے کڑک کر کہا "نکالو سبھوں کو مار کر"

ایک بڈھے نے ہاتھ جوڑ کر کہا "ہم تو یہاں دروجے پر بیٹھے تھے سیٹھ جی جہاں جوتے رکھے ہیں۔ ہم کیا ایسے نادان ہیں کہ آپ لوگوں کے بیچ میں جاکر بیٹھ جاتے۔"

برھمچاری جی نے اُسے ایک لات جماتے ہوئے کہا "تو یہاں آیا کیوں دیکھتا نہیں یہاں سے وہاں تک دری بچھی ہوئی ہے۔ سب کا سب بھرشٹ ہوگیا کہ نہیں۔ پرساد ہے۔ چرنامرت ہے، گنگا جل ہے۔ سب مٹی ہوا کہ نہیں۔ اب اس جاٹے پالے میں لوگوں کو بنانا پڑے گا کہ نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ تو بوڑھا ہوگیا مٹھوا، مرنے کے دن آگئے پر تجھے اتنی عقل نہ آئی۔ چلا ہٹ وہاں سے بڑا بھگت کی دم بن کر۔"

سمرکانت نے بگڑ کر پوچھا "اور بھی پہلے کبھی آیا تھا کہ آج ہی آیا ہے؟"

مٹھوا نے خطاوارانہ انداز سے کہا "روج آتے ہیں مہراج یہیں دروجے پر بیٹھ کر بھگوان کی کتھا سنتے ہیں۔"

برھمچاری نے سر پیٹ لیا "یہ بدمعاش روز یہاں آتے تھے، روز سب کو چھوتے تھے، ان کا چھوا ہوا پرساد روز لوگ کھاتے تھے۔ اس سے بڑھ کر اندھ

"اور کیا ہو سکتا ہے" دینداروں کے سر پر جنون سوار ہو گیا کئی آدمی جوتے لیکر ان غریبوں پر پل پڑے۔ بھگوان کے مندر میں بھگوان کے بھگتوں کے ہاتھوں اور بھگوان کے بھگتوں پر جوتوں کی بارش ہونے لگی۔

ڈاکٹر شانتی کمار اور ان کے مدرس ذرا دیر تک کھڑے یہ تماشا دیکھتے رہے جب جوتے چلنے لگے تو سوامی آتمانند اپنا موٹا سونٹا لے کر برہمچاری جی کی طرف لپکے۔

ڈاکٹر صاحب کو اندیشہ ہوا کہ کوئی فساد نہ کھڑا ہو جائے۔ لپک کر آتمانند کے ہاتھوں سے سونٹا چھین لیا۔

آتمانند نے خوں بار نظروں سے دیکھ کر کہا "آپ یہ ستم دیکھ سکتے ہیں میں نہیں دیکھ سکتا"

شانتی کمار نے ان کا غصہ ٹھنڈا کیا اور بلند آواز سے بولے "واہ رے خدا پرستو واہ! کیا کہنا ہے تمہاری خدا پرستی کا، جو شخص زیادہ سے زیادہ جوتے لگائے گا اس پر بھگوان اتنے ہی زیادہ خوش ہوں گے، اس کے لئے جنت سے سیدھے بمان آئے گا۔ مگر اب چاہے جتنا مارو پیٹو دھرم تو بھرشٹ ہو ہی گیا"

برہمچاری جی، لالہ سمر کانت، سیٹھ دھنی رام اور دیگر علم برداران دین نے متحیر ہو کر شانتی کمار کی طرف دیکھا۔ جوتے چلنے بند ہو گئے۔

شانتی کمار، اس وقت کرتا دھوتی پہنے، ماتھے پر چندن لگائے، گلے میں چادر ڈالے بیاس جی کے چھوٹے بھائی سے معلوم ہو رہے تھے۔ یہ ان کا وہ فیشن نہ تھا جس پر غیر مذہبیت کا الزام لگایا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے پھر للکار کر کہا۔ آپ لوگوں نے ہاتھ کیوں بند کر لئے

لگائے خوب کس کس کر۔ اور جوتوں سے کیا ہوتا ہے بندوقیں منگائیے۔ اور ان بے دھرموں کا خاتمہ کر دیجئے اور تم دھرم۔ کو ناپاک کرنے والو، تم سب بیٹھ جاؤ اور جتنے جوتے کھا سکو کھاؤ تمھیں اتنی بھی خبر نہیں کہ یہاں سیٹھ مہاجنوں کے بھگوان رہتے ہیں۔ تمھاری اتنی مجال کہ ان کے بھگوان کے مندر میں قدم رکھو۔ تمھارے بھگوان کہیں کسی جھونپڑے میں یا درخت کے نیچے پڑے ہوں گے۔ یہ بھگوان جواہرات کے زیور پہنتے ہیں، موہن بھوگ اور ملائی کھاتے ہیں۔ چیتھڑے پہننے والوں اور ستو کھانے والوں کی صورت نہیں دیکھنا چاہتے۔"

پرھچاری جی کالے دیو کی سی مہیب صورت بنا کر بولے "تم تو بابو جی اندھیر کرتے ہو۔ شاستر میں کہاں لکھا ہے کہ ان نیچوں کو مندر میں آنے دیا جائے۔"

شانتی کمار نے تمسخر کے انداز سے کہا "یہ کہیں نہیں۔ شاستر میں یہ لکھا ہے کہ گھی میں چربی ملا کر بیچو، ڈنڈی مارو، رشوتیں کھاؤ، نقلی بہی کھاتے بناؤ اور جو صاحب اختیار ہیں ان کے دروازے پر ناک رگڑو۔ چاہے وہ شاستر کو پیروں سے ٹھکراتے ہوں۔ تمھارے شاستر میں اگر یہی لکھا ہے تو کرو۔ ہمارے شاستر میں تو یہ لکھا ہے کہ بھگوان کی نگاہ میں نہ کوئی چھوٹا ہے نہ بڑا، نہ کوئی پاک ہے نہ کوئی ناپاک۔ ان کی گود سب کے لئے کھلی ہوئی ہے۔"

سمرکانت نے دیکھا کہ وہاں اور کئی اصحاب بھی ڈاکٹر صاحب کے ہم خیال ہیں تو تحمل آمیز لہجے میں بولے "ڈاکٹر صاحب تم ناحق اتنا خفا ہو رہے ہو۔ شاستر میں کیا لکھا ہے کیا نہیں لکھا ہے۔ یہ تو پنڈت ہی جانتے ہیں۔ ہم تو جیسا رواج دیکھتے ہیں ویسا کرتے ہیں۔ ان پاجیوں کو سوچنا چاہیے تھا یا نہیں۔ انھیں

"یہاں کا حال معلوم ہے، کہیں باہر سے تو نہیں آئے ہیں۔"
شانتی کمار کا خون کھول رہا تھا۔ بولے۔ آپ لوگوں نے جوتے کیوں مارے؟"
برھمچاری نے اجڈپن سے کہا۔ "اور۔ کیا۔ پان پھول لے کر پوجتے۔"
شانتی کمار برانگیختہ ہو کر بولے "کوڑھ مغزوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر یہ حلوے بہت دن کھانے کو نہ ملیں گے، مہراج سمجھ گئے! اب وہ زمانہ آرہا ہے گدھا گھوان بھی پانی سے نہائیں گے دودھ سے نہیں۔"
سب لوگ ہاں ہاں کرتے ہی رہے مگر شانتی کمار اور آتمانند اور کئی آدمی اٹھ کر چلدئے۔

(۴)

اس دن پھر کتھا نہ ہوئی، کچھ لوگوں نے برھمچاری جی ہی کو مطعون کرنا شروع کیا۔ "بیچارے ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انھیں اٹھانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اور اٹھایا بھی تو نرمی سے اٹھاتے۔ مار پیٹ سے کیا فائدہ تھا۔"
دوسرے دن وقت معین پر کتھا شروع ہوئی لیکن سامعین کی تعداد بہت کم ہو گئی تھی۔ مدھوسودن جی نے رنگ جمانے کی بہت کوشش کی لوگ جمائیاں لے رہے تھے اور پچھلی صفوں میں تو بہت سے آدمی دھڑلے سے سو رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا مندر کا آنگن کچھ چھوٹا ہو گیا ہے۔ دروازے کچھ نیچے ہو گئے ہیں۔ اُدھر نوجوان سبھا کے سامنے کھلے میدان میں شانتی کمار کی تقریر ہو رہی تھی، برجناتھ، سلیم، آتمانند وغیرہ آنے والوں کا خیر مقدم کر رہے تھے۔ برجناتھ مدھوسودن کی بھجن منڈلی کا سرغنا تھا وہ بھی ان سے ناراض ہو کر مخالف جماعت میں جا ملا تھا۔ تھوڑی دیر میں دریاں چھوٹی پڑ گئیں اور ذرا دیر گذرنے پر میدان بھی

چھوٹا پڑ گیا۔ زیادہ تر لوگ ننگے بدن تھے۔ خال خال پھٹے پرانے کپڑے پہنے نظر آتے تھے۔ ان کے جسم سے تمباکو اور کثافت کی بو آ رہی تھی۔ مردوں سے زیادہ عورتیں تھیں، میلی بدسلیقہ اور بے زیور۔ ریشم اور مرصع زیوروں کا کہیں نام نہ تھا مگر ان کے دلوں میں صفائی تھی، سادگی تھی، خلوص تھا۔ نئے آنے والوں کو دیکھ کر لوگ جگہ روکنے کے لئے پاؤں نہ پھیلاتے تھے۔ یوں نہ تاکتے تھے جیسے کوئی دشمن آگیا ہو بلکہ سمٹ جاتے تھے اور بہت خوشی سے انھیں جگہ دیدیتے تھے۔

نو بجے کتھا شروع ہوئی۔ وہ دیوی، دیوتاؤں اور اوتاروں کی مبالغہ آمیز داستان نہ تھی۔ رشیوں اور نبیوں کے فضائل اور کمالات کا قصہ نہ تھا، چھتریوں کی شجاعت اور سخاوت کے افسانے نہ تھے، نہ دیوتاؤں اور راکششوں کے خوں ریز معرکوں کے کارنامے تھے۔ یہ اس نفس پاک کا تذکرہ تھا جس کے یہاں ظاہر و باطن کی پاکیزگی ہی مذہب کا حقیقی اصول ہے۔ وہی اعلیٰ ہے جس کا باطن پاک ہے، وہی ادنیٰ ہے جس کا باطن کثیف ہے جس نے نسلی امتیاز کا اصول قائم کر کے قوم کے ایک حصہ کو فرشتہ اور دوسرے کو شیطان نہیں بنایا۔ کسی کے لئے ترقی اور نجات کا دروازہ نہیں بند کیا۔ ایک کی پیشانی پر تقدس کا تلک اور دوسرے کی پیشانی پر پستی کا داغ نہیں لگایا۔ اس تذکرہ میں روحانی عروج کا ایک زندہ پیغام تھا جسے سن کر ناظرین کو ایسا محسوس ہوتا تھا گویا ان کی اندرونی زنجیریں ٹوٹ گئی ہیں اور دنیا جنت کا نمونہ بن گئی ہے۔

نینا کو بھی مذہب کی رسوم سے چڑ تھی۔ امرکانت اس موضوع پر اکثر گفتگو کیا کرتا تھا۔ ان غریبوں پر یہ ظلم دیکھ کر اس کے خون میں ابال آگیا تھا۔ امرکانت کا ادب نہ ہوتا تو اس نے وہیں برھمچاری جی کو پھٹکار بتائی ہوتی۔ اس لئے جب شانتی کمار نے تلک دھاریوں کو آڑے ہاتھوں لیا تو اس کی روح جیسے شگفتہ ہو کر

دھیدکرنے لگی۔ امرکانت سے کتنی ہی بار ان کا ذکر خیر سن چکی تھی۔ اس وقت ان کی تقریر سے اس درجہ متاثر ہوئی کہ جاکر ان سے کہے تم دھرم کے سچے دوتا ہو۔ تمھیں نمسکار کرتی ہوں۔ اپنے آس پاس کے آدمیوں کو غضبناک دیکھ کر اسے اندیشہ ہو رہا تھا کہ کہیں یہ لوگ شانتی کمار پر ٹوٹ نہ پڑیں۔ اس کے جی میں آتا تھا، جاکر ڈاکٹر کے پاس کھڑی ہو جائے اور ان کی حفاظت کرے۔ جب وہ بہت سے آدمیوں کے ساتھ مندر سے چلے گئے تو اُسے اطمینان ہوا۔ وہ بھی سکھدا کے ساتھ گھر سے چلی گئی۔

سکھدا نے راستے میں کہا "بھگتی چمار آج نہ جانے کہاں سے پھٹ پڑے اس پر ڈاکٹر صاحب الٹے انھیں کو شہ دے رہے تھے"

نینا نے کہا "ایشور نے تو کسی کو اونچا اور کسی کو نیچا نہیں بنایا"

"ایشور نے نہیں بنایا تو کس نے بنایا؟"

"انسان کی خود غرضی نے"

"چھوٹے بڑے دنیا میں ہمیشہ رہے ہیں اور رہیں گے"

نینا نے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس کے لئے یہ مسئلہ بحث سے خارج تھا۔

دوسرے دن شام کو اسے خبر ملی کہ آج نوجوان سبھا میں الک کتھا ہوگی تو اس کا دل وہاں جانے کے لئے بے قرار ہو گیا۔ وہ مندر میں سکھدا کے ساتھ تو گئی مگر اس کا جی اچاٹ ہو رہا تھا۔ جب سکھدا جھپکیاں لینے لگی۔ اور اس نے یہ عمل شروع کر دیا۔ تو وہ چپکے سے باہر آئی اور ایک تانگے پر بیٹھ کر نوجوان سبھا کو چلی، اس کا ارادہ دور ہی سے اس صحبت کو دیکھ کر لوٹ آنے کا تھا۔ جس میں سکھدا کو اس کے آنے کی خبر نہ ہو۔ لیکن جب وہاں گیس کی روشنی نظر آئی اور برہمانند کے روحانیت میں ڈوبے ہوئے بھجن کی آواز کانوں میں آئی تو اسے اب شوق

پر قابو نہ رہا۔ وہ بھول گئی کہ اُسے چند لمحوں میں مندر واپس جانا ہے۔ آخر جب تانگہ اس مقام پر پہنچا تو شانتی کمار تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہو گئے تھے خلقت کا ایک سمندر امڈا ہوا تھا اور ڈاکٹر صاحب کا جلال اس سمندر کے اوپر نور کی بارش کر رہا تھا۔ نینا کچھ دیر تانگے پر مسحور بیٹھی سنتی رہی پھر اتر کر پچھلی قطار میں سب کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔

ایک بڑھیا بولی "کب تک کھڑی رہو گی بیٹا! آگے جا کر بیٹھ جاؤ"

نینا نے کہا "میں بڑے آرام سے ہوں۔ سنائی تو دے رہا ہے"

بڑھیا آگے تھی۔ اس نے نینا کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جگہ پر کھینچ لیا اور خود اس کی جگہ پیچھے ہٹ گئی۔ نینا نے آج شانتی کمار کو روبرو دیکھا، ان کے چہرے پر روحانیت کا جلوہ تھا گویا وہ اس کثافت سے اٹھ کر دنیائے لطیف میں جا پہنچے ہوں۔ گویا وہاں کی ہوا میں کوئی برقی لہر پیدا ہو گئی ہے۔ جن خستہ حال چہروں پر وہ پھٹکار برستے دیکھا کرتی تھی ان پر آج کتنا افتخار تھا گویا وہ کوئی نعمت پا گئے ہیں۔ اتنی شرافت، اتنا اخلاق ان لوگوں میں اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

شانتی کمار کہہ رہے تھے "کیا تم ایشور کے گھر سے ہمیشہ کے لئے غلامی کا پٹہ لے کر آئے ہو۔ تم دل و جان سے دوسروں کی خدمت کرتے ہو، مگر تم غلام ہو۔ سماج میں تمہاری کوئی جگہ نہیں، تم سماج کی بنیاد ہو، لیکن تمہاری کوئی قدر نہیں تم مندروں میں نہیں جا سکتے، ایسی زبردستی اس بدنصیب ملک کے سوا اور کہاں ہو سکتی ہے۔ کیا تم اسی طرح مظلوم اور پامال بنے رہنا چاہتے ہو"

ایک آواز آئی "ہمارا کیا بس ہے؟"

شانتی کمار نے ولولہ انگیز لہجے میں کہا "تمہارا بس اس وقت تک کچھ نہیں جب تک تم سمجھتے ہو کہ تمہارا بس کچھ نہیں۔ مندر کسی ایک شخص یا فرقے کی چیز

نہیں ہے۔ اگر کوئی تمہیں روکتا ہے تو یہ اس کی زیادتی ہے۔ مت ٹلو اس مندر کے دروازے سے، چاہے تمہارے اوپر گولیوں کی بارش ہی کیوں نہ ہو۔"

کل کی مار دھاڑ نے ان سب آدمیوں کو مشتعل کر دیا تھا۔ دن بھر اسی معاملے کا ذکر ہوتا رہا۔ بارود تیار تھی۔ اس میں چنگاری کی کسر تھی۔ یہ الفاظ چنگاری کا کام کر گئے اجتماع کی قوت نے ان کی ہمتیں بڑھا دیں۔ لوگوں نے پہلو بدلے، آستینیں سنبھالیں اور ایک دوسرے کی طرف دیکھا، گویا پوچھ رہے ہوں۔ چلتے ہو یا ابھی کچھ سوچنا باقی ہے اور پھر ٹھنڈے پڑ گئے، ہمت نے چوہے کی طرح بل سے سر نکالا اور پھر اندر کھینچ لیا۔

نینا کے پاس والی بڑھیا نے کہا "اپنا مندر لئے رہیں ہمیں کیا کرنا ہے"

نینا نے گویا گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالا "مندر کسی ایک آدمی کا تھوڑا ہی ہے"

شانتی کمار نے گونجتی ہوئی آواز میں کہا "کون چلتا ہے میرے ساتھ اپنے ٹھاکر جی کے درشن کرنے؟"

بڑھیا نے سہم کر کہا "بھیا اندر کوئی نہ جانے دیگا۔"

شانتی کمار مٹھی باندھ کر بولے "یہی تو دیکھنا ہے کون نہیں جانے دیتا ہمارا ایشور کسی کی ملکیت نہیں ہے جو صندوق میں بند کر کے رکھا جائے۔ آج ہمیں اس معاملے کا تصفیہ کرنا ہے۔ ہمیشہ کے لئے۔"

بے شمار خلقت شانتی کمار کے ساتھ مندر کی طرف چلی۔

نینا کا دل دھڑکنے لگا مگر بالآخر وہ بھی جتھے کے پیچھے پیچھے ہولی۔ وہ اس خیال سے مسرور تھی کہ بھیا اس وقت یہاں ہوتے تو کتنا خوش ہوتے۔ اس کے ساتھ ہی طرح طرح کے وسوسے بھی دل میں پانی کے بلبلوں کی طرح اٹھ رہے تھے۔

جتھا جیسے جیسے آگے بڑھتا تھا اور لوگ آ آ کر ملتے جاتے تھے۔ لیکن جب مندر قریب آگیا تو ان کی ہمتوں نے جواب دے دیا۔ جس اختیار سے وہ ہمیشہ محروم رہے اس کے لئے ان کے دل میں کوئی پُرزور کشش نہ تھی، صرف کل کی مار کا غصہ تھا۔ وہ قوت جو انصاف کے احساس سے پیدا ہوئی ہے وہاں نہ تھی پھر بھی آدمیوں کی تعداد بڑھتی تھی، جان پر کھیلنے والے بہت کم لوگ تھے۔ اجتماع کی دھونس جما کر فتح پانے کی امید ہی انھیں آگے بڑھا رہی تھی۔

جتھا مندر کے سامنے پہنچا تو دس بج گئے تھے۔ برھمچاری جی کئی پجاریوں اور پنڈتوں کے ساتھ لاٹھیاں لئے مندر کے دروازے پر کھڑے تھے لالا سمرکانت میں بھی جوانی کا جوش عود کر آیا تھا۔

نینا کو برھمچاری جی پر ایسا غصہ آ رہا تھا کہ جا کر پھٹکارے "تم بڑے دھرماتما بنتے ہو؟ آدھی رات تک اس مندر میں جوا کھیلتے ہو، پیسے پیسے پر جان دیتے ہو، پیسے پیسے پر ایمان بیچتے ہو، جھوٹی شہادتیں دیتے ہو، دروازے دروازے بھیک مانگتے ہو پھر بھی تم مذہب کے ٹھیکے دار ہو۔ تمہارے قرب سے بھی دیوتاؤں کو کلنک لگتا ہے۔"

نینا کے دل میں ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا، وہ پیچھے سے بھیڑ کو چیرتی ہوئی مندر کے دروازے کی طرف چلی آ رہی تھی کہ شانتی کمار کی نگاہ اس پر پڑ گئی چونک کر بولے "تم یہاں کہاں نینا؟ میں نے تو سمجھا تھا تم اندر کتھا سن رہی ہوگی"

نینا نے نمائشی غصے سے کہا "آپ نے تو راستہ روک رکھا ہے کیسے جاؤں؟"

شانتی کمار نے بھیڑ کو سامنے سے ہٹا کر کہا۔ "مجھے معلوم ہوتا ہے تم روٹھی کھڑی ہو"

نینا نے ذرا ٹھٹک کر کہا "آپ ہمارے ٹھاکر جی کو بھرشٹ کرنا چاہتے ہیں"

شانتی کمار یہ مذاق نہ سمجھ سکے۔ رنجیدہ ہو کر بولے "کیا تمہارا بھی یہی خیال ہے نینا؟"

نینا نے اور رد اجایا "آپ ہری جنوں کو مندر میں بھر دیں گے دیوتا بھرشٹ نہ ہوں گے۔"

شانتی کمار نے متین لہجے میں کہا "میں نے تو سمجھا تھا دیوتا بھرشٹوں کو بھی پاک کرتے ہیں خود بھرشٹ نہیں ہوتے۔"

یکایک برھمچاری نے گرج کر کہا "تم لوگ کیا یہاں بلوہ کرنے آئے ہو۔ ٹھاکر جی کے مندر کے دروازے پر۔"

ایک آدمی نے آگے بڑھ کر کہا "ہم فوجداری کرنے نہیں آئے ہیں۔"

سمر کانت نے اسے دھکا دے کر کہا "تمہارے باپ دادا بھی کبھی درشن کرنے آئے تھے کہ تمہیں سب سے بہادر ہو۔"

شانتی کمار نے اسے سنبھالتے ہوئے کہا "باپ دادا نے جو کام نہیں کیا کیا وہ پوتوں پر پوتوں کے لئے منع ہے۔ باپ دادا تو بجلی اور تار کا نام تک نہ جانتے تھے پھر آج ان چیزوں کا اتنا کیوں استعمال ہو رہا ہے۔ خیالوں میں تغیر ہوتا ہی رہتا ہے اسے آپ نہیں روک سکتے۔"

سمر کانت نے طعنہ دے کر کہا "اسی لئے تو ہمارے خیال میں یہ تغیر ہوا ہے کہ ٹھاکر جی کی پوجا چھوڑ کر ان کے مخالف بن بیٹھیں۔"

شانتی کمار نے اسکی تردید کی "میں ٹھاکر جی کا مخالف نہیں ہوں۔ مخالف وہ ہیں جو ان کے بھگتوں کو ان کی پوجا نہیں کرنے دیتے۔ کیا یہ لوگ ہندو رسم و رواج کے پابند نہیں ہیں۔ پھر آپ نے مندر کا دروازہ کیوں بند کر دیا؟"

برھمچاری نے آنکھیں نکال کر کہا "جو لوگ ماس کھاتے ہیں، شراب

پیتے ہیں۔ اور بُرے بُرے کام کرتے ہیں، وہ مندر میں نہیں جا سکتے۔"

شانتی کمار نے مصالحت آمیز انداز میں کہا "گوشت اور شراب تو بہت سے برہمن اور چھتری اور ویش بھی کھاتے ہیں۔ آپ انھیں کیوں نہیں روکتے۔ کیا اونچی ذات والے چوری نہیں کرتے۔ زنا نہیں کرتے، رشوت نہیں لیتے۔ آپ انھیں کیوں نہیں روکتے۔ ایسے لوگ یہاں کیوں پیر اور پجاری بنے ہوئے ہیں۔"

مجمعے کو پیش قدمی کرتے دیکھ کر سمر کانت نے ڈنڈا سنبھالا اور بولے "یوں نہ مانیں گے برہمچاری جی، ذرا جا کر تھانے میں اطلاع دو۔ یہ لوگ فوجداری کرنے آئے ہیں۔"

اس وقت بہت سے پنڈے پجاری جمع ہو گئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔ اسی کے کندے سے وہ مجمع کو ہٹانے لگے۔ بھگدڑ مچ گئی۔ کوئی پورب بھاگا کوئی پچھم۔ شانتی کمار کے سر پر بھی ایک ڈنڈا پڑا۔ مگر وہ اپنی جگہ سے ایک قدم بھی نہ ہلے۔ بلکہ بھاگنے والوں کو سمجھاتے رہے، "بھاگو مت، بھاگو مت سب کے سب وہیں بیٹھ جاؤ۔ ٹھاکر جی کے نام پر اپنے کو قربان کر دو۔ اپنے حق کے لئے۔"

مگر دوسری لاٹھی سر پر اتنے زور سے پڑی کہ پوری بات بھی منہ سے نہ نکلنے پائی اور وہ گر پڑے۔ سنبھل کر پھر اٹھنا چاہتے تھے کہ تابڑ توڑ کئی لاٹھیاں پڑ گئیں۔ یہاں تک کہ وہ بیہوش ہو گئے۔

(۵)

نینا بار بار دروازے پر آتی ہے اور سمر کانت کو بیٹھے دیکھ کر لوٹ جاتی ہے۔ آٹھ بج گئے اور لالہ جی ابھی تک گنگا اشنان کرنے نہیں گئے۔ تیارات

بھر کروٹیں بدلتی رہی۔ اس سانحے کے بعد اسے نیند کب آسکتی تھی۔ اس نے شانتی کمار کو چوٹ کھا کر گرتے دیکھا تھا لیکن بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ اتنا بھی تو نہ ہو سکا کہ قریب جا کر خون کا بہنا ہی بند کر دیتی۔ امر کانت نے اُسے فوری معالجے کی موٹی موٹی باتیں سکھا دی تھیں۔ مگر اس موقع پر تو وہ کچھ بھی نہ کر سکی وہ دیکھ رہی تھی کہ ایک ہجوم نے انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ پھر اس نے دیکھا کہ ڈاکٹر آیا اور شانتی کمار کو ایک ڈولی میں لٹا کر لے گیا۔ پھر بھی وہ اپنی جگہ سے نہ ہلی اس کا دل کسی صید گرفتار کی طرح بار بار بھاگنا چاہتا تھا مگر وہ خود اسی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے پوری طاقت سے اُسے روک رہی تھی۔

آخر اس نے کلیجہ مضبوط کیا اور دروازے سے نکل کر برآمدے میں آگئی۔

سمر کانت نے پوچھا "کہاں جاتی ہے؟"

"ذرا مندر تک جاتی ہوں۔"

سمر کانت نے تشویشناک لہجے میں کہا "وہاں کا راستہ ہی بند ہے۔ جانے کہاں کے چمار سیار آکر دروازے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ کسی کو اندر جانے ہی نہیں دیتے۔ پولیس انھیں ہٹانے کی کوشش کر رہی ہے مگر بدمعاش کچھ سنتے ہی نہیں۔ یہ سب اُسی شانتی کمار کا پاجی پن ہے۔ اُسی کے اشارے سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے، ولایت جا کر اپنا دھرم تو کھو ہی آیا تھا اب یہاں ہندو دھرم کی جڑ کھود رہا ہے۔ ایسے شہدوں کو اور کیا سوجھے گی۔ اسی کی صحبت نے امر کو چوپٹ کیا اسے نہ جانے کس نے پروفیسر بنا دیا۔"

نینا نے دور ہی سے یہ تماشا دیکھ کر لوٹ آنے کا بہانا کیا اور مندر کی طرف چلی۔ پھر کچھ دیر کے بعد وہ ایک گلی میں ہو کر اسپتال کی طرف چل پڑی۔ داہنے

بائیں چوکنی آنکھوں سے تکتی ہوئی وہ تیزی سے چلی جا رہی تھی، گویا چوری کرنے جا رہی ہو۔

اسپتال میں پہنچی تو دیکھا کہ ہزاروں آدمیوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے اور کالج کے لڑکے اِدھر اُدھر دوڑ رہے ہیں۔ سلیم بھی نظر آیا۔ وہ اُسے دیکھ کر لوٹنا چاہتی تھی کہ برجناتھ مل گیا۔ بولا "ارے نینا! تم کہاں۔ ڈاکٹر صاحب کو رات بھر ہوش نہیں آیا۔ سلیم اور میں ان کے پاس بیٹھے رہے۔ اس وقت جا کر آنکھیں کھولی ہیں۔"

اتنے اجنبی آدمیوں کے سامنے نینا کیسے ٹھہرتی، مگر یہاں آنا بے کار نہ ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا حال معلوم ہو گیا۔

وہ راستے ہی میں تھی کہ سیکڑوں آدمیوں کو دوڑے آتے ہوئے دیکھا، گلی میں چھپ گئی۔ شاید فساد ہو گیا۔ اب وہ گھر کیسے پہنچے گی۔ حسن اتفاق سے آتما نند مل گئے۔ نینا کو پہچان کر بولے "تم یہاں کیسے آئیں؟ وہاں تو گولیاں چل رہی ہیں۔ پولیس کپتان نے آ کر فیر کرا دیا۔"

نینا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ جیسے رگوں میں خون کی حرکت ہی بند ہو گئی ہو۔ پھر بولی "کیا آپ ادھر ہی سے آ رہے ہیں؟"

"ہاں مرتے مرتے بچا۔ ایک گلی سے نکل آیا۔ ہم لوگ تو چپ چاپ کھڑے تھے۔ بس کپتان نے فیر کرنے کا حکم دیدیا۔"

"میں گھر کیسے پہنچوں گی؟"

"اس وقت تو ادھر سے جانے میں جوکھم ہے"

پھر ایک لمحے کے بعد شاید اپنی بزدلی پر شرمندہ ہو کر کہا "مگر گلیوں میں کوئی خوف نہیں ہے۔ چلو میں تمہیں پہنچا دوں۔ کوئی پوچھے تو کہدینا میں لالہ سمرکانت

کی بیٹی ہوں۔"

نینا نے دل میں کہا یہ حضرت سیاسی بنتے ہیں۔ پھر بھی اتنے ڈرپوک پہلے تو غریبوں کو بھڑکایا اور جب مار پڑی تو سب سے پہلے بھاگ کھڑے ہوئے موقع نہ تھا نہیں تو ان کی ایسی خبر لیتی کہ یاد کرتے۔ ان کے ساتھ کئی گلیوں کا چکر لگاتی ہوئے دس بجے گھر پہنچی۔ آتما نند پھر اسی راستے سے لوٹ گئے۔ نینا نے ان کا شکریہ تک نہ ادا کیا۔ اس کے دل میں ان کی اب ذرا بھی عزت نہ تھی۔

وہ پیچھے کی کھڑکی سے اندر گئی تو دیکھا سکھدا صدر دروازے پر کھڑی ہے اور سامنے سڑک سے لوگ بھاگتے چلے جاتے ہیں۔

سکھدا نے پوچھا "تم کہاں چلی گئی تھیں بی بی! یہاں تو پولیس نے فیر کر دیا۔ بیچارے بھاگے جا رہے ہیں۔"

"مجھے تو راستے ہی میں پتہ لگا۔ گلیوں میں چھپتی ہوئی آئی ہوں۔"

"لوگوں نے دوکانوں کے دروازے تک بند کر لئے۔"

"لالہ جی جا کر پولیس والوں کو منع کیوں نہیں کرتے؟"

انھیں کے حکم سے تو گولی چلی ہے۔ منع کیسے کریں گے۔"

"اچھا! دادا ہی نے گولی چلوائی ہے۔"

"ہاں انھیں نے جا کر کپتان سے کہا۔ اور اب گھر میں چھپے بیٹھے ہیں۔ میں ان لوگوں کا سندر میں جانا اچھا نہیں سمجھتی۔ لیکن گولیاں چلتے دیکھ کر میرا خون کھول رہا ہے۔ جس دھرم کی حفاظت کے لئے گولیوں کی ضرورت ہو وہ دھرم کبھی سچا ہو ہی نہیں سکتا۔ دیکھو دیکھو وہ آدمی گر پڑا۔ اس کی چھاتی سے خون بہہ رہا ہے۔"

یہ کہتی ہوئی وہ سمرکانت کے سامنے جا کر بولی۔ "خون کی ندی بہہ جائے

لیکن مندر کا دروازہ نہ کھلے گا ؟"

سمر کانت نے غضبناک آنکھوں سے دیکھ کر کہا "کیا کہتی ہے بہو ان ڈوم چماروں کو مندر میں گھسنے دوں ۔ تو تو امر سے بھی دو ہاتھ آگے بڑھی جاتی ہے۔"

سکھدا نے بحث نہ کی۔ وہ خوددار عورت تھی۔ وہی عالی ظرفی جو غرور بن کر اُسے نفاست پسند بنائے ہوئے تھی جو اسے کمتر درجے کے لوگوں سے ملنے نہ دیتی تھی، جو اُسے اپنی مرضی کے خلاف کوئی امر دیکھ کر مشتعل کر دیا کرتی تھی اس وقت حمیت کی صورت میں ابل پڑی۔ وہ ایک جنون کی حالت میں گھر سے نکلی اور پولیس کے سامنے کھڑی ہو کر بھاگنے والوں کو للکارتی ہوئی بولی۔ بھائیو کیوں بھاگے جا رہے ہو ؟ یہ بھاگنے کا موقع نہیں ہے۔ سینہ کھول کر سامنے کھڑے ہونے کا موقع ہے۔ دکھا دو کہ تم حق کے لئے کتنی دلیری سے اپنی جان قربان کرتے ہو۔ بھاگنے والوں کو کبھی فتح نہیں ہوتی۔"

بھاگنے والوں کے پاؤں سنبھل گئے۔ ایک عورت کو گولیوں کے سامنے کھڑا دیکھ کر بزدلی بھی شرمندہ ہو گئی۔ ایک بڑھیا نے اس کے پاس آ کر کہا "بیٹی ایسا نہ ہو تمہارے گولی لگ جائے۔"

سکھدا نے دلیرانہ انداز سے کہا "جہاں اتنے آدمی مر گئے وہاں میرے مر جانے سے کوئی نقصان نہ ہوگا۔ بھائیو، بہنو، بھاگو مت! تمہاری جانوں کی قربانی پا کر ہی ٹھاکر جی تم سے خوش ہوں گے۔"

خوف کی طرح بے خوفی متعدی ہوتی ہے۔ ایک لمحے میں اُڑتی ہوئی پتیوں کی طرح بھاگنے والے آدمیوں کی ایک دیوار سی کھڑی ہو گئی۔ اب ڈنڈے پڑیں یا گولیوں کی بارش ہو انہیں غم نہیں۔

بندوقوں سے دھائیں دھائیں کی آوازیں نکلیں، ایک گولی سکھدا کے

کانوں کے پاس سے سن سے نکل گئی۔ تین چار آدمی گر پڑے مگر دیوار جوں کی توں اچل کھڑی رہی۔

پھر بندوقیں چھوٹیں، چار پانچ آدمی پھر گرے لیکن دیوار نے جنبش نہ کی۔

بڑا جگر دوز نظارہ تھا۔ لوگ اپنے پیاروں کو آنکھوں کے سامنے تڑپتے دیکھتے تھے مگر کسی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی بوند نہ تھی، ان میں اتنی جرأت کہاں سے آگئی تھی؟ وہی فوج جو ایک دن بندوق کی پہلی آواز پر بھاگ کھڑی ہوتی ہے دوسرے دن جان کی بازی کھیل جاتی ہے۔ مگر یہ کرایہ کے سپاہیوں کا حال ہے جن میں حق اور انصاف کی طاقت نہیں ہوتی۔ جو محض پیٹ کے لئے بالوٹ کے لئے لڑتے ہیں، اس مجمعے میں ہر ایک مرد عورت چاہے وہ کتنا ہی جاہل کیوں نہ ہو سمجھنے لگا تھا کہ ہم اپنے دھرم اور حق کے لئے سینہ سپر ہو رہے ہیں۔ اور حق کے لئے مرجانا اچھوتوں کے آئین میں بھی اتنا ہی قابل فخر ہے جتنا برہمنوں کے آئین میں۔

مگر یہ کیا، پولیس کے جوان کیوں سنگینیں اتار رہے ہیں! بندوقیں کیوں کندھوں پر رکھ لی گئیں؟ یہ سب کے سب پیچھے کی طرف کیوں گھومے جاتے ہیں؟ ان کی چار چار کی قطاریں بن رہی ہیں۔ مارچ کا حکم ملتا ہے۔ سب کے سب مندر کی طرف لوٹے جا رہے ہیں، ایک کانسٹبل بھی یہاں نہیں رہا۔ صرف لالہ سمرکانت اور پولیس سپرنٹنڈنٹ میں کچھ باتیں ہو رہی ہیں۔ اور خلقت اسی طرح سکھدا کے پیچھے ثابت قدم کھڑی ہے۔ ایک لمحے میں سپرنٹنڈنٹ بھی چلا جاتا ہے پھر لالہ سمرکانت سکھدا کے قریب آکر بلند آواز میں کہتے ہیں، "مندر کھل گیا ہے۔ کسی کے لئے کوئی روک ٹوک نہیں ہے"۔ مجمعے میں ہل چل پڑ جاتی ہے، لوگ دیوانے ہو ہو کر سکھدا کے پیروں پر گرتے ہیں اور تب مندر کی طرف

دوڑتے ہیں۔

مگر دس منٹ کے بعد ہی مجمع اسی مقام پر لوٹ آتا ہے اور لوگ اپنے پیاروں کی لاشوں سے لپٹ کر رونے لگتے ہیں۔ سیوا اشرم کے رضا کار ڈولیاں لے کر آتے ہیں اور زخمیوں کو اٹھا لیجاتے ہیں۔ جاں نثاروں کے آخری مراسم کی تیاریاں ہونے لگتی ہیں، بزازوں کی دوکانوں سے کپڑے کے تھان آجاتے ہیں۔ کہیں سے بانس، کہیں سے رسیاں فاتحوں نے دھرم پر ہی فتح نہیں پائی ہے، دلوں پر بھی فتح پائی ہے۔ سارا شہر ان کی تعظیم کرنے کے لئے بے قرار ہوا ٹھا ہے۔

شام کے وقت ان حق کے شہیدوں کے جنازے نکلے سارا شہر پھٹ پڑا، جنازے پہلے مندر کے دروازے پر گئے۔ مندر کے دونوں دروازے کھلے ہوئے تھے۔ پجاری اور پرھچاری کسی کا پتہ نہ تھا، سکھدا نے مندر سے تلسی دل لاکر جنازوں پر رکھا اور گنگا جل چھڑکا۔ انھیں دروازوں کو کھلوانے کے لئے ان شہیدوں نے جانیں قربان کیں۔ اب وہ دروازہ کھلا ہوا ہے شہیدوں کا استقبال کرنے کے لئے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہے۔ مگر یہ روٹھنے والے اب دروازے کی طرف آنکھیں اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ کیسی عجب فتح ہے جس چیز کے لئے جان دی اسی سے اتنے بے نیاز!

ذرا دیر کے بعد لاشیں ندی کی طرف چلیں وہی لوگ جو ایک گھنٹہ پہلے ان سے نفرت کرتے تھے اس وقت ان پر پھولوں کی بارش کر رہے تھے قربانی میں جادو کی تاثیر ہے۔

اور سکھدا! وہ تو فتح کی دیوی تھی، قدم قدم پر اس کے نام پر نعرے اٹھتے تھے کہیں پھولوں کی برکھا ہوتی تھی، کہیں میوؤں، کہیں روپیوں کی، گھنٹہ بھر پہلے

شہر میں اس کا کہیں شمار نہ تھا۔ اس وقت وہ شہر کی رانی ہے۔ اُسے اس وقت دونوں طرف کے اونچے اونچے مکان کچھ نیچے اور سڑک کے دونوں طرف کھڑے ہونے والے انسان جیسے کچھ چھوٹے معلوم ہوتے تھے۔ مگر اتنا انکسار، اتنی فروتنی، اتنا اخلاق اس میں کبھی نہ تھا۔ گویا اس تحسین اور احترام کے بوجھ سے اس کا سر جھکا جاتا ہو۔

ادھر گنگا کے کنارے چتائیں جل رہی تھیں اُدھر مندر اس تقریب کے جشن میں چراغوں کی روشنی سے جگمگا رہا تھا گویا شہیدوں کی روحیں چمک رہی تھیں۔

(۶)

دوسرے دن مندر میں کتنی دھوم دھام ہوئی، شہر میں کتنی ہل چل مچی، شہر کے مضافات میں کتنا جشن منایا گیا۔ یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ سارے دن مندر میں عقیدت مندوں کا تانتا لگا رہا۔ برھماری جی آج پھر رونق افروز ہو گئے تھے اور جتنی نذریں انھیں آج ملیں اتنی شاید عمر بھر میں بھی نہ ملی ہوں گی۔ اس ترشح سے ان کے دل کا غبار شاید بہت کچھ فرو ہو گیا تھا۔ مگر اونچی ذاتوں کے لوگ اب بھی مندر میں جسم بچا کر آتے اور ناک سکوڑتے ہوئے کترا کر نکل جاتے تھے۔ سکھدا مندر کے دروازے پر کھڑی لوگوں کا استقبال کر رہی تھی۔ عورتوں سے گلے ملتی تھی، بچوں کو پیار کرتی تھی اور مردوں کو نمسکار کرتی تھی۔

کل کی سکھدا اور آج کی سکھدا میں کتنا فرق ہو گیا ہے۔ عیش اور تن پروری پر جان دینے والی حسینہ آج ایثار اور انکسار کی پتلی بنی ہوئی ہے۔ ان غریبوں کا اعتقاد و ولولہ اور انہماک دیکھ کر اس کے دل میں مسرت کی لہریں سی اٹھ رہی ہیں۔ کسی کے جسم پر ثابت کپڑے نہیں ہیں۔ بہتوں کو آنکھوں سے سوجھتا بھی نہیں۔ نقاہت کے مارے

سیدھے پاؤں نہیں پڑتے، مگر حسن اعتقاد سے دوڑے چلے آرہے ہیں، گویا کائنات کی دولت مل گئی ہو، گویا دنیا سے رنج وغم اور افلاس بالکل مٹ گیا ہو۔ ان کا خلوص اور فدائیانہ جوش دیکھ دیکھ کر سکھدا میں قوت عمل کا طوفان سا اٹھا ہوا ہے جو بڑے تن پرور ہوتے ہیں وہی اولوالعزم بھی ہوتے ہیں۔ چھوٹے بڑے سبھی سکھدا کے پیروں تلے آنکھیں بچھا رہے تھے۔ اور اُن کی یہ ارادت سکھدا میں خدمت کا ایک پرافتخار ولولہ پیدا کر رہی تھی۔ کل اس نے جو کچھ کیا وہ ایک عارضی جنون کی حالت میں کیا تھا۔ اس کا انجام کیا ہوگا۔ اس کی اُسے مطلق فکر نہ تھی۔ ایسے موقعوں پر سود وزیاں کا خیال ہمت کو پست کر دیتا ہے۔ آج وہ جو کچھ کر رہی تھی اس میں ارادے کی پاکیزگی اور نیک نفسی شامل تھی۔ اسے اپنی طاقت اور صلاحیت کا علم ہو گیا ہے۔ وہ نشہ ہو گیا ہے جس میں نفس کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ اب سکھدا شہر کی رانی ہے۔ شہر میں جتنی قومی تحریکیں ہوتی ہیں ان کا آغاز سکھدا ہی کے ہاتھوں ہوتا ہے کوئی تقریب ہو، کوئی ثواب کا کام ہو، کوئی قومی فلاح کی تجویز ہو۔ سکھدا ہی اس کی روح رواں ہوتی ہے۔ اس کا جی چاہے یا نہ چاہے معتقد اُسے کھینچ لے جاتے ہیں۔ اس کی موجودگی ہر ایک جلسے کی کامیابی کے لئے لازمی ہو گئی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ وہ تقریر بھی کرنے لگی ہے اور اس کی تقریر میں چاہے زبان کی خوبیاں نہ ہوں مگر سچے جذبات ضرور ہوتے ہیں۔ شہر میں کئی قومی ادارے ہیں جو پہلے بے جان سے پڑے ہوئے تھے۔ سکھدا کے آتے ہی اُن میں جان پڑ گئی ہے۔ منشیات کے انسداد کی انجمن ایک عرصے سے مضمحل پڑی ہوئی تھی نہ کوئی تبلیغ تھی نہ تنظیم۔ اس کا سکرٹری ایک دن سکھدا کو کھینچ لے گیا، دوسرے ہی دن انجمن کے کارکن اور رضاکار اور معاون سبھی جاگ اُٹھے۔ کئی بی بیاں گھر گھر منادی کے لئے تیار ہو گئیں اور ہر ایک محلے میں پنچائتیں بننے لگیں۔ ایک نئی زندگی

پیدا ہو گئی۔

اب سکھدا کو غریبوں کی خستہ حالی کے مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ اب تک اس معاملے میں اُسے جو کچھ علم تھا وہ سنی سنائی باتوں پر ہی منحصر تھا۔ اب آنکھوں سے دیکھ کر اسے معلوم ہوا کہ دیدن اور شنیدن میں بڑا فرق ہے۔ شہر کی ان اندھیری اور تنگ گلیوں میں جہاں ہوا اور روشنی کا گذر بھی نہ ہوتا تھا، جہاں کی زمین ہی نہیں دیواریں بھی سیلی رہتی تھیں، جہاں تعفن کے مارے ناک پھٹتی تھی شہر کے کاریگر اور مزدور افلاس اور مرض کے پیروں تلے دبے ہوئے، اپنی بے سرو سامان زندگی کو موت کے ہاتھوں سے چھیننے میں جان گھلا رہے تھے۔ سکھدا کو اب معلوم ہوا کہ امرکانت کو خود پروری اور عیش پرستی سے جو نفرت تھی وہ کتنی صحیح تھی اُسے خود اپنے شاندار مکان میں رہتے، اچھے اچھے کپڑے پہنتے اور لذیذ غذائیں کھاتے شرم آتی تھی۔ نوکروں سے کام لینا اب اسے جبر معلوم ہوتا تھا۔ اب وہ اپنے گھر میں خود جھاڑو لگاتی ہے، خود اپنے کپڑے دھوتی ہے اس کے مزاج میں سادگی اور خود اعتمادی پیدا ہو گئی ہے۔ اب وہ منہ اندھیرے اٹھتی ہے اور گھر کے کام دھندوں میں لگ جاتی ہے۔ نینا تو اب اس کی پرستش کرتی ہے۔ لالہ جی اپنے گھر کی یہ حالت دیکھ دیکھ کر دل میں کڑھتے ہیں مگر کرتے کیا سکھدا کے ہاں اب ہمیشہ دربار لگا رہتا ہے۔ بڑے بڑے لیڈر بڑے بڑے عالم اس کی زیارت کو آتے رہتے تھے اس لئے لالہ جی اب اُس سے کچھ دبتے تھے خانہ داری کے تفکرات سے ان کا دل بیزار ہونے لگا تھا۔ جس گھر میں ان سے کسی کو ہمدردی نہ ہو اُس گھر سے اُنھیں کیا اُنس ہوتا۔ جہاں اپنے خیالات کی حکومت ہو وہی اپنا گھر ہے۔ جو اپنے خیالات سے موافق ہوں وہی اپنے سگے ہیں یہ گھر اب ان کے لئے سرائے تھا۔ سکھدا اور نینا دونوں ہی سے انھیں کچھ کہتے

اختلاف کا اندیشہ ہوتا تھا۔

ایک دن سکھدا نے نینا سے کہا۔ "اب تو اس گھر میں رہنے کو جی نہیں چاہتا لوگ کہتے ہوں گے آپ تو محل میں رہتی ہیں اور ہمیں کفایت کا سبق دیتی ہیں مہینوں دوڑتے ہو گئے مگر نشہ بازی میں ذرا بھی کمی نظر نہیں آتی۔ ہماری باتوں پر کوئی کان ہی نہیں دیتا۔ بہت سے آدمی تو اپنی مصیبتوں کو بھول جانے ہی کے لئے نشے کرتے ہیں۔ وہ ہماری کیوں سننے لگے۔ ہماری باتوں کا اثر تو جبھی ہوگا جب ہم بھی انھیں کی طرح زندگی بسر کریں۔"

کئی دن سے سردی چمک گئی تھی اور پوس کی ٹھنڈی ہوا مرطوب ہو کر آسمان کو کہرے کے غلاف میں ڈھکے ہوئے تھی۔ کہیں کہیں پالا بھی پڑ گیا تھا۔ للو باہر جا کر کھیلنا چاہتا تھا۔ وہ لٹپٹاتا ہوا چلنے لگا تھا۔ مگر نینا اسے سردی کے خوف سے روکے ہوئے تھی۔ اس کے سر پر اونی کنٹوپ باندھتی ہوئی بولی "یہ تو ٹھیک ہے لیکن ان کی طرح رہنا ہمارے لئے ممکن بھی ہے۔ یہ سوچو۔ میں تو شاید ایک ہی مہینے میں مر جاؤں۔"

سکھدا نے گویا دل میں ایک فیصلہ کر کے کہا۔ "میں تو سوچ رہی ہوں کسی گلی میں ایک چھوٹا سا گھر لے کر رہوں۔ اس کا کنٹوپ اتار کر چھوڑ کیوں نہیں دیتیں۔ بچوں کو گملوں کے پودے بنانے کی ضرورت نہیں۔ جنھیں لو کا جھونکا بھی خشک کر سکتا ہے، انھیں تو جنگل کا درخت بنانا چاہیے جو دھوپ اور بارش، اولے اور پالے کسی کی پروا نہیں کرتے۔"

نینا نے مسکرا کر کہا۔ "شروع سے تو اس طرح رکھا نہیں۔ اب بچارے کی اصلاح کرنے چلی ہو۔ کہیں ٹھنڈ وند لگ جائے تو لینے کے دینے پڑیں۔"

"اچھا بھئی جیسے چاہو رکھو مجھے کیا کرنا ہے۔"

"کیوں للو کو اپنے ساتھ اس چھوٹے سے گھر میں نہ رکھو گی؟"
"جس کا لڑکا ہے وہ چاہے جس طرح رکھے میں کون ہوتی ہوں"
"اگر بھیا کے سامنے تم اس طرح رہتیں تو تمھارے قدموں کا بوسہ لیتے"
سکھدا نے متکبرانہ لہجے میں کہا "میں تو جو اس وقت تھی وہی اب بھی ہوں جب دادا جی سے بگڑ کر انھوں نے الگ مکان لیا تھا تو کیا میں نے ان کا ساتھ نہ دیا وہ مجھے نفاست پسند اور شوقین سمجھتے تھے۔ لیکن میں کبھی نفاست کی لونڈی نہیں رہی۔ ہاں میں دادا جی کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مجھ میں یہی عیب تھا میں اب بھی رہوں گی تو ان کی مرضی سے۔ تم دیکھ لینا۔ میں اس طرح یہ ذکر چھیڑوں گی کہ وہ ذرا بھی اعتراض نہ کریں گے۔ چلو ذرا ڈاکٹر شانتی کمار کو دیکھ آئیں مجھے تو ادھر جانے کی فرصت ہی نہ ملی۔"

نینا ایک بار روز شانتی کمار کو دیکھ آتی تھی۔ ہاں سکھدا سے کچھ نہ کہتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اب اٹھنے بیٹھنے لگے تھے پر اب بھی اتنے کمزور تھے کہ لاٹھی کے سہارے بغیر ایک قدم بھی نہ چل سکتے تھے۔ چوٹیں انھوں نے کھائیں۔ چھ مہینے سے اسپتال میں پڑے ہوئے تھے۔ اور نام ہوا سکھدا کا۔ یہ صدمہ انھیں اور گھلائے ڈالتا تھا۔ اگرچہ انھوں نے اپنے مخلص دوستوں سے بھی کبھی اپنا درد دل نہیں کہا مگر یہ کانٹا کھٹکتا ضرور تھا۔ اگر سکھدا عورت نہ ہوتی اور وہ بھی اپنے ایک عزیز شاگرد اور دوست کی بیوی تو شاید وہ شہر چھوڑ کر بھاگ جاتے سب سے بڑا ستم یہ تھا کہ ان چھ مہینوں میں سکھدا دو تین بار سے زیادہ انھیں دیکھنے نہ گئی تھی۔ وہ بھی امرکانت کے دوست تھے اور اس اعتبار سے سکھدا کو ان سے کوئی خاص اُنس نہ تھا۔

نینا کو سکھدا کے ساتھ جانے میں کوئی عذر نہ ہوا۔ رما دیوی نے کچھ دنوں

سے کار رکھ لی تھی پر وہ رہتی تھی سکھدا ہی کی سواری میں - دونوں بیٹھ کر چلیں۔ نینا نے للو کو بھی لے لیا۔

سکھدا نے کچھ دور جانے کے بعد کہا۔ "یہ سب امیروں کے چونچلے ہیں۔ میں چاہوں تو دو تین آنے میں گذر کر سکتی ہوں"۔

نینا نے تمسخر کے انداز سے کہا۔ "پہلے کر کے دکھا دو تو مجھے یقین آئے۔ میں تو نہیں کر سکتی۔"

"جب تک اس گھر میں رہوں گی میں بھی نہ کر سکوں گی۔ اسی لئے تو میں الگ رہنا چاہتی ہوں"۔

"لیکن ساتھ تو کسی کو رکھنا ہی پڑے گا"

"میں کوئی ضرورت نہیں سمجھتی - اسی شہر میں ہزاروں عورتیں تنہا رہتی ہیں پھر مجھ میں کیا سُرخاب کے پر لگے ہیں۔ میں خود اپنی حفاظت کر سکتی ہوں۔ (مسکرا کر) ہاں خود کسی پر مرنے لگوں تو دوسری بات ہے"۔

شانتی کمار سر سے پاؤں تک کمبل لپیٹے انگیٹھی جلائے کرسی پر بیٹھے حفظ صحت کی ایک کتاب پڑھ رہے تھے - کیسے جلد سے جلد اچھے ہو جائیں آجکل انھیں یہی فکر رہتی تھی - دونوں دیویوں کے آنے کی خبر پاتے ہی کتاب رکھ دی اور کمبل اتار پھینکا - انگیٹھی بھی ہٹانا چاہتے تھے پر اس کا موقع نہ ملا - دونوں جوں ہی کمرے میں آئیں ان کی تعظیم کی اور کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے "مجھے آپ لوگوں پر رشک ہو رہا ہے - آپ اس ٹھنڈ میں گھوم پھر رہی ہیں اور میں انگیٹھی جلائے پڑا ہوا ہوں - کروں کیا اٹھا ہی نہیں جاتا - زندگی کے چھ مہینے گویا کم ہو گئے بلکہ آدھی عمر کہئے - میں اب اچھا ہو کر بھی آدھا ہی رہوں گا کتنی شرم آتی ہے کہ دیویاں باہر نکل کر کام کریں اور میں کمرے میں بند پڑا رہوں"۔

سکھدا نے جیسے ان کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "آپ نے اس شہر میں جتنی بیداری پھیلائی اس حساب سے تو آپ کی عمر چوگنی ہوگئی۔ مجھے تو بیٹھے بٹھائے جشن مل گیا۔"

شانتی کمار کے زرد چہرے پر روحانی مسرت کی سرخی دوڑ گئی۔ سکھدا کی زبان سے یہ سند پاکر گویا انھیں کونین کی دولت مل گئی۔ بولے "یہ آپ کی فیاضی ہے۔ آپ نے جو کچھ کر دکھایا اور کر رہی ہیں وہ آپ ہی کا حصہ ہے، امرکانت آئیں گے تو انھیں معلوم ہوگا کہ آپ کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ یہاں سال بھر میں جو کچھ ہوگیا اس کا شاید انھیں گمان بھی نہ تھا۔ یہاں سیوا شرم میں لڑکوں کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اگر یہی کیفیت رہی تو کوئی دوسری عمارت تلاش کرنی پڑے گی۔ مدرس کہاں سے آئیں گے یہ معما ہے۔ مہذب طبقے کی بیدلی دیکھ کر مجھے تو کبھی کبھی بڑی فکر ہونے لگتی ہے۔ جسے دیکھئے خود پرستی میں ڈوبا ہوا ہے۔ یورپ کی ڈیڑھ سو سال تک عبادت کرکے ہمیں یہ فیض حاصل ہوا! لیکن یہ سب ہوتے ہوئے بھی ہمارا مستقبل بہت روشن ہے مجھے اس میں مطلق شبہ نہیں۔ ہندوستان کی روح ابھی زندہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے جب ہم خدمت اور ترک کے پرانے معیار پر لوٹ آئیں گے اس وقت کسب دولت ہماری زندگی کا تنہا مقصد نہ ہوگا۔ اس وقت ہماری پرکھ دولت کی کسوٹی پر نہ کی جائے گی۔"

لالہ نے کرسی پر چڑھ کر میز پر سے دوات اٹھالی تھی اور اپنے چہرے پر سیاہی پوت کر خوش ہو رہا تھا۔ نینا نے دوڑ کر اس کے ہاتھ سے دوات چھین لی اور ایک دھول جمائی۔ ڈاکٹر صاحب نے اٹھنے کی ناکام کوشش کرکے کہا "کیوں مارتی ہو نینا۔ دیکھو تو کتنا درویش صفت آدمی ہے جو اپنے منہ پر کالک

پوت کر بھی خوش ہو رہا ہے۔ نہیں تو ہم اپنے سیاہ داغوں کو سات پردوں کے اندر چھپاتے ہیں۔"

نینا نے بچے کو ان کی گود میں دیتے ہوئے کہا "تو لیجئے اس کو آپ ہی۔ اس کے مارے چین سے بیٹھنا مشکل ہے"۔ شانتی کمار نے بچے کو چھاتی سے لگا لیا اس گرم اور گدگدے جسم میں ان کی روح نے جس لذت اور سکون کا احساس کیا وہ ان کی زندگی میں بالکل عجیب چیز تھی۔ امر کانت سے انھیں جتنی محبت تھی۔ امر کو یاد کر کے ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ امر نے اپنے کو کتنی بے اندازہ مسرت سے محروم کر رکھا ہے اس کا اندازہ کر کے وہ جیسے دب گئے۔ آج انھیں اپنی زندگی میں خود ایک خلا کا علم ہوا۔ جن آرزوؤں کو وہ اپنی زندگی میں بالکل دبا چکے تھے وہ راکھ میں چھپی ہوئی چنگاریوں کی طرح روشن ہو گئیں۔

بچے نے ہاتھوں کی سیاہی شانتی کمار کے چہرے پر پوت کر نیچے اترنے کے لئے ضد کی۔ گویا یہی پاک فرض ادا کرنے کے لئے وہ ان کی گود میں گیا تھا۔ نینا نے ہنس کر کہا۔ "ذرا اپنا منہ تو دیکھئے ڈاکٹر صاحب، اس درویش صفت آدمی نے آپ کے ساتھ ہولی کھیل ڈالی۔ بڑا بدمعاش ہے۔"

سکھدا بھی ہنسی نہ روک سکی۔ شانتی کمار نے شیشے میں اپنا منہ دیکھا تو وہ بھی زور سے ہنسے۔ یہ کلنک کا ٹیکا اس وقت انھیں نیک نامی کے تلک سے بھی کہیں زیادہ دلفریب معلوم ہوا۔

یکایک سکھدا نے پوچھا "آپ نے شادی کیوں نہیں کی ڈاکٹر صاحب؟"

شانتی کمار نے خدمت اور فرض کی جس بنیاد پر اپنی زندگی کی عمارت کھڑی کی تھی وہ اس معذوری کے دنوں میں کچھ نیچے کھسکتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ جسے انھوں نے زندگی کی بنیادی حقیقت سمجھا تھا وہ اب اتنی مستحکم نہ رہی تھی

اس دوران میں ایسے کتنے ہی واقعے آئے جب انھیں اپنی زندگی بارسی معلوم ہوئی۔ تیمارداروں کی کمی نہ تھی۔ آٹھوں پہر دو چار آدمی گھیرے ہی رہتے تھے۔ شہر کے بڑے بڑے لیڈروں کی آمد و رفت ہوتی رہتی تھی۔ مگر شانتی کمار کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دوسروں کے رحم یا شفقت پر بوجھ ہو رہے ہیں۔ ان عیادتوں میں وہ انسانیت اور وہ خلوص نہ تھا جس سے باطن کی تشفی ہوتی۔ سائل کو کیا حق ہے کہ وہ کسی کی خیرات کو حقیر سمجھے۔ زکوٰۃ میں اُسے جو کچھ مل جائے وہ اُسے قبول کرنا پڑے گا۔ ان دنوں کتنی ہی بار انھیں اپنی ماں کی یاد آتی تھی وہ محبت اب کہاں میسر ہو سکتی ہے؟ نینا جو ایک لمحے کے لئے ان کی خیر و عافیت پوچھنے آجاتی تھی اس میں نہ جانے انھیں کیوں ایک طرح کی تقویت ہوتی تھی۔ وہ جب تک رہتی نہ جانے ان کا درد کہاں چھپ جاتا تھا۔ اس کے جاتے ہی پھر وہی کراہنا وہی بے چینی۔ انھیں ایسا خیال ہونے لگا تھا کہ شاید یہ نینا کی بے غرض خدمت تھی جس نے انھیں موت کے منہ سے نکال لیا۔

⁂

سکھدا کا یہ سوال سن کر مسکراتے ہوئے بولے۔ "اسی لئے کہ شادی کر کے کسی کو سکھی نہیں دیکھا۔"

سکھدا نے سمجھا یہ مجھ پر چوٹ ہے بولی: "قصور بھی ہمیشہ عورتوں ہی کا دیکھا ہوگا کیوں؟"

شانتی کمار نے جیسے اپنا سر پتھر سے بچایا: "یہ تو میں نے نہیں کہا۔ شاید معاملہ اس کے برعکس ہو۔ شاید کیوں بلکہ واقعہ ہے۔"

"خیر اتنا تو آپ نے تسلیم کیا۔ شکریہ۔ اس سے تو یہی ثابت ہوا کہ مرد چاہے تو شادی کر کے سکھی ہو سکتا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے کہا: "لیکن مرد میں تھوڑی سی حیوانیت ہوتی ہے جس پر وہ کوشش کر کے بھی غالب نہیں آسکتا۔ یہی حیوانیت اسے مرد بناتی ہے۔ ارتقا کے عمل میں وہ عورت سے بہت پیچھے ہے۔ جس دن اس کا ارتقائی سفر پورا ہو جائے گا غالباً وہ بھی عورت ہو جائے گا۔ ہمدردی، رحم، قربانی اور خدمت انھیں بنیادوں پر دنیا کا نظام قائم ہے اور یہی سب نسوانی اوصاف ہیں۔ اگر عورت اتنا سمجھ لے تو پھر دونوں کی زندگی سکھی ہو جائے۔ جب عورت حیوان کے ساتھ حیوان ہو جاتی ہے۔ جبھی دونوں دکھی ہوتے ہیں۔"

سکھدا نے تمسخر کے انداز سے کہا "اس وقت تو آپ نے بہت بڑی ایجاد کر ڈالی۔ میں تو ہمیشہ سنتی آئی ہوں کہ عورت کم عقل ہے، اسرزنش کے قابل ہے۔ گردن زدنی ہے، مردوں کے گلے کا بوجھ ہے اور نہ جانے کیا کیا، بڑے بڑے عقلمندوں اور شاعروں نے عورتوں کی تحقیر میں اپنی عقلمندی کا خاتمہ کر دیا ہے۔ ادھر سے بھی مردوں کی جیت ادھر سے بھی مردوں کی جیت۔ اگر مرد نیچا ہے تو اُسے عورتوں کی حکومت کیوں بُری لگے، انحان تو کیا ہوتا آپ تو دور ہی سے ڈر گئے۔"

شانتی کمار نے کچھ جھینپتے ہوئے کہا "اب اگر چاہوں بھی تو بوڑھوں کو کون پوچھتا ہے۔"

"اچھا! آپ بوڑھے بھی ہو گئے، تو کسی اپنی جیسی بڑھیا سے کر لیجئے۔"

"جب تم جیسی روشن خیال اور امر جیسے متحمل مزاج میاں، بی بی میں نہ بنی تو مجھے خود امتحان کرنے کی کوئی ضرورت نہ رہی۔ امر کا سا تحمل اور ایثار مجھ میں نہیں ہے اور تم جیسی پاکیزہ صفت اور ....."

سکھدا نے بات کاٹی "مجھ میں یہ اوصاف نہیں ہیں۔ ہاں اپنا فرض سمجھتی

ہوں۔ آپ مجھ سے بڑے ہیں اور مجھ سے کہیں عقلمند ہیں۔ آپ کو میں اپنا بڑا بھائی سمجھتی ہوں۔ آج آپ کی شرافت اور اخلاق دیکھ کر مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ میں آپ سے بے شرم ہو کر پوچھتی ہوں کہ ایسے مرد کو جو عورت کی جانب اپنے فرض کو نہ سمجھے کیا حق ہے کہ وہ عورت سے عصمت پروری کی امید رکھے۔ آپ حق پر ورہیں، میں آپ سے پوچھتی ہوں اگر میں اس سلوک کا بدلہ اسی سلوک سے دوں تو آپ مجھے قابل معافی سمجھیں گے؟"

شانتی کمار نے بیباک ہو کر کہا "نہیں"

"انھیں آپ نے معاف کر دیا"

"نہیں"

"اور یہ سمجھ کر بھی آپ نے ان سے کچھ نہیں کہا؟ کبھی ایک خط بھی نہیں لکھا؟ میں پوچھتی ہوں کہ اس بے حسی کا کیا سبب ہے۔ یہی تو اس موقع پر ایک عورت کی توہین ہوئی ہے اگر یہی حرکت مجھ سے سرزد ہوتی کیا تب بھی آپ اتنے ہی بے حس رہ سکتے۔ بولئے؟"

شانتی کمار رو پڑے۔ نسوانی دل کا درد آج اس انحراف کی صورت میں ظاہر ہو کر کتنا جگر خراش ہو گیا تھا۔

سکھدا اسی لہجے میں بولی "کہتے ہیں انسان کی پہچان اس کی صحبت سے ہوتی ہے۔ جس کی صحبت آپ اور محمد سلیم اور سوامی آتمانند جیسے شریفوں کی ہو وہ اپنے فرائض کو اتنا بھول جائے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ میں یہ نہیں کہتی کہ میں بے قصور ہوں۔ کوئی عورت یہ دعویٰ نہیں کر سکتی، نہ کوئی مرد ہی یہ دعویٰ کر سکتا ہے۔ میں نے سکینہ سے ملاقات کی ہے ممکن ہے اُس میں وہ اوصاف ہوں جو مجھ میں نہیں ہیں۔ وہ زیادہ بامروت ہے زیادہ شیریں

سخن ہے۔ ممکن ہے مجھ سے زیادہ مہر پرور بھی ہو۔ لیکن اگر اسی طرح سب مرد اور عورتیں موازنہ کرتے بیٹھ جائیں تو دنیا کی کیا حالت ہوگی۔ پھر تو یہاں خون اور آنسوؤں کی ندیوں کے سوا اور کچھ نہ نظر آئے گا۔"

شانتی کمار نے ہار مان کر کہا: "میں اپنی غلطی کو مانتا ہوں سکھدا دیوی، میں تمھیں نہ جانتا تھا اور شاید میرا یہ گمان تھا کہ تمھاری زیادتی ہے، میں آج ہی امر کو خط۔۔۔۔۔۔۔۔"

سکھدا نے پھر بات کاٹی: "نہیں، میں آپ سے یہ تحریک کرنے نہیں آئی ہوں اور نہ یہ چاہتی ہوں کہ آپ ان سے میری طرف سے رحم کی بھیک مانگیں۔ اگر وہ مجھ سے دور بھاگنا چاہتے ہیں تو میں بھی ان کو باندھ کر نہیں رکھنا چاہتی۔ مرد کو جو آزادی ملی ہے وہ اُسے مبارک رہے۔ وہ اپنا تن من گلی گلی بیچتا پھرے۔ میں اپنی پابندیوں سے خوش ہوں اور ایشور سے یہی دعا کرتی ہوں کہ وہ مجھے اس قید میں ڈالے رکھے۔ میں جلن یا حسد سے اپنے کو بھول جاؤں اُس دن سے پہلے وہ میرا خاتمہ کر دے۔ مجھے آپ سے مل کر آج جو تشفی ہوئی اس کا ثبوت یہی ہے کہ میں آپ سے وہ باتیں کہہ گئی جو کبھی اپنی ماں سے بھی نہیں کہیں۔ بی بی آپ کی جتنی تعریف کرتی تھیں اُس سے زیادہ شرافت آپ میں پائی۔ مگر میں آپ کو تنہا نہ رہنے دوں گی۔ ایشور وہ دن لائے کہ میں اس گھر میں بھابی کے درشن کروں۔"

جب دونوں دیویاں یہاں سے چلیں تو ڈاکٹر صاحب لاٹھی ٹیکتے ہوئے انھیں پھاٹک تک پہنچانے آئے اور پھر کمرے میں جا کر لیٹے تو ایسا معلوم ہوا کہ ان کی زندگی زیادہ روشن ہو گئی ہے۔ سکھدا کے درد میں ڈوبے ہوئے الفاظ ان کانوں میں گونج رہے تھے اور نینا للو کو گود میں لیے گویا ان کے سامنے کھڑی تھی۔

(۷)

اسی رات کو ڈاکٹر شانتی کمار نے امرکانت کے نام خط لکھا۔ وہ ان آدمیوں میں تھے جن کو ہر کام کے لئے تو وقت ملتا ہے خط لکھنے کے لئے نہیں ملتا۔ جتنی ہی زیادہ بے تکلفی اتنی ہی بے فکری۔ ان کی دوستی خطوں سے کہیں گہری ہوتی ہے۔ شانتی کمار کو امر کے حالات سلیم سے معلوم ہوتے رہتے تھے۔ خط لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ سکینہ سے امر کا جو تعلق ہوا اس کی ذمہ داری انھوں نے سکھدا پر رکھی تھی۔ مگر آج سکھدا سے ملاقات ہونے پر انھوں نے تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھا جس نے سکھدا کو اس ذمہ داری سے آزاد کر دیا۔ خط جو لکھا وہ اتنا لمبا چوڑا کہ سال بھر کی کسر نکل گئی۔ امرکانت کے جانے کے بعد شہر میں جو کچھ ہوا اس کی مفصل کیفیت بیان کی۔ اور اپنے مستقبل کے بارے میں ان کی صلاح پوچھی۔ ابھی تک انھوں نے ملازمت سے استعفا نہیں دیا تھا۔ مگر اس تحریک کے بعد سے انھیں یہ پابندی بار خاطر ہو رہی تھی ان کے دل میں بار بار یہ سوال پیدا ہوتا کہ جب تم غریبوں کے وکیل بنتے ہو تو تمھیں کیا حق ہے کہ سرکار سے ایک بیش قرار رقم ماہوار وصول کرو۔ اگر تم غریبوں کی طرح نہیں رہ سکتے تو غریبوں کی وکالت کرنا چھوڑ دو۔ جیسے اور لوگ آرام کرتے ہیں ویسے تم بھی عیش کی زندگی بسر کرو۔ لیکن سوال یہ تھا گذر کیسے ہو۔ کسی دیہات میں جا کر کھیتی کریں یا کیا یوں روٹیاں تو بغیر کام کئے بھی چل سکتی تھیں کیونکہ سیوا شرم کو کافی چندہ ملتا تھا۔ لیکن چندہ خوری کے خیال ہی سے ان کی خود داری کو چوٹ لگتی تھی۔

مگر خط لکھے چار دن ہو گئے کوئی جواب نہیں۔ اب ڈاکٹر صاحب کے سر پر ایک بوجھ سا سوار ہو گیا۔ دن بھر ڈاکیے کی راہ دیکھا کرتے۔ امر کسی دوسری جگہ تو نہیں چلا گیا۔ سلیم نے پتہ تو غلط نہیں بتا دیا۔ ہر دوار سے تیسرے دن جواب آنا

چاہیئے تھا اس کے عوض آٹھ دن ہو گئے۔ کتنی تاکید کی تھی فوراً جواب لکھنا۔ کہیں بیمار تو نہیں ہو گیا دوبارہ پورا خط لکھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ پورے دس ورق کون لکھے وہ خط بھی کچھ ایسا ویسا خط نہ تھا۔ شہر کی سال بھر کی تاریخ تھی۔ ویسا خط لکھنا مشکل تھا۔ پورے تین گھنٹے لگے تھے۔ ادھر آٹھ دن سے سلیم بھی نہیں آیا۔ وہ تو ایک دوسری دنیا میں ہے۔ آئی۔ سی ایس کی دھن سوار ہے یہاں کیوں آنے لگا۔ مجھے دیکھ کر شاید آنکھیں چرانے لگے۔ خود غرضی بھی خدا نے کیا چیز پیدا کی ہے۔ کہاں تو نوکری کے نام سے نفرت تھی۔ نوجوان سبھا کے بھی ممبر، کانگریس کے بھی ممبر۔ جہاں دیکھئے موجود اور معمولی ممبر نہیں، بڑے سرگرم کام کرنے والے کہاں اب آئی۔ سی۔ ایس کی پڑی ہوئی کہ بچا پاس تو کیا ہوں گے۔ وہاں دھوکا دھڑی نہیں چلنے کی۔ مگر نام زد تو ہو ہی جائیں گے حافظ جی پورا زور لگائیں گے۔ کبھی تو پاس نہیں ہوا۔ کہیں پرچے اڑائے، کہیں نقل کی، کہیں رشوت دی۔ پکا شہدہ ہے اور ایسے لوگ آئی۔ سی۔ ایس ہوں گے۔

دفعتاً سلیم کی موٹر آئی اور سلیم نے ہاتھ ملا کر کہا۔ "اب تو آپ اچھے معلوم ہوتے ہیں، چلنے پھرنے میں تکلیف تو نہیں ہوتی؟"

شانتی کمار نے شکوہ کے انداز سے کہا۔ "مجھے تکلیف ہوتی ہے یا نہیں ہوتی تمہاری بلا سے۔ مہینے بھر کے بعد آج تمہاری صورت نظر آئی ہے۔ تمہیں کیا فکر کہ میں مرا یا جیتا ہوں۔ مصیبت میں کون ساتھ دیتا ہے۔ تم نے کوئی نئی بات نہیں کی۔"

سلیم نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ "نہیں ڈاکٹر صاحب آج کل امتحان کے جھنجھٹ میں پڑا ہوا ہوں ورنہ ضرور حاضر ہوتا۔ خدا جانتا ہے نوکری سے میری روح کانپتی ہے لیکن کروں کیا ابا جان ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں میں ایک سیدھا سا جملہ ٹھیک نہیں لکھ سکتا۔ مگر لیاقت کون دیکھتا ہے یہاں تو سند دیکھی جاتی ہے جو افسروں کا مزاج دیکھ کر کام کر سکتا ہے اس کے لائق ہونے میں

شبہ نہیں۔ آج کل یہی فن سیکھ رہا ہوں۔"

شانتی کمار نے مسکرا کر کہا۔ "مبارک ہو۔ لیکن آئی سی۔ ایس کی سند آسان نہیں ہے۔"

سلیم نے کچھ اس انداز سے کہا جس سے ٹپک رہا تھا آپ یہ باتیں کیا جانیں

"جی ہاں لیکن سلیم بھی اس فن میں استاد ہے۔ بی اے تک تو بچوں کا کھیل تھا۔ آئی سی ایس میں ہی میرے کمال کا امتحان ہوگا۔ سب سے نیچے میرا نام نہ نکلے تو منہ نہ دکھاؤں۔ چاہوں تو سب سے اوپر بھی آسکتا ہوں مگر فائدہ کیا۔ روپے تو برابر ہی ملیں گے۔"

شانتی کمار نے زور سے قہقہہ مارا اور بولے: "ڈینگ مارنا کوئی تم سے سیکھے مگر اتنا تو معلوم ہو ہی گیا کہ تم بھی غریبوں کا خون چوسنے پر آمادہ ہو گئے۔"

سلیم نے بے حیائی کے ساتھ کہا۔ "غریبوں کے خون سے تو اپنی پرورش ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب جس دن سے پڑھنے بیٹھے اسی دن سے مفت خوری کی دھن سمائی۔ لیکن آپ سے سچ کہتا ہوں میرا میلان اس طرف نہیں ہے۔ کچھ دنوں ملازمت کرنے کے بعد میں بھی دیہات میں جا بسوں گا۔ گائے بھینس پالوں گا۔ کچھ پھل وغیرہ پیدا کروں گا اور پسینے کی کمائی کھاؤں گا۔ ابھی تو کچھ دنوں کھٹملوں کی طرح دوسروں کے خون ہی پر بسر ہوگی۔ لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ میں کتنا ہی گر جاؤں میری ہمدردی غریبوں کے ساتھ ہی رہے گی۔ میں دکھا دوں گا کہ افسری کر کے بھی رعایا کی خدمت کیجا سکتی ہے۔ ہمارا آبائی پیشہ زراعت ہے۔ ابا جان نے اپنی قوت بازو سے یہ ثروت پیدا کی۔ مجھے رعایا سے جتنی محبت ہو سکتی ہے اتنی ان لوگوں کو نہیں ہو سکتی جو خاندانی رئیس ہیں۔ میں تو کبھی دیہاتوں میں جاتا ہوں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ میرے اپنے ہیں، ان کی سادگی اور شفقت دیکھ کر دل میں ان

کی عزت ہوتی ہے۔ نہ جانے کیسے لوگ ان پر ظلم کرتے ہیں۔ میرا بس چلے تو بدمعاش افسروں کو کالے پانی بھیجدوں۔"

شانتی کمار نے تحسین کی نگاہ سے سلیم کو دیکھا۔ افسری کا زہر ابھی اس کے خون میں نہیں پہنچا۔ اس کا دل ابھی تک صحیح وسالم ہے۔ بولے "جب تک رعایا کے ہاتھ میں اختیار نہ ہوگا افسروں کی یہی حالت رہے گی۔ تمہاری زبان سے یہ الفاظ سن کر مجھے سچی خوشی ہو رہی ہے۔ مجھے گواں میں ایک بھی بھلا آدمی نظر نہیں آتا۔ مگر اپنا کوئی اختیار نہیں۔ اسی خیال سے دل کو تسکین دینی پڑتی ہے کہ جب خدا کی مرضی ہوگی تو ویسے سامان خود بخود ہو جائیں گے۔ انقلاب کی ضرورت ہے، کامل انقلاب کی، یہ شعلے دو چار گھڑے پانی سے نہ بجھیں گے۔ اس لئے جلے جتنا بھی چاہے۔ سب کچھ خاکستر ہو جائے۔ جب کچھ جلنے کو باقی نہ رہے گا تو خود بخود آگ ٹھنڈی ہو جائے گی تب تک ہم بھی ہاتھ سینکتے ہیں۔ کچھ امر کی بھی خبر ہے؟ میں نے ایک خط بھیجا تھا کوئی جواب نہیں آیا۔"

سلیم نے چونک کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک خط نکالتا ہوا بولا "لاحول ولا قوۃ۔ اس خط کی یاد ہی نہ رہی۔ آج چار دن سے جیب میں پڑا ہوا ہے روز سوچتا تھا بھیجدوں اور بھول جاتا تھا۔"

شانتی کمار نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر خط لے لیا اور میٹھے غصے کے دو چار الفاظ کہہ کر خط پڑھنے لگے۔

"بھائی صاحب میں زندہ ہوں، اور آپ کا مشن حتی الامکان پورا کر رہا ہوں۔ وہاں کے حالات کچھ تو نینا کے خطوں سے ملتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن آپ کا خط پڑھ کر تو میں حیرت میں آ گیا۔ ان تھوڑے سے دنوں میں تو وہاں انقلاب سا ہو گیا۔ میں تو اس ساری بیداری کا فخر آپ کو دیتا ہوں اور سکھدا تو اب میرے لئے پرستش

کی چیز ہوگئی ہے۔ میں نے اُسے سمجھنے میں کتنی افسوسناک غلطی کی یہ خیال کرکے میں بےچین ہوجاتا ہوں۔ میں نے اسے کیا سمجھا تھا اور وہ کیا نکلی۔ میں اپنے سارے فلسفے اور ادراک اور نفس کشی سے وہ کچھ نہ کرسکا جو اس نے ایک لمحے میں کر دکھایا۔ کبھی غرور سے سر اٹھا لیتا ہوں، کبھی شرم سے سر جھکا لیتا ہوں۔ ہم اپنے قریب ترین عزیزوں سے کتنے ناآشنا رہتے ہیں اس کا احساس مجھے رُلا دیتا ہے کیا میں خواب میں بھی یہ سوچ سکتا تھا کہ نفس پرور سکھدا کی زندگی اتنی پاکیزہ ہوجائے گی۔ مجھے اس کم نظری نے کہیں کا نہ رکھا۔ جی میں آتا ہے آکر سکھدا سے اپنی خطائیں معاف کراؤں لیکن کیا منہ لے کر آؤں۔ میرے سامنے اندھیرا ہے۔ کچھ نہیں سوجھتا۔ مجھے اپنے اوپر بالکل اعتماد نہیں رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، کوئی غیبی طاقت مجھے کھلا کھلا کر کچل ڈالنا چاہتی ہے۔ میں مچھلی کی طرح کانٹے میں پھنسا ہوا ہوں۔ کانٹا میرے حلق میں چبھ گیا ہے کوئی ہاتھ مجھے کھینچ لیتا ہے کھنچا چلا جاتا ہوں، پھر ڈور ڈھیلی ہوجاتی ہے اور میں بھاگتا ہوں، اب معلوم ہوا کہ انسان مشیت کے ہاتھ کا کھلونا ہے۔ اس لئے اب اس کی کج ادائیوں کی شکایت نہ کروں گا۔ کہاں ہوں کچھ نہیں جانتا بگڑ رہا ہوں یہ بھی نہیں جانتا۔ اب زندگی میں کوئی مستقبل نہیں ہے۔ مستقبل پر اعتبار نہیں رہا ارادے جھوٹے ثابت ہوئے۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں سکھدا مجھے نچا رہی ہے اس ساحرہ کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا ہوں۔ پہلے ایک روپ دکھا کر اس نے مجھے خائف کردیا۔ اور اب دوسرا روپ دکھا کر مجھے پست کررہی ہے۔ اس کا اصلی روپ کیا ہے نہیں جانتا، سکینہ کا جو روپ دیکھا تھا وہ اس کا سچا روپ تھا اس کی خبر نہیں، میں خود اپنے ہی سے بے خبر ہوں۔

آپ نے اپنے بارے میں مجھ سے جو صلاح پوچھی ہے اس کا میں کیا جواب دوں آپ مجھ سے کہیں زیادہ عقلمند ہیں۔ میرا خیال تو ہے کہ خدام کو قوم سے گذارا صرف

کا اختیار ہے اگر وہ اس غرض کو بھی مٹا سکیں تو اور بہتر۔"
شانتی کمار نے بیدلی کے ساتھ خط کو میز پر رکھ دیا۔ جس امر کے متعلق انھوں نے خاص طور پر اس کی رائے پوچھی تھی اسے صرف دو لفظوں میں اُڑا دیا۔
یکایک انھوں نے سلیم سے پوچھا "تمھارے پاس بھی کوئی خط آیا ہے؟"
"جی ہاں اس کے ساتھ ہی آیا تھا۔"
"کچھ میرے بارے میں لکھا تھا؟"
"کوئی خاص بات تو نہ تھی صرف یہی تھا کہ ملک کو سچے خادموں کی ضرورت ہے اور خدا جانے کیا کیا۔ میں نے خط کو آخر تک پڑھا بھی نہیں۔ اس قسم کی باتوں کو میں جنون سمجھتا ہوں۔ مشنری ہونے کا مطلب تو میں بھی سمجھتا ہوں کہ ہماری زندگی خیرات پر بسر ہو۔"
ڈاکٹر صاحب نے متانت سے کہا "زندگی کا خیرات پر بسر ہونا اس سے کہیں اچھا ہے کہ وہ جبر پر بسر ہو۔ جسے تم حکومت کہتے ہو اور جس کی کشش تمھیں اپنی طرف کھینچ رہی ہے وہ دراصل تھوڑے خود پرور اور حکومت پسند آدمیوں کا نظام ہے جو انھوں نے عوام کو مرغوب کرنے کے لئے قائم کیا ہے۔"
سلیم نے جواب دیا۔ "اس نظام کی ضرورت اس وقت تک رہے گی جب تک دنیا میں فرشتے نہ آباد ہوں گے۔ لیکن تعلیم کا صیغہ تو جبر کا صیغہ نہیں ہے پھر آپ کیوں کشمکش و پنج میں پڑے ہوئے ہیں اور جب آپ اپنی آمدنی کا بڑا حصہ کارِ خیر میں صرف کرتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ دوسروں کی امداد پر زندگی بسر کریں۔"
یہ دلیل ڈاکٹر صاحب کے دل میں بیٹھ گئی۔ انھیں اپنے دل کے سمجھانے کا ایک حیلہ مل گیا۔ بیشک صیغہ تعلیم کا حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہے جس وقت جو اور

جبر کا خاتمہ ہو جائے گا اُس وقت بھی تعلیم کی ضرورت باقی رہے گی۔ بلکہ اس وقت اس کا دائرہ اور بھی وسیع ہو جائے گا اس وقت اس سیوا اشرم کی بھی کیا ضرورت رہے گی۔ منظم طریقے سے فرض اور معیار کو سامنے رکھ کر علم کی اشاعت کسی حالت میں بھی قابل اعتراض نہیں ہو سکتی۔ مہینوں سے جو مسئلہ ڈاکٹر صاحب کو بے چین کر رہا تھا وہ آج حل ہو گیا۔

سلیم کو رخصت کر کے وہ لالہ سمر کانت کے گھر چلے۔ سکھدا کو امر کانت کا خط دکھا کر سرخرو بننا چاہتے تھے۔ جو مسئلہ ابھی وہ حل کر چکے تھے اس کی تائید بھی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ سمر کانت تو کچھ کھل کر ان سے نہ ملے ہاں سکھدا نے خبر پاتے ہی انھیں بلا لیا۔ رامادیوی بھی آئی ہوئی تھیں۔

شانتی کمار نے جاتے ہی امر کانت کا خط نکال کر سکھدا کے سامنے رکھ دیا اور بولے "سلیم نے چار دن سے اپنی جیب میں ڈال رکھا تھا اور میں گھبرا رہا تھا کہ بات کیا ہے۔"

سکھدا نے خط کو اچٹتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر کہا "تو میں اسے لے کر کیا کروں؟"

شانتی کمار نے تعجب سے کہا "ذرا ایک بار اسے پڑھ تو جائیے۔ اس سے آپ کے دل کے بہت سے شکوک رفع ہو جائیں گے۔"

سکھدا نے بے اعتنائی سے جواب دیا "میرے دل میں کسی کی طرف سے کوئی شک نہیں ہے۔ اس خط میں جو کچھ لکھا ہے وہ بھی میں جانتی ہوں۔ میری خوب تعریفیں کی گئی ہوں گی۔ مجھے تعریفوں کی ضرورت نہیں۔ میں نے جو کچھ کیا وہ ایک نشے کی حالت میں کیا وہ محض ایک عارضی جنون تھا۔ اس کے لئے میں کسی تعریف کی مستحق نہیں ہوں۔"

"یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ اس میں آپ کی تعریف ہی ہے؟"

- ممکن ہے میرے آنسو بھی پونچھے ہوں۔"

"تو پھر آپ اور چاہتی کیا ہیں؟"

"اگر آپ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے تو میرا کچھ کہنا ہی فضول ہے۔"

رامابائی سکھدا کا ضمیر سمجھ کر بولی "جب وہ اب تک گھر لوٹ کر نہیں آئے تو کیسے معلوم ہو کہ وہ اپنے کئے پر نادم ہیں۔ اچھے کام کی تعریف تو سبھی کرتے ہیں انھوں نے خاص بات کیا کی، مرد عورت جب مسرت اور اطمینان کی زندگی بسر کریں جبھی تو معلوم ہو انھیں محبت ہے، محبت کو چھوڑئیے۔ وہ تو ایک نایاب چیز ہے، فرض کا نباہ تو کرنا ہی چاہیے۔ شوہر ہزار کوس پر بیٹھا ہوا عورت کا گن گائے، عورت ہزار کوس پر بیٹھی ہوئی میاں کو سراہے اس سے کیا ہوتا ہے۔"

سکھدا جھنجھلا کر بولی "آپ تو اماں بے بات کی بات کرتی ہیں، زندگی میں راحت جبھی میسر آتی ہے جب دل کا آدمی ملے، انھیں مجھ سے اچھی چیز مل گئی، وہ اس سے دور رہ کر بھی خوش ہیں، مجھے ان سے اچھا ابھی تک کوئی نہ ملا اور نہ اس زندگی میں ملے گا، یہ میری بدنصیبی ہے۔ اس میں کسی کا قصور نہیں۔"

رامانے ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھ کر کہا "سنا آپ نے ڈاکٹر صاحب! یہ مجھے روز اسی طرح جلایا کرتی ہے، کتنی بار کہا کہ چل ہم دونوں اُسے وہاں سے پکڑ لائیں، دیکھیں کیسے نہیں آتا۔ جوانی کی عمر میں تھوڑی بہت نادانی سبھی کرتے ہیں مگر یہ نہ خود میرے ساتھ چلتی ہے نہ مجھے جانے دیتی ہے۔ ایسا ایک دن بھی نہیں جاتا کہ بغیر روئے اس کے منہ میں نوالا جاتا ہو مگر اپنی ضد نہیں چھوڑتی تمھیں کیوں نہیں چلے جاتے بھیا، تم اس کے استاد ہو، تمھارا ادب کرتا ہے، تمھارا کہنا وہ کسی طرح نہیں ٹال سکتا۔"

سکھدا مسکرا کر بولی "ہاں یہ تو تمھارے کہنے سے آج ہی چلے جائیں گے،

یہ تو اور خوش ہوتے ہوں گے کہ ان کے شاگردوں میں ایک تو ایسا نکلا جو ان کے اصولوں کی پیروی کر رہا ہے۔ شادی کو یہ لوگ انسانیت کا کلنک سمجھتے ہیں۔ ان کے بنتھ میں پہلے تو کسی کو شادی کرنی ہی نہ چاہیئے اور اگر دل نہ مانے تو کسی کو رکھ لینا چاہیئے۔ ان کے دوسرے شاگرد میاں سلیم ہیں۔ ان کے پہلے شاگرد تو نہ جانے کس دباؤ میں پڑ کر شادی کر بیٹھے لیکن اب اس کا کفارہ ادا کر رہے ہیں۔"

شانتی کمار نے جھینپتے ہوئے کہا۔ "دیوی جی آپ مجھ پر جھوٹا الزام لگا رہی ہیں اپنے بارے میں میں نے ضرور یہ طے کر لیا ہے کہ بن بیاہا رہوں گا۔ لیکن میں نے اپنے شاگردوں کو کبھی یہ صلاح نہیں دی۔ میرا ارادہ شروع ہی سے خدمت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنانا رہا ہے۔"

سکھدا نے پوچھا۔ "کیا شادی کر لینے کے بعد خدمت کی زندگی بسر کرنی غیر ممکن ہے۔ یا عورت اتنی خود غرض ہوتی ہے کہ وہ آپ کے کار خیر میں دخل دیے بغیر رہ نہیں سکتی؟ میرا تو خیال ہے کہ گرہستی میں آدمی جتنی خدمت کر سکتا ہے اتنا تجرد کی زندگی میں کبھی نہیں کر سکتا۔"

شانتی کمار نے مباحثے سے بچنے کی کوشش کر کے کہا۔ "یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے دیوی جی اور طے نہیں ہو سکتا۔ اس پر پھر کبھی غور کریں گے۔ اس وقت مجھے آپ سے ایک معاملے میں صلاح لینی ہے۔ آپ کی ماتا جی موجود ہیں یا اور بھی اچھا ہے میں سوچ رہا ہوں نوکری سے کیوں نہ استعفا دے کر اپنی زندگی خدمت کے لئے وقف کر دوں۔"

سکھدا نے اس انداز سے کہا۔ گویا یہ سوال بالکل غیر ضروری ہے۔ "اگر آپ سوچتے ہیں کہ آپ بغیر کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے اپنا نباہ کر سکتے ہیں تو آپ ضرور استعفا دے دیجئے۔"

شانتی کمار نے جیسے سہم کر کہا۔ "اچھا نینا دیوی کی شادی ہونے والی ہے یہ تو بڑی مبارک خبر ہے۔ میں کل ہی آپ سے مل کر ساری باتیں طے کر لوں گا۔ کانت کو بھی اطلاع دیدوں؟"

سکھدا نے بے اعتنائی سے کہا۔ "کوئی ضرورت نہیں۔"

راما بولی "نہیں آپ انھیں ضرور اطلاع دیدیں مجھے تو امید ہے وہ ضرور آئیں گے۔"

ڈاکٹر صاحب یہاں سے چلے تو نینا بچے کو لئے موٹر سے اتر رہی تھی۔

شانتی کمار نے دردناک لہجے میں پوچھا "تم اب چلی جاؤ گی نینا؟"

نینا نے سر جھکا لیا مگر اس کی آنکھیں پرنم تھیں۔

(۸)

چھ مہینے گذر گئے۔

سیوا شرم کا ٹرسٹ بن گیا۔ صرف سوامی آتمانند نے جو آشرم کے سرگرم کارکن اور جمہوریت کے فدائیوں میں تھے اس انتظام سے ناخوش ہو کر استعفا دیدیا ان کی منشا تھی کہ اہل ثروت کو آشرم میں نہ گھسنے دیا جائے۔ انھوں نے بہت زور مارا کہ ٹرسٹ نہ بننے پائے۔ ان کا خیال تھا کہ آشرم کی آزادی کو روپے کے لئے بیچنا آشرم کے لئے قاتل ہوگا۔ ثروت ہی نے تو دنیا میں اعلیٰ اور ادنی کی تفریق پیدا کر دی ہے، سرمایہ ہی تو دنیا میں ہر قسم کی غلامی کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ اسی ثروت کے سامنے وہ کیوں گھٹنے ٹیکیں لیکن سوامی جی کی ایک نہ چلی اور ٹرسٹ قائم ہو گیا اس کا سنگ بنیاد رکھا سکھدا نے، جلسہ ہوا، دعوت ہوئی، گانا بجانا ہوا دوسرے دن شانتی کمار نے ملازمت سے استعفا دیدیا۔

سلیم کا امتحان بھی ختم ہو گیا اور اس نے جو پیشین گوئی کی تھی وہ حرف بحرف پوری ہوئی۔ گزٹ میں اس کا نام سب سے نیچے تھا۔ شانتی کمار نے دانتوں میں انگلی دبالی۔ سلیم کو اب قاعدے کے مطابق دو سال کے لئے انگلینڈ جانا چاہئے تھا مگر سلیم کے لئے انگلینڈ کالے پانی سے کم نہ تھا۔ دو چار مہینے کے لئے تفریحاً جانا ہوتا تو وہ شوق سے چلا جاتا۔ دو سال کی قید اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ مگر اس نے کچھ ایسی دوڑ دھوپ کی، کچھ ایسے ہتھ کنڈے کھیلے کہ اس قاعدے سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ جب صوبے کا سب سے مشہور ڈاکٹر کہہ رہا ہے کہ انگلینڈ کی سرد آب و ہوا میں اس نوجوان کا دو سال تک رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے تو اس میں قیل و قال کی گنجائش کہاں تھی۔ حافظ حلیم لڑکے کو وہاں بھیجنے پر آمادہ تھے لیکن اس کی صحت زائل ہو گئی تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا۔ وہ کس کا دامن پکڑیں گے۔ آخر یہاں بھی سلیم کی فتح ہوئی۔ اُسے اسی حلقے کا چارج بھی ملا جہاں اس کا دوست امرکانت پہلے ہی سے موجود تھا۔ اس علاقے کو اس نے خود پسند کیا تھا۔

ادھر سلیم کی زندگی میں ایک بڑا تغیر ہو گیا تھا۔ ہنسوڑ تو اتنا ہی تھا پر اتنا شوقین، اتنا رنگین مزاج نہ رہا۔ شاعری سے اب اُسے زیادہ شغف نہ تھا۔ شادی سے اسے جو پرانی عداوت تھی وہ اب بالکل غائب ہو چکی تھی۔ یہ انقلاب یکایک کیسے ہو گیا ہم نہیں جانتے لیکن ادھر وہ کئی بار سکینہ کے گھر گیا تھا اور دونوں میں پوشیدہ طور پر خط کتابت بھی ہو رہی تھی۔ امرکانت کی بے اعتنائی کے باوجود سکینہ اس کی یاد ماضی کو کتنی یکسوئی سے دل میں پالے ہوئے تھی اس نے سلیم کا کفر توڑ دیا تھا۔ اس ضیار سے وہ اپنی زندگی کو منور کرنے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا۔ اپنی ماما کی زبانی سکینہ کی اس لازوال محبت کی داستان

سن سنکر وہ اکثر رو دیا کرتا۔ اس کی شاعرانہ طبیعت جو بھونرے کی طرح نئے نئے پھولوں سے رس لیا کرتی تھی، اب سرفروشانہ محبت سے پر ہو کر اس کی زندگی میں ایک عالی نفسی کی تخلیق کر رہی تھی۔

نینا کی شادی بھی ہو گئی۔ لالہ دھنی رام شہر کے سب سے مالدار آدمی تھے ان کا بڑا لڑکا منی رام بڑا ہونہار نوجوان تھا۔ سمر کانت کو تو امید نہ تھی کہ وہاں رشتہ ہو سکے گا کیونکہ دھنی رام مندر والے دن کے وقوعے ہی سے اس خاندان کے مخالف ہو گئے تھے لیکن بالآخر سمر کانت کی تھیلیوں نے فتح پائی۔ بڑی بڑی تیاریاں ہوئیں۔ دور دور سے مہمانوں کی ٹولیاں آئیں اور بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی لیکن امر کانت نہ آیا۔ اور نہ سمر کانت نے اسے بلایا۔ دھنی رام نے کہلا دیا تھا کہ امر کانت شادی میں شریک ہوا تو برات دروازے سے لوٹ آئے گی۔ یہ بات امر کانت کے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔ نینا نہ کچھ کہہ سکتی تھی نہ بول سکتی تھی۔ منی رام کے بارے میں طرح طرح کی روایتیں سنتی تھی، شرابی ہے، عیاش ہے، جاہل ہے، مغرور ہے لیکن باپ کی مرضی کے سامنے سر جھکانا اس کا فرض تھا۔ اگر سمر کانت اسے کسی دیوتا کی قربان گاہ پر چڑھا دیتے تب بھی وہ زبان نہ کھولتی۔ صرف رخصتی کے موقعے پر روئی لیکن اس وقت بھی اُسے یہ دھیان رہا کہ دادا کو رنج نہ ہو۔ سمر کانت کی نظروں میں دولت ہی سب سے بیش قیمت جنس تھی۔ نینا کو زندگی کا کیا تجربہ تھا۔ ایسے معاملے میں باپ کا فیصلہ ہی اس کے لئے ناطق تھا، اس کے دل میں شبہے آتے تھے لیکن اس نے اپنا جو کچھ فرض سمجھ رکھا تھا اس کی پابندی میں اس کی جان بھی چلی جائے تو اُسے غم نہ ہو گا۔

ادھر سکھدا اور شانتی کمار دونوں روز بروز ہمرنگ ہوتے جاتے تھے

دولت کی کمی تو تھی ہی نہیں۔ ہر ایک محلے میں سیوا شرم کی شاخیں کھل رہی تھیں اور ترک منشیات کی تحریک بھی زوروں سے جاری تھی۔ سکھدا کی زندگی میں اب ایک فقیرانہ زہد کی کیفیت پیدا ہوتی جاتی تھی۔ وہ اب علی الصباح سندھیا کرتی، غذا میں بھی سادگی کا خیال رہتا۔ ضبط اور عمل ہی اب اس کی مصروفیت کے رکن تھے۔ ناولوں کے مقابلے میں اب تاریخ اور فلسفہ سے اُسے زیادہ مناسبت ہوگئی تھی اور اس کی قوت تقریر تو اتنی بڑھ گئی تھی کہ سننے والوں کو تعجب ہوتا تھا اور اُس کی تقریر میں کچھ ایسی تاثیر ہوتی تھی کہ اس کے معتقدوں کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا تھا۔ ان اصلاحی تجاویز میں ایک امر کا اضافہ ہوگیا تھا وہ تھا غریبوں کے مکان کا مسئلہ۔ اب اُسے یہ تجربہ ہو رہا تھا کہ جب تک عوام کے مکانوں کا مسئلہ طے نہ ہوگا اصلاح کی کوئی کوشش بارآور نہیں ہوسکتی۔ اور یہ کام چندے سے نہ ہوسکتا تھا اسے تو میونسپلٹی ہی ہاتھ میں لے سکتی تھی مگر یہ محکمہ اتنے کثیر المصارف تجویز کو ہاتھ میں لیتے ہوئے گھبراتا تھا۔

حافظ حلیم صدر تھے۔ لالہ دھنی رام نائب صدر۔ ایسے رجعت پسند اصحاب کے دماغ میں اس مسئلے کی اہمیت اور ضرورت کو داخل کر دینا مشکل تھا۔ دو چار ایسے اصحاب تو نکل آئے تھے جو زمین مل جانے پر دو چار لاکھ روپیہ لگانے پر تیار تھے ان میں لالہ سمرکانت بھی تھے اگر آٹھ آنے سیکڑے کا سود بھی نکلتا آئے تو انھیں اطمینان تھا مگر سوال یہ تھا کہ زمین کہاں سے آئے۔ سکھدا کی دلیل تھی کہ جب ملوں کے لئے اسکولوں اور کالجوں کے لئے زمین مل سکتی ہے تو اس کام کے لئے کیوں نہ میونسپلٹی زمین مفت دے جو اسکولوں اور کالجوں سے کہیں ضروری ہے۔

شام کا وقت تھا۔ شانتی کمار نقشوں کا ایک پلندا لئے ہوئے سکھدا کے پاس آئے اور ایک ایک نقشہ کھول کر اُسے دکھانے لگے۔ وہ ان مکانوں کے

نقشے تھے جن کے بنوانے کی تجویز تھی۔ ایک نقشہ آٹھ آنے مہینہ کا تھا دوسرا ایک روپیہ کے کرائے کا اور تیسرا دو روپیہ کا۔ آٹھ آنے والے میں ایک کمرہ تھا، ایک باورچی خانہ ایک برآمدہ، سامنے ایک بیٹھک اور ایک چھوٹا سا صحن۔ ایک روپیہ والوں میں اندر دو کمرے تھے اور دو روپیہ والوں میں تین کمرے۔ کمروں میں کھڑکیاں تھیں۔ فرش اور دو فٹ اونچائی تک دیواریں پختہ، ٹھاٹ کھپریل کا تھا دو روپئے والوں میں پاخانہ بھی تھا۔ باقی دس دس گھروں کے بیچ میں ایک ایک پاخانہ بنوایا گیا تھا۔

سکھدرانے پوچھا "آپ نے لاگت کا تخمینہ بھی کیا ہے۔؟"

"اور کیا یوں ہی نقشے بنوا لایا ہوں۔ آٹھ آنے والے مکان کی لاگت دو سو ہوگی۔ ایک روپیہ والوں کی تین سو اور دو روپیہ والوں کی چار سو۔ چار آنہ سیکڑہ کا سود پڑتا ہے۔"

"پہلے کتنے مکانوں کا پروگرام ہے؟"

"کم سے کم تین ہزار، دکھن کی طرف بھی قریب قریب اتنے ہی مکانوں کی ضرورت ہوگی۔ میں نے حساب لگا لیا ہے۔ کچھ لوگ تو زمین ملنے پر خود مکان بنوالیں گے مگر کم سے کم دس لاکھ کی ضرورت اور ہوگی۔"

"مار ڈالا، دس لاکھ ایک طرف کے لئے"

"اگر پانچ لاکھ کے حصے دار ملجائیں تو باقی روپئے لوگ خود لگا دیں گے۔ مزدوری میں بھی بڑی کفایت ہوگی۔ راج، بیلدار، بڑھئی، لوہار نصف مزدوری پر کام کرنے کو تیار ہیں۔ ٹھلے والے، گدھے والے، گاڑی والے یہاں تک کہ یکے اور تانگہ والے بھی بیگار میں کام کرنے پر راضی ہیں۔"

"دیکھئے شاید اسکیم چل جائے۔ دو تین لاکھ تو شاید دادا ہی لگا دیں، اماں

کے پاس بھی ابھی کچھ ہوگا ہی، سب سے مشکل مسئلہ زمین کا ہے۔"

"مشکل کیا ہے، دس بنگلے خالی کر دئے جائیں تو زمین ہی زمین نکل آئے گی۔"

"بنگلوں کا خالی ہونا آپ آسان سمجھتے ہیں؟"

"آسان تو نہیں سمجھتا لیکن تدبیر کیا ہے، شہر میں بھی بعض مکان اتنے وسیع ہیں کہ ان میں ایک ہزار آدمی آسانی سے رہ سکتے ہیں۔ آپ ہی کا مکان کیا چھوٹا ہے اس میں دس غریب خاندانوں کے رہنے کی جگہ ہے۔"

سکھدا مسکرائی۔ "آپ تو ہم لوگوں ہی پر ہاتھ صاف کرنے لگے۔"

"جو راہ بتائے اسے آگے چلنا پڑے گا۔"

"میں تیار ہوں لیکن میونسپلٹی کے پاس زمین بھی تو ہو۔"

"زمین کی کیا کمی ہے کتنے ہی پلاٹ ابھی خالی پڑے ہوئے ہیں۔ مگر حافظ جی فرماتے ہیں، ان پلاٹوں کی بات چیت طے ہو چکی ہے۔"

سلیم نے موٹر سے اتر کر شانتی کمار کو پکارا، انھوں نے اسے اندر بلا لیا اور پوچھا "کدھر سے آ رہے ہو؟"

سلیم بہت خوش تھا۔ بولا "کل رات کو چلا جاؤں گا۔ سوچا آپ سے رخصت ہوتا چلوں، اسی بہانے دیوی جی سے بھی نیاز حاصل ہو گیا۔"

شانتی کمار نے پوچھا "ارے یوں چلے جاؤ گے کیا بھائی، جلسہ دعوت کچھ نہیں واہ؟"

"جلسہ تو کل شام کو ہے۔ آپ لوگوں کی خدمت میں کارڈ بھیج دئے گئے ہیں۔ مگر آپ سے تو محض جلسے کی ملاقات کافی نہیں۔"

"پھر چلتے چلاتے ہماری تھوڑی سی مدد کرو، دکھن کی طرف میونسپلٹی کے جو پلاٹ ہیں ان کے حاصل کرنے کا کوئی تدبر بتاؤ؟"

سلیم نے متفکرانہ انداز سے کہا۔ "ان پلاٹوں کی تو شاید بات چیت ہو چکی ہے کئی ممبر خود بیٹوں اور بیویوں کے نام سے خریدنے کو منہ کھولے بیٹھے ہیں۔"

سکھدا کو تعجب ہوا۔ "اچھا اندر ہی اندر یہ حرکتیں بھی ہو رہی ہیں، تب تو آپ کی مدد کی اور زیادہ ضرورت ہے۔ ایسی بے عنوانیوں کے انسداد میں سرگرم ہونا آپ کا فرض ہے۔"

سلیم نے آنکھیں چرا کر کہا۔ "مگر جو معاملہ طے ہو چکا اس کے بارے میں کوئی کارروائی کی بھی تو نہیں جا سکتی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے سکھدا اور شانتی کمار سے ہاتھ ملایا اور دونوں سے کل شام کو جلسے میں آنے کی استدعا کر کے چلا گیا۔ وہاں بیٹھنے میں اب اس کی خیریت نہ تھی۔

شانتی کمار نے کہا۔ "دیکھا آپ نے ابھی اپنی جگہ کا چارج نہیں لیا مگر مزاج میں افسری کی بو آ گئی۔ کچھ عجب طلسم ہے کہ اس کے اندر جو قدم رکھتا ہے اس کی عقل پھر جاتی ہے۔ یہ حضرت اس تجویز کے خاص معاون تھے مگر آج صاف نکل گئے۔"

سکھدا نے غرور کے ساتھ کہا۔ "حق ہماری جانب ہے اور وہی ہماری مدد کرے گا۔ ہم اور کسی کی مدد کے محتاج نہیں ہیں۔" اسی اثنا میں لالہ سمرکانت بھی آ گئے شانتی کمار کو بیٹھا دیکھ کر ذرا جھجکے پھر پوچھا۔ "کہئے ڈاکٹر صاحب حافظ جی سے کیا بات چیت ہوئی؟"

شانتی کمار نے اب تک جو کچھ کیا تھا کہہ سنایا۔

سمرکانت نے شکایت کے انداز سے کہا۔ "آپ لوگ ولایت کے پڑھے ہوئے صاحب۔ میں بھلا آپ لوگوں کے سامنے کیا منہ کھول سکتا ہوں لیکن اگر آپ چاہیں کہ حق، انصاف اور سچائی کے نام پر آپ کو زمین ملجائے تو منہ دھو رکھئے اس کام کے لئے دس بیس ہزار خرچ کرنے پڑیں گے۔ ہر ایک نمبر سے

الگ الگ ملئے - دیکھئے وہ کس مزاج کا، کس خیال کا، کس قماش کا آدمی ہے، کس طرح اُسے قابو میں لائے۔ خوشامد سے راضی ہو خوشامد سے، چاندی سے راضی ہو چاندی سے، دعا، تعویذ، جنتر، منتر جس طرح کام نکلے نکالئے۔ حافظ جی سے میری پرانی ملاقات ہے پچیس ہزار کی تھیلی ان کی ماما کے ہاتھ گھر میں بھیجدو پھر دیکھیں کیسے زمین نہیں ملتی۔ سردار کلیان سنگھ کو ان مکانات کا ٹھیکہ دیدو وہ قابو میں آجائیں گے۔ دوبے جی کو پانچ تولے چندرودے نذر دیکر طے کر سکتے ہو۔ کھنّا سے یوگ ابھیاس کی باتیں کرو، رائے صاحب دھنی رام کے نام پر اس نئی بستی کا نام رکھدو۔ ان سے کچھ روپئے بھی مل جائیں گے۔ یہ ہیں کام کرنے کے ڈھنگ روپئے کی طرف سے بے فکر رہو۔ بنیوں کو چاہے بدنام کرلو۔ لیکن رفاہ عام کے کاموں میں بنئے ہی آگے آتے ہیں۔ دس لاکھ تک کا بیمہ تو میں لیتا ہوں۔ مجھے تو رات بھر نیند نہیں آتی یہ سوچا کرتا ہوں کہ کیسے یہ کام سدھ ہو جب تک اس کی تکمیل نہ ہوگی مجھ پر نشہ سا چڑھا رہے گا۔"

شانتی کمار نے دبی آواز سے کہا۔ "یہ فن تو مجھے سیکھنا پڑے گا سیٹھ جی، مجھے نہ تو کھانے کا تجربہ ہے نہ کھلانے کا۔ مجھے تو کسی بھلے آدمی سے یہ تجویز کرتے ہی شرم آتی ہے۔ یہ خوف بھی ہوتا ہے کہ کہیں وہ مجھے ڈانٹ نہ بیٹھے۔"

سمرکانت نے سر ہلا کر کہا۔ "تو پھر تمھیں زمین مل چکی۔ سیوا شرم میں لڑنے پڑھانا دوسری بات ہے۔ معاملے پٹانا دوسری بات ہے۔ میں خود پٹاؤں گا۔"

سکھدا بولی۔ "نہیں ہمیں رشوت دینا منظور نہیں۔ ہم حق کے لئے کھڑے ہیں ہمارے پاس حق کی طاقت ہے۔ ہم اسی طاقت سے فتح پائیں گے۔"

سمرکانت نے مایوس ہو کر کہا "تو تمھاری اسکیم چل چکی۔"

سکھدا نے کہا۔ "اسکیم تو چلے گی، ہاں شاید دیر میں چلے یا دھیمی چال سے چلے

مگر رُک نہیں سکتی۔"

"اچھی بات ہے میں بھی دیکھوں گا"

سمرکانت طیش کے عالم میں باہر چلے گئے۔ جو شخص آنکھیں بند کر کے ان کے پیچھے نہ چلے اُس سے وہ دور بھاگتے تھے۔

شانتی کمار نے خوش ہو کر کہا۔ "سیٹھ جی بھی عجیب آدمی ہیں۔ ان کی نظر میں جو کچھ ہے وہ روپیہ ہے۔ انسانیت بھی کوئی چیز ہے۔ اسے شاید یہ تسلیم ہی نہیں کرتے۔"

سکھدا نے پُرغرور انداز میں کہا۔ "ان کی باتوں پر نہ جائیے ڈاکٹر صاحب ان کے دل میں جتنا خلوص اور جتنا جوش خدمت ہے وہ ہم دونوں میں مل کر بھی نہ ہوگا۔ ان کے طور طریق میں کتنا تغیر آگیا ہے۔ یہ آپ نہیں دیکھتے؟ ڈیڑھ سال پہلے ان کے صاحبزادے نے یہ تجویز کی ہوتی تو آگ ہو جاتے۔ اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جانا معمولی بات نہیں ہے۔ اور خاص کر اس آدمی کے لئے جس نے ایک ایک کوڑی کو دانتوں سے پکڑا ہو۔ اولاد کی محبت نے یہ کایا پلٹ کی ہے۔ میں اسی کو سچا ہیراگ کہتی ہوں۔ آپ پہلے ممبروں سے ملئے اگر ضرورت سمجھئے تو مجھے بھی ساتھ لے لیجئے۔ مجھے تو امید ہے اکثریت ہمارے ساتھ ہوگی بہتر یہ ہو کہ کل آپ آئیں اور ہم دونوں چلیں۔ دس بجے تک لوٹ آئیں گے۔ اس وقت مجھے ذرا سکینہ سے ملنا ہے۔ سنا ہے مہینوں سے بیمار ہے مجھے تو اس سے بڑی عقیدت ہو گئی ہے۔ وقت ملا تو ادھر ہی سے نینا سے ملتی آؤں گی۔"

ڈاکٹر صاحب نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اُسے گئے تو دو مہینے ہو گئے آئے گی کب تک؟"

"یہاں سے تو کئی بار بلا واگیا۔ سیٹھ دھنی رام رخصت ہی نہیں کرتے۔"

"نینا خوش تو ہے؟"

"اپنے بارے میں کچھ کہتی ہی نہیں۔ پوچھتی ہوں تو بھی کہتی ہیں بہت اچھی طرح ہوں۔ مگر مجھے قرینے سے کچھ اور ہی معلوم ہوتا ہے۔ وہ شکایت کرنے والی لڑکی نہیں ہے۔ اگر وہ لوگ اسے زہر بھی کھلا دیں تو شاید زبان نہ کھولے۔"

شانتی کمار کی آنکھیں بھر آئیں۔ "میں تو قیاس ہی نہیں کر سکتا کہ کوئی اس سے ناراض بھی ہو سکتا ہے۔"

سکھدا مسکرا کر بولی۔ "اس کا بھائی آوارہ مزاج ہے، کیا یہ ان لوگوں کی ناراضگی کے لئے کافی نہیں ہے؟"

"میں نے تو سنا منی رام پکا شہدہ ہے۔"

"نینا کے سامنے آپ نے یہ بات کہی ہوتی تو آپ سے لڑ بیٹھتی۔"

"میں ایک بار ذرا منی رام کی مزاج پرسی کرنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ آپ نے اس سے کچھ کہا تو نینا کے سر جائے گی۔"

"میں اس سے لڑنے نہ جاؤں گا۔ اس کی خوشامد کرنے جاؤں گا۔ اس فن سے واقف نہیں۔ مگر نینا کی خاطر یہ بھی کروں گا۔ وہ معصوم لڑکی ان ظالموں کے ہاتھوں پامال ہو یہ میں نہیں دیکھ سکتا۔" یہ کہتے ہوئے شانتی کمار باہر چلے گئے۔

(۹)

سکھدا موٹر سے اتر کر گلی میں سکینہ کا مکان تلاش کرنے لگی۔ اِدھر سے اُدھر تک دو تین چکر لگا آئی کہیں اس کے گھر کا نشان نہ ملا۔ جہاں وہ گھر ہونا چاہیے تھا

وہاں اب ایک نیا کمرہ تھا جس پر قلعی پتی ہوئی تھی، وہ کچی بوسیدہ دیوار اور سڑا ہوا ٹاٹ کا پردہ کہیں نظر نہ آتا تھا۔ آخر اُس نے ایک آدمی سے پوچھا۔ تب معلوم ہوا کہ جسے وہ نیا کمرہ سمجھ رہی تھی وہی سکینہ کے مکان کا دروازہ ہے۔ اس نے آواز دی اور دروازہ ایک لمحے میں کھل گیا۔ سکھدا نے دیکھا وہ ایک صاف ستھرا چھوٹا سا کمرہ ہے جس میں ٹاٹ کا فرش ہے اور دو تین مونڈھے رکھے ہوئے ہیں۔

سکینہ نے ایک موڑھا بڑھا کر کہا "آپ کو مکان تلاش کرنے میں دقت ہوئی ہوگی؟"

سکھدا نے اس کے زرد خشک چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں میں نے دو تین چکر لگائے۔ اب یہ گھر کہلانے کے لائق ہوگیا۔ مگر تمھاری یہ کیا حالت ہے؟"

سکینہ نے زرد تبسم کے ساتھ کہا "میں تو کبھی بہت موٹی تازی نہ تھی۔"

"مگر ایسی حالت تو نہ تھی۔"

دفعتاً پٹھانی آگئی اور یہ کلمہ سن کر بولی "ایک مہینے سے بخار آرہا ہے بیٹی، لیکن دوا نہیں کھاتی۔ کون کہے۔ مجھ سے تو بول بھی بند ہے۔ میں تو اسے اب دیکھ کر جلتی ہوں۔ اس کا براچا ہتی ہوں۔ اللہ جانتا ہے تمھاری بڑی یاد آتی تھی بہوجی۔ مگر آؤں کیا منہ لے کر۔ ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی لالہ جی بھی گئے ہیں۔ دودھوں نہائیں اور پوتوں پھلیں، سکینہ نے منع کر دیا تھا۔ اس لئے اپنی طلب لینے نہ گئی تھی۔ وہی دینے آئے تھے۔ دنیا میں ایسے ایسے خدا کے بندے پڑے ہوئے ہیں۔ دوسرا ہوتا تو میری صورت نہ دیکھتا۔ ان کا بسا بسایا گھر مجھ نصیبوں جلی کے کارن اجڑ گیا مگر لالہ کا دل وہی ہے، وہی پرورش کی نگاہ ہے۔ میری

آنکھوں پر نہ جانے کیوں پردہ پڑ گیا تھا کہ میں نے اُس بھولے بھالے لڑکے کو رُسوا کر دیا۔ خدا کرے مجھے مرنے کے بعد کفن بھی نہ نصیب ہو۔ جس نے سنا اس نے مجھ پر لعنت ملامت کی۔ اس لڑکی نے تو مجھ سے بولنا ہی چھوڑ دیا کھڑی تو ہے پوچھو۔"

سکینہ نے ڈانٹ کر کہا۔ "ارے تو چپ بھی رہو گی یا اپنا دکھڑا ہی روئے جاؤ گی۔ کچھ اور بات چیت کرو گی یا نہیں۔"

پٹھانی نے فریاد کی۔ "اسی طرح یہ مجھے جھڑکتی رہتی ہے بہو جی۔ بولنے نہیں دیتی۔ پوچھو تم سے دکھڑا نہ روؤں تو کس سے رونے جاؤں۔"

سکھدا نے سکینہ سے پوچھا۔ "اچھا یہ تو بتاؤ تم نے اپنا وثیقہ لینے سے کیوں انکار کر دیا تھا؟"

سکینہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ پٹھانی پھر بول اُٹھی۔ "اس کے پیچھے مجھ سے برابر لڑا کرتی ہے بہو۔ کہتی ہے کیوں کسی سے خیرات لیں۔ یہ نہیں سوچتی کہ اسی سے ہماری پرورش ہوئی ہے۔ بس آج کل سلائی کی دھن ہے۔ بارہ بارہ بجے رات تک بیٹھی آنکھیں پھوڑتی رہتی ہے۔ اسی سے بخار بھی آنے لگا ہے کہتی ہوں جان رکھ کر کام کر۔ کون سا لاؤ لشکر کھانے کو بیٹھا ہوا ہے۔ لیکن یہاں تو دھن ہے گھر بھی اچھا ہو جائے، سامان بھی اچھے بن جائیں، ان دنوں کام خوب مل رہا ہے مگر سب اسی ٹیپ ٹاپ میں اڑ جاتا ہے۔ یہاں سے تھوڑی دور پر ایک عیسائن رہتی ہے وہ روز صبح کو پڑھانے آتی ہے۔ ہمارے زمانے میں تو بیٹا سیپارہ، روزہ نماز کا رواج تھا۔ کئی جگہ سے شادی کے پیغام آئے ....."

سکینہ نے تیز ہو کر کہا۔ "اچھا رہنے دو یہ قصہ، کوئی نئی بات نہیں کہہ رہیں

آپ کی کیا خاطر کروں بہن۔ آپ نے اتنے دنوں بعد مجھ بدنصیب کو یاد تو کیا"
سکھدا نے ہمدردانہ انداز سے کہا" یاد تو تمھاری برابر آتی رہتی تھی اور تم سے ملنے کو جی بھی چاہتا تھا مگر فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ یہ تو آج میاں سلیم سے معلوم ہوا کہ تمھاری طبیعت بہت خراب ہوگئی ہے۔ آخر تم کیوں اپنی جان کھپائے ڈالتی ہو۔ ہم لوگ تو ہر طرح تمھاری مدد کرنے کو حاضر ہیں"
سکینہ نے دردناک انداز سے کہا" بہن آپ نے میرے ساتھ جو شریفانہ برتاؤ کیا ہے اس کے لئے میں آپ کی احسانمند ہوں۔ لیکن یہ تو اچھا نہیں لگتا کہ کوئی ہمیشہ دوسروں کا دست نگر بنا رہے۔ انسان کو خود بھی تو ہاتھ پاؤں ہلانا چاہئیں۔ اب مجھے تجربہ ہوا ہے کہ افلاس ہی ساری مصیبتوں کی جڑ ہے۔ چاہے میری جان چلی جائے لیکن اس افلاس کو مٹا کر چھوڑوں گی۔ میں اس حالت میں نہ ہوتی تو آج بابوجی کیوں بدنام ہوتے، میں کیوں رسوا ہوتی۔ سوچئے"
سکھدا مسکرائی" میں تو سمجھتی ہوں دولت ہی ساری برائیوں کی جڑ ہے۔ اگر وہ حضرت بھی تمھاری جیسی حالت میں ہوتے تو انھیں کیوں یہ شرارت سوجھتی یہ دولت والے ہی ہیں جو دنیا میں بدکاری پھیلاتے پھرتے ہیں۔"
" لیکن اگر کوئی غریب نہ ہو تو دولت والوں کو بدکاری پھیلانے کا موقع کیسے ملے؟"
" تو میں بھی یہی کہوں گی کہ کوئی دولتمند نہ ہو تو وہ غریبوں کو اپنے نفس کا شکار کیسے بنائے۔ جب تک امیر اور غریب کا امتیاز قائم رہے گا اس قسم کے واقعے ہوتے رہیں گے۔"
" تو آپ نیچے آئیے۔ میں اوپر اٹھتی ہوں۔ بیچ میں کہیں نہ کہیں میل ہو ہی جائے گا"

پٹھانی کو آج یہ سوجھی کہ سکھدا کی کچھ خاطر کیجائے۔ جب تک روزانہ ضرورتوں ہی کے لئے کافی نہ ملتا تھا۔ خاطر مدارات کا ذکر ہی کیا تھا۔ لیکن اب ہاتھ میں پیسے تھے۔ مہماں نوازی کا جوش روکا نہ جا سکتا تھا۔ وہ حلوائی کی دوکان پر اچھی اچھی مٹھائیاں اور تمبولی کی دوکان سے پان لانے چلی گئی۔ تخلیہ ہو گیا تو سکینہ اندر جا کر عطر میں بسا ہوا ایک لفافہ لائی اور سکھدا کے ہاتھ میں دے کر بولی "یہ میاں محمد سلیم کا خط ہے۔ آپ پڑھ سکتی ہیں۔ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ اب وہ مجھ پر عاشق ہو گئے ہیں۔ پہلے اپنے خدمت گار کے ساتھ میرا نکاح کرانا چاہتے تھے اب خود سرفراز کرنا چاہتے ہیں۔"

سکھدا نے خط پڑھا۔ اگرچہ وہ سمجھ رہی تھی کہ سکینہ کی اس بے تکلفی سے فائدہ مناسب نہیں ہے۔ لیکن اشتیاق کو نہ روک سکی۔ اس نے خط کو پھر احتیاط سے لفافہ میں بند کر دیا اور بولی "سکینہ، تم خدا جانے اپنے دل میں کیا کہو مگر اس خط میں مجھے ایک سچے دل کے جذبات نظر آ رہے ہیں۔ پہلے سلیم چاہے جس قماش کے آدمی رہے ہوں۔ لیکن ایسا خط کوئی نفس پرور نوجوان نہیں لکھ سکتا۔ ایک ایک لفظ سے سچی محبت جھلک رہی ہے۔ تم میں ضرور کوئی ایسا جادو ہے جس سے تم دلوں پر فتح پا جاتی ہو۔ پہلے تم نے ایک ایسے آدمی کو اپنے قدموں پر گرایا جسے میں محبت سے عاری سمجھتی تھی۔ اور اب تم ایک چھٹے ہوئے شہدے کی دیوی بنی ہوئی ہو۔ میں تم پر رشک کرتی ہوں۔ سچ۔ میں تو تمہیں یہی مشورہ دوں گی کہ خواب دیکھنا چھوڑ دو اور جو نعمت تمہارے سامنے آ رہی ہے اُسے لے لو۔ اس خط نے میرے دل سے وہ ساری بدگمانیاں دور کر دیں جو مجھے سلیم کی جانب سے تھیں۔"

سکینہ نے معترضانہ انداز سے کہا "لیکن مجھے اُن پر اعتبار نہیں

آتا بہن۔ آدمی بہت سی باتیں بناوٹ سے بھی تو لکھ سکتا ہے۔ میں نے انھیں کئی بار اپنے دروازے پر تاک جھانک کرتے دیکھا ہے۔"

"تو اس سے یہ کیوں سمجھتی ہو کہ اُن کی نیت خراب ہے۔ یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ اضطراب کی حالت میں وہ تمھارے دروازے کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔"

"شاید آپ کا خیال صحیح ہو لیکن محبت کی اس زنجیر کو کیا کروں جس نے مجھے جکڑ رکھا ہے۔ جہاں پہلے ہی سے ایک درخت پھل پھول رہا ہو وہاں دوسرا پودا کیا کبھی جڑ پکڑ سکتا ہے؟ اب تو جب تک مجھے یہ نہ معلوم ہو جائے گا کہ امرکانت نے مجھے دل سے نکال دیا۔ میں انھیں کی ہوں۔ اور ان کے دل سے نکل جانے پر بھی اُن کی محبت کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ ایسی پاکیزہ محبت کا ایک لمحہ بھی انسان کو آخر تک متوالا رکھنے کے لئے کافی ہے۔ میں نے سلیم کو اسی مضمون کا خط لکھ دیا ہے۔ کل ہی تو اُن کے جانے کی تاریخ ہے۔ میرا خط پڑھ کر رونے لگے لیکن مردوں کے آنسوؤں پر مجھے اعتبار نہیں آتا۔ ان کی دنیا دوسری ہے، محبت وہاں تفریح کی چیز ہے، اسی طرح جیسے کوئی تماشا، کوئی دردناک واقعہ ہوا ذرا رو لئے۔ اس کے بعد کوئی ہنسانے والی بات آ گئی ہنس پڑے محبت ان کی طبیعت کی اوپری سطح پر رہتی ہے۔ گہرائیوں میں کیا ہوتا ہے خدا جانے۔"

بڑھیا ایک برہمن کے ہاتھوں میں مٹھائی اور پان لے کر آ گئی اور صاف زمین پر ان چیزوں کو رکھوا کر لونڈے کو پانی لانے کے لئے دوڑا دیا۔ بکھدانے تھیلی سے ایک روپیہ نکال کر بڑھیا کی طرف بڑھایا۔ بڑھیا ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور بولی "وہ بھی تو تمھارا ہی ہے بہوجی۔ میں کیا کہیں اور سے لائی ہوں۔"

سکینہ نے چٹکی لی "دینا ہی ہے تو کوئی اچھی رقم دیجئے۔ غریب کی نذر غرض سے خالی کیسے ہوسکتی ہے اسی لئے تو غربت کو لعنت کہا گیا ہے۔"

سکھدا سچے دل سے بولی "مجھے تمھاری غربت پر رشک آتا ہے۔ سکینہ سچ کہتی ہوں۔ زندگی غربت میں ہے۔ تمول تو روح کو آگے قدم اٹھانے کے لئے کوئی موقع ہی نہیں دیتا۔ وہ مبارک دن ہوگا جب مجھ میں اتنی قوت آجائے گی کہ میں دولت کی سنہری بیڑیوں سے اپنے کو آزاد کرلوں گی۔ دولت والے جائداد خریدتے ہیں۔ بڑی بڑی عمارتیں بنواتے ہیں، عیاشی اور نفس پروری کرتے ہیں، شہرت کے لئے جان دیتے ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟ روحانی تشفی اور سکون کی ناکام کوششیں۔ محض ناکام۔ غریب کے لئے سارا سکون اور ساری قوت اس کی غربت میں ہے۔"

اس نے ہاتھ دھوکر دونے سے مٹھائی نکالی۔ سکینہ کو کھلائی۔ خود کھائی پانی پیا۔ پھر دونوں نے پان کھایا معلوم ہوتا تھا دونوں بہنیں ہیں۔

دفعتاً سکینہ نے پوچھا "مجھے کبھی کبھی بڑا تعجب ہوتا ہے بہوجی کہ آپ جیسی دیوی کو چھوڑ کر بابوجی میری طرف کیسے مخاطب ہوگئے۔ میں آج آپ سے حلف لے کر کہتی ہوں کہ میں نے کوئی جادو ٹونا نہیں کیا۔"

سکھدا مسکرائی "اب تک تو میں سمجھتی تھی کہ تم نے کوئی جادو ٹونا نہیں کیا اور یہ ان کی ہوس پرستی تھی۔ آج معلوم ہوگیا کہ تم جادوگرنی ہو۔ میں اگر مرد ہوتی تو شاید مجھ پر بھی تمھارا جادو چل گیا ہوتا۔ اس بھولی بھالی پاکیزہ صورت پر کون نہ فدا ہوجائے گا۔ لیکن اگر ہر ایک بہتر چیز دیکھ کر انسان اس کی طرف لپکے تو شاید زندگی میں اسے کبھی اطمینان نہ ہو۔ تم میں ہزاروں اوصاف ہوں لیکن کیا اسی طرح ایسے مرد نہیں ہیں جو ان سے ہر ایک اعتبار سے بڑھ کر ہوں۔ اگر مرد اور عورت

دونوں بہتر کی تلاش کرنے لگیں تو وہ کسی اور طرح کی زندگی ہوگی جس کا میں قیاس نہیں کر سکتی۔ انھوں نے میری جو توہین کی ہے اسے میں کبھی معاف نہیں کر سکتی اگر انھیں محبت کی بھوک تھی تو کیا مجھے بھی اس کی آرزو کچھ کم تھی۔ مجھ سے وہ جو چاہتے تھے وہی میں بھی اُن سے چاہتی تھی۔ جو چیز وہ مجھے نہ دے سکے وہ اگر میں انھیں نہ دے سکی تو انھیں اس قدر برہم ہونے کا کیا حق تھا۔ کیا اسی لئے کہ وہ مرد ہیں، اور مرد چاہے عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھے، مگر عورت کا فرض ہے کہ وہ اس کے قدموں لپٹی رہے۔ بہن جس طرح تم نے مجھ سے کوئی پردہ نہیں رکھا، اسی طرح میں بھی تم سے صاف صاف باتیں کر رہی ہوں۔ میری جگہ ایک لمحے کے لئے اپنے کو رکھ لو۔ تب تمھیں میری محسوسات کا اندازہ ہوگا۔ اگر اس معاملے میں میری خطا ہے تو اتنی ہی خطا ان کی بھی ہے۔ جس طرح میں اپنی تقدیر کو رو کر بیٹھ گئی تھی، کیا وہ بھی نہ بیٹھ سکتے تھے۔ تب شاید کبھی آپس میں صفائی ہو جاتی۔ لیکن اب تو اس کی گنجائش ہی نہیں، چاہے مجھے ساری عمر اسی حالت میں رہنا پڑے۔"

سکینہ اس کے جواب میں کچھ بولنے کی جرأت نہ کر سکی۔ شریف مستورات کے دل میں ایسے موقعوں پر کیا جذبات پیدا ہوتے ہیں، اس کا آج صحیح اندازہ ہو گیا۔

(۱۰)

سکھدا سیٹھ دھنی رام کے گھر پہنچی تو نو بج رہے تھے۔ بڑا عالی شان، آسمان سے باتیں کرنے والا محل تھا۔ دروازے پر ایک تیز برقی بلب جل رہا تھا۔ اور دو دربان مسلح کھڑے تھے۔ سکھدا کو دیکھتے ہی اندر باہر ہل چل مچ گئی۔

لالہ منی رام باہر نکل آئے اور اسے اندر لے گئے۔ دوسری منزل پر ملاقاتی کمرہ تھا۔ نہایت تکلف سے سجا ہوا۔ سکھدا وہاں بیٹھی۔ گھر کی عورتیں اُسے پردوں سے جھانک رہی تھیں۔ کمرے میں آنے کی ہمت نہ کر سکتی تھیں۔ سکھدا کا اُن پر سایا پڑ جانے کا اندیشہ تھا۔

سکھدا نے ایک کوچ پر بیٹھ کر خیر و عافیت پوچھی اور منیا سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔

منی رام ایک سگار جلا کر بولے "آپ نے شاید اخبار نہیں دیکھا۔ پاپا کو دو دن سے بخار آ رہا ہے۔ میں نے کلکتہ سے مسٹر ہاگ کو بلا لیا ہے۔ یہاں کسی ڈاکٹر پر میرا اعتبار نہیں ہے۔ پاپا اب بہت ضعیف ہو گئے ہیں۔ اور ایک نہ ایک شکایت ہمیشہ پیدا ہوتی رہتی ہے۔ کہتا ہوں اب اطمینان سے بیٹھئے۔ اور وہ خود آرام کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جب کوئی بیٹھنے دے۔ گورنر صاحب الہ آباد آئے تھے۔ ان کے یہاں سے خاص ان کے پرائیویٹ سکریٹری کا دعوت نامہ آ پہنچا۔ جانا لازم ہو گیا۔ اس شہر میں اور کسی رئیس کے نام دعوت نامہ نہیں آیا۔ یہ اعزاز کسے نصیب ہوتا ہے۔ عزت ہی تو انسان کی زندگی میں ایک چیز ہے۔ یوں تو اپنا پیٹ سبھی پالتے ہیں۔ وہیں سردی کھا گئے، اب یہ سمجھئے کہ صبح سے شام تک شہر کے رئیسوں کا تانتا لگا ہوا ہے۔ صبح ڈپٹی کمشنر اور ان کی میم صاحبہ آئی تھیں۔ گورنر نے بھی ہمدردی کا تار بھیجا ہے، پاپا سے اُن کی خوب چھنتی ہے۔ پرانی ملاقات ہے۔ دو چار دن کی بیماری کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو روز کے دھندے ہیں۔ یہ اعزاز تو مل گیا۔ شہر کے رؤسا مارے حسد کے بھنے جا رہے ہیں۔ لیکن بھنو اور جلو۔ ہمارا کیا بگڑتا ہے۔"

نوکر پان اور الائچی کی طشتری رکھ گیا۔ سکھدا اندر جانے کے لئے بیقرار

تھی۔ لیکن منی رام اپنا راگ الاپے جاتا تھا۔ "میرے گھر میں ایسی عورت کی ضرورت تھی جو نئی معاشرت کے آداب سے واقف ہو اور لیڈیوں کی خاطر تواضع کر سکے اس شادی سے تو وہ بات پوری نہیں ہوئی۔ پاپا نے لالہ سمر کانت کے حکم کی تعمیل کی۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میں ایسی شادی نہ چاہتا تھا۔ پرانے خیال کی مستورات کی تو ہمارے یہاں کمی نہ تھی۔ مگر وہ لیڈیوں سے ہم کلام نہیں ہو سکتیں لیڈیوں کے سامنے انھیں لانا اپنی توہین کرانا ہے۔ یہ پردے کا زمانہ نہیں رہا آج تو ایسی عورت چاہئے جو جنٹلمینوں سے دوبدو گفتگو کر سکے۔"

سکھدا نے تمسخر کے انداز سے کہا۔ "تو آپ نے کسی لیڈی سے کیوں نہ شادی کی؟"

منی رام بے حیائی سے بولا۔ "دھوکا ہوا اور کیا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ ایسے تعلیم یافتہ خاندان میں لڑکیاں ایسی پھوہڑ ہوں گی، اماں، میری بہنیں اور محلے کی عورتیں تو نئی بہو کو دیوی سمجھ رہی ہیں۔ وہ برت رکھتی ہے، پوجا کرتی ہے۔ سیندور کا ٹیکا لگاتی ہے، ساس کے پانوں چھوتی ہے۔ نندوں کے سر میں تیل ڈالتی ہے۔ دیوروں کے بچوں کو پیار کرتی ہے، لیکن مجھے تو ایسی عورت چاہئے جو میرے کاروبار کو بڑھانے میں میری مدد کر سکے۔ مجھے دنیا میں رہ کر کچھ کام اور کچھ نام کرنا ہے۔ مجھے پوجا پاٹ والی عورت کی ضرورت نہ تھی۔ اونچے درجے کے آدمیوں سے ہمارا ربط ضبط ہے۔ ایسی پرانے خیال کی عورتوں کو تو ہم ان کے روبرو لا ہی نہیں سکتے۔ جب میں اپنے دوستوں کی عورتوں سے ملتا ہوں تو وہ بھی تو چاہتے ہیں کہ میری عورت سے ملیں مجھے مجبور ہو کر دوسری شادی کرنی پڑے گی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں اس شادی کو شادی ہی نہیں سمجھتا۔"

سکھدا کو اس اکیس سال کے نوجوان کی بے شرم دنیا پرستی پر نفرت ہو رہی

تھی۔ اس کی ہوس ناکیوں نے اس کے نفس لطیف کو گویا بالکل پامال کر ڈالا تھا۔
سکھدا نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔ "اس کام کے لئے تو آپ کو تھوڑی سی تنخواہ پر ایسی عورتیں مل سکتی ہیں جو لیڈیوں ہی کی نہیں، صاحبوں کی خاطر و مدارات بھی کر سکیں۔"
منی رام نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا۔ "آپ کاروبار کے ان مسئلوں کو نہیں سمجھ سکتیں۔ یہاں بڑے بڑے ملوں کے ایجنٹ آتے ہیں۔ اگر میری بیوی ان کی خاطر مدارات کر سکتی تو اس کا معاملات پر کتنا خوشگوار اثر پڑتا۔ یہ کام تو کچھ عورت ہی کر سکتی ہے۔"
سکھدا نے اسی منافرت سے ٹوکا۔ "میں تو کبھی نہ کروں چاہے سارا کاروبار خاک میں ملجائے۔"
"شادی کا منشا جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ ہے کہ عورت ہر کام میں مرد کی معاون ہو۔ انگریزوں کے یہاں عورتوں کے ذریعے بڑے بڑے تجارتی مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔"
منی رام منہ پھٹ تھا۔ اس کے مصاحب اسے صاف گو کہتے تھے۔ اُس کا مذاق بھی گالی سے شروع ہوتا تھا اور گالی تو گالی تھی ہی۔ "بولا کم سے کم آپ کو اس معاملے میں مجھے رہنمائی کرنے کا حق نہیں ہے۔ آپ نے اس لفظ کا مطلب سمجھا ہوتا تو اس وقت امرکانت آوارہ وطن نہ ہوتے اور گلی کوچوں کی ہوا نہ کھاتے۔"
سکھدا کا چہرہ شرم اور غصے سے سُرخ ہو گیا۔ اس نے کرسی سے اُٹھ کر تند لہجے میں کہا۔ "میرے بارے میں آپ کو رائے زنی کرنے کا مجاز نہیں ہے لالہ منی رام، رتی بھر بھی مجاز نہیں ہے۔ آپ انگریزی تہذیب کے علم بردار بنتے

ہیں کیا آپ سمجھتے ہیں کہ انگریزی لباس اور سنگار ہی اس تہذیب کی خاص صفت ہے نہیں بلکہ ..... عورتوں کی عزت کرنا۔ اب تک آپ نہیں سیکھ سکے۔ کوئی شریف عورت نفع کے لئے اتنی بے غیرت بننا قبول نہ کرے گی۔"

اس کی بلند آواز سُن کر سارا گھر تھرا اٹھا اور منی رام کی تو گویا زبان ہی بند ہو گئی نینا اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی بھاوج کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کی گرج سن کر سمجھ گئی کوئی بات اس کے مزاج کے خلاف ہو گئی۔ دوڑی ہوئی آکر بولی "میں تمہاری راہ دیکھ رہی تھی بھابی، تم یہاں کیسے بیٹھ گئیں؟"

سکھدا نے اس کی طرف دھیان نہ دے کر اُسی اشتعال کے عالم میں کہا "دولت پیدا کرنا اچھی بات ہے مگر عزت بیچ کر نہیں اور شادی کا منشا وہ نہیں ہے جو آپ سمجھے ہوئے ہیں۔ مجھے آج معلوم ہوا کہ خود غرضی انسان کو کہاں تک نیچے لیجا سکتی ہے۔"

نینا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے اُٹھاتی ہوئی بولی۔ "اُرے تو یہاں سے اٹھو گی بھی۔"

سکھدا اور بھی تیز ہو کر بولی "آپ جانتے ہیں میں کیوں اپنے شوہر کے ساتھ نہیں گئی؟ اس لئے کہ وہ جتنے تیاگی ہیں میں اتنا تیاگ نہیں کر سکتی تھی۔ آپ کو اپنا کاروبار اور دولت غالباً اپنی بی بی کے شرم و حیا سے بھی زیادہ پیارا ہے۔ انھوں نے دولت کو بھی لات ماردی اور کاروبار کو بھی۔ آپ نے گلی کوچوں کی جو بات کہی اس کا اگر وہی مطلب ہے جو میں سمجھی ہوں تو وہ بہتان ہے۔ آپ اپنے روپئے کمائے جائیے اور دولت کے ہاتھوں اپنی عزت کا خون کئے جائیے۔ آپ کا اس پاک نفس آدمی پر چھینٹے اڑانا چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔"

سکھدا لوہار کی ایک کو سنار کی سو کے برابر کرنے کی ناکام کوشش

کر رہی تھی - وہ ایک کلمہ اس کے دل میں جتنا چبھا اتنا کاری کوئی لفظ وہ منہ سے نہ نکال سکی -

نینا کے منہ سے نکلا "بھابی تم کس سے منہ لگ رہی ہو ؟"

منی رام نے غصے سے مٹھی باندھ کر کہا "میں اپنے ہی گھر میں اپنی یہ توہین نہیں برداشت کر سکتا"

نینا نے بھاوج کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا "بھابی مجھ پر رحم کرو۔ ایشور کے لئے یہاں سے چلو"

سکھدا نے پوچھا "کہاں ہیں سیٹھ جی - ذرا ان سے دو دو باتیں کرنا چاہتی ہوں"

منی رام بے رخی سے بولا "آپ اس وقت ان سے نہیں مل سکتیں - ان کی طبیعت اچھی نہیں ہے اور میں نہیں چاہتا کہ آپ کو ان کے دل دکھانے کا موقع دوں"

"اچھی بات ہے نہ جاؤں گی - نینا دیوی کچھ معلوم ہے تمھیں - تمھاری ایک انگریزی سوت آنے والی ہے - بہت جلد"

"اچھا ہی ہے ایک سے دو ہو جائیں گی"

منی رام اس تضحیک پر آپے سے باہر ہو گیا - سکھدا نینا کے ساتھ چلی تو آگے آکر بولا "آپ میرے گھر میں نہیں جا سکتیں"

سکھدا رک کر بولی "اچھی بات ہے نہ جاؤں گی - مگر یاد رکھئے اس توہین کا نتیجہ آپ کے حق میں اچھا نہ ہوگا"

نینا پیروں پڑتی رہی مگر سکھدا فوراً باہر نکل گئی -

ایک لمحے میں گھر کی ساری عورتیں اور بچے جمع ہو گئے - اور سکھدا کی حرکت پر تبصرے ہونے لگے - کسی نے کہا اس کی آنکھ کا پانی مر گیا - دوسری بولی ایسی

نہ ہوتی تو کھسم چھوڑ کر کیوں چلا جاتا۔

نینا سر جھکائے سنتی رہی۔ اُس کا ضمیر اس پر ملامت کر رہا تھا۔ تیرے سامنے یہ ستم ہو رہا ہے اور تو بیٹھی سن رہی ہے۔ لیکن اس وقت زبان کھولنا قہر ہو جاتا۔ وہ لالہ سمر کانت کی بیٹی ہے اس داغ کو اس کی بے غرض خدمت اور بے زبان تحمل بھی نہ مٹا سکا تھا۔ بالمیکی رامائن کی کتھا کے موقع پر سمر کانت نے سیٹھ دھنی رام کا سر نیچا کر کے اس مخاصمت کا بیج بویا تھا۔ اس کے پہلے دونوں سیٹھوں میں خاصہ یارانہ تھا۔ اُس دن سے حسد پیدا ہوا۔ شاید سمر کانت کو ذلیل کرنے ہی کے لئے دھنی رام نے یہ شادی منظور کی شادی کے بعد ان کے حسد کا شعلہ ٹھنڈا ہو گیا۔

منی رام میز پر پیر رکھ کر متکبرانہ لہجے میں بولا "میں اس عورت کو کیا سمجھتا ہوں اُس کا جواب دینا ہی فضول تھا۔ کوئی مرد ہوتا تو اسے بتلاتا۔ لالہ سمر کانت نے جوا کھیل کھیل کر دولت جمع کی ہے۔ اسی پاپ کا پھل بھوگ رہے ہیں۔ یہ مجھ سے باتیں کرنے چلی ہیں۔ ان کی ماں ہیں انھیں اس شہدے شانتی کمار نے بیوقوف بنا کر ساری جائداد لکھالی۔ اب ٹکے ٹکے کو محتاج ہو رہی ہیں۔ سمر کانت کا بھی یہی حال ہونے والا ہے۔ اور یہ دیوی ملک کی نجات کا بیڑا اُٹھانے چلی ہیں۔ اچھوتوں کے لئے مندر کیا کھلوا دیا کہ اب کسی کو کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ مگر زمین کے معاملہ میں ایسا غچہ کھائیں گی کہ عمر بھر یاد کریں گی۔ میں نے ان دو برسوں میں اپنے کاروبار کو جتنی ترقی دی ہے لالہ سمر کانت سات جنم میں بھی نہیں کر سکتے۔"

منی رام کا سارے گھر پر رعب تھا۔ وہ دولت کما سکتا تھا۔ اس لئے اس کے طور طریق کو پسند نہ کرنے پر بھی سارا گھر اس کا غلام تھا۔ اسی نے تو کاغذ اور چینی کی ایجنسی کھولی تھی۔ لالہ دھنی رام جی گھی کے بیوپاری تھے مگر اس بیوپار میں رقابت کے باعث نفع بہت کم ہوتا تھا۔ کاغذ اور چینی کا وہ اکیلا ایجنٹ

تھا نفع کا کیا ٹھکانا۔ یہ فروغ پاکر اس کا سر پھر گیا تھا۔ کسی کو گنتا ہی نہ تھا۔ اگر کسی کا کچھ لحاظ کرتا تھا تو لالہ دھنی رام کا۔ اور انھیں سے کچھ ڈرتا بھی تھا۔

دفعتاً لالہ دھنی رام کھانستے ہانپتے لاٹھی ٹیکتے آکر بیٹھ گئے۔

منی رام نے فوراً پنکھا بند کرتے ہوئے کہا۔ "آپ نے اتنی تکلیف کیوں کی بابو جی۔ مجھے بلا لیتے۔ ڈاکٹر نے آپ کو چلنے پھرنے کی ممانعت کی تھی۔"

لالہ دھنی رام نے پوچھا۔ "کیا آج لالہ سمر کانت کی بہو آئی تھی؟"

منی رام کچھ سہم کر بولا۔ "جی ہاں آئی تھی"

دھنی رام نے آنکھیں نکال کر کہا۔ "تو تم نے ابھی سے مردہ سمجھ لیا۔ مجھے اطلاع تک نہ دی۔"

"میں تو انھیں روک رہا تھا مگر وہ جھلائی ہوئی چلی گئیں۔"

"تم نے اپنی بدزبانیوں سے اُسے ناراض کر دیا ہوگا۔ ورنہ وہ مجھ سے ملے بغیر نہ جاتی۔"

"میں نے تو صرف یہی کہا تھا۔ ان کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔"

"تو تم سمجھتے ہو جس کی طبیعت اچھی نہ ہو اُسے تنہائی میں مرنے دینا چاہئے! آدمی تنہائی میں مرنا بھی نہیں چاہتا۔ اس کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ ایسے موقعوں پر اس کے عزیز و اقارب اُسے آکر گھیر لیں۔" کھانسی کی شدت سے وہ ایک منٹ تک بے قرار رہے۔ پھر بولے۔ "میں کہتا ہوں تم کچھ سڑی تو نہیں ہو گئے ہو۔ اچھی دوکانداری ہی سے کسی کی زندگی کی اصلاح نہیں ہو جاتی۔ سمجھ گئے۔ کامیاب آدمی وہی ہے جو دوسروں سے اپنا کام بھی نکالے اور ان پر احسان بھی رکھے شیخی مارنا کامیابی کی دلیل نہیں، اوچھے پن کی دلیل ہے۔ وہ میرے پاس آتی تو یہاں سے خوش ہو کر جاتی۔ اور یہ سمجھ لو کہ اس کی خوشی بڑے کام کی

چیز ہے۔ شہر میں اس کی کتنی دھاک ہے شاید تمھیں اس کی خبر نہیں۔ وہ اگر تمھیں نقصان پہنچانا چاہے تو ایک دن میں تمھیں تباہ کر سکتی ہے۔ اور وہ تمھیں تباہ کر کے چھوڑے گی۔ میری بات گرہ میں باندھ لو۔ جس نے اپنے شوہر کی پروانہ کی۔ اپنی جان کی پروانہ کی ..... نہ جانے تمھیں کب عقل آئے گی۔"

کھانسی کا دوسرا دورہ ہوا۔ منی رام نے دوڑ کر انھیں لٹایا اور ان کی پیٹھ سہلانے لگا۔ ایک منٹ کے بعد لالہ جی سانس لے سکے۔

منی نے متفکر ہو کر کہا۔ "اس ڈاکٹر کی دوا سے آپ کو کچھ فائدہ نہیں ہو رہا ہے۔ کہیے تو کبیراج کو تار دیکر بلا لوں۔"

دھنی رام نے لمبا سانس کھینچ کر کہا۔ "اچھا تو ہوں گا، بیٹا میں کسی سادھو کی چٹکی بھر راکھ سے۔ ہاں یہ تماشا چاہے کر لو۔ اور یہ تماشا کچھ برا نہیں رہا۔ ایسے تماشوں میں تھوڑا سا روپیہ خرچ کر دینے کو میں برا نہیں سمجھتا۔ لیکن اس وقت کے لئے اتنا بہت ہے۔ کل ڈاکٹر صاحب سے کہہ دوں گا اب آپ کی ضرورت نہیں تشریف لے جائیے۔"

منی رام نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "کہیے تو سکھدا دیوی کے پاس جاؤں؟"

دھنی رام نے پرغرور لہجے میں کہا۔ "نہیں میں تمھیں ذلیل نہیں کرنا چاہتا ذرا مجھے یہ دیکھنا ہے کہ وہ کتنی بے لنس ہے۔ میں نے کتنی ہی بار نقصان اٹھائے مگر کبھی ذلت نہیں اٹھائی۔ سمر کانت کو میں نے دیکھ لیا۔ وہ لاکھ برا ہو پر دل کا صاف ہے۔ اب ان کی بہو کا امتحان ہے۔"

یہ کہہ کر انھوں نے لکڑی اٹھائی اور آہستہ آہستہ اپنے کمرے کی طرف چلے۔ منی رام انھیں دونوں ہاتھوں سے سنبھالے جا رہا تھا۔

(۱۱)

ساون میں نینا میکے آئی۔ سسرال چار قدم پر تھی لیکن چھ مہینے سے پہلے آنے کی نوبت نہ آئی۔ منی رام کا بس چلتا تو اب بھی رکھنے ڈالتا۔ لیکن سارا گھر نینا کی طرف تھا۔ ساون میں سبھی بہوئیں میکے جاتی ہیں۔ نینا پر اتنا بڑا ظلم نہیں کیا جا سکتا۔

ساون کی جھڑی لگی ہوئی تھی، کہیں کوئی مکان گرتا تھا، کہیں کوئی چھت بیٹھتی تھی۔ سکھدا برآمدے میں بیٹھی ہوئی آنگن میں اٹھتے ہوئے بلبلوں کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ آنگن کچھ گہرا تھا پانی رک جایا کرتا تھا۔ بلبلوں کا بتاسوں کی طرح اٹھ کر کچھ دور چلنا اور غائب ہو جانا اس کے لئے بڑی دلچسپی کا سامان تھا۔ کبھی کبھی دو بلبلے آمنے سامنے آجاتے۔ اور کترا کر ایک دوسرے کے بغل سے نکل جاتے۔ اس محویت کے عالم میں سکھدا کو ایسا معلوم ہوا گویا یہ بلبلے جاندار ہیں۔ گویا ننھے ننھے بچے گول ٹوپیاں دئے پانی میں دوڑ رہے ہیں۔

اُسی وقت نینا نے پکارا، بھابی آؤ، ناؤ ناؤ کھیلیں، میں ناؤ بنا رہی ہوں۔"

سکھدا نے بلبلوں کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا "تم کھیلو میرا جی نہیں چاہتا۔"

نینا نے نہ مانا۔ کاغذ کی دو ناویں لے آکر سکھدا کو اٹھانے لگی "جس کی ناؤ کنارے تک پہنچ جائے اس کی جیت۔ پانچ پانچ روپے کی بازی۔"

سکھدا نے بے دلی سے کہا۔ "تم میری طرف سے بھی ایک ناؤ چھوڑ دو۔ جیت جانا تو روپے لے لینا مگر اس کی مٹھائی نہیں آئے گی بتائے دیتی ہوں۔"

"تو کیا دوائیں آئیں گی؟"

"واہ اس سے اچھی اور کیا بات ہوگی۔ شہر میں ہزاروں آدمی کھانسی اور بخار میں مبتلا ہیں۔"

دفعتاً للو نے آکر دونوں ناریں چھین لیں اور انھیں پانی میں ڈال کر تالیاں بجانے لگا۔ نینا نے بچہ کا بوسہ لے کر کہا۔ "وہاں دو ایک بار روزا سے یاد کر کے روتی تھی۔"

سکھدا نے پوچھا۔ "میری یاد بھی کبھی آتی تھی؟"

"کبھی نہیں۔ ہاں بھیا کی یاد آتی تھی۔ مگر وہ اتنے بے درد ہیں کہ چھ مہینے میں ایک خط بھی نہ لکھا۔ میں نے بھی ٹھان لی ہے کہ جب تک ان کا خط نہ آئے گا میں بھی نہ لکھوں گی۔"

"تو سچ مچ تمھیں میری یاد نہ آتی تھی۔ اور میں سمجھ رہی تھی کہ تم میرے لئے بے قرار ہو۔ آخر اپنے بھائی کی بہن ہی تو ہو۔ آنکھ اوٹ، پہاڑ اوٹ۔"

"مجھے تو تمھارے اوپر غصہ آتا تھا۔ اتنے دنوں میں صرف تین بار گئیں اور ایک بار بھی للو کو نہ لے گئیں۔"

"وہ جاتا تو آنے کا نام نہ لیتا۔"

"تو کیا میں اس کی دشمن تھی۔"

"ان لوگوں پر میرا اعتبار نہیں ہے میں کیا کروں۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ تم وہاں کیسے رہتی تھیں۔"

"تو کیا کرتی بھاگ آتی۔ تب بھی تو زمانہ مجھی پر ہنستا۔"

"اچھا سچ بتانا۔ منی رام تم سے محبت کرتے ہیں؟"

"وہ تو تمھیں معلوم ہی ہے۔"

"میں تو ایسے آدمی سے ایک بار بھی نہ بولتی۔"

"میں بھی کبھی نہیں بولی۔"

"سچ! بہت بگڑے ہوں گے۔ اچھا سارا قصہ کہو۔ سہاگ رات کو کیا ہوا؟ دیکھو تمھیں میری قسم ایک لفظ بھی جھوٹ نہ بولنا۔"

نینا نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا "بھابی تم مجھے دق کرتی ہو۔ لے کر قسم رکھا دی جاؤ میں کچھ نہیں بتاتی۔"

"اچھا نہ بتاؤ بھائی کوئی زبردستی ہے۔"

وہ اٹھ کر جانے لگی کہ نینا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "اب بھاگی کہاں جاتی ہو۔ قسم تو دے چکیں۔ بیٹھ کر سنتی جاؤ۔ آج تک میرے اور ان کے درمیان ایک بار بھی بول چال نہیں ہوئی۔"

سکھدا تعجب سے بولی "سچ؟"

نینا نے دردناک لہجے میں کہا۔ "ہاں بالکل سچ ہے بھابی جس دن میں گئی اُس دن رات کو وہ گلے میں ہار ڈالے، آنکھیں نشے سے لال، متوالوں کی طرح آ پہنچے اور میرا گھونگھٹ اٹھاتے ہوئے بولے۔ "میں تمھارا گھونگھٹ دیکھنے نہیں آیا ہوں اور نہ مجھے یہ ڈھکوسلا پسند ہے۔ آ کر اس کرسی پر بیٹھو۔ میں ان دقیانوسی مردوں میں نہیں ہوں جو یہ گڑیوں کا کھیل کھیلتے ہیں۔ تمھیں ہنس کر میرا خیر مقدم کرنا چاہیے تھا۔ اور تم گھونگھٹ نکالے بیٹھی ہو گویا میرا منہ نہیں دیکھنا چاہتیں" ان کا ہاتھ پڑتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے کسی سانپ نے ڈس لیا ہو۔ میں سر سے پاؤں تک تھرا اٹھی۔ انھیں میرے جسم کو ہاتھ لگانے کا کیا حق ہے۔ یہ سوال ایک شعلے کی طرح میرے دل میں اٹھا۔ میری آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ وہ سارے سنہرے خواب جو کئی دنوں سے میں دیکھ رہی تھی پریشان

ہو گئے اس میں تو نہ دیوتا پن تھا نہ آدمی پن۔ یہاں تو صرف بے حیائی تھی، بیہودگی تھی اور غرور تھا۔ میں عقیدت کی تھال میں اپنے دل کا سارا خلوص، ساری مسرت اور ساری محبت لئے اس دیوتا کے قدموں پر نثار کرنے کے لئے بیٹھی ہوئی تھی ان کی یہ قطع دیکھ کر جیسے تھال میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ میرے وجود کا ایک ایک ذرہ اس حکومت کے خلاف بغاوت کرنے لگا۔ میرے جی میں آیا کہ میں بھی کہہ دوں کہ تمہارے ساتھ میری شادی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں تمہاری لونڈی ہوں اگر تم میرے آقا ہو تو میں بھی تمہاری رانی ہوں۔ محبت کی حکومت کے سوا میں کوئی دوسری حکومت قبول نہیں کر سکتی۔ اور نہ چاہتی ہوں کہ تم بھی قبول کرو۔ لیکن جی ایسا جل رہا تھا کہ ملامت بھی نہ کر سکی۔ فوراً وہاں سے اٹھ کر برآمدے میں آ کھڑی ہوئی۔ وہ کچھ دیر کمرے میں میرا انتظار کرتے رہے پھر جھلا کر اُٹھے اور میرا ہاتھ پکڑ کر اندر لیجانا چاہا۔ میں نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور غضبناک ہو کر بولی "میں یہ ذلت نہیں برداشت کر سکتی۔"

آپ بولے۔ "اس صورت پر یہ نخرے!"

میرے جسم میں آگ لگ گئی۔ کوئی جواب نہ دیا۔ ایسے آدمی سے بولنا بھی مجھے شان کے خلاف معلوم ہوا۔ میں نے اندر جا کر کواڑ بند کر لئے اور اُس دن سے پھر اُن سے نہ بولی۔ میں تو ایشور سے مناتی ہوں کہ وہ اپنی شادی کر لیں اور مجھے چھوڑ دیں۔ جو آدمی صرف روپ کا بھوکا ہے، جو صرف ناز و ادا کا غلام ہے۔ جس کے لئے عورت محض نفع کا ایک ذریعہ ہے، اُسے میں اپنا شوہر کیسے سمجھتی۔"

سکھدا نے مذاقاً پوچھا۔ "لیکن تم نے ہی اپنی محبت کا کیا ثبوت دیا۔ کیا شادی کے نام ہی میں اتنی برکت ہے کہ تمہارے میاں آتے ہی آتے تمہارے

قدموں پر سر رکھ دیتے۔"

نینا نے جوش کے ساتھ کہا۔ "ہاں میں تو سمجھتی ہوں شادی کے نام ہی میں برکت ہے۔ جو شخص شادی کو روحانی فرض نہیں سمجھتا محض نفس پروری کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے وہ حیوان ہے۔"

دفعتاً شانتی کمار پانی میں لت پت آکر کھڑے ہو گئے۔

سکھدا نے پوچھا۔ "بھیگ کہاں گئے۔ کیا چھتری نہ تھی؟"

شانتی کمار نے برساتی اتار کر الگنی پر رکھدی اور بولے۔ "آج بورڈ کا جلسہ تھا لوٹتے وقت کوئی سواری نہ ملی۔ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔"

"کتنے ووٹوں سے ہارے؟"

"صرف پانچ ووٹوں سے۔ یہ لالہ دھنی رام کی حرکت تھی۔"

سکھدا نے مایوس ہو کر کہا۔ "تو اب؟"

"اب تو اخباروں اور تقریروں سے عوام میں بیداری پیدا کرنی ہوگی۔"

سکھدا برانگیختہ ہو کر بولی۔ "جی نہیں۔ مجھ میں اتنا تحمل نہیں ہے۔ میں لالہ دھنی رام اور ان کے پٹھوؤں کو چین کی نیند نہ لینے دوں گی۔ اتنے دنوں سب کی خوشامد کر کے دیکھ لیا۔ اب اپنی طاقت سے کام لینا پڑے گا۔"

شانتی کمار لالہ دھنی رام سے جلے ہوئے تھے بولے۔ "لالہ دھنی رام نے تو مجھے دھمکی تک دی۔"

سکھدا برہم ہو کر بولی۔ "دھنی رام کیوں، یہ ذمہ داری بورڈ پر ہے۔ میں ان محلوں میں رہنے والوں کو دکھا دوں گی کہ عوام کیا کر سکتے ہیں۔ لالہ دھنی رام زمین کے ان ٹکڑوں پر اپنے قدم نہ جما سکیں گے۔"

شانتی کمار نے دبی ہوئی آواز سے کہا۔ "میرے خیال میں تو اس وقت پروپگنڈا کرنا ہی کافی ہے ابھی معاملہ طول پکڑ جائے گا۔"

وقف بن جانے کے بعد سے شانتی کمار کسی جوکھم کے کام میں آگے قدم اٹھاتے ہوئے گھبراتے تھے۔ اب ان کے اوپر ایک ادارے کا بوجھ تھا اب انھیں بات بات میں بدنامی اور اس ادارے کے برباد ہو جانے کا خوف ہوتا تھا

سکھدا نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔ "آپ کیا باتیں کر رہے ہیں ڈاکٹر صاحب میں نے ان پرچے لکھے خود غرضوں کو خوب دیکھ لیا۔ مجھ پر اب روشن ہو گیا کہ یہ لوگ محض زبان کے شیر ہیں۔ میں انھیں دکھا دوں گی کہ جن غریبوں کو تم اب تک کچلتے آئے ہو وہ سانپ بن کر تمھارے پیروں سے لپٹ جائیں گے۔ اب تک ہم لوگ ان سے رعایت کے خواستگار تھے مگر اب ہم جو کچھ مانگیں گے اپنا حق سمجھ کر مانگیں گے۔ رعایتوں سے وہ ہمیں محروم رکھ سکتے ہیں لیکن ہمارے حقوق سے کون انکار کر سکتا ہے۔ رعایت کے لئے کوئی جان نہیں دیتا لیکن حق کے لئے جان دینا سبھی جانتے ہیں۔ میں بھی دیکھوں گی کہ لالہ دھنی رام اور ان کے پٹھو کتنے پانی میں ہیں۔"

یہ کہتی ہوئی سکھدا بارش میں کمرے سے نکل آئی اور باہر چلی گئی۔

ایک منٹ کے بعد شانتی کمار نے نینا سے پوچھا۔ "کہاں چلی گئیں؟ بہت جلد گرم ہو جاتی ہیں۔"

نینا نے ادھر ادھر دیکھ کر خدمت گار سے پوچھا تو معلوم ہوا سکھدا باہر چلی گئی۔ شانتی کمار نے متعجب ہو کر کہا۔ "اس بارش میں کہاں گئی ہوں گی۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ہڑتال ورتال نہ کرانے لگیں۔ تم تو وہاں جا کر مجھے بھول گئیں نینا ایک خط بھی نہ لکھا۔"

یکایک انھیں ایسا معلوم ہوا کہ ان کے منہ سے کوئی نازیبا بات نکل گئی۔ نینا سے یہ سوال پوچھنا غیر مناسب تھا۔ اس کا وہ دل میں نہ جانے کیا مطلب سمجھے انھیں ایسا محسوس ہوا کہ ان کا دم گھٹ رہا ہے۔ وہ وہاں سے نکل بھاگنے کے لئے راستہ ڈھونڈھنے لگے۔ وہ وہاں لمحہ بھر بھی نہیں بیٹھ سکتے تھے ان کے دل میں ہل چل ہونے لگی کہیں نینا ناراض ہو کر کچھ کہہ نہ بیٹھے۔ ایسی حماقت مجھ سے کیوں کر سرزد ہو گئی۔ اب تو شاید وہ یہاں کسی کو منہ نہ دکھا سکیں۔

نینا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ کچھ جواب نہ دے کر للو کو پکارتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ شانتی کمار بت کی طرح بیٹھے رہے۔ آخر کار وہ سر جھکائے ہوئے اس طرح چلے گویا جوتے پڑ گئے ہوں۔ نینا کا وہ سرخ چہرہ ایک شعلے کی طرح ان کے قلب کو جلائے ڈالتا تھا۔

نینا نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "کہاں چلے ڈاکٹر صاحب۔ بارش تو رک جانے دیجئے۔"

شانتی کمار نے کچھ بولنا چاہا لیکن الفاظ کی جگہ حلق میں جیسے نمک کا ڈلا پڑا تھا۔ وہ تیزی سے باہر چلے گئے اس طرح لڑکھڑاتے ہوئے گویا اب گرے اب گرے۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

(۱۲)

اب بھی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ شام سے پہلے شام ہو گئی تھی اور سکھدا ٹھاکر دوارے میں بیٹھی ہوئی ایسی ہڑتال کا انتظام کر رہی تھی جو میونسپل بورڈ اور اس کے کارپردازوں کا سر ہمیشہ کے لئے نیچا کر دے۔ انھیں اس کا تجربہ ہو جائے کہ جن لوگوں کو وہ حقیر سمجھتے ہیں انھیں کی خدمت اور شفقت پر ان کی زندگی

قائم ہے۔ سارے شہر میں ایک سنسنی سی چھائی ہوئی تھی، گویا کسی غنیم نے شہر کا محاصرہ کر لیا ہو۔ کہیں دھوبیوں کا جماؤ ہو رہا ہے، کہیں چماروں کا، کہیں مہتروں کا۔ نائی کہاروں کی پنچایت الگ ہو رہی ہے، سکھدا دیوی کے حکم سے کون انحراف کر سکتا تھا۔ سارے شہر میں یہ خبر اتنی جلد پھیل گئی کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ ایسے موقعوں پر خبر رسانی کے ذریعے گویا غیب سے مہیا ہو جاتے ہیں۔ خبریں اپنے آپ ہوا میں دوڑنے لگتی ہیں۔ مہینوں سے عوام کو یہ امید ہو رہی تھی کہ نئے گھروں میں رہیں گے جہاں دھوپ ہوگی ہوا ہوگی، سبھی ایک نئی زندگی کا خواب دیکھ رہے تھے۔ مگر آج حکام شہر نے ان کی آرزوؤں پر پانی پھیر دیا۔

شہر کی مخلوق اب اس حالت میں نہ تھی کہ اس پر کتنی ہی بے رحمیاں ہوں اور وہ چپ چاپ برداشت کرتی جائے۔ اسے اپنے حقوق کا علم ہو گیا تھا کہ اسے بھی آرام سے رہنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا اہل ثروت کو۔ ایک بار منظم تحریک کی کامیابی دیکھ چکے تھے۔ حکام کی یہ مطلق العنانی، یہ خود غرضی، یہ غریب کشی اب ان سے برداشت نہ ہوتی تھی اور یہ کوئی سیاسیات کی اصولی جنگ نہ تھی جس کی حقیقی صورت ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس تحریک کی کامیابی کا اندازہ وہ خود کر سکتے تھے تخیل یا قوت فکر پر زور دینے کی ضرورت نہ تھی۔ شام ہوتے ہوتے ٹھاکر دوارے میں اچھا خاصہ بازار لگ گیا۔

دھوبیوں کا چودھری میکو اپنی بکرے کی سی ڈاڑھی ہلاتا، نشے سے آنکھیں لال کئے ہوئے بولا "کپڑے بنا رہا تھا کہ کھبر ملی۔ بھاگا آرہا ہوں۔ گھر میں کہیں کپڑے رکھنے کی جگہ نہیں ہے گیلے کپڑے کہاں سوکھیں؟"

اس پر جگنا تھہرانے اس کو ڈانٹا "جھوٹ مت بولو میکو، تم کپڑے بنا رہے تھے ابھی سیدھے تاڑی کھانے سے چلے آرہے ہو۔ اس کے

پیچھے برباد ہوگئے مگر لت نہ چھوڑی۔"

میکو نے تیز ہو کر کہا "لے اب چپ رہو چودھری نہیں ساری کلی کھول دوں گا۔ گھر میں بیٹھ کر بوتل کی بوتل اڑا جاتے ہو اور یہاں آکر پارسائی جتاتے ہو۔"

مہتروں کا جمعدار متی کھڑا ہو کر اپنی جمعداری کی شان سے بولا "پنچو یہ بکھت باد ہوائی باتیں کرنے کا نہیں ہے۔ جس کام کے لئے سرکار نے بلایا ہے اس کو دیکھو اور پھیسلا کرو کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔ انھیں بلوں میں پڑے سڑتے رہیں یا چل کر حاکموں سے پھر یاد کریں۔"

سکھدا نے تحکمانہ لہجے میں کہا "حاکموں سے جو کچھ کہنا سننا تھا کہہ چکے کسی نے کان نہ دیا۔ چھ مہینے سے یہی کہا سنی ہو رہی ہے۔ جب اب تک اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو اب کیا امید کیجائے۔ ہم نے آرزو منت سے کام نکالنا چاہا تھا لیکن معلوم ہوا یہ پرانی کہاوت اب بھی اتنی ہی سچی ہے کہ سیدھی انگلیوں گھی نہیں نکلتا۔ ہم جتنا دبیں گے یہ لوگ ہمیں اتنا ہی دبائیں گے آج تمھیں یہ طے کرنا ہے کہ تم اپنے حق کے لئے لڑنے کو تیار ہو یا نہیں۔"

چماروں کا مکھیا سمیر لاٹھی ٹیکتا ہوا، موٹے چشمے لگائے، پوپلے منہ سے بولا "ارج ماروج کرنے کے سوا اور ہم کر ہی کیا کر سکتے ہیں۔ اور ہمارکیا بس ہے۔"

مرلی کھٹیک نے بڑی بڑی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر کہا "بس کیسے نہیں ہے ہم آدمی نہیں ہیں کیا ہمارے بال بچے نہیں ہیں۔ کسی کو تو محل اور بنگلہ چاہئے ہمیں کچا گھر بھی نہ ملے۔ میرے گھر میں پانچ آدمی ہیں ان میں سے چار آدمی ہینے

بھر سے بیمار ہیں۔ اس کال کوٹھری میں بیمار نہ ہوں تو اور کیا ہوں۔ سامنے گندا نالہ بہتا ہے۔ سانس لیتے ناک پھٹتی ہے۔"

عبد و کنجڑا اپنی جھکی ہوئی کمر کو سیدھا کرنے کی کوشش کر کے بولا "اگر مکدر میں آرام کرنا لکھا ہوتا تو ہم بھی کسی بڑے آدمی کے گھر میں نہ پیدا ہوتے حافظ حلیم آج بڑے آدمی ہو گئے۔ نہیں میرے سامنے جوتے بیچتے تھے۔ بڑی لڑائی ان کے لئے مبارک ہو گئی۔ اب رئیسوں کے سے ٹھاٹ ہیں سامنے چلا جاؤں تو پہچانیں گے بھی نہیں۔ نہیں تو پیسے پیسے کی مولی ترئی اُدھار لیجاتے تھے۔ اللہ بڑا کارساج ہے۔ اب تو لڑکا بھی حاکم ہو گیا ہے۔ کیا پوچھنا ہے۔"

جنگلی گھوسی پورا کالا دیو تھا۔ شہر کا مشہور پہلوان۔ بولا "میں تو پہلے ہی جانتا تھا کچھ ہونا ہوانا نہیں ہے۔ امیروں کے سامنے ہمیں کون پوچھتا ہے۔"

معمار امیر بیگ پتلی گردن نکال کر بولا "بورڈ کے فیصلے کی اپیل تو کہیں ہوتی ہو گی۔ ہائی کورٹ میں کیوں نہ اپیل کیجائے۔ ہائی کورٹ نہ سنے تو بادشاہ سے فریاد کیجائے۔"

سکھدا نے مسکرا کر کہا "بورڈ کے فیصلے کی اپیل وہی ہے جو تمہارے سامنے ہو رہی ہے۔ تمہیں ہائی کورٹ ہو۔ تمہیں جج ہو۔ بورڈ امیروں کے لئے ہے غریبوں کے محلے کھود کر پھینک دیے جاتے ہیں اس لئے کہ امیروں کے محل بنیں۔ غریبوں کو دس پانچ روپیہ معاوضہ دے کر اسی زمین کے ہزاروں وصول کئے جاتے ہیں۔ اس روپئے سے افسروں کو بڑی بڑی تنخواہیں دیجاتی ہیں۔ جس زمین پر ہمارا دعویٰ تھا وہ لالہ دھنی رام کو دیدی گئی۔ وہاں ان کے بنگلے بنیں گے۔ بورڈ کو روپیے پیارے ہیں۔ تمہاری جان کی اس کی نگاہ میں کوئی قیمت نہیں۔ ان خود غرضوں سے انصاف کی امید چھوڑ دو۔ تمہارے پاس کتنی طاقت

ہے اس کا انھیں خیال نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ادنیٰ درجے کے لوگ ہمارا کر ہی کیا سکتے ہیں۔ ابھی انھیں تمھاری طاقت کا تجربہ نہیں ہوا۔ ہمیں لڑائی نہیں کرنی ہے، فساد نہیں کرنا ہے۔ صرف ہڑتال کرنا ہے۔ یہ دکھانے کے لئے کہ تم نے بورڈ کے فیصلے کو منظور نہیں کیا اور یہ ہڑتال ایک دو روز کی نہ ہوگی۔ یہ اس وقت تک رہے گی جب تک کہ بورڈ وہ فیصلہ رد کر کے ہمیں وہ زمین نہ دیدے میں جانتی ہوں ایسی ہڑتال کرنا آسان نہیں ہے۔ تم لوگوں میں بہت سے ایسے ہیں جن کے پاس ایک دن کو بھی کھانے کو نہیں ہے مگر یہ بھی جانتی ہوں کہ بغیر تکلیف اٹھائے آرام نہیں ملتا۔"

سمیر کی جوتے کی دوکان تھی۔ تین چار چمار نوکر تھے۔ مزدور سے سرمایہ دار بن گیا تھا۔ گھاس والوں اور سائیسوں کو سود پر روپیہ قرض دیا کرتا تھا۔ موٹی عینکوں کے پیچھے سے بچوں کی طرح تاکتا ہوا بولا۔ "ہڑتال کرنا تو ہماری برادری میں مشکل ہے بہوجی یوں آپ کا گلام ہوں اور جانتا ہوں کہ آپ جو کچھ کریں گی ہماری بھلائی کے لئے کریں گی۔ مگر ہماری برادری میں ہڑتال ہونا مشکل ہے۔ بیچارے دن بھر گھاس کھودتے ہیں۔ سانجھ کو بجار میں بیچتے ہیں تب چولھے پر توا چڑھتا ہے۔ کوئی کسی رئیس کا سہیس ہے کوئی کوچوان۔ ان کی نوکری جاتی رہے گی۔ اب تو سبھی جات والے سہیسی کو چوانی کرتے ہیں۔ ان کی نوکری دوسرے اڑالیں تو بیچارے کہاں جائیں گے۔"

سکھدا میں اختلاف کا تحمل نہ تھا۔ ان موانعات کی اس نگاہ میں کوئی وقعت نہ تھی۔ تند لہجے میں بولی۔ "تو کیا تم نے سمجھا تھا کہ بغیر کچھ کئے دھرے اچھے اچھے مکان رہنے کو مل جائیں گے۔ دنیا میں جو زیادہ سے زیادہ تکلیف سہہ سکتا ہے اسی کی فتح ہوتی ہے۔"

متی جمعدار نے کہا "ہڑتال سے نقصان تو سبھی کا ہوگا کیا ہم ہوئے کیا تم ہوئے لیکن بغیر دھوئیں کے آگ تو نہیں جلتی۔ بہوجی کو پاکر اگر ہم کچھ نہ کر سکے تو سمجھ لو جندگی بھر ٹھوکریں کھانی پڑیں گی، جو یہ کہتے ہو کہ نوکری چلی جائے گی تو نوکر تو ہم سب بھی ہیں۔ کوئی سرکار کے نوکر ہیں، کوئی رئیس کے نوکر ہیں ہم کو یہاں قسم کھانی پڑے گی کہ جب تک ہڑتال رہے کوئی کسی کی جگہ پر نہ جائے۔ چاہے بھوکوں بھلے مر جائے۔"

سمیر نے متی کو جھڑک کر کہا "جمعدار تم بات تو سمجھتے نہیں بیچ میں کود پڑتے ہو۔ تمھاری اور بات ہی ہماری اور بات ہے۔ ہمارا کام سبھی کرتے ہیں تمھارا کام اور کوئی نہیں کر سکتا۔"

میکو نے سمیر کی تائید کی "یہ تم نے بہت ٹھیک کہا سمیر چودھری ہمیں کو دیکھو۔ اب پڑھے لکھے آدمی دھلائی کا کام کرنے لگے ہیں۔ جگہ جگہ کمپنیاں کھل گئی ہیں۔ گاہک کے گھر پہنچنے میں ہمیں ایک دن کی بھی دیر ہو جاتی ہے تو وہ چٹ پٹ کمپنی میں کپڑے بھیجدیتا ہے۔ ہمارے ہاتھ سے گاہک نکل جاتا ہے۔ ہڑتال دس پانچ دن چلی تو ہم تو کہیں کے نہ رہیں گے۔ ابھی پیٹ کی روٹیاں تو مل جاتی ہیں۔ تب تو روٹیوں کے بھی لالے پڑ جائیں گے۔"

مرلی کھٹیک نے للکار کر کہا "جب کچھ کرنے کا بوتا نہیں تھا تو لڑنے کس برتے پر چلے تھے۔ کیا سمجھتے تھے یہاں بھی رونے سے دودھ مل جائے گا وہ زمانہ اب نہیں ہے۔ اگر اپنا اور بال بچوں کا آرام دیکھنا چاہتے ہو تو سب طرح کی آفتوں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ نہیں گھر میں جا کر آرام سے بیٹھو اور مکھیوں کی طرح مرو۔"

عیدو نے عقیدت مندانہ جوش سے کہا "ہوگا وہی جو مقدر میں ہے۔

ہائے ہائے کرنے سے کچھ ہونے کا نہیں۔ حافظ حلیم تقدیر ہی سے بڑے آدمی ہوگئے اللہ کو منجور ہوگا تو مکان بنتے دیر نہ لگے گی۔"

جگلی نے اس کی تائید کی: "بس تم نے لاکھ روپے کی بات کہہ دی عید میاں۔ اب تو ہمارا دودھ کا سودا ٹھہرا ایک دن دودھ نہ پہنچے یا دیر ہو جائے تو لوگ گھر کیاں جمانے لگتے ہیں۔ ہم ڈیری سے دودھ لیں گے۔ تم بہت دیر کرتے ہو۔ ہڑتال دس پانچ دن چل گئی تو ہمارا تو دیوالہ ہی پٹ جائے گا۔ دودھ۔ تو ایسی چیز نہیں کہ آج نہ بکے کل بک جائے۔"

عید و بولا "یہی حال تو ساگ پات کا بھی ہے بھائی۔ پھر برسات کے دن ہیں۔ سبزی کی چیز شام کو سڑ جاتی ہے۔ کوئی سیت بھی نہیں پوچھتا۔"

امیر بیک نے اپنی سارس کی سی گردن اٹھائی اور کہا "بھوجی میں تو کوئی کاندا کا نون نہیں جانتا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ بادشاہ سے بیر یا دکھایا جائے تو وہ وبر ورسنے گا۔ بادشاہ لوگ راتوں کو بھیس بدل کر رعیت کی حالت دیکھنے نکلتے ہیں۔ اگر ایسی ارجی تیار کیجائے جس پر ہم سب کے دستخط ہوں اور بادشاہ کے سامنے پیش کی جائے تو اس پر جرور لہاج کیا جائے گا۔"

سکھدا نے جگناتھ کی طرف پُرامید نظروں سے دیکھ کر کہا "تم کیا کہتے ہو جگناتھ! ان لوگوں نے تو جواب دیدیا۔"

جگناتھ نے بغلیں جھانکتے ہوئے کہا "تو بھوجی اکیلا چنا تو بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ اگر سب بھائی ساتھ دیں تو میں تیار ہوں۔ ہماری برادری کی روجی نوکری سے چلتی ہے۔ کچھ لوگ کھونچے لگاتے ہیں، کوئی ڈولی ڈھوتا ہے۔ لیکن بہت کرکے لوگ بڑے آدمیوں کی ٹہل کرتے ہیں۔ دو چار دن تو بڑے گھروں کی عورتیں بھی گھر کا کام دھندا کریں گی ہم لوگوں کا تو سنیاناس ہی ہو جائے گا۔"

سکھدا نے اس کی طرف سے بھی منہ پھیر لیا اور متی سے بولی "تم کیا کہتے ہو جمعدار کیا تم نے بھی ہمت چھوڑ دی ؟"

متی نے چھاتی ٹھونک کر کہا "بات کہہ کر نکل جانا پاجیوں کا کام ہے سرکار۔ آپ کا حکم ہوگا اس کے باہر نہیں جا سکتا۔ چاہے جان رہے یا جائے۔ کھدا کے پھل سے برادری پر اتنی دھاک ہے کہ جو بات میں کہوں گا اسے کوئی ٹال نہیں سکتا"

سکھدا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "اچھی بات ہے۔ کل سے تم اپنی برادری کی ہڑتال کروا دو۔ دوسرے چودھریوں کو میری طرف سے چھٹی ہے۔ میں خود گھر گھر گھوموں گی۔ ایک ایک کے دروازے پر جاؤں گی۔ ایک ایک کے پاؤں پڑوں گی اور ہڑتال کرا کے چھوڑوں گی اور ہڑتال نہ ہوئی تو منہ میں کالکھ لگا کے ڈوب مروں گی مجھے تم لوگوں سے بڑی امید تھی، تمھارا بڑا زور تھا، بڑا غرور تھا۔ تم نے میرا غرور توڑ دیا"

یہ کہتی ہوئی وہ ٹھاکر دوارے سے نکل کر پانی میں بھیگتی ہوئی چلی گئی۔ متی بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ دوسرے چودھری اپنی خطاوار صورتیں لئے بیٹھے رہے ایک لمحے کے بعد جگنا تھ بولا "بہوجی نے سیر کا کلیجہ پایا ہے"

سمیر نے پوپلا منہ چلا کر کہا "بچھی کا اوتار ہے لیکن بھائی روجگار نہیں چھوڑا جاتا۔ حاکموں کی کون چلا وے مہینے دو مہینے نہ سنیں تو یہاں تو مر مٹیں گے"

عید و کو دور کی سوجھی "مر نہیں مٹیں گے بچو۔ چودھریوں کو جیل میں ٹھونس دیا جائے گا۔ ہوکس پھیر میں۔ حاکموں سے لڑنا ٹھٹھا نہیں ہے"

جنگلی نے حامی بھری "ہم کیا کھا کر رئیسوں سے لڑیں گے۔ بہوجی کے پاس دولت ہے، علم ہے، وہ جو چاہیں کر سکتی ہیں ہماری تو بدھیا بیٹھ جائے گی"

مگر سبھی دل میں شرمندہ تھے۔ جیسے میدان سے بھاگا ہوا سپاہی اُسے

اپنی جان بچنے کی جتنی خوشی ہوتی ہے اُس سے کہیں زیادہ بھاگنے کی شرم ہوتی ہے وہ زبان سے چاہے اس فعل کی تعریف کرے۔ دل سے نہیں کر سکتا۔

ذرا دیر میں پانی رُک گیا اور یہ لوگ بھی یہاں سے چلے۔ لیکن ان کے اداس چہروں میں، ان کی دھیمی چال میں، ان کے جھکے ہوئے سروں میں اور ان کی فکر آمیز خموشی میں ان کے دل کے جذبات جھلک رہے تھے۔

(۱۳)

سکھدا گھر پہنچی تو بہت ملول تھی۔ قومی زندگی میں شکست کا اسے یہ پہلا ہی تجربہ تھا۔ اور اس کا دل کسی چابک کھائے ہوئے الھڑ بچھیرے کی طرح سارا ساز و بم اور رسیاں توڑ تاڑ کر کہیں بھاگ جانے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا ایسے پست ہمت آدمیوں سے کیا امید کیجا سکتی ہے۔ جو لوگ اپنے ذاتی فائدے کے لئے تھوڑی سی تکلیف نہیں اٹھا سکتے ان کے لئے دنیا میں ذلت اور نکبت کے سوا کیا رکھا ہے۔ نینا دل میں اس کی شکست پر خوش تھی۔ اپنی سسرال میں اس کی کچھ پوچھ نہ تھی۔ سبھی اس سے بد گمان تھے۔ تاہم اس کی زندگی اسی خاندان سے تو وابستہ تھی۔ اپنی آنکھیں دکھتی ہیں تو پھوڑ نہیں دیجاتیں۔ سیٹھ دھنی رام نے جو زمین ہزاروں میں خریدی تھی۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس کے لاکھوں میں بکنے کی امید تھی۔ وہ سکھدا سے کچھ کہہ تو سکتی تھی مگر یہ تحریک اُسے بُری معلوم ہوتی تھی۔ سکھدا سے اُسے اب وہ حسن اعتقاد نہ رہا تھا۔ اپنے حاسدانہ جذبات کو پورا کرنے کے لئے ہی تو وہ شہر میں آگ لگا رہی ہے۔

نینا نے مبصرانہ انداز سے کہا۔ "اگر یہاں سے آدمیوں کو منظم کر دینا اتنا آسان ہوتا تو یہ حالت ہی کیوں ہوتی"

سکھدا برانگیختہ ہو کر بولی "ہڑتال تو ہوگی، چاہے چودھری لوگ مانیں یا نہ مانیں۔ یہ چودھری موٹے تو ہو گئے ہیں اور موٹے آدمی خود غرض ہو جاتے ہیں"

نینا نے اعتراض کیا اور بولی "ایسی حالت میں ڈرنا انسان کا فطری خاصہ ہے جس میں ہمت ہے، عقل ہے، قوت ہے۔ وہ مشکلوں کو حقیر سمجھ سکتا ہے جن کی زندگی ہمیشہ افلاس اور ذلت میں بسر ہوئی ہو۔ ان سے آپ میدان عمل میں آنے کی امید نہیں رکھ سکتیں"

سکھدا نے گویا یہ دلیل سنی ہی نہیں۔ بولی "مندر والے جھگڑے میں ان سبھوں میں نہ جانے کیسی ہمت آ گئی تھی۔ میں ایک بار پھر وہی حالت پیدا کر دینی چاہتی ہوں"

نینا نے کانپ کر کہا "نہیں بھابی اتنی بڑی ذمہ داری سر پر نہ لو۔ وقت آ جانے پر سب کچھ اپنے آپ ہی ہو جاتا ہے۔ دیکھو ہم لوگوں کے دیکھتے دیکھتے کم سنی کی شادیاں، اور چھوت چھات کی بندشیں اور بہت سی دوسری رسمیں کتنی کم ہو گئیں۔ تعلیم کا شوق کتنا زیادہ ہو گیا۔ موقع آ جانے پر غریبوں کے مکانات بن جائیں گے"

"یہ تو پست ہمتوں کی دلیل ہے۔ ہمت اسے کہتے ہیں جو موقع کو اپنے موافق بنا لے"

"اس کے لئے اپنے خیالات کی اشاعت کرنی چاہئے"

"چھپ چھپنے والی راہ ہے"

"لیکن خطرہ تو نہیں ہے"

"مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے"

ایک لمحے کے بعد اس نے پھر کہا "اگر میں نے ابھی خدمت ہی کونسی

ایسی کی ہے کہ لوگوں کو مجھ پر اعتبار ہو۔ دو چار گھنٹے گلیوں کا چکر لگا لینا اور کبھی کبھی تقریریں کر لینا کوئی خدمت نہیں ہے۔"

نینا بولی "میں تو سمجھتی ہوں اس وقت ہڑتال کرانے سے لوگوں کو جو تھوڑی بہت ہمدردی ہے وہ بھی غائب ہو جائے گی۔"

سکھدا نے اپنے زانو پر ہاتھ پٹک کر کہا "ہمدردی سے کام چلتا تو پھر رونا کس بات کا تھا۔ میں صرف ہمدردی نہیں چاہتی۔ میں وہ قوت عمل چاہتی ہوں جو نتائج سے بے پروا ہو کر میرے اشاروں پر چلے۔ لیکن اس گھر میں رہ کر اور امیرانہ شان سے زندگی بسر کر کے میں، عوام کے دلوں پر قابو نہیں پا سکتی میں اب تک اسی نتیجہ پر پہنچی ہوں۔"

دوسرے دن شہر میں اچھی خاصی ہڑتال تھی۔ دہتر تو ایک بھی کام کرتا نظر نہ آتا تھا۔ یکے بانوں اور گاڑی بانوں نے بھی کام بند کر دیا تھا۔ سبزی ترکاری کی دوکانیں بھی آدھی سے زیادہ بند تھیں، کتنے ہی گھروں میں دودھ کے لئے ہائے ہائے مچی ہوئی تھی۔ پولیس اور حکام دوکانیں کھلوا رہے تھے۔ اور دہتروں کو جبراً کام پر لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ شہر کے روسا بھی اس کوشش میں شریک تھے۔

دوپہر کا وقت تھا۔ گھٹا امڈی چلی آتی تھی۔ سڑکوں اور گلیوں میں جا بجا پانی جمع تھا۔ اسی کیچڑ میں لوگ ادھر اُدھر دوڑتے پھرتے تھے۔ سکھدا کے دروازے پر ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی کہ دفعتاً شانتی کمار گھٹنے تک کیچڑ لپیٹے آ کر برآمدے میں کھڑے ہو گئے۔ کل کی باتوں کے بعد آج انھیں یہاں آتے تامل ہو رہا تھا۔ نینا نے انھیں دیکھا مگر اندر نہ بلایا۔ سکھدا اپنی ماں سے باتیں کر رہی تھی۔ شانتی کمار پل بھر کھڑے رہے پھر دل شکستہ ہو کر چلنے کو تیار ہوئے۔

سکھدا نے ان کی رونی صورت دیکھی تاہم طعنہ زنی سے نہ چوکی۔ "کسی نے آپ کو یہاں آتے دیکھ تو نہیں لیا ڈاکٹر صاحب؟"

شانتی کمار نے طنز کی اس چوٹ کو خوش طبعی سے روکا۔ "خوب دیکھ بھال کر آیا ہوں۔ کوئی یہاں دیکھ بھی لے گا تو کہہ دوں گا روپے اُدھار لینے آیا ہوں۔"

راما دیوی نے ڈاکٹر صاحب سے دیور کا رشتہ جوڑ لیا تھا۔ آج سکھدا نے کل کا واقعہ سنا کر اُسے ڈاکٹر کو نشانۂ تضحیک بنانے کا سامان بہم پہنچایا تھا۔ حالانکہ بالواسطہ ڈاکٹر صاحب کو محتاط بنانے کا باعث وہ خود تھی۔ اسی نے وقف کا بوجھ ان کے سر رکھ کر نا نوے کے پھیر میں ڈالدیا تھا۔

اس نے ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ کر کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "چوڑیاں پہن کر بیٹھو نا یہ مونچھیں کیوں بڑھالی ہیں؟" شانتی کمار نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں تیار ہوں۔ لیکن مجھ سے شادی کرنے کے لئے تیار رہیئے گا۔ آپ کو مرد بننا پڑے گا۔"

راما تالی بجا کر بولی۔ "میں تو بوڑھی ہوں لیکن تمہارا خسم ایسا ڈھونڈھونگی جو تمہیں سات پردوں کے اندر رکھے۔ اور گالیوں سے بات کرے۔ گہنے میں بنوا دوں گی۔ مانگ میں سیندور ڈال کر گھونگھٹ نکالنا پڑے گا۔ پہلے خسم کھائے گا تو اس کا جھوٹا کھانے کو ملے گا۔ سمجھ گئے۔ اور اسے دیوتا کا تبرک سمجھ کر کھانا پڑے گا۔ ذرا بھی ناک بھوں سکوڑی تو کلمنی کہلاؤ گے۔ اس کے پاؤں دھونے پڑیں گے اور بچے بھی جننے پڑیں گے، بچے نہ ہوئے تو وہ دوسری شادی کرلے گا۔ پھر گھر میں لونڈی بن کر رہنا پڑے گا۔"

شانتی کمار پر بہم اتنی چوٹیں پڑیں کہ ساری ہنسی بھول گئے۔ منہ ذرا سا نکل آیا مارے خفت کے زبان بند ہوگئی۔ راما نے دو چار بار پہلے بھی ان سے ہنسی کی تھی مگر آج تو رُلا کر ہی چھوڑا۔ پھکڑ بازی میں عورت اپنا جواب نہیں رکھتی

خاص کر جو بوڑھی ہو۔

انھوں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "ایک بج رہا ہے۔ آج تو ہڑتال اچھی رہی"

رامانے پھر چٹکی لی۔ "آپ تو گھر میں لیٹے تھے آپ کو کیا خبر"

شانتی کمار نے اپنی کارگذاری دکھلائی۔ "میں اُن آرام سے لیٹنے والوں میں نہیں ہوں دیوی جی، ہر ایک تحریک میں ایسے آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے جو خفیہ طور پر اس کی امداد کرتے رہیں۔ میں نے اپنا طرز عمل بدل دیا ہے اور مجھے تجربہ ہو رہا ہے کہ میں اس ڈھنگ سے قوم کی کچھ زیادہ خدمت کر سکتا ہوں آج نوجوان سبھا کے دس بارہ رضاکاروں کو تعینات کرآیا ہوں ورنہ اس کی چوتھائی ہڑتال بھی نہ ہوتی۔"

رامانے بیٹی کی پیٹھ پر تھپکی دے کر کہا۔ "سب تو انھیں کیوں بدنام کر رہی تھی سکھدا۔ بیچاروں نے اتنی جان کھپائی پھر بھی بدنام، یہ مصلحت میری سمجھ میں بھی آرہی ہے سب کا آگ میں کودنا مناسب نہیں۔"

شانتی کمار کل کا پروگرام طے کر کے اور سکھدا کو اطمینان دلا کر رخصت ہوئے۔

شام ہو گئی تھی، بادل کھل گئے تھے۔ اور چاند کی سنہری ضیا رزین کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے منہ پر گویا مادرانہ الفت کی بارش کر رہی تھی سکھدا سندھیا کرنے بیٹھ گئی۔ اس وقت اس کے دل کی کمزوری کسی ضدی لڑکے کی طرح روتی ہوئی معلوم ہوئی۔ کیا منی رام نے اس کی وہ تحقیر نہ کی ہوتی تو وہ ہڑتال کے لئے اتنی ضد کرتی۔

اس کے غرور نے کہا۔ "ہاں ہاں ضرور ہوتی۔ یہ خیال اس کے دل میں بہت پہلے آیا تھا۔ دھنی رام کا نقصان ہوتا ہے تو ہو وہ اس خوف سے اپنے

فرض سے منہ موڑے۔ جب وہ اپنی زندگی تک اس جہاد میں قربان کرنے کے لئے تلی ہوئی ہے تو دوسروں کے سود و زیاں کی اسے کیا فکر ہو سکتی ہے۔ اس طرح دل کو سمجھا کر اس نے سندھیا پوری کی۔ اور نیچے اتری تھی کہ لالہ سمرکانت آ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہرے پر کسی روحانی تکلیف کی جھلک تھی اور ہونٹ اس طرح پھڑک رہے تھے گویا دل کے جذبات باہر نکلنے کے لئے مضطرب ہو رہے ہیں۔

سکھدا نے پوچھا "آپ کچھ گھبرائے ہوئے ہیں دادا جی بات کیا ہے؟"

سمرکانت کا سارا جسم کانپ اٹھا۔ آنسوؤں کے سیلاب کو بہ زور روکنے کی کوشش کر کے بولے "ایک پولیس کا افسر دوکان پر ایسی خبر دے گیا ہے کہ کیا کہوں"

یہ کہتے کہتے ان کی آواز جیسے گہرے پانی میں ڈبکیاں کھانے لگی۔

سکھدا نے گھبرا کر پوچھا "تو بتلائیے نہ کیا کہہ گیا ہے؟ ہر دوار میں تو سب خیریت ہے؟"

سمرکانت نے اس کی تشویش کو دوسری طرف بہکتے دیکھ کر جلدی سے کہا۔ "نہیں نہیں اُدھر کی کوئی بات نہیں ہے، تمہارے بارے میں تھی۔ تمہاری گرفتاری کا وارنٹ نکل گیا ہے"

سکھدا نے ہنس کر کہا "اچھا! میری گرفتاری کا وارنٹ ہے تو اس کے لئے آپ اتنے کیوں پریشان ہیں لیکن آخر میرا قصور کیا ہے؟"

سمرکانت نے دل کو سنبھال کر کہا "قصور یہی ہڑتال ہے اور کیا۔ آج افسروں میں صلاح ہوئی ہے اور وہاں یہی طے ہوا ہے کہ تمہیں اور چودھریوں کو گرفتار کر لیا جائے۔ ہر ایک بیماری کی ان کے پاس ایک ہی دوا ہے۔ فساد کے

اسباب دور نہ کریں گے بس پکڑ دھکڑ سے کام لینا چاہتے ہیں۔ جیسے کوئی ماں بھوک سے روتے ہوئے بچے کو پیٹ کر چپ کرنا چاہے۔"

سکھدا افسردہ خاطر ہو کر بولی "جس قوم کی بنیاد ہی بے انصافی پر ہو اس کی سرکار کے پاس سختی کے سوا اور کیا دوا ہو سکتی ہے۔ لیکن اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ تحریک فرو ہو جائے گی۔ اسی طرح جیسے کوئی گیند ٹکرا کر دوگنے زور سے اچھلتی ہے۔ عمل جتنا ہی زوردار ہوگا اتنا ہی اس کا جواب بھی زوردار ہوگا۔" ایک لمحے کے بعد اس نے جوش میں آکر کہا "مجھے گرفتار کر لیں، ان لاکھوں غریبوں کو کہاں لے جائیں گے جن کی آہوں کا دھواں بادل بن کر آسمان پر چھایا ہوا ہے یہی آہیں ایک دن کسی آتش فشاں کی طرح پھٹ کر ساری قوم اور قوم کے ساتھ سرکار کو بھی غارت کر دیں گی۔ اگر کسی کی آنکھیں نہیں کھلتیں، نہ کھلیں میں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ ایک دن آئے گا جب آج کے دیوتا کنکر پتھر کی طرح اٹھا اٹھا کر گلیوں میں پھینک دیے جائیں گے۔ اور پیروں سے ٹھکرائے جائیں گے۔ میرے گرفتار ہو جانے سے چاہے کچھ دنوں کے لئے حکام کے کانوں میں غریبوں کی آہ وزاری کی آواز نہ پہنچے۔ لیکن وہ دن دور نہیں ہے جب یہی آنسو چنگاریاں بن کر اس بے انصافی کو جلا کر خاک کر دیں گی۔ اسی پھونس سے وہ آگ روشن ہوگی جس کے کانپتے ہوئے شعلے آسمان تک کو ہلا دیں گے۔"

سمرکانت پر اس مجنونانہ تقریر کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اس بلا کو رد کرنے کی ترکیب سوچ رہے تھے۔ ڈرتے ڈرتے بولے "برا نہ مانو بہو تو ایک بات کہوں، ضمانت دیجائے تو کیسا ہو۔"

سکھدا نے تیوری چڑھا کر کہا "نہیں، ہرگز نہیں۔ میں کیوں ضمانت دوں کیا اس لئے کہ میری سزا دور ہو جائے گی۔ کیا میں یہ وعدہ کر سکتی ہوں کہ کسی

سرکاری معاملے میں اپنی زبان نہ کھولوں گی۔ اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لوں گی اس سے تو کہیں اچھا ہے کہ اپنی آنکھیں پھوڑ لوں اور زبان ہمیشہ کے لئے بند کر لوں۔"

سمرکانت کا تحمل اعتدال سے متجاوز ہو چکا تھا تند لہجے میں بولے: "اگر تمھاری زبان تمھارے قابو میں نہیں ہے تو کٹوا لو۔ میں اپنے جیتے جی یہ ذلت گوارا نہیں کر سکتا کہ تم گرفتار ہو اور میں بیٹھا دیکھوں۔ تم نے ہڑتال کرانے سے پہلے مجھ سے پوچھا کیوں نہیں، تمھیں اپنے نام کی لاج نہ ہوگی مجھے تو ہے جس خاندانی وقار کی حفاظت کے لئے اپنے بیٹے کو بھی ترک کر دیا . . . . . ."

باہر سے موٹر کا ہارن سنائی دیا۔ سکھدا کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ سراسیمگی کے عالم میں دروازے کی طرف چلی۔ پھر دوڑ کر للو کو نینا کی گود سے لے لیا۔ اور اُسے سینے سے لگائے ہوئے اپنے کمرے میں جا کر اپنے زیور اتارنے لگی۔ سمرکانت کا سارا غصہ کچے رنگ کی طرح پانی پڑتے ہی اڑ گیا۔ لپک کر باہر گئے اور ایک لمحے میں آکر بولے: "وہ ڈپٹی آ گیا۔ میں ضمانت دینے جا رہا ہوں۔ میری اتنی التجا قبول کرو بہو۔ تھوڑے دنوں کا مہمان اور ہوں۔ مجھے مر جانے دو۔ پھر جو کچھ جی میں آئے کرنا۔" سکھدا کمرے کے دروازے پر آکر مستقل انداز سے بولی: "میں نے کوئی قصور نہیں کیا ہے اور نہ ضمانت دوں گی۔"

سمرکانت نے اپنی زندگی میں کبھی ہار نہ مانی تھی۔ لیکن آج اس خوددار حسینہ کے سامنے مجبوب اور مغلوب کھڑے تھے۔ انھوں نے سوچا عورتوں کو دیا صنف نازک کہتی ہے۔ کتنی بڑی جہالت ہے۔ انسان جس چیز کو جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھتا ہے وہ اس کی مٹھی میں ہے اسے نازک کیوں کہتے ہو؟ انھوں نے انکسار کے ساتھ کہا: "لیکن کچھ کھانا تو کھا لو۔ کھڑی منہ کیا دیکھتی

ہے نینا، کیا بھنگ کھا گئی ہے، جا بہو کو کھانا کھلا دے۔ ارے او مہرا نہرا، یہ نہ جانے کہاں جا کر مر رہا۔ وقت پر ایک بھی آدمی نظر نہیں آتا۔ تو بہو کو رسوئیں میں لے جا میں کچھ مٹھائی لیتا آؤں۔ ساتھ کچھ کھانا بھی تو لیجانا ہی پڑے گا۔"

کہار اوپر بچھاون بچھا رہا تھا۔ دوڑتا ہوا آکر کھڑا ہو گیا۔ سمر کانت نے اسے زور سے ایک لات جما کر کہا۔ "کہاں تھا تو۔ اتنی دیر سے پکار رہا ہوں سنتا ہی نہیں۔ کس کے لئے بچھاون بچھا رہا ہے۔ بہو تو جا رہی ہے جا دوڑ کر بازار سے اچھی اچھی مٹھائیاں لا۔"

سکھدا نے منع کرتے ہوئے کہا۔ "مٹھائی کی مجھے بالکل ضرورت نہیں ہے دادا۔ اور نہ کچھ کھانے ہی کو جی چاہتا ہے، کچھ کپڑے ساتھ لئے جاتی ہوں یہی کافی ہے۔"

باہر سے آواز آئی "سیٹھ جی، دیوی کو جلد بھیجئے دیر ہو رہی ہے۔"

سمر کانت باہر آئے اور مجرم کی طرح کھڑے ہو گئے۔

پولیس افسر دوہرے بدن کا، رعب دار مگر خوش اخلاق آدمی تھا۔ جو شاید اور کسی صیغہ میں اچھی جگہ نہ پانے کے باعث پولیس میں چلا آیا تھا۔ بلا ضرورت حکومت جتانے سے اسے نفرت تھی۔ اور حتی الوسع رشوت نہ لیتا تھا۔ پوچھا "کیا رائے ہوئی؟"

سمر کانت نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "کچھ نہیں سنتی حضور، سمجھا کر ہار گیا۔ اور میں اسے کیا سمجھاؤں، مجھے وہ سمجھتی ہی کیا ہے، اب تو آپ لوگوں کی شفقت کا بھروسہ ہے۔ مجھ سے جو خدمت کہئے اس کے لئے حاضر ہوں۔ سے تو آپ کا ربط ضبط ہو گا ہی۔ انھیں بھی سمجھا دیجئے پائے۔ میں کسی طرح بھی باہر نہیں ہوں۔ نازک مزاج"

ڈپٹی نے سیٹھ جی کو برابر کی کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا "آپ تو حضرت مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ یہ طرز عمل وہاں کے لئے ہے جہاں بڑی نیت سے کوئی کام کیا جاتا ہے۔ دیوی جی جو کچھ کر رہی ہیں وہ غریبوں کی بہتری کے لئے۔ انھیں کسی طرح کی تکلیف نہ ہوگی۔ اس کا اطمینان رکھئے۔ نوکری سے مجبور ہوں ورنہ یہ دیویاں تو اس لائق ہیں کہ ان کے قدموں پر سر رکھے۔"

سیٹھ جی نے صندوق سے دو اشرفیاں نکالیں اور چپکے سے ڈپٹی صاحب کی جیب میں ڈالتے ہوئے بولے "یہ بچوں کی مٹھائی کے لئے ہے۔"

ڈپٹی نے اشرفیاں جیب سے نکال کر میز پر رکھدیں اور بولا "آپ پولیس والوں کو بالکل جانور ہی سمجھتے ہیں کیا سیٹھ جی۔ کیا لال پگڑی سر پر رکھنا ہی انسانیت کا خون کرنا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ دیوی جی کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے گی۔ تکلیف انھیں دیجاتی ہے جو دوسروں کو تکلیف دیتے ہیں۔ جو غریبوں کے حق کے لئے اپنی زندگی قربان کرتے ہیں انھیں اگر کوئی ستائے تو وہ انسان نہیں، حیوان بھی نہیں، شیطان ہے۔ ہمارے صیغے میں ایسے آدمی ہیں اور کثرت سے ہیں، میں خود فرشتہ نہیں ہوں۔ لیکن ایسے معاملوں میں میں پان تک کھانا حرام سمجھتا ہوں۔ مندر والے معاملے میں دیوی جی جس دلیری سے میدان عمل میں آکر گولیوں کے سامنے کھڑی ہوگئی تھیں وہ انھیں کا کام تھا۔"

سامنے سڑک پر عوام کا ہجوم ہر لحہ بڑھتا جاتا تھا۔ بار بار جے کے نعرے

میں معرکہ چھڑا ہوا تھا۔ سکھدا نے تھالی سامنے
دیا میں کچھ نہ کھاؤں گی۔"

نینا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "دو چار لقمے ہی کھا لو بھابی، تمہارے پیروں پڑتی ہوں۔ پھر نہ جانے یہ دن کب آئے۔"

اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔

سکھدا بے دردی سے بولی "تم مجھے ناحق پریشان کر رہی ہو بی بی مجھے ابھی بہت سی تیاریاں کرنی ہیں اور اُدھر ڈپٹی جلدی مچا رہا ہے۔ دیکھتی نہیں ہو دروازے پر ڈولی کھڑی ہے۔ اس وقت کھانے کی کسے سوجھتی ہے۔"

نینا نے رقت آمیز لہجے میں کہا "تم اپنا کام کرتی رہو میں تمہیں لقمے بنا کر کھلاتی جاؤں گی۔"

جیسے ماں کھلنڈرے بچے کے پیچھے دوڑ دوڑ کر اُسے کھلاتی ہے۔ اسی طرح نینا بھابی کو کھلانے لگی۔ سکھدا کبھی اس الماری کے پاس جاتی، کبھی اُس الماری کے پاس۔ نینا ایک لقمہ کھلا کر پھر تھال کے پاس جاتی اور دوسرا لقمہ لے کر دوڑتی۔

پانچ چھ لقمے کھا کر سکھدا نے کہا "بس اب پانی پلا دو۔"

نینا نے لقمہ اس کے منہ کے پاس لے جا کر کہا "بس یہی لقمہ اور لے لو۔ میری اچھی بھابی۔"

سکھدا نے منہ کھول دیا اور لقمے کے ساتھ آنسو بھی پی گئی۔

"بس ایک اور"

"اب ایک لقمہ بھی نہیں"

"میری خاطر سے۔"

سکھدا نے لقمہ لے لیا

"پانی بھی دو گی یا کھلاتی ہی جاؤ گی۔"

"بس ایک لقمہ بھیا کے نام کا اور لے لو۔"

"ہرگز نہیں۔"

دونوں ہی کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ مگر نینا کے آنسو نیچے گر رہے تھے۔ سکھدا کے آنکھوں ہی میں خشک ہوئے جاتے تھے۔ نینا ان کے سیلاب میں ڈوبی جاتی تھی۔ سکھدا ضبط سے انھیں روکے ہوئے تھی۔ دل آزار الفاظ سے اس کے دل کے چاروں طرف ایک کھائی سی بنا دینا چاہتی تھی تاکہ وہ رنج اور غم اور جدائی کے حملوں سے محفوظ رہے۔ لیکن نینا کی وہ چھلچھلائی ہوئی آنکھیں وہ کانپتے ہوئے ہونٹ، وہ لجاجت آمیز بے کسی معذور کئے دیتی تھی۔

نینا نے جلدی جلدی پان کے بیڑے لگائے اور بھابی کو کھلانے لگی۔ تو اس کے دبے ہوئے آنسو فوارے کی طرح ابل پڑے۔ منہ پھیر کر رونے لگی سسکیاں اور گہری ہو کر حلق تک جا پہنچیں۔

سکھدا نے اسے گلے لگا کر پر درد الفاظ میں کہا "کیوں روتی ہو بی بی۔ دریا میں ملاقات تو ہوتی ہی رہے گی۔ جیل میں مجھ سے ملنے آنا تو اچھی اچھی چیزیں بنا کر لانا دو چار مہینے میں تو میں پھر آ جاؤں گی۔"

نینا نے گویا ڈوبتی ہوئی ناؤ پر سے کہا "میں ایسی بدنصیب ہوں کہ آپ تو ڈوبی ہی تھیں بھی لے ڈوبی۔"

یہ الفاظ پھوڑے کی طرح اسی وقت سے اس کے دل میں ٹیس رہے تھے۔ جب سے اس نے سکھدا کی گرفتاری کی خبر سنی تھی۔ اور یہ ٹیس اس کے صدمہ جدائی کو اور بھی جگر دوز بنا رہی تھی۔

سکھدا نے تعجب سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا "یہ تم کیا کہہ رہی ہو بی بی کیا تم نے پولیس بلائی ہے؟"

نینا نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ "یہ پتھر کی حویلی والوں کی سازش ہے۔ (سیٹھ دھنی رام شہر میں اسی نام سے مشہور تھے۔) میں کسی کو گالیاں نہیں دیتی لیکن انکا کیا ان کے آگے آئے گا۔ جس آدمی کے لئے ایک منہ سے بھی دعا نہ نکلے اس کا جینا بے کار ہے۔"

سکھدا نے غمگین ہو کر کہا۔ "ان لوگوں کی اس میں کوئی خطا نہیں ہے بی بی، یہ سب ہمارے سماج کا، ہم سبھوں کا قصور ہے۔ اچھا آؤ اب رخصت ہوں۔ وعدہ کرو کہ میرے جانے پر روؤ گی نہیں۔"

نینا نے اس کے گلے سے لپٹ کر سوجی ہوئی لال آنکھوں سے مسکرا کر کہا۔ "نہیں روؤں گی بھابی۔"

"اگر میں نے سنا کہ رو رہی ہو تو میں اپنی سزا بڑھا لوں گی۔"

"بھیا کو تو یہ ساری کیفیت لکھنی ہی ہوگی۔"

"تمہاری جیسی خوشی ہو کرنا، اماں کو سمجھاتی رہنا۔"

"ان کے پاس کوئی آدمی بھیجا گیا ہے یا نہیں؟"

"انھیں بلاتے سے اور دیر ہی تو ہوتی۔ گھنٹوں نہ چھوڑتیں۔"

"سن کر دوڑی آویں گی۔"

"ہاں آئیں گی تو مگر روئیں گی نہیں۔ ان کی محبت آنکھوں میں ہے۔ دل تک اس کی جڑ نہیں پہنچتی۔"

دونوں دروازے کی طرف چلیں۔ نینا نے للو کو ماں کی گود سے اتار کر پیار کرنا چاہا مگر وہ نہ اترا۔ نینا سے بہت ہلا ہوا تھا۔ مگر آج وہ اپنی نادان آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ ماں کہیں جا رہی ہے اس کی گود سے کیسے اترے۔ اسے چھوڑ کر وہ چلی جائے تو وہ بیچارہ کیا کرے گا۔

نینا نے اس کا بوسہ لے کر کہا "بچے بڑے بے درد ہوتے ہیں"
سکھدا نے مسکرا کر کہا "لڑکا کس کا ہے؟"
دروازے پر پہنچکر پھر دونوں گلے ملیں۔ سمرکانت بھی ڈیوڑھی پر کھڑے تھے۔ سکھدا نے ان کے قدموں پر سر جھکایا۔ انھوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُسے اٹھا کر دعا دی۔ پھر للو کو کلیجے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، یہ گویا سارے گھر کو رونے کا سگنل تھا۔ آنسو تو پہلے ہی سے نکل رہے تھے مگر وہ گریۂ خاموش گویا قیدوں سے آزاد ہو گیا۔ صابر، شاکر، متوکل اور متین بڑھاپا جب ضبط کھو بیٹھتا ہے تو گویا پنجرے کے دروازے کھل جاتے ہیں اور چڑیوں کو روکنا غیر ممکن ہو جاتا ہے۔ جب ستر برس تک عرصۂ گیتی میں جا رہنے والا آزمودہ کار سورما ہتھیار ڈالدے تو رنگروٹوں کو کون روک سکتا ہے۔ جب موٹر چلی تو ہزاروں آدمی اس کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ اور سکھدا ہاتھ اٹھا اٹھا کر انھیں پرنام کرتی جاتی تھی۔ یہ اعزاز، یہ محبت، یہ عقیدت کیا دولت سے مل سکتی ہے یا علم سے؟ نہیں۔ اس کا صرف ایک ذریعہ ہے اور وہ ہے خدمت۔ اور سکھدا کو ابھی اس میدان میں آئے ہوئے ہی کتنے دن ہوئے تھے۔

سڑک کے دونوں طرف مرد عورتوں کی دیوار کھڑی تھی اور موٹر جیسے ان کے دلوں کو کچلتی، مسلتی چلی جاتی تھی۔

سکھدا کے دل میں غرور نہ تھا، کدورت نہ تھی صرف درد تھا۔ لوگوں کی اس بیکسی پر، اس زبوں حالی پر جو ڈوبتی ہوئی حالت میں تنکے کا سہارا پاکر پھولی نہیں سماتی۔

کچھ دیر بعد سڑک پر سناٹا تھا۔ ساون کی نیند سی کالی رات دنیا کو اپنے آنچل میں سلا رہی تھی۔ اور موٹر اس فضائے تاریک میں خواب کی طرح اڑی چلی

جا رہی تھی۔ صرف جسم میں ٹھنڈی ہوا لگنے سے حرکت کا علم ہوتا تھا۔ اس تاریکی میں سکھدا کے باطن میں ایک روشنی سی نمودار ہوئی، کچھ ویسی ہی روشنی جو ہماری زندگی کے آخری لمحوں میں بیدار ہو جاتی ہے جس میں دل کی ساری کدورتیں ساری ناہمواریاں اپنی اصلی صورت میں نظر آنے لگتی ہیں۔ تب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اندھیرے میں جس چیز کو ہم نے کالا دیو سمجھا تھا وہ صرف خاشاک کا ایک ڈھیر تھا۔ جسے کالا ناگ سمجھا تھا وہ رسی کا ایک ٹکڑا تھا آج اُسے اپنی شکست کا علم ہوا بے انصافی کے سامنے نہیں، ظلم کے سامنے نہیں، جھوٹ کے سامنے نہیں بلکہ ایثار کے سامنے اور خدمت کے سامنے۔ اسی ایثار اور قربانی کی بدولت تو شوہر سے اسے اختلاف ہوا تھا، جو بالآخر اس صورت میں نمودار ہوا۔ زندگی کے اس معیار کو باطل سمجھ کر بھی وہ اس طرف کھنچی چلی جاتی تھی اور آج وہ اپنے شوہر کی مقلد تھی اُسے امر کے اس خط کی یاد آئی جو اس نے شانتی کمار کے پاس بھیجا تھا اور پہلی بار شوہر کی طرف سے اس کے دل میں عفو کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس عفو میں ہمدردی تھی، ہمنوائی تھی، اشتراک تھا۔ اب دونوں ایک ہی راہ کے مسافر ہیں، ایک ہی مندر کے پجاری ہیں۔ ان میں کوئی فرق نہیں ہے، کوئی اختلاف نہیں ہے، آج پہلی بار اُسے اپنے شوہر سے روحانی مناسبت ہوئی۔ جس مورت کو اس نے پتھر کا ٹکڑا سمجھ رکھا تھا، اُسی کی آج وہ پھول مالا سے پوجا کر رہی ہے۔

دفعتاً موٹر رُکی اور ڈپٹی نے اتر کر سکھدا سے کہا "دیوی جی جیل آگیا، اب مجھے معاف کیجئے گا۔" سکھدا ایسی خوش تھی گویا اپنے شوہر سے ملنے آئی ہے۔

چوتھا حصّہ

(۱)

امر کانت کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ سلیم یہاں کا افسر ہو کر آیا ہے تو اس سے ملنے چلا خوش تھا کہ خوب گپ شپ ہوگی۔ یہ خیال تو آیا کہیں اس میں افسری کی بو نہ آگئی ہو، لیکن بچھڑے ہوئے دوست سے ملنے کی خوشی کو نہ روک سکا۔ بیس پچیس میل کا پہاڑی راستہ تھا۔ سردی خوب پڑنے لگی تھی۔ آسمان کہر کے دھندسے مٹیالا ہو رہا تھا اور اس دُھند میں سورج جیسے ٹٹول ٹٹول کر راستہ ڈھونڈھتا ہوا چلا جاتا تھا۔ کبھی سامنے آجاتا، کبھی چھپ جاتا۔ امر تڑکے چلا تھا۔ اسے امید تھی دن رہتے پہنچ جاؤں گا مگر دن ڈھلتا جاتا تھا اور معلوم نہیں ابھی اور کتنا راستہ باقی ہے۔ اس کے پاس صرف ایک دیسی کمبل تھا۔ رات کو کسی درخت کے نیچے فروکش ہونیکا خیال ہی جاں شکن تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آفتاب رخصت ہوگیا۔ اندھیرا گویا منہ کھولے دنیا کو نگلنے چلا آرہا تھا۔ امر نے قدم اور تیز کئے۔ شہر میں داخل ہوا تو آٹھ بج گئے تھے۔

سلیم اسی وقت کلب سے لوٹا تھا۔ خبر پاتے ہی باہر نکل آیا مگر اس کی سج دھج دیکھی تو جھجکا اور گلے ملنے کے بدلے ہاتھ بڑھا دیا۔ اردلی سامنے ہی کھڑا تھا اس کے سامنے اس دہقان سے کسی طرح کی بے تکلفی کا اظہار بڑی ہمت کا کام تھا۔ اسے اپنے

آراستہ کمرے میں بھی نہ لے جا سکا۔ احاطہ میں چھوٹا سا باغ تھا اُسے ایک درخت کے نیچے لیجا کر اس نے کہا "یہ تم نے کیا وضع بنا رکھی ہے جی۔ اتنے بیہوش کب سے ہو گئے۔ واہ رے آپ کا کرتا، معلوم ہوتا ہے ڈاک کا تھیلا ہے اور یہ ڈابلوس جوتا کس دساور سے منگوایا ہے؟ مجھے خوف ہے کہیں بیگار میں نہ دھر لئے جاؤ۔"

امر وہیں زمین پر بیٹھ گیا اور بولا "کچھ خاطر تواضع تو کی نہیں الٹے اور پھٹکار سنانے لگے۔ دیہاتیوں میں رہتا ہوں جنٹلمین بنوں تو کیسے نباہ ہو۔ تم خوب آئے بھائی اب کبھی کبھی گپ شپ ہوا کرے گی۔ وہاں کی خیر و عافیت بتلاؤ، اور مرد خدا تم نے یہ نوکری کیا کر لی؟ شان سے کوئی روزگار کرتے سو بھی بھی تو غلامی کی۔"

سلیم نے غرور سے کہا "غلامی نہیں ہے جناب حکومت ہے۔ دس پانچ دن میں موٹر آیا جاتا ہے پھر دیکھنا کس شان سے نکلتا ہوں۔ مگر تمہاری یہ حالت دیکھ کر دل ٹوٹ گیا۔ تمہیں یہ وضع چھوڑنی پڑے گی۔"

امر نے خوددارانہ لہجے میں کہا "میرا خیال تھا، اور ہے کہ کپڑے محض جسم کی حفاظت کے لئے ہیں، تمائش کے لئے نہیں۔"

سلیم نے سوچا کتنی لچر سی بات ہے۔ دیہاتیوں کے ساتھ رہ کر یہ شخص عقل بھی کھو بیٹھا۔ بولا "کھانا بھی تو محض جسم کی پرورش کے لئے ہی کھایا جاتا ہے تو سوکھے چنے کیوں نہیں چباتے۔ سوکھا گیہوں کیوں نہیں پھانکتے۔ کیوں لذیذ غذائیں ڈھونڈھتے ہو؟"

"میں سوکھے چنے بھی چباتا ہوں۔"

"جھوٹے ہو، سوکھے چنوں ہی پر یہ سینہ نکل آیا ہے۔ مجھ سے ڈیوڑھے ہو گئے میں تو شاید پہچان بھی نہ سکتا۔"

"جی ہاں۔ یہ سوکھے چنوں ہی کی برکت ہے۔ طاقت صاف ہوا اور احتیاط میں ہے۔ حلوے پوری سے طاقت نہیں آتی۔ اس سے سینہ نہیں نکلتا پیٹ نکلتا ہے۔ پچیس میل پیدل چلا آرہا ہوں، ہے دم؟ ذرا پانچ ہی میل چلو میرے ساتھ۔"

"معاف کیجیے۔ کسی نے کہا۔ بڑی رانی ہو تو آؤ پیسو میرے ساتھ۔ پیسا تمھیں کو مبارک ہو۔ تم یہاں کر کیا رہے ہو؟"

"اب تو آئے ہو خود ہی دیکھ لو گے۔ میں نے زندگی کا جو نقشہ دل میں کھینچا تھا اسی پر عمل کر رہا ہوں۔ سوامی آتمانند کے آجانے سے اور بھی سہولت ہو گئی ہے۔"

ٹھنڈ زیادہ تھی۔ سلیم کو مجبور ہو کر امر کانت کو اپنے کمرے میں لانا پڑا۔

امر نے دیکھا کمرے میں گدے دار کوچ ہے۔ پیتل کے گملے ہیں۔ زمین پر قالین ہے، وسط میں سنگ مرمر کی گول میز ہے۔

امر نے دروازے پر جوتے اتار دیے اور بولا "کواڑ بند کر دوں ورنہ شاید کوئی دیکھ لے تو تمھیں شرمندہ ہونا پڑے۔ تم صاحب ٹھہرے۔"

سلیم پتے کی بات سن کر جھیپ گیا۔ بولا "کچھ نہ کچھ تو اس کا خیال ہوتا ہی ہے بھائی۔ حالانکہ میں فیشن کا غلام نہیں ہوں۔ میں بھی سادہ زندگی بسر کرنی چاہتا تھا لیکن ابا جان کی فرمائش کیسے ٹالتا۔ پرنسپل تک کہتے تھے تم پاس نہیں ہو سکتے۔ لیکن جب رزلٹ نکلا تو سب دنگ رہ گئے۔ تمھارے ہی خیال سے میں نے یہ ضلع پسند کیا۔ کل تمھیں کلکٹر سے ملاؤں گا۔ ابھی مسٹر غزنوی سے تو تمھاری ملاقات نہ ہو گی۔ بڑا شوقین آدمی ہے اور دل کا صاف۔ پہلی ہی ملاقات میں ان سے میری خاصی بے تکلفی ہو گئی۔ چالیس کے قریب ہوں گے مگر صید افگنی نہیں چھوڑی

برابر کپے لگایا کرتے ہیں،

امر کے خیال میں افسروں کو نیک کردار ہونا چاہیے تھا، سلیم اس کا قائل نہ تھا۔ دونوں دوستوں میں بحث ہو گئی۔

سلیم نے کہا "خشک آدمی کبھی اچھا افسر نہیں ہو سکتا۔"

امر بولا "نیک صفت ہونے کے لئے خشک ہونا ضروری نہیں۔"

"میں نے تو ملاؤں کو ہمیشہ خشک ہی دیکھا۔ افسروں کے لئے محض قانون کی پابندی کافی نہیں۔ میرے خیال میں تو تھوڑی سی کمزوری انسان کا زیور ہے۔ میں زندگی میں تم سے زیادہ کامیاب رہا۔ مجھے دعوے ہے کہ مجھ سے کوئی دشمن بھی ناراض نہیں۔ تم اپنی بیوی تک کو خوش نہ رکھ سکے۔ میں اس ملاپن کو دور سے سلام کرتا ہوں۔ تم کسی ضلع کے افسر بنا دئے جاؤ تو ایک دن نہ رہ سکو کوئی تم سے خوش ہی نہ ہو۔"

امر نے بحث کو طول دینا مناسب نہ سمجھا کیونکہ بحث میں وہ بہت گرم ہو جایا کرتا تھا۔

کھانے کا وقت آگیا تھا۔ سلیم نے ایک شال نکال کر امر کو اوڑھا دیا، ایک ریشمی سلیپر اسے پہننے کو دیا۔ پھر دونوں دسترخوان پر بیٹھے۔ امر کو ایک مدت کے بعد ایسا لذیذ کھانا نصیب ہوا۔ گوشت تو اس نے کھایا نہیں لیکن اور چیزیں مزے سے کھائیں۔

سلیم نے کہا "جو چیز کھانے کی تھی وہ تو آپ نے نکال کر رکھدی۔"

امر نے خطاوارانہ انداز سے کہا "مجھے کسی قسم کا اعتراض نہیں ہے، لیکن اندر سے رغبت نہیں ہوتی، اور کہو وہاں کی کیا خبریں ہیں۔ کہیں شادی وادی ٹھیک ہوئی؟"

سلیم نے چٹکی لی۔ "میری شادی کی فکر چھوڑو۔ پہلے یہ بتلاؤ کہ سکینہ سے تمہاری شادی کب ہو رہی ہے؟ وہ بیچاری تمہارے انتظار میں بیٹھی ہوئی ہے۔"

امر کانت کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ یہ ایسا سوال تھا جس کا جواب دینا اس کے لئے سب سے مشکل تھا۔ دل کی جس کیفیت میں وہ سکینہ کی طرف لپکا تھا اب وہ بات نہ رہی تھی۔ اس وقت سکھدا اس کی زندگی میں ایک سدراہ کی طرح کھڑی تھی۔ دونوں کے جذبات میں اور خیالات میں کوئی مناسبت نہ تھی۔ دونوں زندگی کو مختلف نقطہ نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ایک میں بھی یہ صفت نہ تھی کہ وہ دوسرے کو اپنا ہم خیال بنا لیتا۔ لیکن اب وہ کیفیت نہ تھی۔ کسی مشیت غیب نے ان کی زندگی میں یکسانیت پیدا کر کے ان کی روحوں کو باہم مربوط کر دیا تھا۔ امر کو خبر نہیں سکھدا نے اسے معاف کیا یا نہیں لیکن وہ خود سکھدا کا پجاری ہو گیا تھا اسے حیرت ہوتی تھی کہ نفس پرور سکھدا ایسی بیدار مغز کیوں کر ہو گئی اور یہ حیرت اس کے اشتیاق کو روز بروز تیز کرتی جاتی تھی۔ اسے اب اپنی اس بد گمانی کا باعث اپنی ہی کم فہمی میں چھپا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اگر وہ اب تک سکھدا کو کوئی خط نہ لکھ سکا تھا تو اس کے دو اسباب تھے ایک تو شرم اور دوسرا اپنی شکست کا خیال فضیلت کا وہ خیال جو مردوں کے ساتھ مخصوص ہے اُسے اپنی شکست کا اعتراف کرنے میں مانع تھا۔ سکھدا آزادانہ طور پر اپنے لئے ایک نئی راہ نکال سکتی ہے۔ امر کانت کی اسے مطلق ضرورت نہیں ہے۔ یہ خیال اس کی محبت اور اشتیاق کی گردن کو جیسے دبائے دیتا تھا۔ وہ اب زیادہ سے زیادہ اس کا پیرو ہو سکتا ہے۔ سکھدا اس کے میدان جنگ میں جاتے وقت محض کیسر یا تلک لگانے پر قانع نہیں ہے۔ وہ اس سے پہلے ہی میدان میں کود جا رہی ہے۔ یہ جذبہ اس کی خوددار طبیعت پر ایک ضرب تھا اس نے سر جھکا کر کہا "مجھے اب تجربہ ہو رہا ہے کہ میں عورتوں کو خوش نہیں

رکھ سکتا، مجھ میں وہ قابلیت ہی نہیں ہے۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ سکینہ پر یہ ظلم نہ کروں گا۔"

"تو کم از کم اپنا فیصلہ اُسے لکھ تو دیتے؟"

امر نے پُر حسرت لہجے میں کہا۔ "یہ کام اتنا آسان نہیں ہے سلیم، جتنا تم سمجھتے ہو۔ اُسے یاد کر کے میں اب بھی دیوانہ ہو جاتا ہوں۔ اس کے ساتھ میری زندگی جنت ہو جاتی، اس کی وفا پر مر مٹنے کو جی چاہتا ہے" یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھاری ہو گئی۔

سلیم نے ایک لمحے کے بعد کہا "مان لو اُسے میں اپنے ساتھ شادی کر لینے پر راضی کر لوں تو تمھیں ناگوار ہو گا؟"

امر کانت نے خوش ہو کر کہا "نہیں بھائی جان مطلق نہیں۔ اگر تم اُسے راضی کر سکو تو میں سمجھوں گا تم سے زیادہ خوش نصیب دنیا میں کوئی نہیں ہے، لیکن تم مذاق کر رہے ہو۔ تم کسی رئیس زادی سے شادی کرنے کے منتظر ہو گے۔"

دونوں کھانا کھا چکے اور ہاتھ دھو کر دوسرے کمرے میں لیٹے۔

سلیم نے حقے کا کش لگا کر کہا "کیا تم سمجھتے ہو میں مذاق کر رہا ہوں۔ اُس دن میں نے ضرور مذاق کیا تھا لیکن اتنے دنوں میں میں نے اُسے خوب پرکھ لیا، اس وقت تم اس کے راستے میں نہ آ جاتے تو اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ وہ اس وقت کسی دوسرے گھر میں ہوتی۔ تمھیں پا کر اس کا دل بے نیاز ہو گیا۔ تم نے اُسے کیچڑ سے نکال کر مندر کی دیوی بنا دیا۔ اور دیوی کے آسن پر بیٹھ کر وہ سچ مچ دیوی ہو گئی۔ اگر تم اُس سے شادی کر سکتے ہو تو شوق سے کر لو میں تو المست ہوں ہی۔ دلچپی کا کوئی دوسرا سامان تلاش کر لوں گا لیکن تم

نہ کرنا چاہو تو میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔"

امر نے حقہ اپنی طرف کھینچ کر کہا "میں بڑے شوق سے تمہارے راستے سے ہٹا جاتا ہوں لیکن ایک بات بتا دو۔ تم سکینہ کو بھی دلچسپی کی چیز سمجھ رہے ہو یا اسے دل سے چاہتے ہو؟"

سلیم اُٹھ بیٹھا اور بولا "دیکھو امر، میں نے تم سے کبھی پردہ نہیں رکھا۔ اس لئے آج بھی پردہ نہ رکھوں گا۔ سکینہ پیار کرنے کی چیز نہیں ہے پوجنے کی چیز ہے۔ کم سے کم مجھے ایسی ہی معلوم ہوتی ہے۔ میں قسم تو نہیں کھاتا کہ اس سے شادی ہو جانے پر میں کنٹھی مالا پہن لوں گا۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ اس کی صحبت کے فیض سے میں زندگی میں کچھ کر سکوں گا۔ اب تک میری زندگی سیلانی پن میں گذری ہے۔ وہ میری گم گشتہ کشتی کا لنگر ہوگی۔ اس لنگر کے بغیر نہیں کہہ سکتا میری ناؤ کس بھنور میں پڑ جائے گی۔ میرے لئے ایک ایسی عورت کی ضرورت ہے جو مجھ پر حکومت کرے، میری لگام کھینچتی رہے۔"

امر کانت کو زندگی اس لئے دوبھر تھی کہ وہ اپنی بیوی پر حکومت نہ کر سکتا تھا۔ سلیم ایسی بیوی چاہتا تھا جو اس پر حکومت کر سکے اور مزہ یہ تھا کہ ایک ہی حسینہ میں دونوں کو اپنی اپنی مطلوب خوبیاں نظر آ رہی تھیں۔

امر نے کہا "میں تو سمجھتا ہوں سکینہ میں وہ بات نہیں ہے جو تم چاہتے ہو۔"

سلیم جیسے گہرائی میں ڈوب کر بولا "تمہارے لئے نہیں ہے مگر میرے لئے ہے۔ وہ تمہاری پوجا کرتی ہے میں اس کی پوجا کرتا ہوں۔"

اس کے بعد دو ڈھائی بجے تک دونوں میں اِدھر اُدھر کی گپ شپ ہوتی رہی۔ سلیم نے اُس نئی تحریک کا بھی ذکر کیا جو اس کے سامنے شروع ہو چکی

تھی۔ اور یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ اس کے کامیاب ہونے کی کوئی امید نہیں۔

امر نے اپنی دلی مسرت کو چھپاتے ہوئے کہا "سکھدا نے تو وہاں ایک نئی دنیا کھڑی کر دی!"

"تمھاری ساس نے اپنی ساری جائداد سیوا آشرم کے نام وقف کر دی۔"

"اچھا"

اور تمھارے پدر بزرگوار اب قومی کاموں میں شریک ہونے لگے ہیں"

"تب تو وہاں پورا انقلاب ہو گیا۔"

سلیم تو سو گیا لیکن امر دن بھر کا تھکا ہونے پر بھی نیند کو نہ بلا سکا۔ وہ جن باتوں کا گمان بھی نہ کر سکتا تھا وہ سکھدا کے ہاتھوں پوری ہو گئیں۔ مگر کچھ بھی ہو ہے وہی امارت۔ گو ذرا بدلی ہوئی صورت میں۔ شہرت کی ہوس ہے اور کچھ نہیں، لیکن پھر اس نے اس تعصب کو دل سے نکال ڈالا، جو اس کی مردانہ فضیلت نے اس کے دل میں پیدا کر دیا تھا۔ تم کسی کے دل کا حال کیا جانتے ہو۔ آج ہزاروں آدمی قوم کی خدمت کر رہے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کون بندۂ غرض ہے، کون سچا خادم۔

نہ جانے کب اُسے بھی نیند آ گئی۔

(۲)

امر کانت کی زندگی میں ایک نیا ولولہ پیدا ہو گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے سفر میں وہ اب ایک نئے گھوڑے پر سوار ہو گیا ہے پہلے ضعیف گھوڑے کو ایڑ اور چابک لگانے کی ضرورت پڑتی تھی۔ یہ نیا گھوڑا کنوتیاں کھڑی کئے

سرپٹ بھاگتا چلا جاتا ہے، سوامی آتمانند، کاشی، پیاگ، گوڈر سبھی سے اس کی تکرار ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں کے پاس وہی پرانے گھوڑے ہیں، دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ امرکانت کی سست رفتاری پر بگڑتا ہے، تنبیہہ کرتا ہے ایک دن اس نے سوامی آتمانند سے کہا "اس طرح تو کام نہیں چلے گا سوامی جی آپ کام کرتے ہیں یا مذاق کرتے ہیں اس سے تو کہیں اچھا تھا کہ آپ سیوا آشرم ہی میں رہتے۔"

آتمانند نے اپنا فراخ سینہ تان کر کہا "بابا میرے سے اب اور زیادہ دوڑا نہیں جاتا۔ جب لوگ صحت کے اصولوں کی پروا نہیں کرتے تو بیمار ہوں گے اور مریں گے بھی۔ میں صحت کے اصول بتا سکتا ہوں۔ اس کی پابندی تو انھیں پر منحصر ہے۔"

امرکانت نے سوچا یہ آدمی جتنا ہی موٹا ہے اتنی ہی اس کی عقل بھی موٹی ہے کھانے کو ڈیڑھ سیر چاہیئے کام کرتے لرزہ آتا ہے۔ انھیں سنیاس لینے سے نہ جانے کیا فائدہ ہوا۔ ملامت آمیز لہجے میں بولا "آپ کا کام محض اصول بتا دینا نہیں ہے۔ ان سے اس کی پابندی بھی کرانی ہے۔ ان میں ایسا جوش پیدا کیجئے کہ وہ اصولوں کی پابندی کئے بغیر رہ ہی نہ سکیں۔ یہی ان کی فطرت ثانی ہو جائے۔ میں آج پچورا سے نکلا، گاؤں میں جا بجا کوڑے کے ڈھیر دکھائی دیئے۔ آپ کل اسی گاؤں سے ہو آئے ہیں۔ کیوں وہ کوڑا صاف نہیں کرایا گیا۔ آپ خود پھاوڑا لے کر کیوں نہیں پل پڑے۔ آپ سمجھتے ہیں گیروے کپڑے پہن لینے ہی سے لوگ آپ کے معتقد ہو جائیں گے۔"

آتمانند نے صفائی پیش کی۔ "میں کوڑا صاف کرنے لگتا تو سارا دن پچورا ہی میں لگ جاتا۔ مجھے پانچ چھ گاؤں کا دورہ کرنا تھا۔"

"یہ آپ کا عذر لنگ ہے۔ میں نے سارا کوڑا آدھ گھنٹے میں صاف کر دیا میرے پھاوڑا ہاتھ میں لینے کی دیر تھی۔ سارا گاؤں جمع ہو گیا اور بات کی بات میں کوڑے کا نشان بھی نہ رہا۔"

پھر گوڈر چودھری کی طرف مخاطب ہوا "تم بھی دادا اب کام سے جی چراتے ہو۔ میں نے کل ایک پنچایت میں لوگوں کو شراب پیتے پکڑا۔ سوتا آڑے کی بات ہے۔ کسی کو میرے آنے کی خبر تو تھی ہی نہیں۔ لوگ مزے سے بیٹھے ہوئے گپ شپ کر رہے تھے اور بوتلیں سرپنچ صاحب کے سامنے رکھی ہوئی تھیں مجھے دیکھتے ہی فوراً بوتلیں اڑا دی گئیں اور لوگ تقہ بن کر بیٹھ گئے۔ میں نمائش نہیں چاہتا۔ ٹھوس کام چاہتا ہوں۔"

امر نے اپنی لگن، اجتہاد اور روحانی تاثیر سے اپنے سبھی رفیقوں میں خدمت کا جوش پیدا کر دیا تھا اور ان پر حکومت بھی کرنے لگا تھا اور سبھی اس کا رعب مانتے تھے۔

چودھری نے تنک کر کہا "تم نے کونسا گاؤں بتلایا، سوتا ڑا۔ میں آج ہی اس کے چودھری کو بلاتا ہوں وہی ہر کھ لال ہے پرانا پھکڑ۔ دو بار سزا کاٹ آیا ہے۔"

امر نے زانو پر ہاتھ مار کر کہا "پھر وہی ڈانٹ پھٹکار کی بات، ارے دادا ڈانٹ پھٹکار سے کچھ نہ ہوگا۔ دلوں میں گھسئے۔ ایسی ہوا پھیلا دیجئے کہ تاڑی شراب سے لوگوں کو نفرت ہو جائے۔ آپ دن بھر اپنا کام کریں گے اور چین سے سوئیں گے تو یہ کام ہو چکا۔ یہ سمجھ لو کہ ہماری برادری چیت جائے گی تو برہمن ٹھاکر اپنے آپ ہی چیت جائیں گے۔"

گوڈر نے ہار مان کر کہا "تو بھیا اتنا بوتا تو اب مجھ میں نہیں رہا کہ دن بھر کام

کروں اور رات بھر دوڑ لگاؤں۔ کام نہ کروں تو نباہ کیسے ہو؟"

امرکانت نے اُسے ہمت ہارتے دیکھ کر خندہ پیشانی سے کہا "کتا بڑا پیٹ ہی تمھارا دادا، کہ اس کے لئے سارا دن کام کرنا پڑتا ہے۔ اگر اتنا بڑا پیٹ ہے تو اسے چھوٹا کرنا پڑے گا۔"

کاشی اور پیاگ نے دیکھا کہ اس وقت سب کے اوپر پھٹکار پڑ رہی ہے تو وہاں سے کھسک گئے۔

مدرسے کا وقت آگیا تھا۔ امرکانت اپنی کوٹھری میں کتاب لینے گیا تو دیکھا منی دودھ لئے کھڑی ہے، بولا "میں نے تو کہدیا تھا کہ میں دودھ نہ پیوں گا پھر کیوں لائیں؟"

آج کئی دن سے منی کو امر کے مزاج میں ایک بے اعتنائی کا احساس ہو رہا تھا۔ منی کو دیکھ کر اب اس کا چہرہ انبساط سے شگفتہ نہیں ہو جاتا۔ بلا خاص ضرورت کے اس سے بولتا بھی کم ہے، منی کو ایسا معلوم ہو رہا ہے یہ مجھ سے پرہیز کرتے ہیں اس کی کوئی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ کانٹا اس کے دل میں کئی دن سے کھٹک رہا ہے۔ آج وہ اُسے نکال ڈالے گی۔

اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا "کیوں نہیں پیو گے سنوں؟"

امر کتابوں کا ایک بنڈل اٹھاتے ہوئے بولا "اپنی خوشی ہے۔ نہیں پیتا تو میں تمھیں تکلیف دینا نہیں چاہتا۔"

منی نے ترچھی نظروں سے دیکھا "یہ تمھیں کب سے معلوم ہوا کہ تمھارے لئے دودھ لانے میں مجھے تکلیف ہوتی ہے، اور اگر کسی کو تکلیف اٹھانے ہی میں مزہ آتا ہو تو؟"

امر نے ہار کر کہا، "اچھا بھائی جھگڑا نہ کرو۔ لاؤ پی لوں۔"

ایک ہی سانس میں سارا دودھ کڑوی دوا کی طرح پی کر امر چلنے لگا تو منی نے دروازہ چھوڑ کر کہا "بے خطا تو کسی کو سزا نہیں دیجاتی ؟"

امر دروازے پر ٹھٹک کر بولا "تم جانے کیا کہہ رہی ہو مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

منی آزردہ خاطر ہو گئی "تمھیں میں روک تو نہیں رہی ہوں جاتے کیوں نہیں۔"

امر کوٹھری سے باہر پاؤں نہیں نکال سکا۔

منی نے پھر کہا "کیا تم سمجھتے ہو میں اتنا بھی نہیں جانتی کہ میرا تمھارے اوپر کوئی حق نہیں ہے۔ تم آج چاہو تو کہہ سکتے ہو خبردار میرے پاس نہ آنا اور زبان سے چاہے نہ کہتے ہو مگر برتاؤ سے تو روز ہی کہہ رہے ہو۔ آج کتنے دنوں سے دیکھ رہی ہوں۔ لیکن بے حیائی کر کے آتی ہوں، بولتی ہوں، خوشامد کرتی ہوں۔ اگر اس طرح آنکھیں پھیر لینی تھیں تو پہلے ہی سے اس طرح کیوں نہ رہے۔ لیکن میں کیا بکنے لگی تمھیں دیر ہو رہی ہے جاؤ۔"

امر کانت نے جیسے رسّی توڑانے کے لئے زور لگا کر "تمھاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے منی، میں تو جو پہلے تھا وہی اب ہوں۔ ہاں اِدھر زیادہ بات چیت کرنے کا موقع نہیں ملا۔"

منی نے آنکھیں نیچی کر کے رازدارانہ انداز سے کہا "تمھارے دل کی بات میں سمجھ رہی ہوں۔ لیکن وہ بات نہیں ہے تمھیں دھوکا ہو رہا ہے۔"

امر کانت نے تعجب سے کہا "تم تو پہیلی میں باتیں کرنے لگیں۔"

منی نے اسی انداز سے کہا "آدمی کی آنکھیں پھر جاتی ہیں تو سیدھی بات بھی پہیلی سی لگتی ہے۔" پھر دودھ کا خالی کٹورا اٹھا کر جلدی سے چلی گئی۔

امر کا دل مسوسنے لگا۔ منی روحانی کشش سے اُسے اپنی طرف کھینچنے لگی۔ تمھارے دل کی بات میں سمجھ رہی ہوں۔ تمھیں دھوکا ہو رہا ہے۔ یہ کلمہ کسی گہرے غار کی طرح اسے خائف کرنے لگا۔ اُس میں اُترتے دل کانپتا تھا لیکن راستہ اسی غار سے ہو کر جاتا تھا۔

وہ نہ جانے کتنی دیر تک ایک محویت کے عالم میں کھڑا رہا۔ دفعتاً آتمانند نے پکارا "آج مدرسہ بند رہے گا؟"

(۳)

اس علاقے کے زمیندار ایک مہنت جی تھے۔ کارکن اور مختار اور کارندے انھیں کے چیلے چاپڑ تھے۔ اس لئے لگان برابر وصول ہوتا جاتا تھا۔ ٹھاکر دوارے میں کوئی نہ کوئی جشن برابر ہوتا ہی رہتا تھا۔ کبھی ٹھاکر جی کا جنم ہے، کبھی بیاہ ہے، کبھی مونڈن ہے، کبھی جھولا ہے، کبھی جل بہار ہے۔ اسامیوں کو ان تقریبوں میں بیگار دینی پڑتی تھی، نذر و نیاز، پوجا اور دکشنا وغیرہ ناموں سے طرح طرح کی دستوریاں چکانی پڑتی تھیں۔ لیکن مذہب کے معاملے میں کون زبان کھولتا۔ پھر علاقے کے کاشتکار سبھی نیچی ذاتوں کے لوگ تھے۔ گاؤں پیچھے دو چار گھر برہمن چھتریوں کے تھے بھی تو ان کی ہمدردی اسامیوں کی طرف نہ تھی، مہنت جی کی طرف ہی تھی۔ کسی نہ کسی صورت میں وہ سبھی مہنت جی ہی کے ملازم اور معاون تھے۔ اسامیوں کو انھیں بھی خوش رکھنا پڑتا تھا، بیچارے ایک تو غریب، قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے، دوسرے جاہل نہ قاعدہ جانیں نہ قانون۔ مہنت جی جتنا چاہیں اضافہ کریں جب چاہیں بے دخل کریں کسی میں بولنے کی ہمت نہ تھی۔ اکثر اراضیوں کا لگان اتنا بڑھ گیا تھا کہ ساری

پیداوار بھی لگان کے برابر نہ پہنچتی تھی۔ لیکن لوگ تقدیر کو رو کر بھوکے اور ننگے رہ کر کتوں کی موت مر کر کھیتوں کو جوتتے تھے۔ کریں کیا کتنوں ہی نے جا کر شہروں میں ملازمت کر لی تھی۔ کتنے ہی مزدوری کرنے لگے تھے۔ پھر بھی اسامیوں کی کمی نہ تھی۔ زراعتی ملک میں زراعت محض معاش کا ذریعہ نہیں، اعزاز کی چیز بھی ہے۔ سبھی گرہست ہونا باعث فخر سمجھتے ہیں۔ کسان گرہستی میں اپنا سب کچھ کھو کر پردیس جاتا ہے۔ وہاں سے دولت کما کر لاتا ہے اور پھر گرہستی کرتا ہے، عزت آبرو کی ہوس اوروں کی طرح اُسے بھی گھیرے رہتی ہے وہ گرہست رہ کر جینا اور گرہستی ہی میں مرنا بھی چاہتا ہے۔ اس کا بال بال قرض میں بندھا ہو لیکن دروازے پر دو بیل باندھ کر اپنے کو وہ خوش نصیب سمجھتا ہے۔ اُسے سال میں ۶۳ دن آدھے پیٹ کھا کر رہنا پڑے۔ پوال میں لپٹ کر راتیں کاٹنی پڑیں مگر کوئی غم نہیں۔ وہ کاشتکار تو ہے، یہ غرور اس کی ساری مصیبتوں کی تلافی کر دیتا ہے۔

لیکن اب کی یکایک جنسوں کا بھاؤ گر گیا، اور اس حد تک جا پہنچا جتنا چالیس سال پہلے تھا۔ جب بھاؤ تیز تھا کسان اپنی پیداوار بیچ باچ کر لگان دے لیتا تھا۔ لیکن جب دو اور تین کی جنس ایک میں بکے تو وہ غریب کیا کرے۔ کہاں سے لگان دے۔ کہاں سے دستوریاں دے۔ کہاں سے قرض چکائے۔ بڑا مشکل مسئلہ تھا اور یہ حالت کچھ اس علاقے کی نہ تھی، سارے صوبے، سارے ملک، یہاں تک کہ ساری دنیا میں یہی کساد بازاری تھی۔ چار سیر کا گڑ کوئی دس سیر میں بھی نہیں پوچھتا۔ آٹھ سیر کا گیہوں ڈیڑھ روپئے من میں مہنگا ہے۔ تیس روپئے من کی کپاس دس روپئے میں جاتی ہے۔ سولہ روپئے من کا سن چار روپئے میں۔ کسانوں نے ایک ایک دانہ بیچ ڈالا۔ بھوسے کا ایک تنکا بھی نہ رکھا

لیکن یہ سب کچھ کرنے پر بھی نصف لگان سے زیادہ نہ ادا کر سکے۔ اور ٹھاکر دوارے میں وہی جشن تھے، وہی جل بہار تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حلقے میں کہرام مچ گیا۔ ادھر کچھ دنوں سے سوامی آتمانند اور امرکانت کی کوششوں سے علاقے میں کچھ بیداری پھیلنے لگی تھی اور لوگ اپنے حقوق سے باخبر ہونے لگے تھے۔ کئی موضعوں میں لوگوں نے دستوری دینا بند کر دیا تھا۔ مہنت جی کے پیادے اور کارکن پہلے ہی سے جلے بیٹھے تھے۔ یوں تو دال نہ گلتی تھی۔ بقایا لگان نے انھیں اپنے دل کا غبار نکالنے کا موقع دے دیا۔

ایک دن گنگا کنارے اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ایک پنچایت ہوئی سارے علاقے کے مرد و زن جمع ہوئے۔ سوامی آتمانند صدر چنے گئے۔

پہلے بھولا چودھری بولنے کھڑے ہوئے۔ وہ پہلے کسی افسر کے کوچوان تھے۔ اب ستّے سال سے پھر کھیتی کرنے لگے تھے۔ لمبی ناک، کالا رنگ، بڑی بڑی مونچھیں اور بڑی سی پگڑی۔ منہ پگڑی میں چھپ گیا تھا۔ بولے "پنچو! ہمارے اوپر جو لگان بندھا ہوا ہے وہ پنچی کے دنوں کا ہے۔ اس مندی میں وہ لگان دینا ہمارے کابو سے باہر ہے۔ اب کی اگر بیل بدھیا بیچ کر دے بھی دیں تو آگے چل کر کیا کریں گے۔ بس ہمیں اسی بات کا تصفیہ کرنا ہے۔ میری گجارس تو یہی ہے کہ ہم سب مل کر مہنت مہاراج کے پاس چلیں اور ان سے ارج مارو ج کریں اگر وہ نہ سنیں تو حاکم جلا کے پاس چلنا چاہیئے۔ اور دوں کی نہیں کہتا میں گنگا ماتا کی کسم کھا کے کہتا ہوں کہ میرے گھر میں چھٹانک بھر بھی آن نہیں ہے اور جب ہمارا یہ حال ہے تو سب کا یہی حال ہوگا۔ ادھر مہنت جی کے یہاں وہی بہار ہے ابھی پرسوں ایک بجار سادھوؤں کو آرام کی پنگت دی گئی ہے۔ بنارس اور لکھنؤ سے کئی ڈبے آموں کے آئے ہیں۔ آج سنتے ہیں پھر ملائی کی پنگت

ہے - ہم بھوکوں مرتے ہیں وہاں ملائی اڑتی ہے - اس پر ہمارا لہو چوسا جا رہا ہے بس یہی مجھے پنچوں سے کہنا ہے "

گوڈر نے دھسی ہوئی آنکھیں پھاڑ کر کہا "مہنت جی ہمارے مالک ہیں، اَن داتا ہیں، مہاتما ہیں - ہمارا دکھ سن کر جرور سے جرور ہمارے اوپر انھیں دیا آوے گی - اس لئے ہمیں بھولا چودھری کی صلاح منجور کرنی چاہیے - ہم اور کچھ نہیں چاہتے بس ہمیں اور ہمارے بچوں کو آدھ آدھ سیر روجینا کے حساب سے دے دیا جائے باقی جو کچھ ہو سب مہنت جی لیجائیں - ہم گھی دودھ نہیں مانگتے، حلوا پوری نہیں مانگتے - بس آدھ سیر موٹا ناج مانگتے ہیں - اتنا بھی نہ ملے گا تو ہم کھیتی نہ کریں گے مجوری اور بیج کس کے گھر سے لائیں گے - ہم کھیتی سے استھا پا دیدیں گے اس کے سوا دوسری کوئی تدبیر نہیں ہے "

سلونی نے ہاتھ جھٹکا کر کہا "کھیت کیوں چھوڑیں - باپ دادا کی نسانی ہے اُسے نہیں چھوڑ سکتے - کھیت کے پیچھے جان دے دوں گی - ایک روپیہ لگان تھا، تب دو ہوئے، تب چار ہوئے، اب کیا دھرتی سونا اُگلے گی "

الگو کوری بچّو کی سی آنکھیں نکال کر بولا "بھائی میں تو بات بے لاگ کہتا ہوں مہنت کے پاس چلنے سے کچھ نہ ہوگا - راجہ ٹھاکر ہیں - کہیں گنّا آگیا تو پٹوانے لگیں گے - حاکم کے پاس چلنا چاہیے - ان لوگوں میں پھر بھی دیا ہے "

آتمانند نے سب سے اختلاف کیا "میں کہتا ہوں کسی کے پاس جانے سے کچھ نہ ہوگا - تمھاری تھالی کی روٹی تم سے کہے کہ مجھے نہ کھاؤ تو تم مانوگے ؟

چاروں طرف سے آوازیں آئیں "کبھی نہیں مان سکتے "

"تو تم جس کی تھالی کی روٹیاں ہو وہ کیسے مان لے گا ؟"

بہت سی آوازوں نے تائید کی -

"مہنت کو اڑانے کے لئے روپیہ چاہیئے، حاکموں کو بڑی بڑی طلب چاہیئے۔ ان کی طلب میں کمی نہیں ہو سکتی۔ تم مرو یا جیو ان کی بلا سے۔ وہ تمہیں نہیں چھوڑ سکتے۔"

بہت سی آوازوں نے تائید کی۔

امرکانت سوامی جی کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ سوامی جی کا یہ رخ دیکھ کر گھبرایا لیکن صدر کو کیسے روکے۔ یہ تو وہ جانتا تھا کہ یہ گرم مزاج کا آدمی ہے۔ لیکن اسے امید نہ تھی کہ وہ اتنی جلد اتنے جوش میں آجائیں گے۔ کچھ معلوم بھی تو ہو یہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

آتمانند گرج کر بولے۔ "تو تمہارے لئے اب کونسا راستہ ہے۔ اگر مجھ سے پوچھتے ہو اور تم لوگ آج وعدہ کرو کہ اسے مانو گے تو میں بتا سکتا ہوں۔ نہیں تمہاری خوشی۔"

بہت سی آوازیں آئیں۔ "ہاں ہاں بتائیے، سوامی جی بتائیے۔"

لوگ چاروں طرف سے سمٹ کر اور قریب آگئے۔ سوامی جی کا جادو ان پر اثر کر رہا ہے۔ یہ ان کے چہرے سے جھلک رہا تھا۔ عوام کی رائے ہمیشہ حریت کی جانب مائل ہوتی ہے۔

آتمانند بولے۔ "تو آؤ آج ہم سب چل کر مہنت جی کا مکان اور ٹھاکر دوارے گھیریں اور جب تک وہ لگان بالکل نہ چھوڑ دیں کوئی کام نہ ہونے دیں۔"

بہت سی آوازیں آئیں "ہم لوگ تیار ہیں۔"

"خوب سمجھ لو کہ وہاں تمہارے لئے دعوت کے سامان نہ رکھے ہوں گے۔"

"کچھ پروا نہیں۔ مر تو رہے ہی ہیں۔ سسک سسک کر کیوں مریں۔"

"تو اسی وقت چلو۔"

دفعتاً امر نے تحکمانہ انداز سے کہا "ٹھہرو"
سناٹا چھا گیا۔ جو جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔
امر نے چھاتی ٹھونک کر کہا "جس راستے پر تم جا رہے ہو وہ بھلائی کا راستہ نہیں بربادی کا راستہ ہے۔ تمھارا بیل اگر بیمار پڑ جائے تو تم اُسے جوتو گے؟"
کسی طرف سے کوئی آواز نہ آئی۔
نہیں۔ پہلے تم اس کی دوا کرو گے اور جب تک وہ اچھا نہ ہو جائیگا اس سے کام نہ لوگے۔ کیونکہ تم بیل کو مارنا نہیں چاہتے۔ اس کے مرنے سے تمھارے کھیت پر پانی پڑ جائے گا۔"
گوڈر بولے "بہت ٹھیک کہتے ہو بھیا!"
"گھر میں آگ لگنے پر ہمارا کیا دھرم ہے۔ کیا ہم آگ کو پھیلنے دیں اور گھر کی بچی بچائی چیزیں بھی لاکر اس میں ڈالدیں؟"
گوڈر نے کہا "کبھی نہیں، کبھی نہیں۔"
"کیوں؟ اسی لئے کہ ہم گھر کو جلانا نہیں بچانا چاہتے ہیں۔ ہمیں اُس گھر میں رہنا ہے، اسی میں جینا ہے، اسی میں مرنا ہے۔ یہ مصیبت کچھ ہمارے ہی اوپر نہیں پڑی ہے۔ سارے میں کہرام مچا ہوا ہے۔ ہمارے مکھیا اس سوال پر غور کر رہے ہیں۔ ہمیں انھیں کے ساتھ چلنا پڑے گا۔"
اس نے ایک لمبی تقریر کی۔ لیکن وہی خلقت جو اس کا خطبہ سن کر مست ہو جاتی تھی۔ آج بے حس بیٹھی رہی۔ اس کی عزت سبھی کرتے تھے۔ اس لئے شور و غل نہ ہوا۔ مگر خلقت پر مطلق اثر نہ ہوا۔ اس وقت آتما نند ان کے لیڈر تھے۔

مجلس بغیر کچھ فیصلہ کئے برخاست ہوگئی۔ لیکن ہوا کا رخ کدھر ہے۔ یہ کسی سے پوشیدہ نہ رہا۔

(۴)

امر کانت گھر لوٹا تو بہت دل شکستہ تھا۔ اگر اس ہیجان کے فرو کرنے کا کوئی انتظام نہ کیا گیا تو کسی ہنگامے کا اندیشہ تھا۔ اس نے مہنت جی سے ملنے کا ارادہ کیا۔ اس وقت ان معاملات سے وہ اتنا بیزار ہو گیا تھا کہ ایک بار اس کے جی میں آیا کہ یہاں سے چھوڑ چھاڑ کر چلا جائے۔ اُسے ابھی تک یہ تجربہ نہ ہوا تھا کہ خلقت ہمیشہ تیز مزاجوں کے پیچھے چلتی ہے۔ وہ فرض اور انصاف، نفع اور نقصان، قربانی اور تحمل ان سبھی مسائل سے کام لے کر بھی آتمانند کے پھونکے ہوئے جادو کو نہ اتار سکا آتمانند اس وقت یہاں مل جائے تو دونوں دوستوں میں ضرور بد مزگی پیدا ہو جاتی لیکن آج وہ غائب تھے۔ انھیں آج گھوڑے کا آسن مل گیا تھا۔ کسی گاؤں میں تنظیم کرنے چلے گئے تھے۔

آج امر کانت کو کتنی ذلت اٹھانی پڑی، کتنا خفیف ہونا پڑا۔ کسی نے اس کی باتوں پر کان تک نہ دیا۔ ان کے بدلے ہوئے تیور کہہ رہے تھے تم کیا بکتے ہو تمھارے ہاتھوں ہماری نجات نہ ہوگی۔ اس کے اس زخم پر سکون بخش الفاظ ہی مرہم کا کام کر سکتے تھے۔

منی کلسا اور رسّی لئے ہوئے نکلی اور بغیر اس کی طرف دیکھے ہوئے کنوئیں کی طرف چلی گئی۔ اس نے پکارا ذرا سنتی جاؤ منی! مگر منی نے سن کر بھی نہ سنا۔ ذرا دیر بعد وہ کلسا لئے ہوئے لوٹی اور پھر سر جھکائے اس کے سامنے سے چلی گئی۔ امر نے پھر پکارا منی سنو ایک بات کہنی ہے۔ مگر اب کی بھی وہ

مخاطب نہ ہوئی۔ یقین ہوگیا کہ وہ روٹھی ہوئی ہے۔

ایک لمحے میں منی پھر نکلی اور سلونی کے گھر جا پہنچی۔ بڑھیا مدرسے کے پیچھے ایک چھوٹی سی مڑیا ڈال کر رہتی تھی۔ چٹائی پر لیٹی ایک بھجن گا رہی تھی۔ منی نے جاکر پوچھا "آج کچھ پکایا نہیں کاکی"۔ "یوں ہی سو رہیں"۔ سلونی نے اٹھ کر کہا۔ "کھا چکی بیٹی۔ دوپہر کی روٹیاں رکھی ہوئی تھیں"۔

منی نے چوکے کی طرف دیکھ کر کہا۔ چوکا صاف لپا پتا پڑا تھا۔ بولی۔ "کاکی تم بہانہ کر رہی ہو۔ ابھی تو آتے دیر نہیں ہوئی۔ اتنی جلد کھا کہاں سے لیا"۔

"تو تو پتیانی ہی نہیں بہو۔ بھوگ لگی تھی آتے ہی آتے کھا لیا۔ برتن دھو دھا کر رکھ دئے۔ بھلا تجھ سے کیا بہانہ تھا۔ گھر میں کچھ نہ ہوتا تو مانگ نہ لیتی"۔

"اچھا میری قسم کھاؤ؟"

کاکی نے کہا۔ "ہاں اپنی قسم کھاتی ہوں۔ کھا چکی"۔

منی رنجیدہ ہوکر بولی۔ "تم مجھے بھی غیر سمجھتی ہو کاکی؟ جیسے مجھے تمہارے مرنے جینے سے مطلب ہی نہیں۔ ابھی تو تم نے تہن بیچا تھا روپئے کیا کئے؟"

سلونی سر پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "ارے بھگوان تہن تھا ہی کتنا، کل ایک روپیہ تو ملا۔ وہ کل پیادہ لے گیا۔ گھر میں آگ لگائے دیتا تھا۔ کیا کرتی نکال کر پھینکتی۔ اس پر امر بھیا کہتے ہیں مہنت جی سے پھریاد کرو۔ کوئی نہ سنے گا بیٹی میں کہے دیتی ہوں۔"

منی بولی۔ "اچھا تو میرے گھر چلو کھا لو"۔

سلونی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ "تو آج کھلا دیگی بیٹی۔ ابھی تو پورا چوما سا پڑا ہے۔ آج کل تو کہیں گھاس بھی نہیں ملتی۔ بھگوان نہ جانے کیسے پار لگائیں گے۔ گھر بھر میں ان کا ایک دانہ بھی نہیں ہے۔ ڈانڑی اچھی ہوتی تو بانکی

چکا کے بھی چار مہینے نباہ ہو جاتا۔ اس ڈائڑی میں آگ لگے۔ آدھی باکی بھی نہ نکلی۔ امر بھیا کو تو سمجھاتی نہیں۔"

منی نے منہ پھیر کر کہا۔ "مجھ سے تو آجکل روٹھے ہوئے ہیں بولتے ہی نہیں کام دھندے سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ گھر والوں سے بات چیت کرنے کی بھی فرصت چاہیئے۔ جب پھٹے حالوں آئے تھے تب فرصت تھی۔ یہاں جب دنیا ماننے لگی، نام ہوا، بڑے آدمی بن گئے تو اب فرصت نہیں ہے۔"

سلونی نے استعجاب کی نظروں سے منی کو دیکھا۔ "کیا کہتی ہو بہو۔ وہ تجھ سے روٹھے ہوئے ہیں؟ مجھے تو بشواش نہیں آتا۔ بیچارا رات دن دوڑتا رہتا ہے نہ ملی ہوگی چھٹی۔ میں نے تجھے جو دعا دی ہے وہ پوری ہو کر رہے گی، دیکھ لینا"

منی اپنی کم ظرفی پر شرماتی ہوئی بولی۔ "مجھے کسی کی پروا نہیں ہے کاکی جسے سو بار غرض ہو بولے، نہیں نہ بولے۔ وہ سمجھتے ہوں گے میں ان کے گلے پڑی جا رہی ہوں۔ میں تمہارے پانوں چھو کر کہتی ہوں کاکی، جو یہ بات کبھی میرے دل میں آئی ہو۔ میں تو ان کے پیروں کی دھول کے برابر بھی نہیں ہوں ہاں اتنا چاہتی ہوں کہ خوش ہو کر بولیں۔ جو کچھ تھوڑی بہت سیوا کروں اسے قبول کریں۔ اس کے سوا میرے دل میں اور کوئی ارمان نہیں ہے۔"

دفعتاً امر نے سلونی کو پکارا۔ سلونی نے بلایا "آؤ بھیا۔ ابھی بہو آگئی۔ اسی سے باتیں کر رہی ہوں۔"

امر نے منی کی طرف دیکھ کر تیکھے انداز سے کہا۔ "میں نے تمہیں دو بار پکارا منی، تم بولیں کیوں نہیں؟"

منی نے منہ پھیر کر کہا۔ "تمہیں کسی سے بولنے کی فرصت نہیں ہے تو کوئی کیوں جائے۔ تمہارے پاس۔ تمہیں بڑے بڑے کام کرنے پڑتے ہیں اوروں

بھی تو اپنے چھوٹے چھوٹے کام کرنے پڑتے ہیں۔"

امرکانت ادھر منی کی طرف سے ہٹ کر سکھدا کے قریب آگیا تھا۔ پہلے وہ بلندی پر تھا۔ سکھدا اُسے نیچے کی طرف گھسیٹ رہی تھی۔ اب سکھدا ٹیلے کی چوٹی پر پہنچ گئی تھی اور اس کے پاس پہنچنے کے لئے امرکانت کو ہمت اور استقلال کی ضرورت تھی، اس کی ایک پاکیزہ زندگی کا معیار اپنے سامنے رکھ لیا تھا۔ مگر کوشش کرنے پر بھی وہ وفا اور خلوص کی اس دیوی کو دل سے نہ نکال سکتا تھا۔ اُسے معلوم ہو رہا تھا کہ ضبط نفس کی اس کوشش میں اس کی زندگی خشک اور بے رنگ ہو گئی ہے۔

اس نے کچھ بے دل ہو کر کہا۔ "میں یہ مانتا ہوں منی کہ ادھر کام کی کثرت کے باعث میں نے تم سے بے التفاتی کی۔ لیکن مجھے امید تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے اتنے قریب آگئے ہیں کہ بیچ میں کسی بدگمانی کی گنجائش نہیں رہی میں اپنی پریشانیوں میں جھنجھلا کر تمہیں کچھ سخت سُست بھی کہہ دوں تو میں سمجھتا تھا تم اسے معاف کر دو گی۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ وہ میری غلطی تھی۔"

منی نے اُسے شکوہ آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "ہاں لالہ یہ تمہاری بھول تھی۔ بھکاری کو سنگھاسن پر بٹھا دو، تب بھی اسے اپنے راجہ ہونے کا بشواش نہ آئے گا۔ وہ اسے سپنا ہی سمجھے گا۔ لیکن میں نے اس سپنے کو سچ سمجھ لیا۔ اور چاہتی ہوں کہ ہمیشہ وہی سپنا دیکھتی رہوں۔ تم مجھے تھپکیاں دیتے جاؤ اس کے سوا کچھ نہیں چاہتی۔ کیا اتنا بھی نہیں کر سکتے۔ ہاں کیا ہوا آج سوامی جی سے تمہارا جھگڑا کیوں ہو گیا؟"

سلونی ابھی تک آتمانند کی تعریف کر رہی تھی۔ اب امرکانت کی منہ دیکھی کہنے لگی۔ "بھیا نے تو لوگوں کو سمجھایا تھا کہ مہنت کے پاس چلو۔ اسی پر لوگ بگڑ گئے

پوچھو اور تم کر ہی کیا سکتے ہو۔ مہنت جی پٹوانے لگیں تو بھاگنے کو راہ نہ ملے۔"

منی نے اس کی تائید کی "مہنت جی دھرماتما ہیں۔ بھلا لوگ جا کر بھگوان کے مندر کو گھیر لیتے تو کتنی بڑی بدنامی ہوتی۔ دنیا بھگوان کی پوجا کرتی ہے۔ ہم چلیں مندر کا راستہ روکنے۔ نہ جانے سوامی جی کو سوجھی کیا۔ اور لوگ ان کی بات مان بھی گئے۔ کیا اندھیر ہے۔"

امر کو ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے اس کے دل پر مرہم رکھ دیا۔ سوامی جی سے زیادہ سمجھدار تو یہ جاہل عورتیں ہیں اور آپ عالم فاضل بنتے ہیں۔ شگفتہ ہو کر بولا "اس نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا تھا کاکی، سوچو لوگ مندر کو گھیر لیتے تو کتنا بڑا ہنگامہ ہو جاتا۔ آج کل ذرا ذرا سی بات میں تو گولیاں چلتی ہیں۔"

سلونی نے سہم کر کہا "تم نے بہت اچھا کیا بھیا کہ لوگوں کو روک دیا نہیں تو خون خچر ہو جاتا۔"

منی نے ہمدردی کے جوش سے کہا "میں تو تمھیں ان کے ساتھ کبھی نہ جانے دیتی حاکم راج کرتا ہے تو کیا رعیت کی فریاد نہ سنے گا۔ سوامی جی آئیں گے تو پوچھوں گی۔"

امر کانت کو اپنے ضمیر میں تقویت اور سکون کا احساس ہوا۔ کل وہ ضرور مہنت جی کی خدمت میں حاضر ہو گا۔

(۵)

امر کانت گوڑ چودھری کے ساتھ مہنت آشارام کے گھر کے پاس پہنچا، شام کا وقت تھا مہنت جی ایک نقرئی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے جس پر کارچوبی

گدی تھی ان کے ارد گرد مریدوں اور معتقدوں کا ہجوم لگا ہوا تھا، جس میں مستورات کی تعداد زیادہ تھی۔ فرش سنگ مرمر کا تھا۔ مہنت جی پورے چھ فٹ کے بلند قامت اور ذی رعب آدمی تھے۔ عمر پینتیس ۳۵ کے قریب ہوگی، گورا رنگ، دوہرا جسم، پُر جلال چہرہ جس پر گھنی ڈاڑھی زیب دے رہی تھی۔ گیروے کپڑے پہنے ہوئے تھے مگر ریشمی۔ مرید آ آ کر ان کے قدموں کو آنکھوں سے لگاتے تھے، نذریں پیش کرتے تھے اور اپنی جگہ پر جا بیٹھتے تھے۔ گو ڈر تو اندر جا نہ سکتے تھے امر اندر گیا لیکن اسے وہاں کون پوچھتا۔ آخر جب کھڑے کھڑے آٹھ بج گئے تو اس نے مہنت جی کے قریب جا کر کہا "مہاراج مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔"

مہنت جی نے اس طرح اس کی طرف دیکھا گویا اس کی اس جسارت پر ناراض ہیں۔ ان کے قریب ہی ایک دوسرا سادھو کھڑا تھا۔ اس نے پوچھا "کہاں سے آئے ہو؟" امر نے موضع کا نام بتایا۔ حکم ہوا آرتی کے بعد آؤ۔

آرتی میں تین گھنٹے کی دیر تھی۔ امر یہاں کبھی نہ آیا تھا۔ سوچا یہاں کی سیر ہی کریں۔ اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ پچھم کی طرف تو عالی شان مندر تھا۔ سامنے پورب کی طرف صدر دروازہ، دائیں جانب دروازے اور بھی تھے۔ امر ایک دروازے کے اندر گھسا تو دیکھا چاروں طرف چوڑے برآمدے ہیں جہاں سینکڑوں دیویاں بیٹھی انواع و اقسام کے کھانے پکا رہی ہیں۔ کہیں بڑی بڑی کڑھائیوں میں پوریاں کچوریاں بن رہی ہیں، کہیں دودھ ابل رہا ہے، کہیں ملائی نکالی جا رہی ہے، برآمدے کے پیچھے کمروں میں ماکولات کے ڈھیر تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پھل، میوے اور مٹھائیوں کی منڈیاں ہیں۔ کئی چھابے تو صرف پرول کے رکھے ہوئے تھے، اس موسم میں پرول کتنے

مہنگے ہوتے ہیں، یہاں بھوسے کی طرح پڑے ہوئے تھے۔ انگور کے بھی کئی ٹوکرے نظر آئے۔ امر یہ بھنڈار دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یہاں ٹھاکر جی کے بھوگ کی چیزیں تیار ہوتی تھیں اور اُن کے پرساد سے اس مندر کے ہزاروں سادھوؤں ہی کی نہیں بے شمار مریدوں کی بھی پرورش ہوتی تھی۔

شمال کی جانب دوسرا دروازہ تھا۔ امر اُس میں گیا تو ایک بازار سا لگا دیکھا۔ درزیوں کی ایک لمبی قطار دیکھی جو ٹھاکر جی کی پوشاک سی رہے تھے۔ کہیں زری کا کام ہو رہا تھا کہیں کارچوب کی مسندیں اور گاؤ تکیے بنائے جا رہے تھے دوسری قطار سناروں کی تھی جو ٹھاکر جی کے لئے زیور بناتے تھے۔ کہیں جڑائی کا کام ہو رہا تھا۔ کہیں زیوروں پر پالش ہو رہا تھا۔ کہیں پٹوے بیٹھے زیوروں کو ریشم میں گوندھ رہے تھے۔ ایک سہ درے میں دس بارہ مسٹنڈے جوان بیٹھے چندن رگڑ رہے تھے۔ یہ چندن ٹھاکر جی کے ماتھے پر لگایا جائے گا۔ ایک پورا کمرہ عطر تیل، اگر کی بتیوں اور دیگر خوشبویات سے بھرا ہوا تھا۔ ٹھاکر جی کے نام پر دولت کا کتنا بے دریغ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہی سوچتا ہوا امر کانت وہاں سے پھر وسط کے صحن میں آیا اور صدر دروازے سے ہو کر باہر نکلا۔

گوڈر نے بے صبری سے پوچھا۔ "بڑی دیر لگائی۔ کچھ بات چیت ہوئی؟"

امر نے ہنس کر کہا۔ "ابھی تو محض درشن ہوئے ہیں۔ آرتی کے بعد ملاقات ہوگی۔"

یہ کہہ کر اس نے جو کچھ دیکھا تھا وہ تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا۔

گوڈر نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "بھیا یہ بھگوان کا دربار ہے۔ وہ سنسار کو پالتا ہے۔ اُسے کس بات کی کمی۔ سنا تو ہم نے بھی ہے لیکن کبھی بھیتر نہیں گئے۔ کہ کوئی کچھ پوچھنے لگے تو نکالے جائیں۔ ہاں گھوڑ شال اور گئوشالہ

دیکھی ہے جی چاہے تو تم بھی دیکھ لو۔"

ابھی وقت بہت باقی تھا۔ امر گئوشالہ دیکھنے چلا۔ سب سے پہلے فیل خانے میں گھسے۔ کوئی پچیس تیس ہاتھی زنجیروں سے بندھے صحن میں کھڑے تھے کوئی اتنا جسیم کہ پورا پہاڑ، کوئی اتنا چھوٹا جیسے بھینس، کوئی جھوم رہا تھا، کوئی سونڈ سے گرد اڑا رہا تھا، کوئی برگد کی شاخیں چبا رہا تھا۔ ان کے ہودے، جھولیں، عماریاں سب علٰحدہ گودام میں رکھے ہوئے تھے، ہر ایک ہاتھی کا نام، خدمت گار اور مکان الگ تھا۔ ٹھاکر جی کی سواری میں جو ہاتھی تھا وہ سب سے بڑا تھا۔ بھگت لوگ اس کی پوجا کرنے آتے تھے۔ اس وقت بھی اس کے سر پر پھولوں اور مالاؤں کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔

یہاں سے دونوں آدمی اصطبل میں پہنچے۔ گھوڑوں کی قطاریں بندھی ہوئی تھیں گویا کوئی فوجی پڑاؤ ہو۔ سو گھوڑوں سے کم نہ تھے، ہر ایک نسل کے، ہر ایک گھوڑے پر دو دو سائیس نوکر تھے۔ مہنت جی کو گھوڑ دوڑ کا بڑا شوق تھا ٹھاکر جی انھیں کی آنکھوں سے گھوڑ دوڑ دیکھتے تھے۔ ان گھوڑوں کو روز بادام اور ملائی دیجاتی تھی۔

گئوشالے میں بھی چار پانچ سو گائے بھینسوں سے کم نہ تھیں۔ بڑے بڑے مٹکے تازے دودھ سے بھرے رکھے تھے۔ ٹھاکر جی آرتی سے پہلے اشنان کریں گے۔ پانچ پانچ من دودھ تین بار ان کے اشنان کے لئے چاہیے بھنڈار کے لئے الگ۔

ابھی یہ لوگ ادھر ادھر گھوم ہی رہے تھے کہ آرتی شروع ہو گئی، لوگ چاروں طرف سے آرتی کرنے دوڑے۔

گودڑ نے پوچھا "تم سے کوئی پوچھتا کون بھائی ہو تو کیا کہتے؟"

امر نے مسکرا کر کہا۔ "بتیا بتلاتا"۔

"تمھاری تو چل جاتی کیونکہ یہاں تم کو لوگ کم جانتے ہیں۔ مجھے تو لوگ روج ہی ہاٹ میں چرسے بیچنے دیکھتے ہیں پہچان لیں تو جیتا نہ چھوڑیں۔ اب دیکھو بھگوان کی آرتی ہو رہی ہے اور ہم بھیتر نہیں جا سکتے۔ یہاں کے پنڈے پجاریوں کا حال سنو تو دانتوں میں انگلی دبا لو۔ مگر وہ یہاں کے مالک ہیں اور ہم بھیتر پاؤں نہیں رکھ سکتے۔ تم چاہو جا کر آرتی لے لو۔ تم صورت سے بھی تو برہمن معلوم ہوتے ہو۔ میری تو صورت ہی چمار چمار پکار رہی ہے"۔

امر کے جی میں تو آیا اندر جا کر تماشا دیکھے مگر گوڈر کو چھوڑ کر نہ جا سکا۔ کوئی آدھ گھنٹے میں آرتی ختم ہو گئی اور معتقدین لوٹ کر اپنے اپنے گھر گئے تو امر مہنت جی سے ملنے چلا۔ معلوم ہوا کوئی رانی صاحبہ درشن کر رہی ہیں۔ وہیں آنگن میں ٹہلنے لگا۔

آدھ گھنٹے کے بعد اس نے پھر سادھو دربان سے پوچھا۔ تو معلوم ہوا اس وقت درشن نہیں ہو سکتا۔ صبح آؤ۔

امر کو غصہ تو ایسا آیا کہ اسی وقت مہنت جی کی خبر لے مگر ضبط کرنا پڑا۔

گوڈر نے یہ حال سن کر کہا "ایسے دربار میں بھلا ہماری کون سنے گا"۔

"مہنت جی کے درشن تم نے کبھی کئے ہیں؟"

"میں نے! میں بھلا کیسے کرتا اور باہر کہیں مہنت جی نکلتے نہیں۔ سنا مہنت جی کسی سے ملنے نہیں جاتے۔ بڑے بڑے راجے مہاراجے یہیں آ کر ان کے درشن کرتے ہیں۔"

نو بج رہے تھے اتنی رات کو گھر لوٹنا مشکل تھا۔ پہاڑی راستے، جنگلی جانوروں کا کھٹکا، ندی نالوں کا اتار۔ آخر وہیں رات کاٹنے کی صلاح ہوئی،

دونوں ایک دھرم شالے میں پہنچے اور کچھ کھا پی کر وہیں پڑ رہنے کا ارادہ کیا کہ دفعتاً دو سادھو ٹھاکر جی کے بھوگ کی چیزیں بیچتے نظر آئے۔ دھرم شالے کی سبھی جاتری لینے دوڑے۔ امر نے بھی چار آنے کا ایک پتل لیا۔ پوریاں، حلوا کئی قسم کی سبزیاں، طرح طرح کی مٹھائیاں، اچار چٹنی، مربے، ملائی دودھ دہی غرض اتنا سامان تھا کہ اچھے دو کھانے والے شکم سیر ہو جاتے، یہاں بہت کم گھروں میں چولھا جلتا تھا۔ لوگ یہی پتل لے لیا کرتے تھے۔ دونوں نے خوب پیٹ بھر کر کھایا اور پانی پی کر سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ ایک سادھو دودھ بیچنے آیا۔ شین (استراحت) کا دودھ لے لو۔ امر کی خواہش تو نہ تھی مگر دریافت حال کے لئے اس نے دو آنے کا دودھ لیا۔ پورا دو سیر تھا۔ گاڑھا ملائی دار اس میں سے کیسر اور کستوری کی خوشبو اڑ رہی تھی۔ ایسا دودھ اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہ پیا تھا۔

امر کانت نے تعجب سے کہا۔ "اس خرچ کا کہیں ٹھکانا ہے۔"

گوڈر عقیدت کے انداز سے بولا۔ "بھگوان دیتے ہیں اور کیا ہجار دو ہجار جاتری روج آتے ہیں۔ ایک ایک سیٹھ دس دس ہزار کی تھیلی چڑھا دیتا ہے۔ اتنا خرچ کرنے پر بھی کروڑوں روپے بنک میں جمع ہیں۔"

"دیکھو کل کیا باتیں ہوتی ہیں۔"

مجھے تو ایسا جان پڑتا ہے کہ کل بھی درشن نہ ہوں گے۔"

دونوں آدمیوں نے کچھ رات رہے ہی اٹھ اشنان کیا اور ان نکلنے سے پہلے ہی ڈیوڑھی پر جا پہنچے۔ معلوم ہوا مہنت جی پوجا پر ہیں ایک گھنٹے بعد پھر گئے تو خبر ملی مہنت جی ناشتہ کر رہے ہیں۔

جب وہ تیسری بار نو بجے گیا تو معلوم ہوا مہنت جی گھوڑوں کا

معائنہ کر رہے ہیں۔ امر کانت نے جھنجھلا کر دربان سے کہا تو آخر ہمیں کب درشن ہوں گے؟"

دربان نے پوچھا تم کون ہو؟"

"میں ان کے علاقے کا اسامی ہوں۔ ان سے علاقے کے متعلق کچھ کہنے آیا ہوں۔"

"تو کارکن کے پاس جاؤ۔ علاقے کا کام وہی دیکھتے ہیں۔"

امر پوچھتا ہوا کارکن کے دفتر میں پہنچا تو بیسیوں منیم لمبے لمبے بہی کھاتے کھولے ہوئے لکھ رہے تھے۔ کارکن صاحب مسند لگائے ہوئے حقہ پی رہے تھے۔

امر نے سلام کیا۔

کارکن صاحب نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا عرضی کہاں ہے؟"

امر نے بغلیں جھانکتے ہوئے کہا "عرضی تو میں نہیں لایا۔"

"تو پھر یہاں کیا کرنے آئے؟"

"میں تو مہنت جی سے کچھ عرض کرنے آیا تھا۔"

"عرضی لکھا کر لاؤ۔"

"میں مہنت جی سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"نذرانہ لائے ہو؟"

"میں غریب آدمی نذرانہ کہاں سے لاؤں۔"

"اسی لئے کہتا ہوں عرضی لکھا کر لاؤ۔ مہنت جی اس پر غور کریں گے جو کچھ حکم ہوگا وہ تم کو سنا دیا جائے گا۔"

"تو کب حکم سنایا جائے گا؟"

"جب مہنت جی کی مرضی ہو۔"

"مہنت جی کا نذرانہ کتنا ہوگا؟"

"جیسی حیثیت ہو، کم سے کم ایک اشرفی۔"

"کوئی تاریخ بتا دیجئے تو میں حکم سننے آؤں۔ یہاں روز کون دوڑیگا۔"

"تم دوڑوگے اور کون دوڑے گا۔"

امر نے بستی میں جا کر عرضی لکھی اور اُسے کارکن کی خدمت میں پیش کر کے باہر نکل آیا۔ دونوں گھر چلے گئے۔

ان کے آنے کی خبر پاتے ہی سیکڑوں آدمی جمع ہو گئے۔ امر بڑی مشکل میں پڑا۔ اگر ان سے ساری داستان بیان کرتا ہے تو لوگ اسی کو الو بنائیں گے۔ اس لئے بات بنانی پڑی۔ "عرضی پیش کر آیا ہوں اس پر غور کیا جا رہا ہے۔"

کاشی نے بدگمانی کے انداز سے کہا۔ "وہاں کہیں مہینوں میں پھیسلا ہوگا تب تک کارندے ہمیں نوچ ڈالیں گے۔"

امر نے کھسیا کر کہا۔ "مہینوں میں کیوں غور ہوگا۔ دو چار دن کافی ہیں۔"

پیاگ بولا۔ "یہ سب ٹالنے کی باتیں ہیں، خوشی سے کون اپنے روپے چھوڑ سکتا ہے۔"

امر روز سویرے جاتا اور دن بھر خاک پھانک کر گھڑی بھر رات گئے لوٹ آتا، کارکن، ان کے محرروں، یہاں تک کہ چپراسیوں کی منت سماجت کرتا مگر کہیں شنوائی نہ ہوتی تھی، رات کو مایوس ہو کر لوٹتا تو گاؤں کے لوگ اس کا مذاق اڑاتے۔

پیاگ کہتا "ہم نے تو سنا ہے روپے میں آٹھ آنے چھوٹ ہو گئی۔"

کاشی کہتا "تم جھوٹے ہو میں نے تو سنا ہے مہنت جی نے اس سال

پوری لگان معاف کر دی۔"

ادھر آتانند حلقے میں فتنے کی آگ مشتعل کر رہے تھے، روز بڑے بڑے جلسوں کی خبریں آتی تھیں۔ جا بجا کسان سبھاؤں کی تنظیم ہو رہی تھی۔ امر کی پاٹھ شالہ بھی بند پڑی تھی۔ اسے فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ پڑھاتا کون۔ رات کو منی اپنی تشفی آمیز باتوں سے اس کے آنسو پونچھتی تھی۔

آخر ساتویں دن اس کی عرضی پر حکم ہوا کہ سائل پیش کیا جائے۔

امر مہنت کے سامنے لایا گیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ مہنت جی خنخانے میں تخت پر مسند لگائے لیٹے ہوئے تھے۔ چاروں طرف خس کی ٹٹیاں تھیں جن پر گلاب کا چھڑکاؤ ہو رہا تھا۔ بجلی کے پنکھے چل رہے تھے۔ اندر اس جیٹھ کے مہینے میں بھی اتنی سردی تھی کہ امر کانپنے لگا۔

مہنت جی نے عارفانہ متانت سے امر کی طرف دیکھا۔ امر کو معلوم ہوا ان نظروں میں انتہا کا تکبر ہے۔ تب آپ نے گویا استغراق کے عالم میں آنکھیں بند کر لیں اور بہت آہستہ سے بولے۔

"یہ سب مایا ہے بیٹا۔ میرا اور تیرا، اپنا اور پرایا، سب مایا ہے زمیندار بھی وہی ہے، کاشتکار بھی وہی ہے۔ یہ سب اگیان ہے۔ بالکل اگیان اسی اگیان کے کارن نیشہ سوارتھ میں پڑ کر اپنا سیرب ناش کرتا ہے۔ میرے رام نے تو چار آنے کی چھوٹ کا حکم دے دیا۔"

امر نے عرض کی۔ "چار آنے کی چھوٹ سے کسانوں کا بیڑا نہ پار ہوگا مہاراج۔ آٹھ آنے کی پیداوار نہیں ہوئی۔ بارہ آنے کہاں سے آویں گے؟"

مہنت جی عارفانہ انداز سے ہنسے۔ "اچھا اچھا! ہم اپنے رام سے پوچھیں گے۔ اس کا جیسا حکم ہوگا وہ بجا لائیں گے۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ کرنے والا

وہی پرماتما ہے۔ ہم تو کاٹھ کے پتلے ہیں۔ رعایا سے جاکر کہہ دو صبر کریں اور پرماتما کو نہ بھولیں۔ وہی سب کا مالک ہے۔ اس کی اچھا ہوئی تو اور بھی چھوٹ ہو جائے گی۔" عدالت لگ گئی۔

امر نے جھک کر مہنت جی کی تعظیم کی اور وہاں سے باہر نکلا تو اس کی باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس کے پیر آپ ہی آپ اٹھے جا رہے ہیں۔ وہ جلد سے جلد علاقے میں پہنچ کر یہ خبر سنا دینا چاہتا تھا۔ ایسا تیز جا رہا تھا گویا دوڑ رہا ہے۔ کبھی کبھی دوڑ بھی لگا لیتا تھا۔ لیکن پھر ہوش میں آکر رک جاتا تھا۔ لُو تو نہ تھی مگر دھوپ بہت تیز تھی۔ جسم پھنکا جا رہا تھا۔ پھر بھی وہ بھاگا جاتا تھا۔ اب وہ سوامی آنند سے پوچھے گا۔ جناب اب تو آپ کو یقین آیا کہ دنیا میں سبھی خود غرض نہیں ہیں۔ کچھ رحمدل بھی ہیں جو دوسروں کا دکھ درد سمجھتے ہیں۔ اب وہ ان کے ساتھ بے فکروں کی بھی خبر لے گا اگر اس کے پر ہوتے تو اڑ جاتا۔

شام کو جب وہ گاؤں میں پہنچا تو کتنی ہی منتظر، مگر کج بیں آنکھوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ کاشی بولا "آج تو بہت خوش ہو بھیا، پالا مار لائے کیا؟"

امر نے کھاٹ پر بیٹھتے ہوئے اکڑ کر کہا "جو دل سے کام کرے گا وہ پالا مارے گا ہی۔"

بہت سے لوگ پوچھنے لگے "کیا حکم ہوا؟"

امر نے ڈاکٹر کی طرح مریضوں کو تسلی دی "تم لوگ ناحق مہنت جی کو بدنام کر رہے تھے۔ ایسی شرافت سے پیش آئے کہ کیا کہوں۔ مجھ سے کہنے لگے ہمیں پہلے ہی کیوں نہ خبر دی۔ نہیں ہم نے وصولی بند کر دی ہوتی۔ اب وہ سرکار کو خط کتابت کر رہے ہیں۔ یہاں کے کارندے کو بھی پروانہ بھیج دیا جائے گا کہ

وصولی ملتوی کر دو۔

کاشی نے خفیف ہو کر کہا۔ "دیکھو کچھ ہو جائے تو جانیں"

امر نے ذمہ دارانہ لہجے میں کہا۔ "اگر ضبط سے کام لوگے تو سب کچھ ہو جائیگا ہلڑ مچاؤ گے تو کچھ نہ ہو گا۔ الٹے اور ڈنڈے پڑیں گے"

سلونی نے کہا۔ "جب موٹے سوامی مانیں"

گوڈرتے اپنا چودھری پن دکھایا۔ "مانیں گے کیسے نہیں۔ ان کو ماننا پڑے گا"

ایک سیہ فام نوجوان نے جو سوامی جی کے تند مزاج معتقدوں میں تھا شرمندہ ہو کر کہا۔ "بھیا جس لگن سے تم کام کرتے ہو کون کرے گا۔"

دوسرے دن پیادوں نے اسی سختی سے لگان وصول کی۔ لیکن تیسرے دن سے وہ کچھ نرم پڑ گئے سارے علاقے میں خبر پھیل گئی کہ مہنت جی نے سرکار سے نصف لگان معاف کر دینے کی اجازت مانگی ہے۔ سوامی جی جس گاؤں سے نکل جاتے وہاں کے لوگ ان پر آوازے کستے۔ سوامی جی اب بھی اپنی ضد پر قائم تھے۔ یہ سب فریب ہے، گندم نمائی ہے کچھ ہونا ہوانا نہیں۔ انھیں اسامیوں کی اتنی فکر نہ تھی جتنی اپنی بات رکھنے کی۔ اگر نصف معافی کا حکم آجاتا تو وہ شاید اس علاقے سے روپوش ہو جاتے۔ جب تک ایسا کوئی حکم نہ آجائے انھیں اپنے خیالات کے اظہار کی کامل آزادی تھی۔ اور اگرچہ عوام پر ان کا اثر باقی نہ رہا تھا لیکن کچھ نہ کچھ لوگ ان کی تقریریں سننے کے لئے جمع ہو ہی جاتے تھے۔ ہاں اس کان سن کر اُس کان اُڑا دیتے تھے۔

دن گذرنے لگے مگر کوئی حکم نہ آیا، پھر لوگوں کے دلوں میں شبہے پیدا ہونے لگے۔ جب دو ہفتے گذر گئے اور رعایا پھر قابو سے باہر ہونے لگی تو امر کانت صدر گیا اور سلیم کے ساتھ مسٹر غزنوی سے ملا۔ مسٹر غزنوی بے،

دبلے، گورے اور شوقین آدمی تھے۔ اور تھے بھی بڑے خوش مزاج۔ کام اتنا ہی کرتے تھے جتنا ضروری ہوتا تھا۔ اور جس کے نہ کرنے کے جواب طلب ہونے کا اندیشہ تھا۔ لیکن دل کے صاف بے غرض اور فیاض آدمی تھے۔ جب امر نے دیہاتوں کی حالت بیان کی تو ہنس کر بولے "آپ کے مہنت جی نے فرمایا ہے۔ سرکار جتنی مالگذاری معاف کردے میں اتنا ہی لگان معاف کردوں گا۔ کتنا منصف مزاج آدمی ہے؟"

امر نے پوچھا۔ "مجھے تو اس میں کوئی بے انصافی نظر نہیں آتی؟"

"بے انصافی یہی ہے کہ اس کے کروڑوں روپئے بنک میں جمع ہیں سرکار پر اربوں قرض ہے۔"

"تو آپ نے ان کی تجویز پر کوئی حکم دیا؟"

"اتنی جلد۔ بھلا چھ مہینے تو گذرنے دیجئے، ابھی ہم کاشتکاروں کی حالت کا معائنہ کریں گے۔ تب اطمینان سے اس کی رپورٹ لکھیں گے۔ سرکار اطمینان سے رپورٹ پر غور کرے گی۔ تب کوئی حکم نکلے گا۔"

"تب تک تو اسامیوں کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ عجب نہیں کہ فساد شروع ہو جائے۔"

"تو کیا آپ چاہتے ہیں سرکار اپنی وضع چھوڑ دے۔ یہ دفتری حکومت ہے جناب، یہاں سبھی کام ضابطے کے ساتھ ہوتے ہیں۔ آپ ہمیں گالیاں دیں ہم آپ کا کچھ نہیں کر سکتے۔ پولیس میں رپورٹ ہوگی، پولیس تحقیقات کرے گی تب آپ کا چالان ہوگا۔ کوئی ڈپٹی مجسٹریٹ آپ کو سزا دے گا۔ ہوگا وہی جو میں چاہوں گا۔ مگر ضابطے کے ساتھ۔ خیر یہ تو مذاق تھا۔ آپ کے دوست مسٹر سلیم بہت جلد اس علاقے کی تحقیقات کریں گے۔ مگر دیکھئے جھوٹی شہادتیں پیش

کیجئے گا کہ بیچارے وہاں سے نکالے جائیں۔ وہ تو آپ کے بڑے مداح ہیں مگر بھائی میں تم لوگوں سے ڈرتا ہوں۔ خاص کر تمھارے اس سوامی سے۔ بڑا مفسد آدمی ہے۔ اس کی رپورٹ کیوں نہیں کرتے۔ میں نے سنا ہے وہ تم کو بدنام کرتا پھرتا ہے۔"

اتنا بالادست افسر امرکانت سے اتنی بے تکلفی سے باتیں کر رہا تھا پھر اُسے کیوں نہ نشہ ہو جاتا۔ یہ واقعہ تھا کہ سوامی آتما نند علاقے میں شورش پیدا کر رہے تھے۔ اگر وہ شخص گرفتار ہو جائے تو علاقے میں سکون ہو جائے، سوامی دلیر ہے، صاف گو ہے، قوم کا سچا خادم ہے۔ لیکن اس وقت اس کا گرفتار ہو جانا ہی مصلحت ہے۔

اس نے کچھ اس انداز سے جواب دیا کہ اس کے دلی جذبات ظاہر نہ ہوں لیکن سوامی پر وار چل جائے۔ "مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ ہاں انھیں اختیار ہے مجھے چاہے جتنا بدنام کریں"

غزنوی نے سلیم سے کہا۔ "یہ نوٹ کر لو مسٹر سلیم۔ کل اس علاقے کے تھانہ دار کو لکھ دو کہ اس سوامی کی خبر لے۔ بس اب سرکاری کام ختم۔ میں نے سنا ہے مسٹر امرکانت کہ آپ حسینوں کی تسخیر کا کوئی منتر جانتے ہیں۔"

امر نے سلیم کی گردن پکڑ کر کہا۔ "یہ تمھاری شرارت ہوگی سلیم۔ مجھے بدنام کرتے پھرتے ہو۔"

سلیم بولا۔ "تمھیں تمھاری حرکتیں بدنام کر رہی ہیں۔ میں کیوں بدنام کرنے لگا۔"

غزنوی نے بانکپن کے ساتھ کہا۔ "تمھاری بیوی غضب کی دلیر عورت ہے بھائی۔ آج کل میونسپلٹی سے ان کی زور آزمائی ہے اور مجھے یقین ہے کہ بورڈ کو

جھکنا پڑے گا۔ مگر بھائی میری بیوی ایسی ہوتی تو میں فقیر ہو جاتا۔ واللہ"
امر نے ہنس کر کہا۔ "آپ کو تو خوش ہو جانا چاہیے تھا"
"جی ہاں وہ تو جناب کا دل ہی جانتا ہوگا"
سلیم نے شگوفہ چھوڑا۔ "انھیں کے خوف سے تو یہ بھاگے ہوئے ہیں"
غزنوی نے رنگ آمیزی کی۔ "یہاں کوئی جلسہ کر کے انھیں بلانا چاہیے"
سلیم بولا۔ "کیوں بیٹھے بٹھائے زحمت مول لیجئے گا۔ وہ یہاں آئیں اور شہر میں آگ لگی۔ ہمیں بنگلوں سے نکلنا پڑا"۔
غزنوی نے منہ بنا کر کہا۔ "اجی وہ تو ایک دن ہوتا ہی ہے۔ یہ لوگ بغیر سوراج لئے ہرگز نہ مانیں گے"۔
تینوں دوستوں میں بڑی رات تک بے تکلفانہ گفتگو ہوتی رہی۔ سلیم نے امر کی پہلے ہی خوب تعریف کر دی تھی اس لئے اس کی دہقانی وضع کے باوجود غزنوی اس سے دوستانہ برتاؤ کرتے رہے۔ سلیم کے لئے حکومت نئی چیز تھی اپنے نئے جوتے کو کیچڑ اور پانی سے بچاتا تھا۔ غزنوی حکومت کا عادی ہو چکا تھا۔ جانتا تھا کہ پاؤں نئے جوتے سے کہیں اچھی چیز ہے۔ حسینوں کا ذکر اس کے لئے دلچسپی مسرت اور تفریح کا خاص مشغلہ تھا۔ رندوں کی رنگین مزاجی بہت دیر پاتے ہے۔ ان کی ناکام آرزوئیں اظہار سے ہی اپنے کو خوش کر لیا کرتی ہیں۔

امر کانت نے ہنس کر غزنوی سے پوچھا۔ "آپ نے شادی کیوں نہیں کی۔ میرے ایک پروفیسر شانتی کمار ڈاکٹر ہیں وہ بھی شادی نہیں کرتے۔ شاید آپ لوگ عورتوں سے ڈرتے ہوں گے"
غزنوی نے حافظہ پر زور ڈال کر کہا۔ "شانتی کمار وہی تو ہیں خوبصورت سے

گورے چٹے گٹھے ہوئے بدن کے آدمی۔ اجی وہ تو میرے ساتھ پڑھتا تھا یار۔ ہم دونوں آکسفورڈ میں تھے۔ میں نے لٹریچر لیا تھا۔ اس نے پولیٹیکل فلاسفی لی تھی۔ میں اسے خوب بنایا کرتا تھا۔ یونیورسٹی میں ہے نہ۔ اس کی یاد اکثر آتی رہتی ہے۔"

سلیم نے ان کے استعفےٰ اور سیاسی مشاغل کا ذکر کیا۔

غزنوی نے گردن ہلائی۔ گویا کوئی راز سمجھ میں آگیا ہو۔ "تو یہ کہئے آپ لوگ ان کے شاگرد ہیں۔ ہم لوگوں میں اکثر شادی کے مسئلے پر باتیں ہوتی تھیں مجھے تو ڈاکٹروں نے شادی کرنے کی ممانعت کی تھی۔ کیونکہ اس وقت مجھ میں ٹی بی کی کچھ علامتیں نظر آرہی تھیں۔ جوان بیوہ چھوڑ جانے کے خیال سے میری روح کانپتی تھی۔ شانتی کمار کو تو قومی خدمت اور جانے کیا کیا خبط تھا۔ مگر تعجب یہ ہے کہ اب تک اس خبط نے ان کا گلا نہیں چھوڑا۔ اب ان کی ہمت نہ پڑتی ہوگی میرے ہی ہمن تو تھے۔ ذرا ان کا پتہ تو بتانا۔ میں یہاں آنے کی دعوت دوں گا!"

سلیم نے سر ہلایا۔ "انھیں کہاں فرصت، میں نے بلایا تھا نہیں آئے۔"

غزنوی نے مسکرا کر کہا "تم نے نج کے طور پر بلایا ہوگا۔ کسی انسٹیٹیوشن کی طرف سے بلاؤ اور کچھ چندہ کرا دینے کا وعدہ کرو۔ پھر دیکھو سر کے بل دوڑے آتے ہیں یا نہیں۔ ان قومی خادموں کی جان چندہ ہے، ایمان چندہ ہے اور شاید خدا بھی چندہ ہے۔ جسے دیکھو چندے کی ہائے ہائے۔ میں نے کئی بار ان خادموں کو خوب چرکا دیا ہے۔ اس وقت ان کی صورت دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ ہیں کہ گالیاں دے رہے ہیں۔ پیترے بدل رہے ہیں، زبان سے توپ کے گولے چھوڑ رہے ہیں۔ اور آپ ان کی بوکھلاہٹ کا مزہ اٹھا

رہے ہیں۔ میں نے تو ایک بار ایک لیڈر صاحب کو پاگل خانے میں بند کر دیا تھا۔ کہتے ہیں اپنے کو قوم کا خادم اور سمجھتے ہیں آقا۔"

سویرے مسٹر غزنوی نے امرکانت کو اپنے موٹر پر گاؤں پہنچا دیا۔ امر کے غرور اور خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ افسروں کی صحبت نے افسری کی کچھ شان بھی پیدا کر دی تھی۔ سب سے کہنے لگا حاکم پرگنہ تمہاری حالت کی جانچ کرنے آ رہے ہیں۔ خبردار کوئی ان کے سامنے جھوٹا بیان نہ دے۔ جو کچھ وہ پوچھیں ان کا ٹھیک ٹھیک جواب دو۔ نہ اپنی حالت چھپاؤ نہ مبالغہ کے ساتھ کہو۔ تحقیقات سچی ہونی چاہیے۔ مسٹر سلیم بڑے نیک اور غریب دوست آدمی ہیں تحقیقات میں دیر لگے گی لیکن حکومت کے انتظام میں دیر لگتی ہی ہے۔ اتنا بڑا علاقہ ہے کئی مہینے دورے میں لگ جائیں گے تب تک تم لوگ خریف کا کام شروع کر دو۔ روپئے میں آٹھ آنے تخفیف کا ذمہ میں لیتا ہوں۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے اتنا سمجھ لو۔"

سوامی آتمانند کو بھی اب کچھ کچھ یقین آ گیا۔ انھوں نے دیکھا امر اکیلا ہی ساری نیک نامی لوٹے لئے جاتا ہے اور میرے ہاتھ اپیس کے سوا اور کچھ نہیں پڑتا انھوں نے پہلو بدلا۔ ایک جلسے میں دونوں ہی ایک پلیٹ فارم سے بولے کچھ سوامی جی جھکے، کچھ امر نے ہاتھ بڑھایا۔ پھر دونوں میں دوستی ہو گئی۔

ادھر اساڑھ کی بارش شروع ہو گئی۔ ادھر سلیم تحقیقات کرنے آ پہنچا۔ دو چار گاؤں میں اسامیوں کے بیان لئے بھی لیکن ایک ہی ہفتے میں اُکتا گیا۔ پہاڑی ڈاک بنگلے میں بھوت کی طرح تنہا پڑے رہنا اس کے لئے جہنم سے کم نہ تھا۔ ایک دن بیماری کا بہانہ کر کے بھاگ کھڑا ہوا۔ اور ایک مہینے تک ٹال مٹول کرتا رہا۔ آخر جب اوپر سے تنبیہ ہوئی اور مسٹر غزنوی نے سخت تاکید کی

تھی یہ وہ نہ سمجھ سکی۔

(۶)

سلیم یہاں سے کوئی سات آٹھ میل پر ڈاک بنگلے میں پڑا ہوا تھا۔ حلقے کے تھانیدار نے رات ہی کو اسے اس جلسے کی خبر دی اور امرکانت کی تقریر بھی پڑھ کر سنائی۔ اُسے ان جلسوں کی رپورٹ کرنے کی تاکید کردی گئی تھی۔

سلیم کو بڑا تعجب ہوا۔ ابھی ایک دن پہلے امرکانت اس سے ملا تھا اور اگرچہ اس نے مہنت کی اس نئی بے عنوانی سے ناراضگی ظاہر کی تھی مگر اس میں محض افسوس تھا، غصے کا نام بھی نہ تھا۔ آج یکایک یہ تغیر کیسے ہوگیا۔

اس نے تھانے دار سے پوچھا "مہنت جی کی طرف سے کوئی خاص زیادتی تو نہیں ہوئی؟"

تھانے دار نے گویا اس شبہے کو جڑ سے کاٹ دینے پر آمادہ ہو کر کہا۔ "بالکل نہیں حضور۔ انھوں نے تو سخت تاکید کردی تھی کہ اسامیوں پر کسی قسم کا ظلم نہ کیا جائے۔"

"جلسے پر اس تقریر کا کیا اثر ہوا؟"

"حضور یہی سمجھ لیجئے جیسے پوال میں آگ لگ جائے۔ اب اس علاقے میں مہنت جی کو مشکل سے لگان وصول ہوگا۔"

سلیم نے آسمان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "آپ اس وقت میرے ساتھ صدر چلنے کو تیار ہیں؟"

تھانے دار کو کیا عذر ہوسکتا تھا۔ سلیم کے جی میں ایک بار آیا کہ ذرا

امر سے مل لیں۔ لیکن پھر سوچا اگر وہ میرے سمجھانے سے ماننے والا ہوتا تو یہ آگ ہی کیوں لگاتا۔"

دفعتاً تھانے دار نے پوچھا۔ "حضور سے تو ان کی جان پہچان ہے"؟

سلیم نے چڑھ کر کہا "یہ آپ سے کس نے کہا۔ میری سیکڑوں سے جان پہچان ہے تو پھر۔ میرا لڑکا بھی اگر قانون کے خلاف ورزی کرے تو مجھے اس کی تنبیہ کرنی پڑے گی۔"

تھانے دار نے اپنی غلطی سمجھ کر معذرت آمیز انداز سے کہا۔ "میرا یہ مطلب نہیں تھا حضور، حضور سے جان پہچان ہونے پر بھی انھیں حضور کو بدنام کرنے میں تامل نہ ہوا۔ میرا یہ منشا تھا۔"

سلیم نے کچھ جواب تو نہ دیا مگر یہ اس معاملے کا نیا پہلو تھا۔ بیشک امرکانت کو اس کے علاقے میں ایسا طوفان نہ اٹھانا چاہیے تھا۔ آخر افسروں کو یہی خیال تو ہوگا کہ یہ نیا آدمی ہے۔ علاقے پر اس کا رعب نہیں ہے۔

بادل پھر گھرتے آتے تھے، راستہ بھی خراب تھا۔ اس پر اندھیری رات اور رندیوں کا اتار۔ مگر سلیم کا غزنوی سے ملنا ضروری تھا، کوئی تجربہ کار افسر اس ذراسی بات سے بدحواس نہ ہوتا مگر سلیم نیا آدمی تھا۔

دونوں آدمی رات بھر کی حیرانی کے بعد صبح کو صدر پہنچے۔ آج میاں سلیم کو معلوم ہوا کہ یہاں محض حکومت نہیں ہے پریشانی اور خطرہ بھی ہے۔ جب پانی کا جھکولا آتا یا کوئی نالہ سامنے آپڑتا تو اس کے جی میں آتا کیوں نہ اس ملازمت سے استعفا دیدوں۔ یہ نوکری ہے یا بلائے جان۔ مزے سے زندگی گذرتی تھی یہاں اس خلجان میں آپھنسا۔ لعنت ہے ایسی ملازمت پر۔ کہیں موٹر کھد میں جا پڑے تو ہڈیوں کا بھی پتہ نہ چلے۔ نئی موٹر چوپٹ ہوگئی۔

بنگلے پر پہنچ کر اس نے کپڑے بدلے۔ ناشتہ کیا اور آٹھ بجے غزنوی کے پاس جا پہنچا۔ تھانے دار کوتوالی میں ٹھہرا تھا۔ اس وقت وہ بھی حاضر ہوا۔

غزنوی نے یہ واقعہ سن کر کہا "یہ شخص کچھ دیوانہ تو نہیں ہو گیا ہے۔ بات چیت سے تو بڑا سلیم الطبع معلوم ہوتا تھا۔ مگر لیڈری کا خبط بھی برا ہے۔ بیچارہ کیسے نام پیدا کرے۔ شاید حضرت سمجھے ہوں گے، حکام سے بے تکلفی ہو ہی گئی، اب کیا غم سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا، اور ضلعوں میں ابھی شورش ہے ہی۔ ممکن ہے وہاں سے تاکید آئی ہو۔ سوجھی ہے ان سبھوں کو دور کی اور حق یہ ہے کہ کسانوں کی حالت نازک ہے، یوں بھی بیچاروں کو پیٹ بھر دانہ میسر نہ ہوتا تھا۔ اب تو جنسیں اور بھی ارزاں ہو گئیں۔ پورا لگان کہاں۔ آدھے کی بھی گنجائش نہیں۔ مگر اپنی شکایتوں کو پیش کرنے کے اور بھی طریقے تھے۔ یہ ہنگامہ خیزی تو کوئی حکومت برداشت نہیں کر سکتی۔ کسانوں کو آج یقین ہو جائے کہ ادھا لگان دے کر ان کی جان بچ سکتی ہے تو کل وہ چوتھائی کے لئے شور مچائیں گے اور برسوں پوری معافی کا مطالبہ کریں گے۔ میں تو سمجھتا ہوں آپ جا کر لالہ امرکانت کو گرفتار کر لیں۔ ایک بار تو شورش ہو گی، ممکن ہے دو چار گاؤں میں فساد بھی ہو مگر کھلے ہوئے فساد کو روکنا اتنا مشکل نہیں ہے۔ جتنا اس ہوا کو۔ مواد جب پھوڑے کی صورت میں آ جاتا ہے تو نشتر دے کر اسے آسانی سے نکالا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ دل یا دماغ کی طرف چلا جائے تو زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس سوامی کو بھی گرفتار کیجئے۔ دار و غہ جی آپ سپرنٹنڈنٹ صاحب سے جا کر کہئے، آپ کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہیں۔"

سلیم نے درد مند لہجے میں کہا۔ "میں جانتا کہ یہاں آتے ہی آتے اس عذاب میں جان پھنسے گی تو کسی دوسرے ضلع کے لئے کوشش کرتا۔ کیا میرا

تبادلہ نہیں ہو سکتا ؟"

غزنوی نے ستم ظریفانہ لہجے میں کہا۔ "ہاں ضرور ہو جائے گا میں سفارش کر دوں گا۔"

تھانے دار نے پوچھا "حضور کوئی خط دیں گے ؟"

غزنوی نے گھرک کر کہا۔ "خط کی کیا ضرورت ہے، کیا تم اتنا بھی یاد نہیں رکھ سکتے۔"

تھانے دار سلام کر کے چلا گیا تو سلیم نے کہا۔ "آپ نے اسے ناحق ڈانٹا۔ بیچارہ شرمندہ ہو گیا۔ اچھا آدمی ہے۔"

غزنوی نے سر ہلا کر کہا۔ "جی ہاں بہت اچھا آدمی ہے۔ رسد خوب پہنچاتا ہو گا۔ مگر رعایا سے اس کی دس گنی وصول کرتا ہو گا۔ جہاں کسی ماتحت نے ضرورت اور خوشامد کی میں سمجھتا ہوں کہ چھٹا ہوا گرگا ہے۔ حضرت کی لیاقت کا یہ حال ہے کہ علاقے میں صدہا وارداتیں ہوتی ہیں ایک کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ اسے جھوٹی شہادتیں بنانا بھی نہیں آتا۔ بس خوشامد کی روٹیاں کھاتا ہے۔ اگر سرکار پولیس کا سدھار کر سکے تو سوراج کا مطالبہ پچاس سال کے لئے ٹل سکتا ہے۔ آج کوئی شریف آدمی پولیس سے سروکار نہیں رکھنا چاہتا۔ تھانے کو بدمعاشوں کا اڈا سمجھ کر اُدھر سے منہ پھیر لیتا ہے۔ اگر آپ کو اپنے دوست کے گرفتار کرنے میں تکلف ہو تو میں ڈی۔ پی کو بھیجدوں۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی ذلت نہ ہو تو میں استدعا کروں گا کہ آپ خود جائیے۔ اپنی دوستی کا حق ادا کرنے کے لئے ہی جائیے۔ میں جانتا ہوں آپ کو صدمہ ہو رہا ہے۔ مجھے خود رنج ہے۔ اس تھوڑی دیر کی ملاقات میں ہی میں اُن سے متاثر ہو گیا۔ میں ان کے نیک ارادوں کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن ہم اور وہ مخالف جماعتوں میں

ہیں۔ سوراج ہم بھی چاہتے ہیں مگر انقلاب کی صورت میں نہیں۔ حالانکہ کبھی کبھی مجھے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انقلاب کے سوا ہمارے لئے دوسرا راستہ نہیں ہے۔ سرکار کو اتنی کثیر التعداد فوج رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر ان کی تعداد نصف کر دی جائے تو زمین کے محاصل میں بھی تخفیف کی جا سکتی ہے مجھے اگر سوراج سے کوئی خوف ہے تو یہ کہ مسلمانوں کی حالت کہیں اور خراب نہ ہو جائے غلط تاریخیں پڑھ پڑھ کر دونوں فرقے ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے ہیں مسلمان فاتح تھے اور قیاس کہتا ہے کہ انھوں نے ہندوؤں پر زیادتیاں بھی کی ہوں گی۔ ہندو فاتح ہوتے تو غالباً وہ بھی مسلمانوں پر یہی زیادتیاں کرتے۔ ممکن نہیں کہ ہندو موقع پا کر مسلمانوں سے فرضی عداوتوں کا بدلہ نہ چکائے۔ لیکن اس خیال سے تسلی ہوتی ہے کہ اس بیسویں صدی میں ہندو جیسی پڑھی لکھی قوم مذہبی گروہ بندی کی پناہ نہیں لے سکتی مذہب کا دور ختم ہو رہا ہے بلکہ یوں کہو کہ ختم ہو گیا۔ صرف ہندوستان میں اس کی کچھ کچھ جان باقی ہے۔ یہ معاشات کا دور ہے۔ اب قوم میں دار و نادار، مالک اور مزدور اپنی اپنی جماعتیں بنائیں گے ان میں اس سے کہیں زیادہ خونریزی ہوگی۔ یہ لوگ ان سے کہیں زیادہ تنگدل ہوں گے۔ مگر وہ جو کچھ کریں گے جماعت کے نام پر۔ ذاتی اغراض کے لئے نہیں۔ آج بھی شاید ہی کوئی ایسا تعلیم یافتہ آدمی ملے جو مساوات کا حامی نہ ہو آخر ایک دو صدی کے بعد دنیا میں ایک سلطنت قائم ہو جائے گی۔ ساری دنیا کے لئے ایک قانون ہوگا، ایک نظام ہوگا، ایک معیار ہوگا۔ قوم کے خادم قوم پر حکومت کریں گے۔ مذہب محض ایک شخصی چیز رہ جائے گی، حاکم اور محکوم کی تمیز اُٹھ جائے گی۔"

فون کی گھنٹی بجی۔ عزنوی نے ریسیور کان سے لگایا۔ مسٹر سلیم

کب چلیں گے ؟"

غزنوی نے سلیم سے پوچھا "آپ کب تک تیار ہوں گے۔ ڈی۔ ایس پی۔ پوچھ رہا ہے ؟"

"میں تیار ہوں"

"تو ایک گھنٹے میں آجائیے"

سلیم نے لمبی سانس کھینچ کر کہا۔ "تو مجھے جانا ہی پڑے گا ؟"

"بیشک، میں آپ کے اور اپنے دوست کو پولیس کے ہاتھ میں نہیں دینا چاہتا"

"کسی حیلے سے امر کو یہاں بلا کیوں نہ لیا جائے"

"وہ اس وقت نہ آئیں گے"

سلیم نے سوچا۔ اپنے شہر میں جب یہ خبر پہنچے گی کہ میں نے امر کو گرفتار کیا تو مجھ پر کتنی پھٹکاریں پڑیں گی۔ شانتی کمار تو نوچ ہی کھائیں گے۔ سکینہ تو شاید میرا منہ دیکھنا پسند نہ کرے۔ اس خیال سے وہ کانپ اٹھا۔ سونے کا نہ انگلتے بنتی تھی نہ نگلتے۔

اس نے کرسی سے اٹھ کر کہا "آپ ڈی۔ ایس۔ پی کو بھیجدیں میں نہیں جانا چاہتا"

غزنوی نے متفکرانہ لہجے میں کہا "آپ چاہتے ہیں کہ انھیں وہیں سے ہتھکڑیاں لگا کر اور کمر میں رسی ڈال کر چار کانسٹیبلوں کے ساتھ لایا جائے اور جب پولیس لے کر انھیں چلے تو اسے مجمعے کو بھگانے کے لئے گولیاں چلانی پڑیں"

سلیم نے گھبرا کر کہا "کیا ڈی۔ ایس۔ پی کو یہ ہدایت نہیں دی جا سکتی کہ وہ

ان کی پوزیشن کا خیال رکھیں ؟"

"امر کانت آپ کے دوست ہیں، ڈی۔ یس۔ پی کے دوست نہیں"

"تو پھر آپ ڈی۔ یس۔ پی کو میرے ساتھ نہ بھیجیں"

"آپ امر کو یہاں لا سکتے ہیں"

"ہاں لا تو سکتا ہوں مگر دغا کرنی پڑے گی"

"اچھی بات ہے آپ جائیے۔ میں ڈی۔ یس۔ پی کو منع کئے دیتا ہوں"

سلیم اپنے مکان پر لوٹا تو بیحد رنجیدہ تھا۔ آتے ہی آتے اس نے سکینہ شانتی کمار، لالہ سمر کانت، نینا ہر ایک کے نام ایک ایک خط لکھ کر اپنی مجبوری اور بے بسی کا اظہار کیا۔ سکینہ کو اس نے لکھا "میرے دل پر اس وقت جو گذر رہی ہے وہ میں تم سے بیان نہیں کر سکتا۔ شاید اپنے جگر پر خنجر چلاتے ہوئے بھی مجھے اس سے زیادہ درد نہ ہوتا۔ جس کی محبت مجھے یہاں کھینچ لائی اسی کو آج میں ان ظالم ہاتھوں سے گرفتار کرنے جا رہا ہوں۔ سکینہ خدا کے لئے مجھے کمینہ، بے درد اور خود غرض نہ سمجھنا۔ میں خون کے آنسو رو رہا ہوں۔ اسے اپنے آنچل سے پونچھ دو۔ مجھ پر امر کانت نے اتنے احسان کئے ہیں کہ مجھے اُن کے پسینہ کی جگہ اپنا خون بہانا چاہیئے تھا مگر میں ان کے خون کا مزہ لے رہا ہوں۔ میری گردن میں شکاری کا طوق ہے۔ اور اس کے اشارے پر میں وہ سب کچھ کرنے پر مجبور ہوں جو مجھے نہ کرنا لازم تھا۔ مجھ پر رحم کرو سکینہ! میں بدنصیب ہوں"

خانساماں نے آکر پوچھا "حضور کھانا لاؤں ؟"

سلیم نے سر جھکائے ہوئے اسے جواب دیا "مجھے بھوک نہیں ہے"

خانساماں پوچھنا چاہتا تھا، حضور کی طبیعت کیسی ہے، میز پر کئی لکھے خط

دیکھ کر ڈر رہا تھا کہ گھر سے کوئی بُری خبر تو نہیں آئی۔

سلیم نے سر اٹھایا اور پرحسرت لہجے میں بولے: "اُس دن وہ میرے ایک دوست نہیں آئے تھے۔ وہی دیہاتیوں کی سی صورت بنائے ہوئے۔ وہ میرے بچپن کے ساتھی ہیں۔ ہم دونوں نے ایک ہی کالج میں پڑھا۔ گھر کے لکھپتی آدمی ہیں۔ باپ ہیں، بال بچے ہیں۔ اتنے لائق ہیں کہ مجھے انھوں نے پڑھایا۔ چاہتے تو کسی اچھے عہدے پر ہوتے۔ اُن کے گھر پر بھی کسی بات کی کمی نہیں ہے۔ مگر غریبوں کا اتنا درد ہے کہ گھر بار چھوڑ کر یہیں ایک گاؤں میں پڑے ہوئے ہیں۔ اُنھیں کو گرفتار کرنے کا مجھے حکم ہوا ہے۔"

خانساماں اور قریب آکر زمین پر بیٹھ گیا۔ "کیا قصور کیا تھا حضور؟"

"قصور، کوئی قصور نہیں۔ یہی کہ کسانوں کی مصیبت ان سے نہیں دیکھی جاتی۔"

"حضور نے بڑے صاحب کو سمجھایا نہیں؟"

"میرے دل پر اس وقت جو کچھ گذر رہی ہے وہ میں ہی جانتا ہوں حنیف! آدمی نہیں فرشتہ ہے۔ یہ ہے سرکاری نوکری۔"

"تو حضور کو جانا پڑے گا؟"

"ہاں اسی وقت، یہاں اسی طرح دوستی کا حق ادا کیا جاتا ہے۔"

"تو اُن بابو صاحب کو نظر بند کیا جائے گا حضور!"

"خدا جانے کیا کیا جائے گا۔ ڈرائیور سے کہدو موٹر لے آئے۔ شام تک لوٹ آنا ضروری ہے۔"

ذرا دیر میں کار آگئی۔ سلیم آکر اُس میں بیٹھا تو اُس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

(۷)

آج کئی دن کے بعد تیسرے پہر سورج دیوتا نے زمین کی فریاد سُنی ہے اور گویا مراقبے سے نکل کر اُسے دعائیں دے رہے ہیں۔ زمین گویا آنچل پھیلائے اُن کی دعاؤں کو بٹور رہی ہے۔

اسی وقت سوامی آتمانند اور امرکانت دونوں دو مخالف سمتوں سے آکر مدرسے میں کھڑے ہو گئے۔

امرکانت نے پیشانی سے پسینہ پوچھتے ہوئے کہا۔ "ہم لوگوں نے کتنا اچھا پروگرام بنایا تھا کہ ایک ساتھ ہی لوٹے۔ ایک لمحے کا بھی فرق نہ پڑا۔ آؤ کچھ کھا پی لیں اور پھر نکلیں۔"

آتمانند نے زمین پر لیٹ کر کہا۔ "تمہیا اس وقت مجھ سے ایک قدم بھی نہ چلا جائے گا۔ ہاں جان لینا چاہتے ہو تو لے لو۔ بھاگتے بھاگتے کچھ مرنکل گیا۔ پہلے شربت بنواؤ، ٹھنڈے ہوں تب تو آنکھیں کھلیں۔"

"تو پھر آج کا کام ختم ہو چکا۔"

"ختم ہو یا بھاڑ میں جائے۔ کیا جان دے دیں، تم سے ہو سکتا ہے تو کرو مجھ سے تو نہیں ہو سکتا۔"

امر نے مسکرا کر کہا۔ "یار مجھ سے دونے تو ہو۔ پھر بھی چیں بول گئے۔ مجھے اپنی طاقت اور اپنا جسم دیدو۔ پھر دیکھو میں کیا کرتا ہوں۔"

آتمانند نے سوچا تھا۔ آج کی کا گذاری پر ان کی پیٹھ ٹھونکی جائے گی۔ یہاں یہ بے قدری ہوئی۔ بولے۔ "تم مرجانا چاہتے ہو۔ میں جینا چاہتا ہوں۔ جینے کا حاصل عمل کے سوا اور کیا ہے؟"

"ہاں میری زندگی کا حاصل عمل ہی ہے۔ تمھاری زندگی کا حاصل تو جوان موت ہے۔"

"اچھا شربت پلواتا ہوں۔ اس میں دہی بھی ڈلوا دوں؟"

"ہاں دہی کی مقدار کافی ہو۔ اور دو لوٹے سے کم نہ ہو۔ اس کے دو گھنٹے بعد کھانا کھاؤں گا۔"

"مارڈالا تب تک تو دن ہی غائب ہو جائے گا۔"

"امر نے منی کو بلا کر شربت بنانے کو کہا اور سوامی جی کی برابر ہی زمین پر لیٹ کے پوچھا۔ "علاقے کی کیا حالت ہے؟"

"مجھے تو خوف ہو رہا ہے کہ لوگ دھوکا دیں گے۔ بے دخلی شروع ہوتے ہی سب کے آسن ڈول جائیں گے۔"

"ایسا کام ہی کیوں کیا جائے جس کا انجام شرمندگی اور رسوائی ہو۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس تحریک کے رہنما بننے کے قابل نہیں ہیں۔"

منی شربت بنا کر لائی۔ آتمانند نے کمنڈل بھر لیا اور ایک سانس میں چڑھا گئے۔ امرکانت ایک کٹورے سے زیادہ نہ پی سکے۔

آتمانند نے منہ چڑا کر کہا۔ "بس، پھر بھی آپ اپنے کو آدمی کہتے ہیں؟"

امر نے جواب دیا۔ "بہت کھانا جانوروں کا کام ہے۔"

"جو کھا نہیں سکتا وہ کام کیا کرے گا؟"

"نہیں جو کم کھاتا ہے وہی کام کر سکتا ہے۔ پیٹو کے لئے سب سے

بڑا کام کھانے کو ہضم کرنا ہے۔"

سلونی کل سے بیمار تھی۔ امر اُسے دیکھنے چلا ہی تھا کہ مدرسے کے سامنے کار آتے دیکھ کر رُک گیا۔ شاید اس گاؤں میں یہ کار پہلی ہی بار آئی ہو۔ وہ سوچ رہا تھا کس کی کار ہے کہ سلیم اُس میں سے اُتر پڑا۔ امر نے۔ لپک کر ہاتھ ملایا اور بولا "کوئی ضروری کام تھا؟ مجھے کیوں نہ بلا لیا؟"

دونوں آدمی مدرسے میں آئے۔ امر نے ایک کھاٹ لاکر ڈال دی اور بولا "تمھاری کیا خاطر کروں۔ یہ تو فقیروں کی جھونپڑی ہے۔ شربت بنواؤں؟"

سلیم نے سگار جلاتے ہوئے کہا "نہیں کوئی تکلف نہیں۔ میں نے ابھی ڈاک بنگلے میں ناشتہ کیا ہے۔ مسٹر عزنوی تم سے کسی معاملے میں صلاح کرنا چاہتے ہیں۔ میں آج ہی جا رہا ہوں۔ سوچا کہ تمھیں بھی لیتا چلوں۔ تم نے تو کل آگ ہی لگا دی۔ اب تو تحقیقات بیکار ہو گئی۔"

امر نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا "مہنت جی نے مجبور کر دیا۔ کیا کرتے؟"

سلیم نے دوستی کی آڑ لی "مگر اتنا تو سوچتے کہ میرا علاقہ ہے۔ یہاں کی ساری ذمہ داری مجھ پر ہے۔ میں نے سڑک کے کنارے اکثر لوگوں کو جمع دیکھا۔ کہیں کہیں تو میری کار پر پتھر بھی پھینکے گئے یہ تو اچھے آثار نہیں ہیں مجھے خوف ہے کوئی ہنگامہ ہو جائے۔ اپنے حق کے لئے یا بیجا ظلم کے خلاف رعایا میں جوش ہو تو میں اسے بُرا نہیں کہتا۔ لیکن جہلا قانونی دائرے کے اندر رہیں گے۔ مجھے شک ہے۔ تم نے گونگوں کو آواز دی، مردوں میں جان ڈالی۔ لیکن اس کے لئے جس ضبط اور تحمل کی ضرورت ہے اس کا عشر عشیر بھی میں لوگوں میں نہیں پاتا۔"

امر کو اس تقریر میں حاکمانہ پہلو نظر آیا۔ بولا "تمھیں یقین ہے کہ تم بھی وہی غلطی نہیں کر رہے ہو جو حکام عموماً کیا کرتے ہیں؟ جن کی زندگی آرام اور فراغت سے گذر رہی ہے ان کے لئے ضبط و عمل کی ہانک لگانا آسان ہے۔ لیکن جن کی زندگی کا ہر ایک دن ایک نئی مصیبت ہے وہ نجات کے لئے اپنی جنواسی چال سے آنے کا انتظار نہیں کر سکتے۔ وہ اُسے کھینچ لانا چاہتے ہیں اور جلد سے جلد۔"

"مگر نجات کے پہلے قیامت آئے گی یہ بھی یاد رہے۔"

"ہمارے لئے یہ اندھیر ہی قیامت ہے۔ جب پیداوار لاگت سے بھی کم ہو تو لگان کی گنجائش کہاں۔ اس پر بھی ہم آٹھ آنے پر راضی تھے، مگر بارہ آنے تو خواب و خیال ہے۔ آخر سرکار رکفایت کیوں نہیں کرتی۔ پولیس اور فوج اور انتظام پر کیوں اتنی بے دردی سے روپئے اڑائے جاتے ہیں۔ کسان گونگے ہیں، بے بس ہیں، کمزور ہیں۔ کیا اسی لئے سارا نزلہ انھیں پر گرنا چاہئے؟"

سلیم نے حاکمانہ غرور کے ساتھ کہا۔ "اس کا نتیجہ کیا ہوگا جانتے ہو۔ گاؤں کے گاؤں برباد ہو جائیں گے۔ فوجی قانون نافذ ہو جائے گا۔ زاید پولیس تعینات کر دی جائے گی۔ فصلیں نیلام کر دی جائیں گی۔ زمینیں ضبط ہو جائیں گی مذاق نہیں ہے۔"

امرکانت نے لاپروائی سے کہا۔ "جو کچھ بھی ہو۔ مرمٹنا ظلم کے سامنے سر جھکانے سے اچھا ہے۔"

مدرسے کے سامنے ہجوم بڑھتا جاتا تھا۔ سلیم نے بحث کو ختم کرنے کے ارادے سے کہا۔ "چلو اس مسئلے پر راستے میں باتیں ہوں گی۔ دیر ہو رہی ہے۔"

امر نے جھٹ پٹ کرتا گلے میں ڈالا۔ اور آتما نند سے دو چار ضروری باتیں کر کے چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔ دونوں کار پر بیٹھے۔ جب کار چلی تو سلیم کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

امر نے پوچھا۔ میرے ساتھ دغا تو نہیں کر رہے ہو؟"

سلیم اس کو گلے لگا کر بولا "اس کے سوا اور دوسرا علاج نہ تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہیں پولیس کے ہاتھوں ذلیل کیا جائے۔"

"تو ذرا ٹھہرو میں اپنی ضروری چیزیں تو لے لوں۔"

"ہاں ہاں لے لو۔ لیکن راز کھل گیا تو یہاں میری لاش نظر آئے گی۔"

"تو چلو کوئی مضائقہ نہیں، اس کا مجھے بھی اندیشہ ہے۔"

گاؤں کے باہر نکلے ہی تھے کہ منی آتے دکھائی دی۔ امر نے کار ٹھہرا کر پوچھا "تم کہاں گئی تھیں منی! دھوبی سے میرے کپڑے لے کر رکھ لینا۔ سلونی کاکی کے لئے میری کوٹھری میں دوا رکھی ہے پلا دینا۔"

منی نے سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر پوچھا "تم کہاں جاتے ہو؟"

"ایک دوست کے یہاں دعوت کھانے جا رہا ہوں۔"

کار چلی۔ منی نے پوچھا "کب تک آؤ گے؟"

امر نے سر نکال کر اسے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا "جب تقدیر لائے۔"

(۸)

ساتھ کے پڑھے، ساتھ کے کھیلے، دو دلی دوست جن میں دھول دھپا، ہنسی مذاق سب کچھ ہوتا رہتا تھا۔ حالات زمانہ کی گردش میں پڑ کر دو متضاد راستوں پر چلے جا رہے تھے۔ مقصد دونوں کا ایک تھا، نصب العین

ایک دونوں ہی قوم کا درد رکھنے والے، دونوں ہی کسانوں کے بہی خواہ مگر ایک افسر تھا، دوسرا قیدی - دونوں پہلو بہ پہلو بیٹھے ہوئے تھے مگر اس طرح گویا بیچ میں کوئی دیوار حائل ہو - امر خوش تھا گویا شہادت کے زینے پر چڑھ رہا ہو، سلیم افسردہ خاطر تھا جیسے بھری مجلس میں اپنی جگہ سے اٹھا دیا گیا ہو۔

یکایک سلیم نے مسکرانے کی کوشش کرکے کہا - "کیوں امر! مجھ سے خفا ہو؟"

امر نے خندہ پیشانی سے کہا "بالکل نہیں - میں تمھیں وہی اپنا پرانا دوست سمجھ رہا ہوں - اصولوں کی لڑائی ہمیشہ ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ اس سے دوستی میں فرق نہیں آتا۔"

سلیم نے اپنی صفائی پیش کی - "بھائی انسان انسان ہے - دو مخالف گروہوں میں آکر دل میں اگر کینہ یا ملال پیدا ہو جائے تو تعجب نہیں - لیکن مجھے امید ہے تمھیں حالات کا صحیح اندازہ ہو گیا ہو گا - پہلے ڈی - بس - پی کو بھیجنے کی صلاح تھی - مگر میں نے خود آنا مناسب سمجھا۔"

"اس کے لئے میں تمھارا بڑا احسان مند ہوں - مجھ پر کوئی مقدمہ دائر ہو گا؟"

"ہاں تمھاری تقریروں کی رپورٹ پر گورنمنٹ نے تمھارے اوپر مقدمہ چلائے جانے کا حکم دیا ہے - تمھارا کیا خیال ہے - تمھاری گرفتاری سے یہ شورش فرو ہو جائے گی؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا اگر میری گرفتاری یا سزا سے لوگوں میں سکون پیدا ہو جائے تو اس کا فرو ہو جانا ہی اچھا ہے۔"

اس نے ایک لمحے کے بعد پھر کہا "عوام کو اب اپنے حقوق کی خبر

ہوگئی ہے۔ انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ حقوق کی حفاظت کے لئے قربانیاں کرنی پڑتی ہیں۔ میرا فرض یہیں تک ختم ہوگیا۔ اب وہ جانیں اور ان کا کام جانے ممکن ہے سختیوں سے دب جائیں، ممکن ہے نہ دبیں لیکن کچھ بھی ہو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کے جگر پر کاری زخم لگا ہے۔ رعایا کا دب جانا ہی طرز عمل کی کامیابی کی دلیل نہیں ہے۔"

کار کے روانہ ہوتے ہی گویا حقیقت منی کے سامنے چمک اٹھی۔ وہ ایک جنون کے عالم میں چلا اٹھی۔ "لالہ پکڑے گئے! اور اسی حالت میں موٹر کے پیچھے دوڑی۔ چلاتی جاتی تھی لالہ پکڑے گئے!!"

برسات میں کسانوں کو ہاریں بہت کام نہیں ہوتا۔ زیادہ تر لوگ گھروں پر رہتے ہیں۔ منی کی آواز گویا خطرے کی بگل تھی۔ طرفۃ العین میں سارے گاؤں میں یہ آواز گونج اٹھی۔ بھیا پکڑے گئے!

عورتیں گھروں میں سے نکل پڑیں۔ "کیا ہوا؟ بھیا پکڑے گئے!"

ایک لحظے میں سارا گاؤں چوکنا ہوگیا اور سب کے سب سڑک کی طرف دوڑے۔ کار چکر کھاتی ہوئی سڑک سے جا رہی تھی۔ لوگوں نے قیاس کیا ابھی پگڈنڈیوں کے راستے سے کار پکڑی جا سکتی ہے۔ سب اسی طرف دوڑے۔

کاشی بولا۔ "مرنا تو ایک دن ہے ہی۔"

منی بولی۔ "پکڑنا ہے تو سب کو پکڑے۔ لے چلے سب کو۔"

پیاگ بولا۔ "سرکار کا کام ہے چوروں، بدمعاشوں کو پکڑنا یا ایسوں کو جو دوسروں کے لئے جان لڑا رہے ہیں وہ دیکھو موٹر آ رہی ہے بس سب کے سب راستے میں کھڑے ہو جاؤ۔ کوئی نہ ہٹنا۔ اُسے چلانے دو۔"

سلیم کا رروکتا ہوا بولا۔ "کیا مجھے پستول نکالنا پڑے گا؟"
امر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا "نہیں نہیں میں انھیں سمجھائے دیتا ہوں"
"مجھے پولیس کے دو چار آدمیوں کو ساتھ لے لینا تھا"
"گھبراؤ مت پہلے میں مروں گا تب تمھارے اوپر آنچ آئے گی"
امر نے کار سے سر نکال کر کہا۔ "بہنو اور بھائیو! اب مجھے بدا کیجئے۔ آپ لوگوں نے میرے ساتھ جس محبت اور فیاضی کا برتاؤ کیا وہ میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ میں پردیسی مسافر تھا۔ آپ نے مجھے جگہ دی، عزت دی۔ مجھ سے بھی جو کچھ خدمت ہو سکی میں نے کی۔ اگر مجھ سے کچھ بھول چوک ہوئی ہو تو معاف کرنا۔ تم سے میرا یہی سوال ہے کہ جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اُسے چھوڑنا مت یہ کام جوں کا توں ہوتا رہے یہی سب سے بڑا صلہ ہے۔ جو آپ مجھے دے سکتے ہیں"

پھر اس نے بچوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ "پیارے بچو! میں جا رہا ہوں لیکن میری دعائیں ہمیشہ تمھارے ساتھ رہیں گی"

کاشی نے کہا۔ "بھیا ہم سب تمھارے ساتھ چلنے کو تیار ہیں"

امر نے مسکرا کر کہا۔ "نیوتا تو مجھے ملا ہے۔ تم لوگ کیسے جاؤ گے؟"

کسی کے پاس اس کا جواب نہ تھا۔ بھیا بات ہی ایسی کہتے ہیں کہ کسی سے اس کا جواب بن نہیں پڑتا"

منی سب سے پیچھے کھڑی رو رہی تھی۔ اس حالت میں امر کے سامنے کیسے جائے۔ جس شمع کو دل میں جلائے وہ اپنی تاریک زندگی میں اُجالے کا خواب دیکھ رہی تھی۔ وہ شمع کوئی اب اس کے دل سے نکالے لئے جاتا ہے وہ خاموش تاریکی کیسے جھیل سکے گی۔

دفعتاً اُس نے وحشت کے عالم میں کہا "اتنے آدمی کھڑے دیکھتے کیا ہو اُتار لو انھیں گاڑی سے"

مجمع میں ایک ہل چل مچ گئی۔ ایک نے دوسرے کی طرف قیدیوں کی طرح دیکھا کوئی بولا نہیں۔

منی نے پھر للکارا "کھڑے دیکھتے کیا ہو۔ تم لوگوں میں کچھ غیرت ہے یا نہیں؟"

امر نے کار سے نکل کر کہا "منی تم سمجھدار ہو کر ایسی باتیں کر رہی ہو۔ میرے منہ میں کالکھ مت لگاؤ"

منی اسی وحشت کے عالم میں بولی "میں سمجھدار نہیں ہوں۔ میں تو مورکھ ہوں، گنوار ہوں۔ آدمی ایک ایک پتی کے لئے سر کٹا دیتا ہے، ایک ایک بات پر جان دیتا ہے۔ تمھیں کوئی پکڑ لے جائے اور ہم کھڑے دیکھتے رہیں۔ تم نے کوئی چوری کی ہے، ڈاکہ مارا ہے"

کئی آدمی اشتعال کے عالم میں موٹر کی طرف بڑھے۔ لیکن امرکانت کی تند آواز سن کر ٹھٹک گئے "بس خبردار! اگر کسی نے آگے قدم رکھا۔ پیچھے ہٹ جاؤ اگر میری اتنے دنوں کی خدمت اور تعلیم کا یہی نتیجہ ہے تو میں کہوں گا کہ میری ساری جانفشانی خاک میں مل گئی"

جادو کا سا اثر ہوا۔ لوگ راستے سے ہٹ گئے۔ امر کار میں بیٹھ گیا اور کار چلدی۔

منی نے آنکھوں میں غصے اور رنج کے آنسو بھر کر امرکانت کو پرنام کیا۔ کار کے ساتھ جیسے اس کا دل بھی اڑا جاتا ہے۔

پانچواں حصّہ

(۱)

لکھنؤ کا سنٹرل جیل شہر سے باہر کھلی ہوئی جگہ میں ہے۔ سکھدا اسی جیل کے زنانے وارڈ میں ایک درخت کے نیچے کھڑی بادلوں کی گھوڑ دوڑ دیکھ رہی ہے۔ برسات گذر چکی ہے۔ آسمان میں بڑی دھوم دھام سے گھیر گھار ہوتا ہے مگر چھینٹے پڑکر رہجاتے ہیں۔ سخی کے دل میں اب بھی رحم ہے۔ لیکن ہاتھ خالی ہیں۔ جو کچھ تھا لٹا چکا۔

جب کوئی اندر آتا ہے اور صدر دروازہ کھلتا ہے تو سکھدا دروازے کے سامنے آکر کھڑی ہوجاتی ہے۔ دروازہ ایک ہی لمحے میں بند ہوجاتا ہے مگر باہر کی دنیا کی اُسی ایک جھلک کے لئے وہ کئی کئی گھنٹے اسی درخت کے نیچے کھڑی رہتی ہے۔ اُسے یہاں آئے ابھی پورے دو مہینے بھی نہیں ہوئے مگر اُسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں نہ جانے کیا کیا انقلاب ہو گئے۔ راہ گیروں کو راہ چلتے دیکھنے میں بھی اب اُسے خاص لطف آتا ہے۔ یہ باہر کی دنیا کبھی اتنی دلفریب نہ تھی۔

وہ کبھی کبھی سوچتی ہے۔ میں نے صفائی پیش کی ہوتی تو بری ہوجاتی۔ لیکن یہ کیا معلوم تھا کہ دل کی یہ حالت ہوگی۔ وہ جذبات جو کبھی بھول کر بھی

دل میں نہ آتے تھے۔ کسی مریض کی ہوسناکیوں کی طرح دل کو بے قرار کرتے رہتے تھے۔ جھولا جھولنے کو کبھی اس کا جی نہ مچلتا تھا۔ لیکن آج بار بار یہی جی میں آتا ہے کہ رسی ہو تو اسی درخت میں جھولا ڈال کر جھولے۔ احاطہ میں گوالن لڑکیاں بھینسیں چراتی ہوئی آم کی ابالی ہوئی گٹھلیاں توڑ توڑ کر کھا رہی ہیں۔ سکھدا نے بچپن میں ایک بار یہ گٹھلی چکھی تھی۔ وہ اس وقت کسیلی لگی تھی، اس نے دوبارہ گٹھلی زبان پر نہ رکھی۔ مگر آج ان گٹھلیوں پر اس کا جی للچا رہا ہے۔ ان کی سختی، ان کا سوندھا پن، اُن کی خوشبو اُسے کبھی اتنی دلاویز نہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کا دل اب کچھ زیادہ نازک ہوگیا ہے جیسے پال میں پڑ کر کوئی پھل زیادہ رسیلا، میٹھا اور لذیذ ہوجاتا ہے۔ للو کو اب وہ ایک لمحے کے لئے بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی۔ وہی اس کی زندگی کا سہارا ہے۔ دن میں کئی کئی بار اس کے لئے دودھ گرم کرتی ہے، حلوا پکاتی ہے، اب اسے بار بار امرکی یاد آتی ہے اس کی گرفتاری اور سزا کی خبر پاکر انھوں نے جو خط لکھا ہوگا اُسے پڑھنے کے لئے اس کا دل تڑپ تڑپ کر رہ جاتا ہے۔

لیڈی میسٹرن نے آکر کہا "سکھدا دیوی تمھارے سسر تم سے ملنے آئے ہیں۔ تیار ہوجاؤ۔ بیس منٹ کا وقت ہے۔"

سکھدا نے جھٹ پٹ للو کا منہ دھویا، نئے کپڑے پہنائے جو کئی دن پہلے جیل ہی میں سیے تھے۔ اور اُسے گود میں لئے میسٹرن کے ساتھ باہر نکلی۔

ملاقات کا کمرہ جیل کے وسط میں تھا اور راستہ باہر ہی سے تھا۔ دو مہینے کے بعد جیل سے باہر نکل کر سکھدا کو ایسی مسرت ہو رہی تھی گویا کوئی مریض بستر سے اٹھا ہو۔ جی چاہتا تھا سامنے کے میدان میں خوب اچھلے اور للو تو چڑیوں کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

لالہ سمرکانت وہاں پہلے ہی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ للو کو دیکھتے ہی باغ باغ ہوگئے اور گود میں اٹھا کر بار بار اس کا منہ چومنے لگے۔ اس کے لئے مٹھائیاں، کھلونے، پھل، کپڑے، پورا ایک گٹھڑ لائے تھے۔ سکھدا بھی عقیدت اور احترام سے آب گوں ہوگئی۔ ان کے قدموں پر گر پڑی اور رونے لگی اس لئے نہیں کہ اس پر کوئی مصیبت آئی ہے بلکہ اس لئے کہ رونے میں مزہ آرہا ہے۔

سمرکانت نے دعا دیتے ہوئے پوچھا "یہاں تمہیں جس بات کی تکلیف ہو میسٹرن صاحب سے کہنا۔ مجھ پر یہ بہت مہربان ہیں۔ للو اب شام کو روز باہر کھیلا کرے گا۔ اور کسی بات کی تکلیف تو نہیں ہے؟"

سکھدا نے دیکھا سمرکانت دبلے ہو گئے ہیں۔ محبت سے اس کا دل جیسے چھلک اٹھا۔ بولی "میں تو یہاں بڑے آرام سے ہوں۔ لیکن آپ کیوں اتنے دبلے ہو رہے ہیں۔"

"یہ نہ پوچھو۔ یہ پوچھو آپ زندہ کیسے ہیں۔ نینا بھی چلی گئی۔ اب گھر بھوتوں کا ڈیرہ ہو گیا ہے۔ سنتا ہوں لالہ منی رام اپنے باپ سے الگ ہو کر دوسری شادی کرنے والے ہیں۔ تمہاری اماں تیرتھ کرنے چلی گئیں۔ شہر میں تحریک بدستور جاری ہے۔ اس زمین پر سارے دن لوگوں کا ہجوم لگا رہتا ہے، کچھ لوگ رات کو وہیں سوتے ہیں۔ ایک دن تو را توں رات وہاں سینکڑوں جھونپڑے کھڑے ہو گئے۔ لیکن دوسرے دن پولیس نے ان میں آگ لگا دی اور کئی چودھریوں کو گرفتار کر لیا۔"

سکھدا نے دل میں خوش ہو کر کہا۔ "ان لوگوں نے کیا نادانی کی۔ مگر وہاں تو اب کوٹھیاں بننے لگی ہوں گی؟

سمرکانت بولے۔ "ہاں۔ اینٹیں، چونا، سرخی تو جمع کی گئی تھی۔ لیکن ایک دن راتوں رات سارا سامان اُڑ گیا۔ تب سے وہاں کسی کو مزدور ہی نہیں ملتے نہ کوئی بلدار جاتا ہے نہ کاریگر۔ رات کو پولیس کا پہرہ رہتا ہے۔ وہی بڑھیا پٹھانی آج کل وہاں اس تحریک کی روح رواں ہے۔ ایسی تنظیم کر لی ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔"

جس کام میں وہ ناکام ہوئی اُسے وہ کھوسٹ بڑھیا اتنی خوش اسلوبی سے چلا رہی ہے اس خیال سے سکھدا کی خودداری کو چوٹ لگی۔ بولی "وہ بڑھیا تو چل پھر بھی نہ سکتی تھی۔"

سمرکانت نے سر ہلا کر کہا۔ "ہاں وہی بڑھیا اچھے اچھوں کے دانت کھٹے کر رہی ہے۔ عوام کو اس نے ایسا مٹھی میں کر لیا ہے کہ کیا کہوں۔ اندر سے بیٹھے شانتی کمار کل گھماتے رہتے ہیں۔"

سکھدا نے آج تک ان سے یا کسی سے امرکانت کے متعلق کچھ نہ پوچھا تھا لیکن اس وقت وہ ضبط نہ کر سکی۔ "پوچھا ہر دوار سے کوئی خط آیا تھا؟"

لالہ سمرکانت کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ بولے۔ "ہاں آیا تھا۔ اسی شہدے سلیم کا خط تھا۔ وہی اس علاقے کا حاکم ہے۔ اس نے بھی پکڑ دھکڑ شروع کر دی ہے۔ ان حضرت کو اس نے خود گرفتار کیا۔ یہ آپ کے دوستوں کا حال ہے۔ اب آنکھیں کھلی ہوں گی۔ میرا کیا بگڑا۔ آپ ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ اب جیل میں چکی پیس رہے ہوں گے۔ گئے تھے غریبوں کی خدمت کرنے یہ اسی کا انعام ہے۔ میں تو ایسے دوست کو گولی مار دیتا۔ اور گرفتار تک ہو گیا پر مجھے خط نہ لکھا۔ اس کے حساب سے تو مر گیا۔ مگر میں بے حیا ابھی مرنے کا نام نہیں لیتا۔ چین سے کھاتا ہوں اور سوتا ہوں۔ کسی کے مانے

سے کیوں مروں۔ ذرا اس کی مٹھ دی تو دیکھو گھر میں کسی کو خبر تک نہ دی۔ میں دشمن تھا۔ نینا تو دشمن نہ تھی۔ شانتی کمار تو دشمن نہ تھے یہاں سے جا کر کوئی مقدمے کی پیروی کرنا تو اسے۔ بی کوئی درجہ تو مل جاتا۔ نہیں معمولی قیدیوں کی طرح پڑے ہوئے ہیں۔ آپ روئیں گے میرا کیا بگڑتا ہے۔"

سکھدا نے حجاب کے ساتھ کہا "آپ اب کیوں نہیں چلے جاتے؟"

سمرکانت ناک سکوڑ کر بولے۔ "میں کیوں جاؤں، مجھ سے مطلب؟ جیسا کیا ہے ویسا بھوگے۔ وہ لڑکی جو تھی سکینہ۔ اس کی شادی اسی شہدے سلیم سے ہو رہی ہے جس نے بچاجی کو گرفتار کیا ہے۔ اب آنکھیں کھلی ہوں گی"

سکھدا نے ہمدردانہ لہجے میں کہا "آپ انھیں ناحق کوس رہے ہیں دادا۔ دراصل ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ سراسر میرا قصور تھا۔ ان کا سا غریب دوست آدمی مجھ جیسی نفاست پسند عورت کے ساتھ کیسے خوش رہ سکتا تھا۔ بلکہ یوں کہیئے کہ قصور نہ آپ کا تھا، نہ میرا تھا، نہ ان کا۔ یہ ساری آگ لکشمی نے لگائی۔ آپ کے گھر میں ان کے لئے جگہ نہ تھی۔ آپ ان سے کھنچے رہتے تھے میں نے بھی اسی آب و ہوا میں پرورش پائی تھی۔ انھیں نہ پہچان سکی۔ وہ اچھا یا برا جو کچھ کرتے تھے گھر میں اس کی مخالفت ہی ہوتی تھی۔ ایسی حالت میں انھیں گھر سے کیا الفت ہو سکتی تھی۔ میں نے یہاں تنہائی میں اس سوال پر خوب غور کیا اور مجھے اپنی غلطی تسلیم کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے۔ آپ آج ہی وہاں جا کر افسروں سے ملیں۔ سلیم کی خوشامد کریں۔ اور ان کی جو کچھ مدد ہو سکے کریں۔ ہم نے آسمان میں اڑنے والی چڑیا کو پنجرے میں بند کرنا چاہا تھا۔ جب چڑیا پنجرے کو توڑ کر اڑ گئی تو میں نے سمجھا میں بدنصیب ہوں۔ آج مجھے معلوم ہو رہا ہے چڑیا نے وہی کیا جو اسے کرنا چاہیئے تھا۔"

سمرکانت ایک لمحے تک تعجب کی آنکھوں سے سکھدا کی طرف تکتے رہے گویا اپنے کانوں پر اعتبار نہ آرہا ہو۔ ہمدردی کی اس حرارت نے ان کے منجمد جذبۂ پدری کو پگھلا دیا۔ بولے۔ "اس کی تو میں نے خوب جانچ کی۔ بات کچھ نہیں تھی۔ اسے غصہ تھا۔ اسی غصے میں جو کچھ منہ میں آیا بک دیا۔ یہ عیب اس میں کبھی نہ تھا۔ لیکن اس وقت میں بھی اندھا ہو رہا تھا۔ پھر میں کہتا ہوں یہ بات صحیح بھی ہو۔ سولہ آنے سچ ہو تو کیا دنیا میں جتنے آدمی ایسے ہیں ان کی گردن مار دی جاتی ہے۔ میں بڑے بڑے پنچوں کے سامنے گردن جھکاتا ہوں تو پھر اپنے ہی گھر میں اور انھیں کے اوپر جن سے کسی طرح کے انتقام کا خوف نہیں دھرم اور اخلاق کی ساری ذمہ داری کیوں ڈال دی جائے۔ انسان کی گردن میں جب محبت کی بندش نہیں ہوتی تبھی وہ بے راہ ہو جاتا ہے، آوارگی اختیار کرتا ہے بھکاری دربدر اسی لئے پھرتا ہے کہ ایک دروازے سے اس کی بھوک نہیں بجھتی۔ اگر اسے گناہ بھی مان لوں تو ایشور نے کیوں گناہ سے پاک دنیا نہیں بنائی۔ اگر کہو کہ ایشور کی مرضی ایسی نہیں ہے تو میں پوچھوں گا جب ایشور قادر ہے تو وہ دل کو کیوں ایسا بناتا ہے کہ اسے کسی خستہ حال جھونپڑی کی طرح بہت سی تھونیوں سے سنبھالنا پڑے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کسی مریض سے کہا جائے کہ تو اچھا ہو جا۔ اگر مریض میں اتنی طاقت ہوتی تو وہ بیمار ہی کیوں پڑتا۔"

ایک سانس میں اپنے دل کی ساری کدورت انڈیل دینے کے بعد لالہ سمرکانت دم لینے کے لئے رک گئے۔ جو کچھ ادھر ادھر لگا لپٹا رہ گیا تھا شاید اسے بھی کھرچ کر نکال دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

سکھدا نے پوچھا۔ "تو آپ وہاں کب جا رہے ہیں؟"

لالہ جی نے سرگرمی سے کہا "آج ہی ادھر ہی سے چلا جاؤں گا۔ سنا ہے وہاں خوب سختیاں ہو رہی ہیں۔ اب تو وہاں کا حال اخباروں میں بھی چھپنے لگا ہے کئی دن ہوئے منی نام کی عورت بھی کئی آدمیوں کے ساتھ گرفتار ہوئی ہے کچھ اسی طرح کی ہل چل سارے صوبے بلکہ سارے ملک میں مچی ہوئی ہے۔"

بچہ کمرے کے باہر نکل گیا تھا۔ لالہ جی نے اسے پکارا تو وہ سڑک کی طرف بھاگا۔ سمر کانت بھی اس کے پیچھے دوڑے۔ بچے نے سمجھا کھیل ہو رہا ہے اور تیز دوڑا ڈھائی تین سال کے بچے کی تیزی ہی کیا مگر سمر کانت جیسے تھل تھل آدمی کے لئے پوری ورزش ہو گئی۔ بڑی مشکل سے اسے پکڑا۔

اندر آ کر ایک منٹ کے بعد کچھ اس انداز سے بولے "گویا کوئی بہت اہم بات کہہ رہے ہوں" میں تو سوچتا ہوں جو لوگ قوم کے لئے اپنی جان قربان کرنے کو ہر دم تیار رہتے ہیں ان کی برائیوں پر نگاہ ہی نہ ڈالنی چاہیے۔"

سکھدا نے اختلاف کیا "یہ نہ کہئے دادا۔ بلکہ ایسے آدمیوں کو بے داغ رہنا چاہیے ورنہ ان کی خدمت میں بھی غرض اور حرص کی بو آنے لگے گی۔"

سمر کانت نے فلسفیانہ انداز سے کہا "غرض میں اسی کو کہتا ہوں جس کے ملنے سے دل کو خوشی اور نہ ملنے سے رنج ہو۔ ایسا آدمی جسے نہ خوشی ہوتی ہے نہ رنج انسان نہیں ہے، دیوتا بھی نہیں ہے، پتھر ہے۔"

سکھدا مسکرائی۔ "تو دنیا میں کوئی بے غرض ہو ہی نہیں سکتا۔"

"غیر ممکن۔ غرض چھوٹی ہو تو غرض ہے۔ بڑی ہو تو خدمت ہے۔ میرا تو خیال ہے ایشور بھکتی بھی غرض ہی ہے۔"

ملاقات کا وقت کب کا گذر چکا تھا۔ میٹرن اب اور رعایت نہ کر سکتی تھی سمر کانت نے بچے کو پیار کیا، بہو کو دعا دی اور باہر نکلے۔

بہت دنوں کے بعد آج انھیں اپنے دل میں مسرت اور روشنی کا احساس ہوا۔ گویا چاند کے چہرے سے بادلوں کا پردہ ہٹ گیا ہو۔

(۲)

سکھدا اپنے کمرے میں پہنچی تو دیکھا ایک حسین عورت قیدیوں کے کپڑے پہنے اس کے کمرے کی صفائی کر رہی ہے۔ ایک چوکیدارن بیچ بیچ میں اسے ڈانٹتی جاتی ہے۔

چوکیدارن نے قیدن کی پیٹھ میں لات مار کر کہا۔ "رانڈ تجھے جھاڑو لگانا بھی نہیں آتا۔ گرد اڑاتی ہے ہاتھ دبا کر لگا۔"

قیدن نے جھاڑو پھینکدی اور تمتماتے ہوئے چہرے سے بولی "میں یہاں کسی کی ٹہل کرنے نہیں آئی ہوں۔"

"تب کیا رانی بن کر آئی ہے؟"

"ہاں رانی بن کر آئی ہوں، کسی کی چاکری کرنا میرا کام نہیں۔"

"تو جھاڑو لگائے گی یا نہیں؟"

"بھلنسی سے کہو تو میں تمہارے بھنگی کے گھر میں بھی جھاڑو لگا دوں گی لیکن مار کا ڈر دکھا کر تم مجھ سے راجا کے گھر میں بھی جھاڑو نہیں لگوا سکتی اتنا سمجھ لو۔"

"تو نہ لگائے گی جھاڑو؟"

چوکیدارن نے قیدن کے بال پکڑ لئے اور کھینچتی ہوئی کمرے کے باہر لیچلی رہ رہ کر اس کے گالوں پر طمانچے بھی لگاتی جاتی تھی۔

"چل جیلر صاحب کے پاس۔"

"ہاں لے چلو، میں یہی ان سے بھی کہوں گی۔ یہاں مار گالی کھانے نہیں آئی ہوں۔"

سکھدا کے متواتر خط و کتابت کرنے پر اسے یہ نوکرانی دی گئی تھی۔ مگر یہ نظارہ دیکھ کر سکھدا کو روحانی صدمہ ہوا۔ اس کمرے میں قدم رکھنا بھی اسے برا معلوم ہو رہا تھا۔

قیدن نے اس کی طرف پرنم آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ "تم گواہ رہنا۔ اس چوکیدارن نے مجھے کتنا مارا ہے۔"

سکھدا نے قریب جا کر چوکیدارن کو ہٹایا اور قیدن کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔

چوکیدارن نے دھمکا کر کہا۔ روز سویرے یہاں آجایا کر۔ جو کام یہ کہیں کیا کر۔ نہیں ڈنڈے پڑیں گے۔"

قیدن غصے سے کانپ رہی تھی۔ میں کسی کی لونڈی نہیں ہوں اور نہ یہ کام کروں گی۔ کسی مہارانی کی ٹہل کرنے نہیں آئی۔ جیل میں سب برابر ہیں۔"

سکھدا نے دیکھا۔ حسینہ میں خودداری کی کمی نہیں ہے۔ شرمندہ ہو کر بولی۔ "یہاں کوئی رانی مہارانی نہیں ہے بہن۔ میرا جی اکیلے گھبرایا کرتا تھا اسی لئے تمہیں بلا لیا۔ ہم دونو یہاں بہنوں کی طرح رہیں گے۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

حسینہ کا غضبناک چہرہ نرم پڑ گیا۔ بولی۔ "میرا نام منی ہے۔ ہردوار سے آئی ہوں۔"

سکھدا چونک پڑی لالہ سمرکانت نے یہی نام تو لیا تھا۔ پوچھا "وہاں کس جرم میں سزا ہوئی تھی؟"

"جرم کیا تھا۔ سرکار جمین کا لگان نہیں کم کرتی تھی۔ کل چار آنے کی چھوٹ

ہوئی۔ جنس کو بجا رہیں کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ ہم کس کے گھر سے لاکر دیتے۔ اسی بات پر ہم نے پھر یاد کی۔ بس سرکار نے سجا دینا شروع کر دیا۔"

"تمھارے یہاں وہ بھی تو اسی معاملے میں گرفتار ہوئے ہیں جو تھوڑے دنوں سے وہاں جاکر ٹھہرے تھے؟"

"کیا امر بھیا کو پوچھتی ہو؟"

"ہاں ہاں وہی! انھیں جانتی ہو؟"

منی خوش ہوگئی۔ بولی۔ "جانتی کیوں نہیں۔ وہ تو ہمارے ہی گھر میں رہتے تھے۔ تم انھیں کیسے جانتی ہو؟"

سکھدا نے کہا۔ "میں بھی دہلی کی رہنے والی ہوں۔ اسی محلے میں ان کا بھی گھر ہے۔ تم کیا برہمنی ہو؟"

"ہوں تو ٹھکرانی۔ پر اب کچھ نہیں ہوں۔ بیٹا بھی تھا۔ آدمی بھی تھا۔ اب کوئی نہیں رہا۔ سب کے نام کو رو بیٹھی۔"

"وہ بابو کبھی اپنے گھر کی بات چیت نہیں کرتے تھے؟"

"کبھی نہیں۔ نہ کبھی آنا جانا۔ نہ چٹھی نہ پتر۔"

سکھدا نے اُسے کنکھیوں سے دیکھ کر کہا۔ "مگر وہ تو بڑے رسیا آدمی ہیں۔ وہاں گاؤں میں کسی پر ڈورے نہیں ڈالے؟"

منی نے زبان دانتوں تلے دبائی۔ "کبھی نہیں بہوجی، کبھی نہیں۔ میں نے تو کبھی ان کو کسی کی طرف تکتے اور ہنستے نہیں دیکھا۔ نہ جانے کس بات پر گھر والی سے روٹھ گئے۔ تم تو جانتی ہوگی؟"

سکھدا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "روٹھ کیا گئے۔ عورت کو چھوڑ دیا چھپ کر گھر سے بھاگ گئے۔ بیچاری عورت گھر میں بیٹھی ہوئی ہے۔ تم کو معلوم نہ ہوگا انھوں نے

ضرور کہیں نہ کہیں جال پھینکا ہوگا۔"

منی نے سر ہلا کر کہا۔" ایسی بات ہوتی تو گاؤں میں چھپی نہ رہتی بہو۔ میں تو نت ہی دو چار بار ان کے پاس جاتی تھی۔ کبھی سر اوپر نہ اٹھاتے تھے۔ پھر اس دیہات میں ایسی تھی ہی کون جس پر ان کا من چلتا۔ نہ کوئی پڑھی لکھی، نہ بات چیت کرنے کا ڈھنگ۔"

سکھدا نے پھر نبض ٹٹولی۔ مُردگن، شعور، پڑھنا، لکھنا نہیں دیکھتے۔ وہ تو روپ رنگ دیکھتے ہیں۔ وہ تمھیں بھگوان نے دیا ہی ہے۔ جوان بھی ہو۔"

منی نے منہ پھیر کر کہا۔" تم تو گالی دیتی ہو بہو جی۔ میری طرف بھلا وہ کیا دیکھتے جوان کی جوتیوں کے برابر بھی نہیں۔ تم یہاں کیسے آئیں؟"

" جیسے تم آئیں، ویسے میں بھی آئی۔"

" تو یہاں بھی وہی ہل چل ہے؟"

"ہاں کچھ اسی طرح کا ہے۔"

منی کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ایسے اونچے گھرانوں کی عورتیں بھی جیل آئی ہیں۔ بھلا انھیں کس بات کی تکلیف ہوگی۔

اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ تمھارے آدمی بھی سجا پا گئے ہوں گے؟"

"ہاں تبھی تو میں آئی۔"

منی نے چھت کی طرف دیکھ کر دعا دی۔" بھگوان تمھاری مراد پوری کریں بہو جی۔ گدی مسند لگانے والی رانیاں جب گریبوں کا درد سمجھنے لگیں۔ تو ان کے اچھے دن آنے میں دیر نہیں ہے کتنے دنوں کی سجا ہوئی ہے تمھاری؟"

" میں تو چھ مہینے کو آئی ہوں۔"

سکھدا نے اپنی سزا کی میعاد بتا کر کہا۔ تمھارے ضلع میں بڑی سختیاں ہو رہی

ہوں گی؟"

منی بولی۔ "کچھ نہ پوچھو بہوجی، بیچاروں کو بیل بدھیئے بیچ بیچ کر لگان بھرنا پڑا۔ آدمی کہاں تک سہتا مجھے پکڑنے کے لئے پوری پلٹن گئی۔ پچاس آدمی سے کم نہ ہوں گے۔ گولی چلتے چلتے بچی۔ ہجاروں آدمی جمع ہو گئے۔ کتنا سمجھاتی تھی بھائیو اپنے اپنے گھر جاؤ مجھے جانے دو مگر کون سنتا ہے جب میں نے ڈانٹا تب لوٹے۔ نہیں اس دن دس پانچ کی جانیں جاتیں۔ نہ جانے بھگوان کہاں سوئے ہوئے ہیں کہ اتنی بے انصافی دیکھتے ہیں اور نہیں بولتے۔ سال میں چھ مہینے ایک جوں کھا کر بیچارے دن کاٹتے ہیں، چیتھڑے پہنتے ہیں لیکن سرکار کو دیکھو تو انھیں کی گردن پر سوار۔ بڑوں کو تو اپنے لئے بنگلہ چاہیئے، موٹر چاہیئے ہر نعمت کھانے کو چاہیئے، سیر تماشا دیکھنے کو چاہیئے لیکن گریبوں کا اتنا سکھ بھی نہیں دیکھا جاتا۔ وہ جمع کو نہیں مانگتے۔ لیکن پیٹ کی روٹی اور تن ڈھانکنے کا کپڑا تو چاہیئے ہی۔"

سکھدا نے دیکھا اس گنواری کے دل میں کتنا درد ہے۔ امرکانت کی خدمت اور قومی کارگذاریوں کی اس نے جن لفظوں میں تعریف کی اُنھوں نے گویا اس کے دل سے ساری کدورتوں کو دھو کر صاف کر دیا۔ گویا اس کے اندر روشنی کا ظہور ہو گیا ہو اور اس کے سارے شبہے اور توہمات تاریکی کی طرح مٹ گئے ہوں۔ امرکانت کی خیالی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ قیدیوں کا جانگیہ اور کنٹوپ پہنے، بڑے بڑے بال بڑھائے، چہرہ زرد، بال بکھرے ہوئے۔ قیدیوں کے بیچ میں چکی پیستے ہوئے۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

میٹرن نے آ کر کہا "اب تو آپ کو بیش خدمت مل گئی۔ اس سے خوب کام لو۔"

سکھدا نے دھیمی آواز میں کہا "مجھے کسی پیش خدمت کی ضرورت نہیں ہے۔ میم صاحب۔ میں یہاں رہنا بھی نہیں چاہتی۔ آپ مجھے معمولی قیدیوں کے ساتھ ہی رکھیں"

میٹرن پستہ قد، اینگلو انڈین لیڈی تھی، چوڑا منہ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، تراشے ہوئے بال، گھٹنیوں کے اوپر تک کا اسکرٹ پہنے ہوئے۔ آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ "یہ کیا کہتی ہو سکھدا دیوی۔ یہ عورت آ ہی گئی اور جس چیز کی تکلیف ہو ہم سے کہو۔ ہم جیلر صاحب سے بولے گا"

سکھدا نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "میں اب آپ سے کسی طرح کی رعایت نہیں چاہتی۔ معمولی قیدیوں کی طرح رہنا چاہتی ہوں"

"ادنےٰ درجے کی عورتوں کے ساتھ رہنا پڑے گا کھانا بھی وہی ملے گا"

"یہی تو میں چاہتی ہوں"

"شاید چکی پیسنا پڑے؟"

"کوئی ہرج نہیں"

"گھر کے آدمیوں سے چھٹے مہینے ملاقات ہو سکے گی؟"

"جانتی ہوں"

لالہ سمرکانت نے میٹرن کو نذرانے اور شکرانے سے مالا مال کر دیا تھا اس سونے کی چڑیا سے وہ اور بھی بہت کچھ کما سکتی تھی۔ جب بہت سمجھانے پر بھی سکھدا اپنے فیصلے پر قائم رہی تو بادل ناخواستہ چلی گئی۔

منی نے پوچھا۔ "میم صاحب کیا کہتی تھیں؟"

سکھدا نے منی کو پر محبت نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "اب میں تمہارے ہی ساتھ رہوں گی منی"۔

منی نے چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "یہ کیا کرتی ہو بہو۔ تم سے نہ رہا جائے گا"
"جہاں تم رہ سکتی ہو وہاں میں بھی رہ سکتی ہوں"
ایک گھنٹے کے بعد جب سکھدا منی کے ساتھ یہاں سے چلی تو اس کا دل امید اور بیم سے کانپ رہا تھا۔ جیسے کوئی بچہ امتحان میں کامیاب ہو کر اونچی جماعت میں آگیا ہو

(۳)

پولیس نے اس پہاڑی علاقے کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ پیدل اور سوار ہمیشہ گھومتے رہتے تھے۔ پانچ آدمیوں سے زیادہ ایک جگہ جمع نہ ہو سکتے تھے شام کو آٹھ بجے کے بعد کوئی گھر سے نکل نہ سکتا تھا۔ پولیس کی اجازت کے بغیر گھر میں کسی مہمان کو بھی ٹھہرانے کی اجازت نہ تھی۔ فوجی قانون نافذ کر دیا تھا۔ کتنے ہی مکانات جلا دئے گئے تھے اور ان کے مکین کنجڑوں کی طرح درخت کے نیچے بال بچوں کو لئے پڑے ہوئے تھے۔ مدرسے میں بھی آگ لگا دی گئی تھی اور اس کی آدھی آدھی سیاہ دیواریں جیسے بال کھولے ماتم کر رہی ہوں۔ سوامی آتمانند اب بھی بانس کی چھتری لگائے وہاں ڈٹے ہوئے تھے۔ ذرا سا موقع پاتے ہی دس بیس آدمی ادھر اُدھر سے آکر جمع ہو جاتے تھے۔ لیکن سواروں کو دیکھا اور غائب۔
یکایک لالہ سمرکانت ایک گٹھر پیٹھ پر لادے آکر مدرسے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ سوامی جی نے دوڑ کر ان کا بستر لے لیا۔ اور کھاٹ کی فکر میں دوڑے سارے گاؤں میں بجلی کی طرح خبر دوڑ گئی۔ امرکانت کے باپ آئے ہیں۔ ہیں تو بوڑھے مگر ابھی ٹانٹھے ہیں۔ سیٹھ ساہوکار جیسے لگتے ہیں۔ ایک لمحے میں بہت سے آدمیوں نے آکر ان کو گھیر لیا۔ کسی کے سر میں پٹی بندھی ہوئی تھی، کسی کے ہاتھ میں۔ کئی آدمی لنگڑا رہے تھے۔ شام ہو گئی تھی اور آج کوئی خاص خطرہ نہ دیکھ کر

اور سارے علاقے میں ڈنڈے کے زور سے امن قائم کرکے پولیس آرام کر رہی تھی۔ بیچارے کانسٹبل رات دن دوڑتے دوڑتے ادھ مرے ہو رہے تھے

گوڈر نے لاٹھی ٹیکتے ہوئے آکر سمر کانت کو سلام کیا اور بولا "امر بھیا کا حال تو آپ کو معلوم ہوا ہوگا۔ آج کل تو پولیس کا دھاوا ہے۔ حاکم کہتا ہے بارہ آنی لیں گے، ہم کہتے ہیں ہمارے پاس ایک آنہ بھی نہیں ہے دیں کہاں سے۔ بہت سے لوگ تو گاؤں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ جو رہ گئے ہیں ان کی حالت آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ منی بہو کو پکڑ کر جیل میں ڈال دیا۔ آپ ایسے سمے آئے کہ آپ کی کچھ کھاطر بھی نہیں کر سکتا۔"

سمر کانت مدرسے کے چبوترے پر بیٹھ گئے اور سر پر ہاتھ رکھ کر سوچنے لگے۔ ان غریبوں کی کیا مدد کریں۔ پوچھا "یہاں کوئی افسر بھی تو ہوگا؟"

گوڈر نے کہا "ہاں افسر تو ایک نہیں پچیس ہیں جی، سب سے بڑے افسر تو وہی میاں جی ہیں جو امر بھیا کے بڑے دوست ہیں۔"

"تم لوگوں نے اس لنگے سے پوچھا نہیں۔ مار پیٹ کیوں کرتے ہو؟ کیا یہی کوئی قانون ہے؟"

گوڈر نے سلونی کی مڑیا کی طرف دیکھ کر کہا۔ "مالک کہتے تو سب کچھ ہیں جب کوئی سنے۔ سلیم میاں نے خود اپنے ہاتھوں سے ہنٹر مارے۔ اس کی بے دردی دیکھ کر پولیس والے بھی دانتوں تلے انگلی دباتے۔ سلونی میری بھاوج لگتی ہے۔ اس نے ان کے منہ پر تھوک دیا تھا۔ یہ اُسے نہ کرنا چاہیے تھا۔ پاگل پن تھا اور کیا۔ مگر اس پر میاں صاحب آگ ہو گئے اور بڑھیا کے اتنے ہنٹر مارے کہ بھگوان ہی بچائیں تو بچے۔ مگر ہے وہ بھی اپنی دھن کی پکی۔ ہر ایک ہنٹر پر گالی دیتی تھی۔ جب بے دم ہو کر گر پڑی تب اس کی جان بند ہوئی۔ امر بھیا اسے کاکی کاکی کہا کرتے

تھے۔ کہیں سے بھی آئیں سب سے پہلے کالی کے پاس جاتے تھے۔"

آتمانند نے چڑھ کر کہا "ارے تو اب رہنے بھی دو۔ کیا سب آج ہی کہہ ڈالوگے۔ پانی منگواؤ۔ آپ ہاتھ منہ دھوئیں۔ تھکے ماندے آرہے ہیں ذرا آرام کرلینے دو وہ دیکھو سلونی کو بھی خبر مل گئی۔ لاٹھی ٹیکتی چلی آتی ہے۔"

سلونی نے قریب آکر کہا "کہاں ہیں دیورجی۔ ساون میں آتے تو تمہارے ساتھ جھولا جھولتی۔ چلے بھی تو کاتک میں۔ جس کا ایسا سردار اور ایسا بیٹا اُسے کس کا ڈر۔ تمھیں دیکھ کر سارا دکھ بھول گئی دیورجی۔"

سمرکانت نے دیکھا سلونی کا سارا جسم سوجا ہوا ہے اور ساڑی پر خون کے داغ سوکھ کر کتھئی ہوگئے ہیں۔ منہ بالکل سوجا ہوا ہے۔ اس مُردے پر اتنا غصہ اس پر عالم فاضل بنتا ہے۔ اُن کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ غصہ ضعیف اور چاہے کچھ نہ کرسکے۔ خدا کی خبر تو لے ہی سکتا ہے۔ تم عالم الغیب ہو، قادر مطلق ہو۔ غریبوں کے دستگیر ہو اور تمہاری آنکھوں کے سامنے یہ اندھیر۔ اس دنیا کا خالق کوئی نہیں ہے۔ اگر کوئی رحمدل ایشور اس کا خالق ہوتا تو یہ ظلم نہ ہوتا۔ اچھے قادر مطلق ہو۔ کیوں اُن بے رحموں کے دل میں نہیں گھس جاتے۔ یا وہاں تمہاری بھی پہنچ نہیں ہے کہتے ہیں یہ سب بھگوان کا کھیل ہے۔ اچھا کھیل ہے۔ اگر تمھیں بھی ایسے کھیل میں مزہ آتا ہے تو تم جانوروں سے بھی گئے گذرے ہو۔ اگر تمھیں دنیا کی کچھ خبر نہیں ہے تو علیم اور بصیر کیوں کہلاتے ہو۔"

سمرکانت راسخ الاعتقاد آدمی تھے۔ مذہبی کتابوں کا خوب مطالعہ کیا تھا بھگوت گیتا کا روز ورد کیا کرتے تھے۔ مگر اس وقت سارا دھرم شاستر انھیں گورکھ دھندا معلوم ہوا۔

وہ اسی وقت اُٹھ کھڑے ہوئے اور پوچھا "سلیم تو صدر میں ہوگا؟"

آتمانند نے کہا "آج کل تو یہیں پراؤ ہے۔ ڈاک بنگلے میں ٹھہرے ہوئے ہیں"

"میں ذرا ان سے ملوں گا"

"ابھی غصے میں ہیں ان سے مل کر کیا کیجئے گا۔ آپ کو بھی سخت سست کہہ بیٹھیں گے"

"یہی دیکھنے تو جانا ہے کہ آدمی کہاں تک حیوان ہو سکتا ہے"

"تو چلئے میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں"

"نہیں نہیں تم نہ چلو سوامی جی۔ مالک، یہ تو سنیاسی اور دیا کے پتلے ہیں مگر گئے میں بھی دریا سا متی سے کم نہیں ہیں۔ جب حاکم صاحب سلونی کو مار رہے تھے تو چار آدمی انھیں پکڑے ہوئے تھے نہیں تو اسی دم میاں کا خون چوس لیتے پیچھے چاہے پھانسی ہو جاتی۔ سارے گاؤں کی مرہم پٹی انھیں کے سپرد ہے"

سلونی نے سمرکانت کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ میں تمھارے ساتھ چلوں گی دیور جی اُسے دکھا دوں گی کہ بڑھیا تیری چھاتی پر مونگ دلنے کو بیٹھی ہوئی ہے۔ تو مار رہے تو کوئی تجھ سے بڑا راکھن ہا رہی ہے۔ جب تک اس کا حکم نہ ہوگا تو کیا مار سکے گا"

خدا کی ذات میں اس کا یہ زندہ اعتقاد دیکھ کر سمرکانت کی آنکھیں بھر آئیں سوچا مجھ سے تو یہ جاہل ہی اچھے۔ جو اتنی سختیاں اور تکلیفیں جھیل کر بھی تمھارا نام رٹتے ہیں۔ بولے "نہیں بھابی مجھے اکیلے جانے دو۔ میں ابھی ان سے دو دو باتیں کر کے لوٹا آتا ہوں"

سلونی لاٹھی سنبھال ہی رہی تھی کہ سمرکانت چل پڑے۔ تیجا اور درجن ڈاک بنگلے کا راستہ دکھاتے ہوئے آگے آگے چلے۔

تیجا نے پوچھا۔ "دادا۔ جب امر بھیا چھوٹے تھے تو بڑے شیطان تھے نہ؟"

سمرکانت نے اس سوال کا مطلب نہ سمجھ کر کہا۔ "نہیں تو وہ بچپن ہی سے بڑے سیدھے تھے۔"

درجن تالی بجا کر بولا۔ "اب کہو تم ہارے کہ نہیں۔ دادا ہمارا ان کا یہ جھگڑا ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ جو لڑکے بچپن میں بڑے شیطان ہوتے ہیں وہ بڑے ہو کر بڑے دھرماتما ہو جاتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ جو لڑکپن میں سیدھے ہوتے ہیں وہی بڑے ہو کر بھی سیدھے ہوتے ہیں۔ جو بات آدمی میں ہے ہی نہیں وہ بیج میں کہاں سے آجائے گی۔"

تیجا نے اعتراض کیا۔ "لڑکے میں تو اکل بھی نہیں ہوتی جوان ہونے پر کہاں سے آجاتی ہے؟ ننھے سے بیج میں ڈال بات کہاں سے آجاتے ہیں؟"

"یہ کوئی بات نہیں۔ میں ایسے کتنے ہی نامی آدمیوں کی مثال دے سکتا ہوں جو بچپن میں بڑے باجی تھے مگر آگے چل کر بڑے ہاتما ہو گئے۔"

سمرکانت کو بچوں کے اس مباحثے میں بڑا مزہ آیا۔ ثالث بن کر دونوں کو کچھ کچھ سہارا دیتے جاتے تھے۔ راستے میں ایک جگہ کیچڑ بھرا ہوا تھا۔ سمرکانت کے جوتے کیچڑ میں پھنس کر پاؤں سے نکل گئے۔ اس پر بڑی ہنسی ہوئی۔

سامنے سے پانچ سوار آتے نظر آئے تیجا نے ایک پتھر اٹھا کر ایک سوار پر نشانہ مارا۔ اس کی پگڑی زمین پر گر پڑی۔ وہ تو گھوڑے سے اتر کر پگڑی اٹھانے لگا۔ باقی چاروں گھوڑے دوڑاتے ہوئے سمرکانت کے قریب آپہنچے۔

تیجا دوڑ کر ایک درخت پر چڑھ گیا۔ دو سوار اس کے پیچھے دوڑے اور نیچے سے گالیاں دینے لگے۔ باقی تین سواروں نے سمرکانت کو گھیر لیا اور ایک

نے ہنٹر نکال کر اوپر اٹھایا ہی تھا کہ یکایک چونک پڑا اور بولا "آپ ہیں سیٹھ جی! آپ یہاں کہاں ؟"

سیٹھ جی نے سلیم کو پہچان کر کہا "ہاں ہاں چلا دو ہنٹر رُک کیوں گئے اپنی کارگذاری دکھانے کا پھر ایسا موقع کہاں ملے گا۔ امیروں پر تو ہنٹر چلا ہی نہیں سکتے غریبوں پر بھی نہ چلاؤ تو چلاؤ کس پر"

سلیم نے شرمندہ ہو کر کہا "آپ لونڈوں کی شرارتیں دیکھ رہے ہیں پھر بھی مجھ ہی کو تصور وار ٹھہراتے ہیں۔ شیطان نے ایسا پتھر مارا کہ ان داروغہ جی کی پگڑی گر گئی۔ خیریت یہ ہوئی کہ آنکھ بچ گئی۔"

سمرکانت اشتعال سے متجاوز ہو کر بولے "ٹھیک تو ہے جب اس لونڈے نے پتھر چلایا جو ابھی نادان ہے تو پھر ہمارے حاکم صاحب جو عالم ہیں کیا ہنٹر بھی نہ چلاویں۔ کہدو دونوں سوار درخت پر چڑھ جائیں اور لونڈے کو نیچے ڈھکیل دیں۔ مر جائے گا تو کیا ہوا حاکم سے بے ادبی کرنے کی سزا تو پا جائیگا"

سلیم نے اپنی صفائی پیش کی "آپ تو ابھی آئے ہیں آپ کو کیا معلوم کہ یہاں کے لوگ کتنے مفسد ہیں۔ ایک بڑھیا نے تو میرے منہ پر تھوک دیا۔ میں نے ضبط کیا ورنہ سارا گاؤں جیل میں ہوتا"

سمرکانت نے یہ چوٹ کھا کر بھی ہار نہ مانی۔ بولے "تمہارے ضبط کی بانگی دیکھے آرہا ہوں بیٹا! اب منہ نہ کھلواؤ۔ وہ اگر جاہل بے سمجھ عورت تھی تو تمہیں نے عالم فاضل ہو کر کون سی شرافت کی۔ اس کا سارا جسم لہو لہان ہو رہا ہے شاید بچے کی بھی نہیں۔ کچھ یاد ہے کتنے آدمیوں کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے۔ سب تمہارے نام کو دعائیں دے رہے ہیں۔ اگر ان سے روپے وصول ہوتے تھے تو بے دخلی جاری کرتے۔ فصل قرق کرا لیتے۔ مار پیٹ کا قانون کہاں سے لائے؟

"بیدخلی سے کیا نتیجہ، زمین کا یہاں کون خریدار ہے، آخر سرکاری رقم کیسے وصول کیجائے؟"

"تو مار ڈالو۔ سارے گاؤں کو، دیکھو کتنے روپئے وصول ہوتے ہیں تم سے مجھے ایسی امید نہ تھی۔ مگر شاید حکومت میں کچھ نشہ ہوتا ہے۔"

"آپ نے ابھی ان لوگوں کی بدمعاشی نہیں دیکھی۔ میرے ساتھ آئیے تو میں ساری داستان سناؤں۔ اس وقت آ کہاں سے رہے ہیں؟"

سمرکانت نے اپنے لکھنؤ آنے اور سکھدا سے ملنے کا حال کہا۔ پھر مطلب کی بات چھڑی۔ "امر تو یہیں ہوگا؟ سنا سی۔ ٹی۔ کلاس میں رکھا گیا ہے۔"

اندھیرا زیادہ زیادہ ہو گیا تھا، کچھ سردی بھی پڑنے لگی تھی۔ چار سوار تو گاؤں کی طرف چلے گئے۔ سلیم گھوڑے کی راس تھامے ہوئے پاؤں پاؤں سمرکانت کے ساتھ ڈاک بنگلے چلا۔

کچھ دور چلنے کے بعد سمرکانت نے کہا "تم نے دوستی کا حق خوب ادا کیا امر کو جیل بھیجدیا اچھا کیا۔ مگر کم سے کم اُسے کوئی اچھا درجہ تو دلا دیتے۔ لیکن حاکم ٹھہرے، دوست کی سفارش کیسے کرتے؟"

سلیم نے رنجیدہ ہو کر کہا۔ "آپ تو سیٹھ جی مجھ ہی پر سارا غصہ اتار رہے ہیں۔ میں نے تو کوشش کر کے دوسرا درجہ دلا دیا تھا مگر وہ خود معمولی قیدیوں کے ساتھ رہنے پر ضد کرنے لگے تو میں کیا کرتا۔ میری بدنصیبی ہے کہ یہاں آتے ہی آتے مجھے وہ سب کچھ کرنا پڑا جس سے نفرت تھی۔"

ڈاک بنگلے پر پہنچ کر سیٹھ جی ایک آرام کرسی پر لیٹ گئے اور بولے "تو میرا آنا بیکار ہوا۔ ان سے ملاقات تو ہو ہی جائے گی؟"

سلیم نے جواب دیا: "میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔ ملاقات کی تاریخ تو

ابھی نہیں آئی ہے مگر جیل والے شاید مان جائیں۔ ہاں اندیشہ امرکانت کی طرف سے ہے۔ وہ کسی قسم کی رعایت نہیں چاہتے۔"

پھر اس نے ذرا مسکرا کر کہا "اب آپ کو بھی ان کاموں میں دلچسپی پیدا ہو گئی"

سیٹھ جی نے انکسار کے ساتھ کہا "اب میں اس عمر میں کیا کروں گا۔ بوڑھے دل میں جوانی کا جوش کہاں سے آئے، بہو جیل میں ہے، لڑکا جیل میں ہے شاید لڑکی بھی جیل کی تیاری کر رہی ہے اور میں چین سے کھاتا پیتا ہوں اور آرام سے سوتا ہوں میری اولاد میرے گناہوں کا کفارہ کر رہی ہے۔ میں نے غریبوں کا کتنا خون چوسا ہے، کتنے گھر تباہ کئے ہیں اس کی یاد کر کے خود شرمندہ ہو جاتا ہوں۔ اگر جوانی میں سمجھ آ گئی ہوتی تو اپنی اصلاح کرتا اب کیا کروں گا۔ باپ اپنی اولاد کا رہنما ہوتا ہے اسی کے پیچھے اس کے لڑکے چلتے ہیں۔ مجھے اپنے لڑکوں کے پیچھے چلنا پڑا۔ میں مذہب کی اصلیت کو نہ سمجھ کر مذہب کے سوانگ کو مذہب سمجھے ہوئے تھا۔ وہی میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا کینڈا ہی بگڑا ہوا ہے۔ جب تک ہمیں جائداد پیدا کرنے کی دھن رہے گی۔ ہم مذہب سے کوسوں دور رہیں گے۔ ایشور نے دنیا کو کیوں اس ڈھنگ پر لگایا یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

سلیم ایسے مسئلوں میں سر نہ کھپانا چاہتا تھا۔ جب وہ بھی ان کی طرح زندگی سے سیر ہو جائے گا تو مرتے وقت مذہب اور خدا کی یاد میں محو ہو جائے گا۔

دونوں آدمی کئی منٹ تک خاموش بیٹھے رہے۔ تب لالہ جی محبت آمیز لہجے میں بولے۔ "نوکر ہو جانے پر آدمی کو مالک کا حکم ماننا ہی پڑتا ہے اس کی میں برائی نہیں کرتا۔ ہاں ایک بات میں کہوں گا۔ جن پر تم نے ظلم کیا ہے چل کر ان کے آنسو پونچھ دو۔ تم ان غریب آدمیوں کو تھوڑی سی شرافت سے اپنا غلام بنا سکتے ہو۔ سرکار کا آئین

حکومت تو تم نہیں بدل سکتے۔ لیکن اتنا تو کر ہی سکتے ہو کہ کسی پر بیجا سختی نہ کرو۔"

سلیم نے شرماتے ہوئے کہا۔ "لوگوں کی گستاخی پر غصہ آجاتا ہے۔ ورنہ میں خود نہیں چاہتا کہ کسی پر سختی کروں۔ پھر بھی میرے سر پر کتنی بڑی ذمہ داری ہے۔ لگان وصول نہ ہوا تو میں کتنا نالائق سمجھا جاؤں گا۔"

سمرکانت نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ "تو بیٹا لگان وصول نہ ہوگا۔ ہاں آدمیوں کے خون سے ہاتھ رنگ سکتے ہو۔"

"یہی تو دیکھنا ہے۔"

"دیکھ لینا میں نے بھی اسی دنیا میں بال سفید کئے ہیں۔ کسان افسروں کی صورت سے کانپتے تھے۔ لیکن زمانہ بدل رہا ہے۔ اب انھیں بھی اپنی عزت آبرو کا خیال ہوتا ہے۔ تم مفت میں بدنامی اٹھا رہے ہو۔"

"اپنا فرض ادا کرنا بدنامی ہے تو مجھے اس کی پروا نہیں۔"

سمرکانت نے اس حاکمانہ غرور پر دل میں ہنس کر کہا۔ "فرض میں تھوڑی سی مٹھاس ملا دینے سے کسی کا کچھ نہیں بگڑتا۔ ہاں بن بہت کچھ جاتا ہے۔ یہ بیچارے کسان اتنے غریب ہیں کہ تھوڑی سی ہمدردی کرکے انھیں اپنا غلام بنا سکتے ہو حکومت تو بہت جھیل چکے اب انسانیت کا برتاؤ چاہتے ہیں۔ جس عورت کو تم نے ہنٹروں سے مارا اُسے ایک بار ماتا کہہ کر تم اس کی گردن کاٹ سکتے تھے یہ سمجھتے ہی کیوں ہو کہ ان پر حکومت کرنے آئے ہو۔ یہ سمجھو کہ تمھیں ان کی خدمت کرنے کا موقع ملا ہے۔ مان لیا تمھیں تنخواہ سرکار سے ملتی ہے۔ لیکن آتی تو ہے انھیں کی گرہ سے۔ کوئی جاہل ہو تو اُسے سمجھاؤں۔ تم خدا کے فضل سے خود ہی پڑھے لکھے آدمی ہو تمھیں کیا سمجھاؤں۔ تم پولیس والوں کی باتوں میں آگئے۔ یہی بات ہے نا؟"

سلیم بھلا یہ کیسے تسلیم کرتا۔

لیکن سرکانت اڑے رہے"۔ میں یہ مانتا ہوں کہ تم کسی سے نذر نیاز نہیں لینا چاہتے۔ تم نے جو کچھ کیا ضرورت سے مجبور ہو کر کیا۔ لیکن جن لوگوں کی روٹیاں نوچ کھسوٹ پر چلتی ہیں انھوں نے ضرور تھیں بھرا ہوگا۔ تمہارا چہرہ کہے دیتا ہے کہ تمھیں اپنے طرز عمل پر افسوس ہو رہا ہے۔ جو بھوکوں مرتے ہیں، چیتھڑے پہن کر اور پوال میں سو کر دن کاٹتے ہیں ان پر تمھیں غصہ آیا ہی کیوں کر، جب ہم اور تم دو چار گھنٹے آرام سے کام کر کے عیش کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ جو لوگ بال بچوں سمیت اٹھارہ گھنٹے کام کریں وہ روئی کپڑے کو ترسیں بیچارے غریب ہیں، بے زبان ہیں، غیر منظم ہیں۔ اسی لئے چھوٹے بڑے سبھی ان پر رعب جماتے ہیں۔ مگر تم جیسے روشن خیال اور تعلیم یافتہ لوگ بھی وہی کرنے لگیں جو معمولی عملے کرتے ہیں تو افسوس ہوتا ہے۔ اپنے ساتھ کسی کو مت لو میرے ساتھ چلو میں ذمہ لیتا ہوں کہ کوئی تمھارے ساتھ گستاخی نہ کرے گا۔ میں تمھیں دکھا دوں گا کہ وہ کتنے حلیم اور فرمانبردار ہیں۔ میں اتنا ہی چاہتا ہوں کہ تم ان کے زخم پر مرہم رکھ دو"

سلیم کا دل ابھی اتنا سیاہ نہ ہوا تھا کہ اس پر دوسرا کوئی رنگ ہی نہ چڑھتا خفت آمیز لہجے میں بولا "لیکن میری وکالت آپ ہی کو کرنی پڑے گی"

"ہاں ہاں یہ سب میں کر دوں گا۔ لیکن ایسا نہ ہو میں یہاں سے ادھر چلوں ادھر تم ہنٹر بازی شروع کرو"

"اب زیادہ شرمندہ نہ کیجئے"

"تم یہ تجویز کیوں نہیں کرتے کہ علاقے کی حالت کی جانچ کیجائے۔ آنکھیں بند کر کے حکم ماننا تمہارا کام نہیں۔ پہلے اپنا اطمینان تو کر لو کہ تم سے جو کچھ کرنے کو کہا جاتا ہے وہ اخلاقاً مناسب بھی ہے یا نہیں۔ تم خود ایسی رپورٹ کیوں نہیں کرتے ممکن ہے حکام اسے پسند نہ کریں لیکن حق کے لئے کچھ نقصان بھی اٹھانا پڑے

تو کیا غم"

سلیم کا دل ان الفاظ سے بالکل غیر متاثر نہ رہ سکا۔ کھونٹے کی پتلی نوک زمین کے اندر پہنچ چکی تھی بولا۔ "اس بزرگانہ فہمائش کے لئے میں آپ کا احسان مند ہوں اور اس پر عمل کرنے کے لئے کوشش کروں گا۔"

کھانے کا وقت آگیا تھا سلیم نے پوچھا "آپ کے لئے کیا بنواؤں؟"

"جو چاہے بنواؤ مگر اتنا یاد رکھو کہ میں ہندو ہوں اور پرہ آدمی ہوں۔ ابھی تک چھوت چھات مانتا جاتا ہوں۔"

"آپ چھوت چھات کو اچھا سمجھتے ہیں؟"

"اچھا تو نہیں سمجھتا مگر مانتا ہوں۔"

"کیوں مانتے ہیں؟"

"اس لئے کہ اسی میں میری پرورش ہوئی ہے۔ اگر ضرورت پڑے تو میں تمہارا پاخانہ اٹھا کر پھینکدوں گا لیکن تمہاری تھالی میں کھا نہیں سکتا۔"

"میں تو آپ کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلاؤں گا۔"

"تم پیاز، گوشت انڈے کھاتے ہو۔ مجھے ان کی بو سے نفرت ہے۔"

"آپ یہ سب کچھ نہ کھائیے گا مگر میرے ساتھ بیٹھنا پڑے گا۔"

"روز اشنان کرتے ہو یا نہیں!"

"روز صابن لگا کر نہاتا ہوں۔"

"برتنوں کو خوب صاف کرا لینا۔"

"ہاں ہاں برتنوں کو صاف کرالوں گا۔ برہمن سے پکوا بھی دوں گا۔ بس ایک میز پر بیٹھ کر کھانا ہوگا۔"

"اچھا کھالوں گا بھائی تمہاری خاطر سہی۔"

سیٹھ جی تو سندھیا کرنے بیٹھے۔ ادھر ایک کانسٹبل نے سیٹھ جی کے لئے پوری کچوری، حلوا، کھیر پکائی۔ دہی پہلے ہی سے رکھا ہوا تھا۔ سلیم آج خود بن کھانا کھائے گا۔

سیٹھ جی سندھیا کرکے لوٹے تو دیکھا۔ دو کمبل بچھے ہوئے ہیں۔ اور دو تھالیاں رکھی ہوئی ہیں۔ خوش ہو کر بولے "یہ تم نے بہت اچھا انتظام کیا"

سلیم نے ہنس کر کہا "میں نے سوچا آپ کا دھرم کیوں لوں۔ نہیں ایک ہی کمبل رکھتا"

"اگر یہ خیال ہے تو میرے کمبل پر آجاؤ۔ نہیں میں ہی آتا ہوں"

وہ تھالی اٹھا کر سلیم کے کمبل پر آبیٹھے۔ اپنے خیال میں انھوں نے آج اپنی زندگی کا سب سے بڑا معرکہ جیتا۔ اپنی ساری دولت خیرات کر کے بھی انھیں اتنی پرغرور مسرت نہ حاصل ہوئی۔

سلیم نے چٹکی لی۔ "اب تو آپ مسلمان ہو گئے"

سیٹھ جی۔ "میں مسلمان نہیں ہوا تم ہندو ہو گئے"

(۴)

علی الصباح سمرکانت اور سلیم ڈاک بنگلے سے گاؤں کی طرف چلے پہاڑیوں سے نیلی بھاپ اٹھ رہی تھی اور آسمان کا دل گویا کسی موہوم درد سے بھاری ہو رہا تھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ زمین کسی مریض کی طرح کہر کے نیچے پڑی ہوئی سسک رہی تھی۔ کچھ لوگ بندروں کی طرح چھپروں پر بیٹھے اس کی مرمت کر رہے تھے۔ اور کچھ دروازوں پر بیٹھے دھوپ کھا رہے تھے۔ دونوں آدمی پہلے سلونی کے گھر گئے۔

سلونی کو بخار چڑھا ہوا تھا اور سارا جسم پھوڑے کی طرح درد کر رہا تھا۔ مگر اسے گانے کی دھن سوار تھی۔

سنتو دیکھت جگ بورانا
سانچ کہو تو مارن دھاوے، جھوٹ جگت پتیانا
سنتو دیکھت من بورانا

درد دل جب ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ جب وہ نالہ و فغاں کی گود میں بھی پناہ نہیں پاتا، تب وہ نغمے کی گود میں جا بیٹھتا ہے۔

سمرکانت نے پکارا "بھابی ذرا باہر تو آؤ۔"

سلونی چٹ پٹ اٹھ کر پکے بالوں کو گھونگھٹ سے چھپاتی دوشیزہ کی طرح شرماتی آکر کھڑی ہو گئی اور پوچھا "تم کہاں چلے گئے تھے دیورجی؟"

دفعتاً سلیم کو دیکھ کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور جیسے اسے گالی دی "یہ تو حاکم ہے۔"

پھر شیرنی کی طرح جھپٹ کر اس نے سلیم کو ایسا دھکا دیا کہ وہ گرتے گرتے بچا اور جب تک سمرکانت اسے ہٹاویں ہٹاویں سلیم کی گردن پکڑ کر اتنی زور سے دبائی گویا گلا گھونٹ دے گی۔

سیٹھ جی نے اسے پوری طاقت سے ہٹا کر کہا "پاگل ہو گئی ہے کیا بھابی۔ الگ ہٹ جا سنتی نہیں۔"

سلونی نے پھٹی پھٹی انگارے کی سی آنکھوں سے سلیم کو گھورتے ہوئے کہا "تار تو دکھا دوں۔ آج میرا سردار آ گیا ہے۔ سر کچل کر رکھ دے گا۔"

سمرکانت نے ملامت آمیز لہجے میں کہا "سردار کے منہ میں کالک لگا رہی ہو اور کیا۔ بوڑھی ہو گئی، مرنے کے دن آ گئے اور عقل نہ آئی۔ یہی تمہارا

کام ہے کہ کوئی حاکم دروازے پر آئے تو اس کی گردن پر چڑھ بیٹھو۔"
سلونی نے دل میں کہا۔ یہ لالہ بھی ٹھکر سہانی کہتے ہیں! لڑکا پکڑ گیا ہے نا اسی سے کھسیا کر بولی۔ "پوچھو اس نے سب کو پٹا ہے یا نہیں؟"
سیٹھ جی بگڑ کر بولے "تم حاکم ہوتیں اور گاؤں والے تمھیں دیکھتے ہی لاٹھیاں لے کر نکل آتے تو تم کیا کرتیں؟ جب رعیت لڑنے پر تیار ہو جائے تو حاکم کیا اس کی پوجا کرے۔ امر ہوتا تو وہ لاٹھی لے کر نہ دوڑتا۔ گاؤں والوں کو لازم تھا کہ حاکم کے پاس آکر اپنا اپنا حال کہتے۔ ادب کے ساتھ عرض معروض کرتے۔ یہ نہیں کہ حاکم کو دیکھا اور مارنے دوڑے۔ گویا وہ تمھارا دشمن ہے میں انھیں سمجھا بجھا کر لایا تھا کہ میل کرا دوں۔ دلوں کی صفائی ہو جائے۔ اور تم ان سے لڑنے پر تیار ہو گئیں۔"
یہاں کی ہل چل سن کر گاؤں کے اور کتنے ہی آدمی جمع ہو گئے مگر کسی نے سلیم کو سلام نہیں کیا۔ سبھوں کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں۔
سمر کانت نے انھیں مخاطب کر کے کہا "میں تمھیں لوگوں سے پوچھتا ہوں۔ یہ صاحب تمھارے حاکم ہیں کہ نہیں؟ جب رعایا حاکم کے ساتھ گستاخی کرتی ہے تو حاکم کو بھی غصہ آجائے تو کوئی تعجب ہے؟ یہ بیچارے تو اپنے کو حاکم سمجھتے ہی نہیں۔ لیکن عزت تو سبھی رکھتے ہیں، حاکم ہو یا نہ ہو۔ کوئی بھلا آدمی اپنی بے عزتی نہیں دیکھ سکتا۔ بولو۔ گوڈر میں کچھ غلط کہتا ہوں؟"
گوڈر نے سر جھکا کر کہا "نہیں مالک سچی کہتے ہو۔ مگر وہ تو باولی ہے اس کی کسی بات کا برا نہ مانو۔ سب کے منہ میں کالکھ لگا رہی ہے اور کیا۔"
سمر کانت نے پھر کہا "یہ ہمارے لڑکے کے برابر ہیں۔ امر کے ساتھ پڑھے انھیں کے ساتھ کھیلے۔ تم نے اپنی آنکھوں دیکھ کر امر کو گرفتار کرنے یہ اکیلے ہی

آئے تھے۔ کیا پولیس کو بھیج کر نہ پکڑوا سکتے تھے۔ سپاہی حکم پاتے ہی آتے اور اُسے دھکے دے کر پکڑ لے جاتے۔ ان کی شرافت تھی کہ خود آئے اور کسی پولیس کو ساتھ نہ لائے۔ امر نے بھی وہی کیا جو واجب تھا۔ اکیلے آدمی کو بے عزت کرنا مشکل تھا۔ اب تک جو کچھ ہوا اس کا انھیں رنج ہے۔ حالانکہ قصور تم لوگوں کا زیادہ تھا۔ خیر اب ان پچھلی باتوں کو بھول جاؤ۔ ان کی طرف سے اب کسی قسم کی سختی نہ ہوگی۔ انھیں اگر تمھاری جائداد نیلام کرنے کا حکم ملے گا۔ نیلام کریں گے گرفتار کرنے کا حکم ملے گا گرفتار کریں گے تمھیں برا نہ لگنا چاہیئے۔ تم دھرم کی لڑائی لڑ رہے ہو۔ لڑائی نہیں یہ تپسیا ہے۔ تپسیا میں غصہ اور نفرت آجائے تو تپسیا ٹوٹ جاتی ہے۔"

سوامی آتمانند بولے "دھرم کی حفاظت ایک طرف سے نہیں ہوتی، سرکار قانون بناتی ہے، قانون کی حفاظت کرنا اس کا کام ہے۔ جب اس کے اہل کار ہی قانون کو پیروں سے کچلتے ہیں تو پھر رعایا کیسے ان کے قانون کی پابندی کر سکتی ہے۔"

سمر کانت نے پھٹکار بتلائی "آپ سنیاسی ہو کر ایسا کہتے ہیں۔ سوامی جی۔ آپ کو اپنی روحانیت سے اپنے حاکموں کو راہ راست پر لانا ہے۔ اگر وہ حق پر ہوتے تو آپ کو یہ تپسیا کیوں کرنی پڑتی۔ آپ ظلم پر ظلم سے نہیں، پریم سے فتح پا سکتے ہیں۔"

سوامی جی کا منہ ذرا سا نکل آیا۔ زبان بند ہوگئی۔

سلونی کا مجروح دل کسی چڑیا کی طرح پنجرے سے نکل کر بھی کوئی مامن تلاش کر رہا تھا۔ یہ شرافت اور درد سے بھری ہوئی تقریر گویا اس کے روبرو دانہ بکھیرنے لگی۔ طائر نے دو چار بار گردن جھکا کر دانوں کو چوگنی آنکھوں سے دیکھا پھر اپنے

محافظ کو آ آ کہتے سنا اور پیر پھیلا کر رانوں پر اتر آیا۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھرے دونوں ہاتھ جوڑے بولی "سرکار مجھ سے بڑی کھتا ہوگئی، مجھے جو سجا چاہے دیدیجئے"

سیٹھ جی نے ٹوکا "سرکار نہیں، بیٹا کہو۔"

"بیٹا مجھ سے بڑی کھتا ہوئی، مورکھ ہوں، باولی ہوں۔ جو سجا چاہے دو"

سلیم کی نوجوان آنکھیں بھی پرآب ہوگئیں۔ اختیار کا غرور اور حکومت کا نشہ اتر گیا۔ بولا۔ "ماتا جی مجھے شرمندہ نہ کرو۔ یہاں جتنے لوگ کھڑے ہیں ان سب سے اور جو یہاں نہیں ہیں ان سے بھی اپنی خطاؤں کی معافی چاہتا ہوں"

گوڈر ہاتھ باندھ کر بولے "ہم تمہارے گلام ہیں بھیا، آدمی پہچانتے تو یہ نوبت کیوں آتی"

سوامی نے سمرکانت کے کان میں کہا۔ "مجھے تو ایسا جان پڑتا ہے کہ دغا کرے گا"

سیٹھ جی نے کہا "کبھی نہیں۔ نوکری چاہے چلی جائے مگر تمہیں ستائے گا نہیں۔ شریف آدمی ہے"

سوامی ہٹے تو سلیم نے آکر سیٹھ جی کے کان میں کچھ کہا۔

سیٹھ جی گاؤں والوں سے مسکرا کر بولے "جنٹ صاحب تم لوگوں کی دوا دارو کے لئے سو روپیہ دان دے رہے ہیں۔ میں اپنی طرف سے نوسو اور ملائے دیتا ہوں۔ اس سے لوگوں کی مرہم پٹی کیجئے"

گوڈر نے شکریہ ادا کرنا چاہا مگر الفاظ نہ ملے۔

سمرکانت نے کہا "یہ نہ سمجھو یہ روپئے میرے ہیں۔ میں اپنے باپ کے گھر سے نہیں لایا۔ تمہیں سے تمہارا ہی گلا دبا کر لے تھے وہ تمہیں لوٹا رہا ہوں

گاؤں میں جہاں سناٹا سا چھایا ہوا تھا وہاں رونق نظر آنے لگی۔ جیسے مسرت

ہوا میں کھل گئی ہو۔"

(۵)

امرکانت کو جیل میں کسی نہ کسی طرح روزانہ خبریں مل جاتی تھیں۔ جس دن مار پیٹ اور آتش زنی کی خبر ملی۔ اسے روحانی صدمہ ہوا۔ لوگوں کے رونے پیٹنے کی پر درد ہائے ہائے جیسے مجسم ہو کر اس کے سامنے سر پیٹ رہی تھی۔ جلتے ہوئے گھروں کی لپٹیں گویا اُسے جھلسائے ڈالتی تھیں۔ تخیل نے اس حادثے کو اور بھی خوفناک صورت میں پیش کر کے اُسے اور بھی متوحش کر دیا تھا۔ اور اس کی ذمہ داری کس پر تھی؟ روپئے تو یوں بھی وصول کئے جاتے۔ مگر اتنا ظلم تو نہ ہوتا۔ کچھ رعایت تو کیجاتی۔ اب اس فساد کے بعد سرکار سے کسی نرمی یا رعایت کی توقع رکھنا عبث تھا۔

ان خیالات سے تنگ آکر اس نے بالآخر توکل کی پناہ لی۔ ظلم ہو رہا ہے ہونے دو۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں کون ہوں؟ کمزوروں کی تقدیر میں مار کھانا لکھا ہے۔ مار کھائیں گے۔ میں ہی یہاں کیا پھولوں کی سیج پر سویا ہوا ہوں جو کچھ ہوگا ہوگا۔ یہ بھی ایشور کی لیلا ہے۔ واہ ری تیری لیلا۔ اگر تمھیں ایسی ہی لیلاؤں میں مزہ آتا ہے تو تم رحیم کیوں بنتے ہو۔ زبردست کا ٹھینگا سر پر۔ کیا یہ بھی کوئی خدائی قانون ہے۔

وہ منکر نہ تھا لیکن یہاں اس کی عقل کام نہ کرتی تھی۔ اسے ساری کائنات درہم برہم نظر آتی تھی جس میں کسی نظام کا پتہ نہ تھا۔ ایسے نظام کو وہ خدا سے منسوب نہ کر سکتا تھا۔

اس نے بان بٹنا شروع کیا۔ لیکن آنکھوں کے سامنے وہی تماشا ہو رہا

تھا۔ وہی سلونی ہے، سر کے بال کھلے ہوئے، نیم برہنہ، مار پڑ رہی ہے۔ اس کے رونے کی دردناک صدا کانوں میں آنے لگی۔ پھر منی کی تصویر سامنے آ کھڑی ہوئی اُسے سپاہیوں نے گرفتار کر لیا ہے اور کھینچے لئے جا رہے ہیں۔ امر کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ہیں ہیں یہ کیا کرتے ہو؟ پھر وہ چونک پڑا اور بان بٹنے لگا۔

رات کو بھی وہی نظارے آنکھوں میں پھرا کرتے۔ وہی صدائیں کانوں میں گونجا کرتیں۔ ساری تباہی کا بار اپنے سر پر لے کر وہ اس کے نیچے دبا جا رہا تھا۔ اس بوجھ سے سبکدوش ہونے کے لئے اس کے پاس کوئی تدبیر نہ تھی۔ ایشور سے منحرف ہو کر اس نے گویا کشتی کو ترک کر دیا تھا اور اتھاہ پانی میں ڈوبا جا رہا تھا۔ امر وہی اسے کسی تنکے کا سہارا نہ لینے دیتی تھی۔ وہ کدھر جا رہا ہے اور اپنے ساتھ لاکھوں مظلوموں کو کدھر لئے جا رہا ہے؟ اور اس کا انجام کیا ہوگا۔ اس ابر سیاہ میں کہیں چاندی کی چھالر بھی ہے؟ وہ چاہتا تھا کہیں سے آواز آئے "بڑھے آؤ، بڑھے، یہی سیدھا راستہ ہے۔" مگر چاروں طرف بے جان خاموشی طاری تھی۔ یہیں سے کوئی آواز نہیں آئی، کوئی روشنی کی جھلک نہیں ملتی۔ جب وہ خود اندھیرے میں پڑا ہوا ہے، خود نہیں جانتا کہ آگے جنت کا ٹھنڈا سایہ ہے یا جہنم کے خوفناک شعلے۔ تو اسے کیا حق ہے کہ اتنے آدمیوں کی جان آفت میں ڈالے۔ اسی روحانی خلجان کی حالت میں اس کے دل سے نکلا۔ ایشور مجھے روشنی دو۔ مجھے اپنے قدموں میں جگہ دو اور وہ رونے لگا۔

صبح کا وقت تھا، قیدیوں کی حاضری ہو گئی تھی۔ امر کو کچھ سکون ہو گیا تھا وہ طوفان فرو ہو گیا تھا اور آسمان میں چھائی ہوئی گرد بیٹھ گئی تھی۔ چیزیں صاف صاف نظر آنے لگی تھیں۔ امر بیٹھا ہوا دل میں پچھلے واقعات کا تبصرہ کر رہا تھا

جب تک نینا کا خط اُسے نہ ملا تھا۔ اس کا طرزِ عمل کچھ اور ہی تھا۔ سکھدا کی گرفتاری کی خبر پاتے ہی جیسے اس کی کایا پلٹ ہو گئی۔ اب اُسے معلوم ہوا کہ اس کا وہ فعل حرصِ شہرت کا، ذاتی رقابت کا، خدمت کے پردے میں چھپی ہوئی خودی کا جلوہ تھا۔ یہ بات ایک نئی حقیقت کی طرح اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

امر کے قریب ایک قیدی بیٹھا ہوا بان بٹ رہا تھا۔ امر نے پوچھا "تم کیسے آئے بھائی؟"

اُس نے تعجب سے دیکھ کر پوچھا۔ "پہلے تم بتاؤ؟"

"مجھے تو نام کی دھن تھی۔"

"مجھے دولت کی دھن تھی۔"

اسی وقت جیلر نے آ کر امر سے کہا۔ "تمھارا تبادلہ لکھنؤ ہو گیا ہے۔ تمھارے باپ آئے تھے۔ تم سے ملنا چاہتے تھے۔ تمھاری ملاقات کی تاریخ نہ تھی صاحب نے انکار کر دیا۔"

امر کو حیرت ہوئی۔ "میرے باپ یہاں آئے تھے؟"

"ہاں ہاں، اس میں تعجب کی کیا بات ہے، مسٹر سلیم بھی ان کے ساتھ تھے۔"

"علاقے کی کچھ نئی خبر؟"

"تمھارے باپ نے شاید سلیم صاحب کو سمجھا کر گاؤں والوں سے ان کا میل کرا دیا ہے۔ بڈھا شریف آدمی ہے۔ گاؤں والوں کے علاج معالجے کے لئے اپنے پاس سے ایک ہزار روپے دیدئے۔"

امر مسکرایا۔

"انھیں کی کوشش سے تمھارا تبادلہ ہو رہا ہے۔ لکھنؤ میں تمھاری بیوی بھی آ گئی ہے، شاید انھیں چھ مہینے کی سزا ہو گئی ہے۔"

امر کھڑا ہو گیا "سکھدا ابھی لکھنؤ میں ہے؟"

"اسی لئے تو وہاں تمہارا تبادلہ ہو رہا ہے۔"

امر کو اپنا دل ایک روحانی فضا میں اڑتا ہوا معلوم ہوا۔ وہ مایوسی کہاں گئی، وہ کمزوری کہاں ہے۔

وہ پھر بیٹھ کر بان بٹنے لگا۔ اس کے ہاتھوں میں آج غضب کی پھرتی ہے۔ ایسی کایا پلٹ، کیا اب بھی ایشور کے رحیم ہونے میں کوئی شک ہو سکتا ہے۔ اُس نے کانٹے ہی تو بوئے تھے وہ سب پھول ہو گئے۔

سکھدا آج جیل میں ہے! جو تکلفات اور نمائش پر جان دیتی تھی۔ وہ آج بیکسوں کی خدمت میں اپنی زندگی قربان کر رہی ہے! دادا جو پیسوں کو دانت سے پکڑتے تھے وہ آج دوسروں کی خدمت کر رہے ہیں! کوئی غیبی طاقت نہیں ہے تو یہ سب کچھ کس تحریک سے ہو رہا ہے!!

اس نے اپنے دل کی ساری عقیدت سے ایشور کے قدموں میں سر جھکایا وہ بوجھ جس سے وہ دبا جا رہا تھا اس کے سر سے اتر گیا تھا، اس کا جسم ہلکا تھا، دل ہلکا تھا اور آگے آنے والی اونچی چڑھائی گویا اس کا خیر مقدم کر رہی تھی

(۶)

امر کانت کو لکھنؤ جیل میں آئے آج تیسرا دن ہے۔ یہاں اسے چکی کا کام دیا گیا ہے۔ جیل کے اہلکاروں کو معلوم ہے وہ ایک متمول آدمی کا لڑکا ہے اس لئے اسے سخت محنت دے کر بھی اس کے ساتھ کچھ رعایت کیجاتی ہے۔

ایک چھپر کے نیچے چکیوں کی قطاریں لگی ہوئی ہیں۔ دو دو قیدی ہر ایک چکی کے پاس کھڑے آٹا پیس رہے ہیں۔ شام کو آٹے کی تول ہو گی جس کا آٹا

معین مقدار سے کم ہوگا اسے سزا دیجائے گی۔

امرکانت نے اپنے رفیق سے کہا۔ "ذرا ٹھہر جاؤ بھئی دم لے لوں میرے ہاتھ نہیں چلتے۔ کیا نام ہے تمہارا؟ میں نے شاید تمہیں کہیں دیکھا ہے۔ یہ رفیق گٹھیلا سیاہ، تندرو، سرخ چشم آدمی تھا۔ جو محنت سے تھکنا نہ جانتا تھا۔ مسکرا کر بولا میں وہی کالے خاں ہوں جو ایک بار چوری کے کپڑے لے کر تمہارے پاس بیچنے گیا تھا۔ یاد کرو۔ شام کو تم اپنی دوکان پر بیٹھے تھے اور لالہ جی کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ لیکن تم یہاں کیسے آپھنسے یہ تعجب ہو رہا ہے۔ برسوں ہی سے پوچھنا چاہتا تھا مگر ڈرتا کہ کہیں دھوکا نہ ہو رہا ہو۔"

امرکانت نے مختصراً اپنی داستان کہہ سنائی اور پوچھا "تم کیسے آئے؟"

کالیخاں ہنس کر بولا "میرا حال کیا پوچھتے ہو بھیّا۔ یہاں تو چھ مہینے باہر رہتے ہیں تو چھ سال اندر۔ اب تو یہی آرزو ہے کہ اللہ یہیں سے بلا لے۔ میرے لئے باہر رہنا ہی مصیبت ہے۔ سب کو اچھا اچھا کھاتے، اچھا اچھا پہنتے دیکھتا ہوں تو جلن ہوتی ہے مگر ملے کہاں سے۔ کوئی ہنر آتا نہیں۔ علم ہی نہیں۔ چوری نہ کروں ڈاکہ نہ ماروں تو کھاؤں کیا۔ یہاں نہ کسی کو اچھا کھاتے دیکھتا ہوں، نہ اچھا پہنتے اس لئے جلن بھی نہیں ہوتی۔ سب اپنے ہی جیسے ہیں۔ پھر حسد اور ڈاہ کیوں ہو اسی لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ یہیں سے بلا لے۔ چھوٹنے کی تمنا نہیں ہے۔ تمہارے ہاتھ دکھ گئے ہوں تو رہنے دو۔ میں اکیلا ہی پیس ڈالوں گا تمہیں ان لوگوں نے یہ کام دیا ہے کیوں؟ تمہارے بھائی بند تو ہم لوگوں سے الگ آرام سے رکھے جاتے ہیں۔ تمہیں یہاں کیوں ڈال دیا۔ چھوڑو میں ابھی بات کی بات میں اڑائے دیتا ہوں۔"

امر نے چکی کی مٹھیا زور سے پکڑتے ہوئے کہا "نہیں نہیں، میں تھکا نہیں

ہوں - دو چار دن میں عادت ہو جائے گی تو تمہارے برابر کام کر کے دکھا دوں گا۔"
کالے خاں نے اُسے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا "مگر یہ تو اچھا نہیں لگتا کہ تم میرے ساتھ چکی پیسو۔ تم نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ رعایا کے پیچھے سرکار سے لڑے ہو۔ میں تمہیں نہ پیسنے دوں گا۔ معلوم ہوتا ہے تمہاری خدمت کے لئے ہی اللہ نے مجھے یہاں بھیجا ہے وہ تو بڑا کارساز ہے۔ اُس کی قدرت کون سمجھ سکتا ہے۔ آپ ہی آدمی سے برائی کرواتا ہے، آپ ہی سزا دیتا ہے اور آپ ہی اسے معاف بھی کر دیتا ہے۔"

امر کانت نے اعتراض کیا "برائی خدا نہیں کرتا، ہم خود کرتے ہیں۔"

کالیخاں نے ایسی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا جو کہہ رہی تھیں تم ان رموز کو ابھی نہیں سمجھ سکتے۔ اور بولا۔ "تا میں یہ نہ مانوں گا۔ تم نے تو پڑھا ہوگا اس کے حکم کے بغیر پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ برائی کون کرے گا۔ سب کچھ وہی کرواتا ہے اور پھر معاف بھی کر دیتا ہے۔ ابھی میں یہ بات منہ سے کہہ رہا ہوں۔ جس دن میرے ایمان میں یہ بات جم جائے گی اسی دن برائی بند ہو جائے گی۔ تمہیں اس دن مجھے نصیحت دی تھی۔ میں تمہیں اپنا پیر سمجھتا ہوں۔ دو سو کی چیز تم نے بیس میں لی۔ اسی دن مجھے معلوم ہوا بدی کیا چیز ہے۔ اب سوچتا ہوں اللہ کو کیا منہ دکھاؤں گا زندگی میں اتنے گناہ کئے ہیں کہ جب اُن کی یاد آتی ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اب تو اسی کی رحیمی کا بھروسہ ہے۔ کیوں بھیا۔ تمہارے مذہب میں کیا لکھا ہے۔ اللہ گنہگاروں کو بخش دیتا ہے یا نہیں؟"

کالیخاں کا تند چہرہ اس گہری نورانی، ہمہ گیر عقیدت سے منور ہو گیا۔ آنکھوں میں روحانیت کا جلوہ چمک اٹھا۔ اور لہجہ اتنا معرفت خیز، اتنا معصوم، اور اتنا پاکیزہ تھا کہ امر کانت کا دل مسرت سے شگفتہ ہو گیا، بولا "سنتا تو ہوں خانصاحب کہ وہ بڑا رحیم ہے"

کالے خاں دوگنے جوش سے چکی گھماتا ہوا بولا "ہاں بھیا۔ بڑا رحیم ہے۔ ماں کے پیٹ میں بچے کو رزق پہنچاتا ہے۔ یہ دنیا ہی اس کی رحیمی کا آئینہ ہے۔ جدھر آنکھیں اٹھاؤ، اس کی رحیمی کے جلوے۔ اتنے خونی، ڈاکو، زناکار، یہاں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے لئے بھی رزق کا سامان مہیا کر دیتا ہے۔ موقعہ دیتا ہے، بار بار موقعہ دیتا ہے، کہ اب بھی سنبھل جاؤ۔ مگر آدمی کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔ جس دن اُسے غصہ آئیگا یہ دنیا جہنم میں چلی جائے گی۔ ہمارے تمھارے اوپر وہ کیا غصہ کرے گا۔ ہم چیونٹی کو پیروں تلے پڑتے دیکھ کر کنارے سے نکل جاتے ہیں۔ اُسے کچلنے رحم آتا ہے پھر جس اللہ نے ہم کو پیدا کیا، جو ہم کو پالتا ہے، وہ ہمارے اوپر کبھی اپنا قہر نازل کر سکتا ہے؟ کبھی نہیں۔ غصہ برابر والوں پر کیا جاتا ہے۔ ضعیفوں پر نہیں۔"

امرکانت کو اپنے دل میں معرفت کا ایک نغمہ سا گونجتا ہوا معلوم ہوا۔ اتنے کامل یقین اور طفلانہ عقیدت کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو کرتے اس نے کسی کو نہ سنا تھا بات وہی تھی جو وہ ہمیشہ چھوٹے بڑوں کے منہ سے سنا کرتا تھا۔ پر روحانی خلوص نے ان الفاظ میں ایک نئی جان ڈال دی تھی۔

ذرا دیر کے بعد کالیخاں نے پھر کہا "بھیا تم سے چکی چلوانا تو ویسا ہی ہے جیسے کوئی تلوار سے چڑیا کو حلال کرے۔ تمھیں اسپتال میں رکھنا چاہئے تھا جہاں تم مریضوں کو تسلی دیتے۔ بیماری میں دوا سے اتنا فائدہ نہیں ہوتا جتنا ہمدردی سے ہوتا ہے۔ میرے سامنے کتنے ہی قیدی بیمار ہو کر وہاں گئے۔ پر ایک بھی اچھا نہ ہوا۔ بات کیا ہے؟ دوا قیدی کے سر پر پٹک دی جاتی ہے۔ جیسے کتے کے سامنے ہڈی کا ٹکڑا پھینکدیا جائے۔ مریض ایسی دوا کھا کر اچھا ہونے سے مرجانا بہتر سمجھتا ہے۔ میں آج سپرنٹنڈنٹ سے کہوں گا کہ انھیں اسپتال میں رکھے۔ اگر وہ کہیں گے کہ تمھیں پورا آٹا دینا پڑے گا تو میں منظور کر لوں گا۔ اخا آٹا تو میں بائیں ہاتھ سے پیس سکتا ہوں بھیا۔

سچ کہتا ہوں۔

وہی اُچکا جسے امرکانت نے ایک دن سیہ کاریوں کی کیچڑ میں لوٹتے دیکھا تھا آج تقدس کے رتبہ پر پہنچ گیا تھا اس کی روح سے گویا ایک تجلی نکل کر امر کے باطن کو روشن کرنے لگی۔

اس نے کہا "لیکن یہ تو برا معلوم ہوتا ہے کہ تم بوڑھے ہو کر محنت کا کام کرو۔ اور میں جوان ہو کر اسپتال میں بیٹھوں"

کالے خاں ہنسا "اسپتال کے کام کو تم آسان سمجھتے ہو؟ وہ اس چکی سے کہیں جان لیوا ہے۔ میں راتوں کو مزے سے ٹانگ پھیلا کر سوؤں گا۔ تمھیں جاگ کر راتیں کاٹنی پڑیں گی۔ پتے کو اتنا مارنا پڑے گا کہ کوئی اللہ کا بندہ ہی مار سکتا ہے میں تو کسی مریض کی تیمارداری کرنے کے لائق ہی نہیں ہوں۔ جہاں اس نے دو ایک بار میری بات نہ مانی اور میں بگڑا۔ پھر اسپتال میں کبھی کبھی جان کا خطرہ بھی ہو جاتا ہے اس چکی میں کیا رکھا ہے۔ یہ کام تو گدھا بھی کر سکتا ہے۔ کل بھی کر سکتی ہے۔ لیکن جو کام تم کرو گے وہ فرشتے ہی کر سکتے ہیں"

سورج ڈوب رہا تھا۔ کالے خاں نے اپنے پورے گیہوں پیس ڈالے تھے اور دوسرے قیدیوں کے پاس جا جا کر دیکھ رہا تھا کس کا کتنا کام باقی ہے۔ کئی قیدیوں کے گیہوں ابھی ختم نہ ہوئے تھے جیل کا ملازم آٹا تولنے آ رہا ہوگا۔ ان بیچاروں پر آفت آ جائے گی۔ مار پڑنے لگے گی۔ کالے خاں نے قیدیوں کی مدد کرنی شروع کی۔ اس کی پھرتی اور محنت پر لوگوں کو حیرت ہو رہی تھی۔ آدھ گھنٹے میں اس نے سارے پھسڈیوں کی کمی پوری کر دی۔ امرکانت اپنی چکی کے پاس کھڑا خدمت کے اس پتلے کو عقیدتمندانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا گویا کسی دیوتا کے درشن کر رہا ہو

کالیخاں اُدھر سے فرصت پا کر نماز پڑھنے لگا۔ وہیں کل کے نیچے اس نے

وضو کیا اور چھپر کے نیچے کمبل بچھا کر نماز شروع کی۔ اسی وقت نائب داروغہ چار وارڈروں کے ساتھ آٹا تلوانے آ پہنچا۔ قیدیوں نے اپنا اپنا آٹا بوریوں میں بھرا اور ترازو کے پاس لا کر تلوانے لگے۔

نائب نے امر سے پوچھا "تمہارا جوڑی دار کہاں گیا؟"

امر نے بتلایا نماز پڑھ رہا ہے۔

"اسے بلاؤ۔ پہلے آٹا تلوائے۔ پھر نماز پڑھے۔ بڑا نمازی کی دم بنا ہے۔ کہاں گیا ہے نماز پڑھنے؟"

امر نے شیڈ کے پیچھے کی طرف اشارہ کر کے کہا "آپ انھیں نماز پڑھنے دیں میں تو آٹا تلوانے کے لیے حاضر ہوں۔"

نائب جیلر کو کب یہ گوارا ہو سکتا تھا کہ کوئی قیدی اس وقت نماز پڑھے جب جیل کا خداوند ہو۔ شیڈ کے پیچھے جا کر بولے "اے او نمازی کے بچے، آٹا کیوں نہیں تلواتا۔ بچا گیہوں چبا گئے ہو تو نماز کا بہانہ کرنے لگے۔ چل جھٹ پٹ ورنہ مارے ہنٹروں کے کھال اُدھیڑ دوں گا۔"

کالے خاں دوسری ہی دنیا میں تھا۔

نائب نے قریب جا کر اپنی چھڑی اس کی پیٹھ میں کونچتے ہوئے کہا۔ بہرا ہو گیا ہے کیا بے۔ شامت تو نہیں آئی ہے۔"

کالے خاں نماز پڑھنے میں محو تھا۔ پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھا۔

نائب نے جھلا کر لات جمائی۔ کالے خاں سجدے کے لیے جھکا ہوا تھا۔ لات کھا کر اوندھے منہ گر پڑا۔ مگر فوراً سنبھل کر پھر سجدے میں جھک گیا۔ نائب کو اب ضد پڑ گئی کہ نماز بند کر کے چھوڑوں گا۔ شاید کالے خاں کو بھی ضد پڑ گئی ہو کہ نماز ختم کر کے ہی اٹھوں گا۔ وہ تو سجدے میں تھا۔ نائب صاحب نے اسے بوٹ دار

ٹھوکریں جانی شروع کیں۔ ایک وارڈر نے لپک کر گارڈ کے سپاہی بلا لیئے۔ دوسرا نائب صاحب کی کمک پر دوڑا۔ کالے خاں پر ایک طرف سے ٹھوکریں پڑ رہی تھیں دوسری طرف لکڑیاں۔ پر وہ سجدہ سے سر نہ اٹھاتا تھا۔ ہاں ہر ایک وار پر اس کے منہ سے اللہ اکبر کی دل ہلا دینے والی صدا نکل جاتی تھی۔ ادھر ان جلادوں کی آتش غضب بھی تیز ہوتی جاتی تھی۔ جیل کا قیدی جیل کے خدا کو سجدہ نہ کرے کے اپنے خدا کو سجدہ کرے۔ اس سے زیادہ نائب صاحب کی اور کیا توہین ہو سکتی تھی۔ کالیخاں پر اتنی ضربیں پڑیں کہ اس کے سر سے خون بہنے لگا۔ امرکانت اسکی حمایت کرنے دوڑا تھا کہ ایک وارڈر نے اسے زور سے دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا۔ ادھر برابر چوٹیں پڑتی جاتی تھیں اور کالے خاں برابر اللہ اکبر کے نعرے لگائے جاتا تھا آخر وہ صدا نحیف ہوتے ہوتے بالکل بند ہو گئی اور کالے خاں بے حس و حرکت ہو گیا۔ مگر چاہے کسی کے کانوں میں اسکی آواز نہ جاتی ہو اس کے ہونٹ اب بھی ہل رہے تھے۔ اور "اللہ اکبر!" کی غیر مسموع صدا اب بھی نکل رہی تھی۔

نائب نے حیف ہو کر کہا "پڑا رہنے دو۔ بدمعاش کو نہیں۔ کل سے اسے کھڑی بیڑی دوں گا اور تنہائی بھی۔ اگر تب بھی سیدھا نہ ہوا تو الٹی دی جائے گی۔ اس کا نمازی پن نکال نہ دوں تو نام نہیں۔"

ایک لمحے میں نائب وارڈر، سپاہی، سب چلے گئے۔ قیدیوں کے کھانے کا وقت آگیا تھا۔ سب کے سب کھانے پر جا بیٹھے۔ مگر کالیخاں ابھی وہیں اوندھا پڑا ہوا تھا۔ سر اور ناک کان سے خون جاری تھا۔ امرکانت بیٹھا اس کے زخموں کو پانی سے دھو رہا تھا۔ اور خون بند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ روحانی قوت کے اس بعید از قیاس جلوے نے اس کی مادیت کو مغلوب کر دیا تھا۔ ایسی حالت میں کیا وہ بھی اسی طرح ثابت و ساکن رہ سکتا تھا شاید پہلے ہی وار میں یا تو اس نے

مدافعت کی ہوتی یا نماز چھوڑ کر الگ ہو جاتا

قیدی کھانا کھا کر لوٹے۔ کالے خان ابھی وہیں پڑا ہوا تھا۔ سبھوں نے اسے اٹھا کر بارک میں پہنچایا اور ڈاکٹر کو اطلاع دی۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے رات کو اپنی نیند میں خلل ڈالنا آئین صحت کے خلاف سمجھا۔ وہاں اور کیا دوا مل سکتی تھی گرم پانی بھی نہ میسر ہو سکا۔

اس بارک کے قیدیوں نے ساری رات بیٹھ کر کاٹی۔ کئی آدمی اس بات پر آمادہ تھے کہ صبح ہوتے ہی نائب صاحب کی مرمت کیجائے۔ یہی تو ہوگا کہ سال دو سال کی معیاد اور بڑھ جائے گی۔ کیا غم۔ امرکانت بہت ہی سلامت پسند آدمی تھا۔ مگر اس وقت وہ بھی انھیں لوگوں میں ملا ہوا تھا۔ رات بھر اس کے اندر حیوان اور انسان میں زور آزمائیاں ہوتی رہیں۔ وہ جانتا تھا آگ آگ سے نہیں پانی سے فرو ہوتی ہے۔ تنہا ہوتا تو شاید اب بھی اسے اشتعال نہ ہوتا لیکن اس اجتماعی ہیجان نے اسے بھی ڈگا دیا۔ مجمع کے ساتھ ہم کتنے ہی ایسے اچھے یا برے کام کر جاتے ہیں جو تنہا نہ کر سکتے۔ اور کالے خاں کی حالت جتنی ہی نازک ہوتی جاتی تھی اتنا ہی انتقام کا جذبہ اور بھی بیتاب ہو جاتا تھا۔

ایک ڈاکے کے قیدی نے کہا "خون پی جاؤں گا یہی تو ہوگا پھانسی ہو جائیگی پھانسی تو ایک دن ہونی ہی ہے"

امرکانت نے افسوس ناک لہجے میں کہا "اس وقت کیا سمجھتے تھے کہ مار ہی ڈالے گا"

چپکے چپکے سازش کی گئی۔ تاموں کا انتخاب ہوا۔ طرز عمل کا فیصلہ کیا گیا اور صفائی کی دلیلیں بھی سوچ نکالی گئیں۔ یکایک ایک ٹھگنے قیدی نے کہا "تم لوگ سمجھتے ہو سویرے تک اسے پتہ نہ لگ جائے گا؟"

تیغ محمد پڑھا لکھا آدمی تھا۔ بحث کرنے کو تیار ہو گیا۔ سلیم نے اس کی کٹھ حجتی کی ہنسی اڑانے کی کوشش کی۔ مذہب کو وہ دنیا کا کلنگ سمجھتا تھا جس نے انسان کو مختلف گروہوں میں بانٹ کر ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا ہے۔ زر، زمین، زن نے پہلے ہی دنیا کو خون میں ڈبو رکھا تھا۔ مذہب بھی اس تگڈم کی کمک پر آ پہنچا اور اس میدان میں سب سے بازی لے گیا۔ ایسے مذہب پر سلیم کو مطلق اعتقاد نہ تھا تیغ محمد روزہ نماز کا پابند، دیندار مسلمان تھا۔ مذہب کی یہ توہین کیونکر برداشت کرتا۔ ادھر تو اہیرانے میں اہیروں اور پولیس میں لاٹھیاں چل رہی تھیں۔ ادھر ان دونوں میں ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی۔ تیغ محمد پہلوان تھا سلیم بھی ٹھوکر چلانے اور گھونسے بازی میں منجھا ہوا، پھرتیلا، چست۔ پہلوان اسے اپنی گرفت میں لا کر دبوچ بیٹھنا چاہتا تھا سلیم اچھل کود کر ٹھوکریں جماتا تھا اور اسکی گرفت سے بچ کر نکل جاتا تھا۔ تابڑ توڑ ٹھوکریں پڑیں تو پہلوان نے زمین بوسی شروع کی اور مغلظات بکنے لگا۔ اس کے دونوں ساتھیوں نے پہلے دور ہی سے تماشا دیکھنا مناسب سمجھا تھا۔ تیغ محمد کی فتح ان کے خیال میں یقینی تھی۔ لیکن جب تیغ محمد گر پڑا تو دونوں کمر کس کر پل پڑے۔ یہ دونوں ابھی جوان پٹھے تھے۔ تیزی اور چستی میں سلیم کے برابر۔ سلیم برابر پیچھے ہٹتا جاتا تھا اور یہ دونوں اسے رگیدتے جاتے تھے۔ اسی وقت سلوفی لاٹھی ٹیکتی ہوئی اپنی گائے کو تلاش کرنے آ رہی تھی۔ پولیس اسکی غیر حاضری میں گائے اس کے دروازے سے کھول لائی تھی۔ یہاں یہ جنگ دیکھکر اس نے آنچل سر سے اتار کر کمر میں باندھا اور لاٹھی سنبھال کر پیچھے سے دونوں فسادیوں کو پیٹنے لگی۔ ان میں سے ایک نے پیچھے پھر کر بڑھیا کو اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ تین چار ہاتھ پر جا گری۔ اتنے میں سلیم نے گھات پا کر اپنے مقابل کو ایسا گھونسا دیا کہ اسکی ناک سے خون جاری ہو گیا اور وہ سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ اب صرف ایک حریف اور رہ گیا تھا اس نے تنہا سلیم کا مقابلہ

کرنا مصلحت کے خلاف سمجھا اور پولیس سے فریاد کرنے بھاگا۔ تیغ محمد کے دونوں گھٹنے بیکار ہو گئے تھے۔ اٹھ نہ سکتا تھا۔ سلیم نے موقعہ دیکھ کر مویشیوں کی رسیاں کھول دیں اور تالیاں بجا بجا کر انھیں بھڑکا دیا۔ بچارے جانور سہمے کھڑے تھے۔ آنے والی مصیبت کا انھیں کچھ کچھ الہام ہو رہا تھا۔ رسّی کھلتے ہی سب کے سب دمیں اٹھا اٹھا کر بھاگے اور پہاڑیوں کی طرف نکل گئے۔

اسی وقت آتمانند بدحواس دوڑے آئے اور بولے "آپ ذرا اپنا ریوالور تو مجھے دیدیجئے۔"

سلیم نے ہکا بکا ہو کر پوچھا "کیا ماجرا ہے۔ کچھ کہو تو۔"

"پولیس نے کئی آدمیوں کو مار ڈالا۔ اب نہیں رہا جاتا۔ میں مسٹر گھوش کو مزہ چکھا دینا چاہتا ہوں۔"

"آپ کچھ بھنگ تو نہیں کھا گئے ہیں۔ بھلا یہ ریوالور چلانے کا موقع ہے۔"

"اگر یوں نہ دوگے تو میں چھین لوں گا۔ اس شیطان نے گولیاں چلا کر چار پانچ آدمیوں کی جان لے لی۔ دس بارہ آدمی بری طرح زخمی ہو گئے ہیں۔ کچھ انھیں بھی تو مزہ چکھنا چاہئے۔ ہمیں تو مرنا ہے ہی۔"

"میرا ریوالور اس کام کے لیے نہیں ہے۔"

آتمانند یوں بھی تند مزاج آدمی تھے۔ اس قتل عام نے انھیں اور بھی برانگیختہ کر دیا تھا۔ بولے "ظالم بے گناہوں کا خون بہا کر چلا جا رہا ہے۔ اور تم کہتے ہو میرا ریوالور اس کام کے لئے نہیں ہے۔ آخر وہ اور کس کام کے لیے ہے۔ میں تمہارے پیروں پڑتا ہوں بھیا۔ ایک لمحے کے لیے دیدو۔ دل کی آرزو پوری کر لوں۔"

سلیم بغیر کچھ جواب دیئے تیزی سے اہیرانے کی طرف چلا۔ راستے میں سبھی دروازے بند تھے۔ کتے بھی کہیں بھاگ کر جا چھپے تھے۔

امر نے پوچھا "پتہ کیسے لگے گا؟ یہاں ایسا کون ہے جو اُسے خبر دیدے؟"

ٹھگنے قیدی نے دائیں بائیں نظر ڈال کر کہا "کبر دینے والے نہ جانے کہاں سے نکل آتے ہیں بھیا۔ کسی کے ماتھے پر تو کچھ لکھا نہیں ہوتا۔ کون جانے ہمیں میں سے جا کر اتلا کر دے۔ آئے دن تو لوگوں کو سرکاری گواہ بنتے دیکھتے ہو۔ وہی لوگ جو سرگنا ہوتے ہیں۔ بکھت پر سرکاری گواہ بن جاتے ہیں۔ اگر کچھ کرنا ہی ہے تو ابھی کر ڈالو۔ انکو کوئی واردات کر دگے، سب کے سب کالے پانی بھیج دیئے جاوگے۔"

امر نے اعتراض کیا "لیکن اس وقت تو وہ اپنے کوارٹر میں سو رہا ہو گا۔"

ٹھگنے قیدی نے جواب دیا "یہ ہمارا کام ہے۔ تم کیا جانو۔"

سرگوشیاں ہوئیں اور پانچ آدمی تیار ہو گئے۔

ٹھگنے قیدی نے کہا "ہم میں جو بھوٹے اسے گھوپتیا۔"

یہ کہکر اس نے ہائے ہائے کی چیخ مارنی شروع کی۔ اور بھی کئی آدمی شور مچانے لگے۔ گویا آپس میں فساد ہو گیا ہو۔

ایک وارڈ نے آکر پوچھا "کیوں شور مچاتے ہو تم سب؟ کیا بات ہے۔ ان سسروں کے مارے رات بھر سونا نصیب نہیں ہوتا۔"

ٹھگنے قیدی نے کہا "بات کیا ہے۔ کالے خاں اب تب ہو رہے ہیں۔ جا کر نائب صاحب کو بلا لاؤ۔ جھٹ پٹ۔"

وارڈ بولا "واہ بے۔ کیسا حکم لگاتا ہے۔ جیسے نائب صاحب تیرے باپ کے نوکر ہی تو ہیں۔ بڑا نواب کا بچہ بنا ہے۔"

"ہم کہتے ہیں جا کر انھیں بھیجدو۔ کچھ بیان سیان لکھنا ہو تو لکھ لیں۔"

کالے خاں نے آنکھیں کھولیں اور ضعیف آواز سے بولا "کیوں چلاتے ہو۔ یارو۔ میں ابھی مرا نہیں ہوں۔ جیسے پیٹھ کی ہڈی میں چوٹ سے۔"

ٹھگنے قیدی نے قریب آکر آہستہ سے کہا "اسی کا بدلا چکانے کی تیاری ہے پٹھان"

کالے خان کی لاش میں گویا جان آگئی۔ جاں کنی کی سی آواز میں بولا "کس سے بدلا چکاؤ گے بھائی، اللہ سے! اللہ کی یہی مرضی ہے تو اس میں دوسرا کون دخل دے سکتا ہے۔ اس کے حکم کے بغیر کہیں ایک پتی بھی ہل سکتی ہے۔ ذرا مجھے پانی پلا دو اور جب میں مرجاؤں تو یہاں جتنے بھائی ہیں سب میری نجات کے لیے خدا سے دعا کرنا۔ دنیا میں اور میرا کون ہے"

امر نے اسے گود میں لے کر پانی پلانا چاہا۔ مگر گھونٹ حلق کے نیچے نہ اترا۔ وہ زور سے کراہ کر پھر لیٹ گیا۔

ٹھگنے قیدی نے دانت پیس کر کہا "ایسے جالم کی گردن تو ایٹی چھری سے کاٹنی چاہیئے"

کالے خاں ملامت آمیز لہجے میں بولا "کیوں میری نجات کا دروازہ بند کرنے ہو بھائی۔ دنیا تو بگڑ گئی۔ کیا عاقبت بھی بگاڑنا چاہتے ہو۔ اللہ سے دعا کرو سب پر رحم کرے۔ زندگی میں کیا کم گناہ کیے ہیں کہ مرنے کے بعد ان میں بیڑیاں پڑی رہیں یا خدا رحم کرا"

ان الفاظ میں گویا مرنے والے کی روح پاک جلوہ پذیر ہو گئی تھی۔ باتیں وہی تھیں جو ہم روز سنتے ہیں۔ لیکن ان میں اس وقت کچھ ایسی تاثیر، کچھ ایسا معجزہ تھا، کہ سبھی سر بہ زانو ہو گئے۔ اس چٹکی بھر راکھ نے جیسے خلط فاسد کی اصلاح کر دی۔

طلوع سحر کے وقت جب کالے خاں کی شمع حیات بجھی تو ایسا کوئی قیدی نہ تھا جس کی آنکھوں سے آنسو نہ نکل رہے ہوں۔ لیکن اور لوگ غم سے رو رہے تھے امر کا نت روحانی مسرت سے رو رہا تھا۔ اوروں کو ایک عزیز دوست کی جدائی

کا صدمہ تھا۔ امرکانت کو ایسا معلوم ہو رہا تھا وہ اس سے قریب تر ہو گیا ہے اپنی زندگی میں اُسے کبھی ایسا پاک نفس انسان ملا تھا جس کے سامنے اُس کا غرور عقیدت سے جھک جاتا تھا۔

اس روشنی کے مینار نے آج اُس کی کشتی کا رخ پلٹ دیا، جہاں شک کی جگہ یقین، اور باطل کی جگہ حق کی آواز سنائی دیتی تھی۔

(۷)

لالہ امرکانت کے چلے جانے کے بعد سلیم نے ہر ایک موضع کا دورہ کر کے آسامیوں کی حقیقی مالی حالت کی تحقیقات شروع کی۔ اب اسے معلوم ہوا کہ ان کی حالت اس سے کہیں ابتر ہے، جتنا وہ سمجھے ہوئے تھا۔ پیداوار کی قیمت لاگت اور لگان سے بھی کم تھی۔ کھانے کپڑے کی بھی گنجائش نہ تھی۔ دوسرے مصارف کا ذکر ہی کیا۔ ایسا شاذ ہی کوئی کسان تھا جس کا سر قرض کے بوجھ سے نہ دبا ہوا ہو۔ کالج میں اس نے مالیات کا مطالعہ کیا تھا اور جانتا تھا کہ یہاں کے مزارعین کی حالت بہت افسوسناک ہے اب اُس پر روشن ہوا کہ کتابی علم اور واقعی صورت میں اتنا ہی فرق ہے جتنا انسان اور اس کی شبیہ میں۔ جوں جوں اس پر اصلیت کھلتی جاتی تھی کسانوں سے اس کی ہمدردی بڑھتی جاتی تھی۔ کتنا ظلم ہے کہ جو بچارے روٹیوں کو محتاج ہوں، جن کے پاس تن ڈھانکنے کو چیتھڑے بھی نہ ہوں جو بیماری میں ایک پیسے کی بھی دوا نہ خرید سکتے ہوں۔ جن کے گھروں میں چراغ بھی نہ جلتے ہوں، اُن سے پورا لگان وصول کیا جائے۔ جب زراعتی پیداواریں گراں تھیں، تب بھی ایک وقت روکھا سوکھا کھانا مل جاتا تھا۔ اس سرد بازاری میں تو ان کی حالت ناقابل بیان ہو گئی ہے۔ جن کے لڑکے پانچ چھ سال کی عمر

سے ہی محنت مزدوری کرنے لگیں، جو ایندھن کے لیئے چراگاہوں میں گوبر بٹورتے پھرتے ہوں، ان سے پورا مطالبہ وصول کرنا گویا ان کے منہ سے روٹی کا ٹکڑا چھین لینا، ان کے تن خشک سے خون چوسنا ہے۔

اصلی حالات کا علم ہوتے ہی سلیم نے اپنے طرز عمل کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے کئی دن تک یک سو ہو کر مفصل رپورٹ لکھی اور مسٹر غزنوی کے پاس بھیجدی۔ مسٹر غزنوی نے فوراً لکھا۔ آکر مجھ سے مل جاؤ۔ سلیم ان سے ملنا نہ چاہتا تھا۔ ڈرتا تھا کہیں وہ میری رپورٹ کو دبا رکھنے کی تجویز نہ کریں۔ لیکن پھر سوچا چلنے میں ہرج ہی کیا ہے۔ اگر وہ مجھے قائل کردیں تب تو کوئی بات ہی نہیں۔ لیکن حکام کی ناراضگی کے خوف سے میں اپنی رپورٹ کو ہرگز داخل دفتر نہ ہونے دوں گا۔

اسی دن شام کو وہ صدر جا پہنچا۔

مسٹر غزنوی نے تپاک سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "مسٹر امرکانت کے ساتھ تم نے دوستی کا حق خوب ادا کیا۔ وہ خود شاید اتنی مفصل رپورٹ نہ لکھ سکتے۔ لیکن کیا تم سمجھتے ہو سرکار کو ان حالات کا علم نہیں ہے؟"

سلیم نے جواب دیا "میرا تو ایسا ہی خیال ہے۔ سرکار کو جو رپورٹیں ملتی ہیں وہ حکام پرست اہل کاروں سے ملتی ہیں جو رعایا کا خون کرکے بھی اظہار حق سے گریز کرتے ہیں۔ میری رپورٹ واقعات پر مبنی ہے۔"

دونوں افسروں میں بحث ہونے لگی مسٹر غزنوی کی دلیل تھی۔ ہمارا فرض صرف احکام کی تعمیل ہے۔ سرکار نے لگان وصول کرنے کا حکم دیا ہمیں وصول کرنا چاہیئے۔ رعایا کو تکلیف ہوتی ہے تو ہو۔ ہمیں اس سے غرض نہیں۔ ہمیں خود اپنی آمدنی کا ٹیکس ادا کرنے میں روحانی تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن مجبور ہو کر دیتے ہیں۔ کوئی آدمی خوشی سے ٹیکس نہیں دیتا۔ مسٹر غزنوی اس حکم کی مخالفت

کرنا اخلاق کی بنا پر ہی نہیں، فرض کی بنا پر بھی قابل تعزیر سمجھتے تھے اور محض ضابطے کی پابندی ان کے اطمینان کے لیئے کافی نہ تھی۔ وہ دل سے اس حکم کی تعمیل کرنا چاہتے تھے۔

سلیم کہتا تھا ہم نے سرکار کی ملازمت محض اس لیئے کی ہے کہ اس کے ذریعہ رعایا کی کچھ خدمت کر سکیں۔ اسکی حالت میں اصلاح کر سکیں۔ اگر سرکار کی کسی تجویز سے اس مقصد کے پورے ہونے میں رکاوٹ پڑتی ہو۔ تو ہمیں اس کی تعمیل سے انکار کر دینا چاہیئے۔

غزنوی نے منہ لٹکا کر کے کہا "مجھے خوف ہے کہ گورنمنٹ یہاں سے تمہارا تبادلہ کر دے گی"

"تبادلے کی مجھے فکر نہیں، میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ اصلی حالت اس پر روشن ہو جائیگی"

غزنوی نے سرکار کی وکالت کی "آپ گورنمنٹ کی دقتوں کا مطلق اندازہ نہیں کر رہے ہیں۔ اگر وہ اتنی آسانیاں دینے لگے تو آپ قیاس کر سکتے ہیں رعایا کتنی شیر ہو جائے گی۔ ذرا ذرا سی بات پر طوفان کھڑے ہو جائیں گے۔ اور یہ مطالبہ محض اس علاقے کا نہیں ہے۔ سارے ملک میں اس قسم کی سورش جاری ہے۔ آپ بتا سکتے ہیں سرکار کے پاس اس کمی کو پورا کرنے کے اور کیا ذرایع ہیں؟"

سلیم نے جواب دیا "میرا دعویٰ تو یہ ہے کہ سرکار رعایا کے لیئے ہے، رعایا سرکار کے لیئے نہیں۔ کاشتکاروں پر ظلم کر کے انھیں بھوکوں مار کر، اگر گورنمنٹ زندہ رہنا چاہتی ہے تو کم سے کم میں اس سے الگ ہو جاؤں گا۔ اگر مالیات میں کمی کا اندیشہ ہے تو سرکار کو اپنے مصارف کم کرنے چاہئیں، نہ کہ رعایا پر سختیاں کی جائیں میں جانتا ہوں میری علحدگی کا سرکار پر کوئی اثر نہ پڑیگا۔ لیکن میرے ضمیر کو اطمینان

ہو جائے گا۔"

غزنوی نے بہت کچھ اونچ نیچ سمجھائی لیکن سلیم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ ڈنڈوں سے لگان وصول کرنے کے لیئے اپنے ضمیر کو کسی طرح مجبور نہ کر سکتا تھا۔ آخر غزنوی نے لاچار ہو کر اس کی رپورٹ اوپر بھیجدی اور ایک ہی ہفتہ کے اندر گورنمنٹ نے اسے علیحدہ کر دیا ایسے خطرناک آدمی پر وہ کیسے اعتبار کرتی۔

جس دن اس نئے افسر کو چارج دیا اور علاقے سے رخصت ہونے لگا، اس کے قیام گاہ پر مردوں عورتوں کا ایک میلہ لگ گیا۔ سب اس سے منتیں کرنے لگے ہمیں اس حالت میں چھوڑ کر آپ نہ جائیں۔ سلیم کی خواہش بھی یہی تھی۔ حافظ جی کے خوف سے وہ گھر نہ جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ان بیکسوں سے اسے کچھ ہمدردی ہو گئی تھی۔ کچھ تو اس کی ہمدردی اور کچھ اپنی ذلت کے احساس نے اسے عوام کا رہبر بنا دیا۔ وہی شخص جو کچھ دن پہلے افسری کے نشہ سے مخمور آیا تھا عوام کا خادم بن بیٹھا۔ مظلوم ہونا ظالم ہونے سے کہیں زیادہ فخر کی بات تھی۔

تحریک کی لگام سلیم کے ہاتھوں میں آتے ہی لوگوں کے حوصلے بندھ گئے۔ جیسے پہلے امرکانت آتمانند کے ساتھ گاؤں گاؤں دوڑا کرتا تھا۔ اسی طرح سلیم دو ڈنڈے لگا دہ سلیم جس کے خون کے لوگ پیاسے ہو رہے تھے اب علاقے کا شاہ بے تاج تھا۔

شام ہو گئی تھی۔ سلیم اور آتمانند دن بھر کی دوا دوش کے بعد لوٹے تھے کہ یکایک نئے بنگالی سویلین مسٹر گھوش نے پولیس اہلکاروں کے ساتھ آ کر گاؤں بھر کے مویشیوں کو قرق کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ کچھ قصاب پہلے ہی سے بلا لیئے گئے تھے۔ سستا سودا خریدنا کون نہیں چاہتا۔ دم کے دم میں کانسٹیبلوں نے مویشیوں کو کھول کھال کر مدرسے کے دروازہ پر جمع کر دیا۔ گوڈر، بھولا، رگھو چودھری سبھی گرفتار ہو چکے تھے۔ فصل کی قرقی پہلے ہی ہو چکی تھی۔ مگر ابھی فصل میں کیا رکھا تھا

اس لیئے اب حکام نے مویشیوں کو قرق کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ انھیں یقین تھا کہ کسان مویشیوں کی قرقی سے مرعوب ہو جائیں گے اور چاہے انھیں قرض لینا پڑے یا عورتوں کے کہنے بیچنے پڑیں، وہ جانوروں کو بچانے کے لیئے سب کچھ کرنے کو تیار ہو جائیں گے۔ جانور ہی تو کسان کے داہنے ہاتھ ہیں۔

کسانوں نے یہ اعلان سنا تو پھکے چھوٹ گئے۔ سمجھے بیٹھے تھے کہ سرکار اور چاہے جو کچھ کرے، مویشیوں سے نہ بولے گی۔ کیا وہ کسانوں کی جڑ کھود کر پھینک دینا چاہتی ہے۔ دراصل انھیں اس کا یقین نہ آتا تھا۔ یہ اعلان سن کر بھی وہ یہی سمجھ رہے تھے۔ کہ محض دھمکی ہے۔ لیکن جب مویشی مدرسے کے سامنے جمع کر دیئے گئے اور قصابوں نے ان کی دیکھ بھال شروع کر دی تو ان پر جیسے بجلی ٹوٹ پڑی۔

چراغ جلتے جلتے مویشیوں کا بازار لگ گیا۔ حکام نے فیصلہ کیا ہے کہ ساری رقم یکجا وصول کر لیں۔ گاؤں کے لوگ آپس میں لڑ بھڑ کر اپنے اپنے حصے کا فیصلہ کر لیں گے۔ حکام کو اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔

سلیم نے آکر مسٹر گھوش سے کہا "آپ کو معلوم ہے کہ مویشیوں کو قرق کرنے کا مجاز آپ کو نہیں ہے؟"

مسٹر گھوش نے بے اعتنائی سے جواب دیا "یہ قانون ایسے موقعوں کے لیئے نہیں ہے۔ خاص ضرورتوں پر خاص قانون کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ امن اور بدامنی کے قوانین یکساں نہیں ہو سکتے۔"

ابھی سلیم نے کوئی جواب نہ دیا تھا کہ معلوم ہوا، ہیروں کے محال میں لاٹھی چل گئی۔ کاشی، بیاگ، آتما نند سب اس طرف دوڑے۔ مسٹر گھوش بھی ادھر چلے سپاہیوں نے بھی سنگینیں چڑھائیں اور موقع پر جا پہنچے۔ صرف سلیم یہاں کھڑا رہا۔ جب میدان خالی ہو گیا تو اس نے قصابوں کے سرغنہ کے پاس جا کر سلام علیک کیا اور

بولا "کیوں بھائی صاحب، آپ کو معلوم ہے۔ آپ لوگ ان مویشیوں کو خرید کر یہاں کی مظلوم رعایا کے ساتھ کتنی بڑی بے انصافی کر رہے ہیں"۔

سرغنہ کا نام تیغ محمد تھا۔ ناٹے قد کا کٹھیلا آدمی تھا پورا پہلوان۔ ڈھیلا کرتہ، چار خانے کی تہمد۔ گلے میں چاندی کا تعویذ۔ ہاتھ میں موٹا سونٹا۔ ملائمت سے بولا "صاحب، ہم تو مال خریدنے آئے ہیں۔ ہمیں اس سے کیا مطلب مال کس کا ہے اور کیسا ہے۔ چار پیسے کی نکاسی جہاں ہوتی ہے وہاں آدمی جاتا ہے"۔

"لیکن یہ تو سوچئے مویشیوں کی قرقی کس سبب سے ہو رہی ہے۔ رعایا کے ساتھ آپ کو ہمدردی ہونی چاہیئے"۔

تیغ محمد پر کوئی اثر نہ ہوا، بولا "سرکار سے جس کی لڑائی ہوگی اس کی ہوگی ہماری کوئی لڑائی نہیں ہے"۔

"تم مسلمان ہو کر ایسی باتیں کرتے ہو اس کا مجھے افسوس ہے۔ اسلام نے ہمیشہ مظلوموں کی مدد کی ہے۔ اور تم مظلوموں کی گردن پر چھری پھیر رہے ہو"۔

"جب سرکار ہماری پرورش کر رہی ہے تو ہم اس کی بدخواہی نہیں کر سکتے"۔

"اگر سرکار تمہاری جائداد چھین کر کسی دوسرے کو دیدے تو تمہیں برا لگے گا یا نہیں"؟

"سرکار سے لڑنا ہمارے مذہب کے خلاف ہے"۔

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم میں غیرت نہیں ہے"۔

"آپ تو مسلمان ہیں۔ کیا آپ کا فرض نہیں کہ سرکار کی مدد کریں۔ آپ اہل کتاب کے مقابلہ میں کافروں کی مدد کر رہے ہیں۔ یہ اچھی بات ہے"؟

"اگر مسلمان ہونے کا یہی مطلب ہے کہ غریبوں کا خون کیا جائے تو میں کافر ہوں"۔

یکایک ایک مکان کا دروازہ جھونکے کے ساتھ کھلا اور ایک عورت سر کے بال کھولے، پریشان، کپڑے خون سے تر، خوف زدہ ہرنی سی آکر اس کے پیروں سے چمٹ گئی اور سہمی آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھتی ہوئی بولی "مالک سپاہی لوگ مجھے مارے ڈالتے ہیں۔"

سلیم نے تسلی دی "گھبراؤ نہیں، گھبراؤ نہیں، ماجرا کیا ہے؟"

عورت نے ڈرتے ڈرتے بتلایا کہ گھر میں کئی سپاہی گھس گئے ہیں۔ اس سے زیادہ وہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔

"گھر میں کوئی آدمی نہیں ہے؟" سلیم نے پوچھا۔

"وہ تو بھینسیں چرانے گئے ہیں۔"

"تمھیں کہاں چوٹ آئی ہے؟"

"مجھے چوٹ نہیں آئی۔ میں نے دو آدمیوں کو مارا ہے۔"

اسی وقت دو کانسٹبل بندوقیں لیئے گھر سے نکل آئے اور حسینہ کو سلیم کے پاس کھڑا دیکھ کر اس کے بال پکڑ لیئے اور اسی دروازہ کی طرف کھینچ لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔

سلیم نے راستہ روک کر کہا "چھوڑ دو اس کے بال۔ ورنہ اچھا نہ ہوگا میں تم دونوں کو بھون کر رکھ دوں گا۔"

ایک کانسٹبل نے غضبناک ہو کر کہا "چھوڑ کیسے دیں۔ اسے لے جائینگے صاحب کے پاس۔ اس نے ہمارے دو آدمیوں کو گنڈاسے سے زخمی کر دیا دونوں تڑپ رہے ہیں۔"

"تم اس کے گھر میں کیوں گئے تھے؟"

"گئے تھے مویشیوں کو کھولنے۔ یہ گنڈاسا لے کر ٹوٹ پڑی۔"

حسینہ نے ٹوکا "جھوٹ بولتے ہو۔ تم نے میری باہنہیں پکڑی تھی؟"
سلیم نے سرخ آنکھوں سے سپاہی کو دیکھا اور دھکا دے کر کہا۔ "اسکے بال چھوڑ دو"
"ہم اسے صاحب کے پاس لے جائیں گے"
"ہرگز نہیں۔ تم اسے نہیں لے جا سکتے"
کانسٹیبلوں نے سلیم کو تھوڑے دن پہلے ایک حاکم کی صورت میں دیکھا تھا۔ اس کی ماتحتی کر چکے تھے۔ اس رعب کا کچھ اثر ان کے دل پر باقی تھا۔ حسینہ کے ساتھ اور کسی قسم کی زیادتی کرنے کا انھیں حوصلہ نہ ہوا۔ جا کر مسٹر گھوش سے فریاد کی۔ مسٹر گھوش سلیم سے جلتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سلیم ہی اس تحریک کی روح ہے اور اگر اسے کسی ترکیب سے زیر کر دیا جائے تو یہ ہنگامہ آپ ہی آپ فرو ہو جائیگا سپاہیوں کی فریاد سنتے ہی فوراً گھوڑا بڑھا کر سلیم کے پاس آ پہنچے۔ اور انگریزی میں قانون بگھارنے لگے۔ سلیم کو بھی انگریزی بولنے کا بہت اچھا ملکہ تھا۔ دونوں میں پہلے قانونی مباحثہ ہوا۔ پھر مذہبی موشگافیوں کا نمبر آیا اس سے اتر کر دونوں فلسفیانہ استدلال کے میدان میں کود پڑے۔ یہاں تک کہ بالآخر ذاتیات پر حملوں کی بوچھار ہونے لگی۔ اس کے ایک ہی لمحے بعد قول نے عمل کی صورت اختیار کر لی۔ مسٹر گھوش نے پیشقدمی کی اور ہنٹر چلایا جس نے سلیم کے چہرے پر ایک سرخی مائل نیلی چوڑی، ابھری ہوئی لکیر چھوڑ دی۔ بالکل اپنی صورت سے ملتی ہوئی۔ آنکھیں بال بال بچ گئیں۔ سلیم بھی جامے سے باہر ہو گیا۔ مسٹر گھوش کی ٹانگ پکڑ کر زور سے کھینچی۔ صاحب گھوڑے سے نیچے گر پڑے۔ سلیم ان کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا اور ناک پر گھونسا مارا۔ گھوش بابو کو غش آ گیا۔ کانسٹیبلوں نے دوسرا گھونسا نہ پڑنے دیا۔ چار آدمیوں نے دوڑ کر انھیں سنبھالا۔ اور ہوش میں لانے کی فکر کرنے لگے۔ سلیم پکڑ لیا گیا۔

اندھیرا ہو گیا تھا۔ سارے گاؤں پر ہیبت چھائی ہوئی تھی۔ لوگ فرطِ غم سے مفلوج، روحانی انتشار کے عالم میں کانپتے ہوئے دل، اور تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے مرنے والوں کی لاشیں اٹھا رہے تھے۔ کسی کے منہ سے رونے کی آواز نہ نکلتی تھی۔ زخم تازہ تھا۔ اس لئے اس میں ٹیس نہ تھی۔ یہ خیال بھی تھا روکر اپنی شکست کا اعتراف کیوں کریں۔ اس شکست میں بھی انھیں اپنی فتح کا غرور تھا۔ شکست اور فتح دل کی کیفیتیں ہیں۔ ظاہری اسباب سے بے نیاز بچے بھی رونا بھول گئے تھے۔

مسٹر گھوش کو لوگ اٹھا کر ڈاک بنگلے لے گئے۔ سلیم ایک سب انسپکٹر اور کئی کانسٹبلوں کے ساتھ صدر بھیجا گیا۔ وہ اہیرن بھی اسی لاری پر بھیجی گئی۔

پھر رات جاتے جاتے لاشیں ندی کی طرف چلیں۔ سلوتی لاٹھی ٹیکتی ہوئی آگے آگے گاتی جاتی تھی۔

سیاں مورا روٹھا جائے سکھی ری

(۸)

کالے خاں کی قربانی امرکانت کی زندگی کا شیرازہ بن گئی۔ اس میں ترتیب نہ تھی، ہمواری نہ تھی، استحکام نہ تھا۔ فوری تغیرات کے جھونکے اس کے ورقوں کو پریشان کرتے رہتے تھے۔ اس شیرازہ نے اس میں توازن اور مطابقت پیدا کر دی کالے خاں کی یاد اسے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھولتی اور کسی غیبی طاقت کی طرح اسے تقویت اور اہمیت دیتی رہتی ہے وہ اس کی وصیت کو اسطرح پورا کرنا چاہتا ہے کہ اس کی روح کو جنت میں بھی سکون ملے۔ گھڑی رات رہے اٹھ کر قیدیوں کا حال چال پوچھنا، مقرر تاریخوں پر ان کے گھروں کو خط لکھنا، مریضوں کیلئے دوا دارو کا انتظام کرنا، ان کی شکایتیں سننا اور اہل کاروں سے مل کر انھیں دور کرانا، یہ سب اس

کے فرائض میں داخل ہو گئے ہیں۔ اور خدمت کو وہ اتنے انکسار اور آنی ہمدردی سے ادا کرتا ہے۔ کہ اہل کاروں کو بھی اس پر شبہ کی جگہ یقین ہوتا ہے۔ وہ قیدیوں کا محترم بھی ہے اور اہل کاروں کا معتمد بھی۔

اب تک وہ ایک طرح سے افادیت کا پجاری تھا۔ اسی وصول کو اضطراری طور پر ذہن میں رکھ کر وہ اپنے طرز عمل کا فیصلہ کرتا تھا۔ تلاش حقیقت کے لیئے اس کی زندگی میں کوئی جگہ نہ تھی۔ ظاہر کی تہہ میں جو اتھاہ گہرائی ہے۔ اسکی نظروں میں التفات کے قابل نہ تھی۔ اس نے سمجھ رکھا تھا وہاں صفر کے سوا اور کچھ نہیں۔ کاکے خاں کی موت نے گویا بزور اس کا ہاتھ پکڑ کر اس گہرائی میں ڈبا دیا۔ اور اس میں ڈوب کر اسے اپنی ساری زندگی کسی تنکے کی طرح سطح پر تیرتی ہوئی نظر آئی۔ کبھی لہروں کے ساتھ آگے بڑھتی ہوئی، کبھی ہوا کے جھونکوں سے پیچھے ہٹتی ہوئی اور کبھی بھنور میں پڑ کر چکر کھاتی ہوئی، اس کی خدمتوں میں بھی غرور تھا۔ انانیت تھی، کم ظرفی تھی۔ اسی کے زیر نظر اس نے سکھدا سے تغافل جتایا۔ اس گل اندام کی زندگی میں جو حقیقت تھی وہاں تک پہنچنے کی کوشش نہ کرکے اس سے کنارہ کش ہو بیٹھا کوشش بھی کیا کرتا۔ اس کوشش کا اسے علم بھی نہ تھا۔ ظاہر نے اس کی اندر کی آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ اسی دھن میں اس نے سکینہ کا سودائے خام پالا۔ اس وقت معلوم ہوتا تھا وہ اس کی محبت میں دیوانہ ہو گیا ہے اب سب کچھ اس پر نثار کئے دیتا ہے۔ پر آج اس محبت میں ہوس پروری کے سوا اور کچھ نہ نظر آتا تھا۔ ہوس پروری ہی نہ تھی، سفلہ پن بھی تھا۔ اس نے اس بھولی بھالی حسینہ کی بینوائی کو اپنے نفس کا نشانہ بنانا چاہا تھا۔ پھر منی اس کے پردۂ زندگی پر آئی، مایوسیوں سے پامال آرزوؤں سے گرانبار۔ اس دیوی سے اس نے کتنی ریاضتیں کی تھیں۔ وہ اس خیال سے اپنے دل کو سمجھا لیا کرتا تھا کہ سکینہ کے ساتھ اس کے تعلقات میں

نفس کا شائبہ تک نہ تھا لیکن اب اندر نظر ڈالنے پر اسے صاف نظر آتا تھا کہ اس ہمدردی میں بھی، اس پریم میں بھی، اس کی بوالہوسی شامل تھی تو کیا وہ فی الحقیقت بندۂ ہوس ہے؟ اس سوال کا اس نے اپنے باطن سے جو جواب پایا وہ بہت ہی دلشکن تھا اس نے سکھدا کو عیش پرور سمجھا تھا۔ پر وہ خود اس سے کہیں زیادہ شرمناک کہیں زیادہ نفسانی عیش پروری میں ملوث تھا۔ اس کے دل میں ایک دلولہ سا اٹھا کہ دونوں دیویوں کے قدموں پر سر رکھ کر روئے اور کہے دیویو! میں نے تمہارے ساتھ دغا کی ہے۔ میں کمینہ ہوں، بے حیا ہوں، کور باطن ہوں مجھے جو سزا چاہے دو۔ یہ سر تمہارے آگے خم ہے۔

اپنے والد سے بھی اس کے دل میں عقیدت پیدا ہو گئی۔ جسے اس نے دولت کا غلام اور خزانے کا سانپ سمجھ رکھا تھا جسے وہ کسی قسم کی قربانی کے ناقابل سمجھتا تھا جس نے اپنی ریاکاری سے دین کو بھی دنیا کے مطیع کر دیا تھا، وہ آج عالی نفسی کے اونچے سنگھاسن پر بیٹھا نظر آتا تھا۔ دہریت کے نشے میں وہ کسی منصف، اور رحیم ذات برحق کے وجود سے بھی منکر ہو بیٹھا تھا پر ان معجزوں کو دیکھ کر اس کے اندر اعتقاد اور ایمان کا ایک دریا سا امڈ پڑا۔ اپنے روزمرہ کے واقعات میں بھی اسے مشیت غیب کی جھلک نظر آتی تھی۔ زندگی میں اب ایک نیا جوش، ایک نئی مسرت ایک نئی بیداری تھی۔ مستقبل اب اس کے لیے تاریک نہ تھا۔ رضاء الٰہی میں تاریکی کہاں؟

شام کا وقت تھا، امرکانت پریڈ میں کھڑا تھا کہ اس نے سلیم کو آتے دیکھا۔ سلیم کی فطرت میں جو انقلاب ہوا تھا اس کی اسے خبر مل چکی تھی۔ مگر یہاں تک نوبت پہنچ چکی ہے اس کا اسے گمان نہ تھا۔ وہ دوڑ کر سلیم کے گلے لپٹ گیا اور بولا۔ تم خوب آئے دوست۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ سکھدا بھی یہیں

ہے زنانے جیل میں۔ منّی بھی آپہنچی۔ تمہاری کسر تھی وہ پوری ہوگئی۔ اس کا تو مجھے یقین تھا کہ تم بھی ایک نہ ایک دن آؤ گے۔ پر اتنی جلد آؤ گے، یہ امید نہ تھی، وہاں کی تازہ خبریں سناؤ۔ کوئی ہنگامہ تو نہیں ہوا؟"

سلیم نے ظرافت سے کہا "جی نہیں۔ ذرا بھی نہیں۔ ہنگامے کی کوئی بات بھی ہو۔ لوگ مزے سے کہار ہے ہیں اور پھاگ گا رہے ہیں۔ آپ یہاں آرام سے بیٹھے ہوئے ہیں نا؟"

اس نے تھوڑے سے لفظوں میں وہاں کی ساری کیفیت بیان کر دی مویشیوں کا قرق کیا جانا، قصابوں کا آنا، اہیروں کے محال میں گولیوں کا چلنا گھوش کو پیٹ کر مارنے کا واقعہ اس نے بڑی تفصیل اور تشریح سے بیان کیا۔

امرکانت کا منہ لٹک گیا۔ بولا "تم نے سراسر نادانی کی۔"

اور آپ کیا سمجھتے تھے کوئی پنچائت ہے جہاں حقے اور شراب کے ساتھ سارا فیصلہ ہو جائے گا۔"

"مگر فریاد تو اس طرح نہیں کی جاتی۔"

"ہم تو کسی رعایت کے خواستگار نہ تھے۔"

"رعائت تو تھی ہی۔ جب تم نے ایک شرط پر زمین لی تو انصاف یہ کہتا ہے کہ وہ شرط پوری کرو۔ پیداوار یا خرچ اجناس کی شرط پر اسامیوں نے زمین نہیں لی تھی۔ بلکہ سالانہ لگان کی شرط پر۔ زمیندار یا سرکار کو بازار کی تیزی مندے سے کوئی سروکار نہیں۔"

"جب بازار تیز ہو جانے پر لگان بڑھا دیا جاتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مندے ہو جانے پر تخفیف نہ ہو جائے۔ مندے میں تیزی کا لگان وصول کرنا سراسر بے انصافی ہے۔"

"مگر اضافہ لاٹھی کے زور سے تو نہیں کیا جاتا۔ اس کے لیئے بھی تو قانون ہے۔"

سلیم کو حیرت ہو رہی تھی کہ ایسی نازک صورتِ حال میں امر کانت اتنا مطمئن کیسے بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے خون میں تو اُبال آجاتا۔ یقیناً جیل کی سختیوں نے حضرت کے حوصلے پست کر دیئے ہیں۔ ایسی حالت میں اس نے ان تیاریوں کا ذکر کرنا ہی فضول سمجھا جو اس وقت تشدد کا مقابلہ کرنے کے لیئے کی جا رہی تھیں۔

امر اس کے جواب کا انتظار کر رہا تھا جب سلیم نے کوئی جواب نہ دیا تو اس نے پوچھا "تو آج کل وہاں کون ہے؟ سوامی جی؟"

سلیم نے شرماتے ہوئے کہا "سوامی جی تو گرفتار ہو گئے۔ میرے بعد ہی وہاں سکینہ پہنچ گئی۔"

امر کانت چونک کر بولا "اچھا! سکینہ بھی آگئی۔"

"تو کیا تم نے سوچ رکھا تھا کہ آگ لگا کر تم اسے ایک دائرے کے اندر باندھ لو گے؟"

"میں نے اسے جس راستے پر لے چلنا چاہا تھا اُسے اس نے چھوڑ دیا ہے۔"

"آپ اصلاح چاہتے ہیں مگر اس کی قیمت نہیں دینا چاہتے۔"

"آپ نے جس چیز کو قیمت سمجھ رکھا ہے۔ وہ اس کی قیمت نہیں ہے۔ اس کی قیمت ہے زیادہ سے زیادہ قربانیاں کرنے کی طاقت۔"

سلیم نے گرم ہو کر کہا "کیا فضول بکتے ہو جس چیز کی بنیاد جبر پر ہے۔ اس پر قربانیوں کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔"

امر نے پوچھا "کیا تم اسے تسلیم نہیں کرتے کہ دنیا کا نظام حق اور انصاف پر قائم ہے۔ اور ہر ایک انسان کے دل کی گہرائیوں میں وہ تار موجود ہے جو قربانیوں سے جھنکار رہتا ہے؟"

سلیم بولا "نہیں۔ میں اسے باور نہیں کرتا۔ دنیا کا نظام۔ خود غرضی اور جبر پر قائم ہے۔ اور ایسے بہت کم انسان ہیں جن کے دل کی گہرائیوں میں وہ تار موجود ہو۔"

"امر نے مسکرا کر کہا "تم تو سرکار کے نوکر تھے۔ تم جیل میں کیسے آ گئے؟"

سلیم ہنسا "تمہارے عشق میں"

"دادا کو کس کا عشق تھا؟"

"اپنے بیٹے کا"

"اور سکھدا کو"

"اپنے شوہر کا"

"اور سکینہ کو؟ اور منی کو؟ اور سیکڑوں آدمیوں کو جو یہاں پڑے سڑ رہے ہیں مگر جن کے پاس ایک انگل پھر زمین بھی نہیں ہے؟"

"اچھا مان بھی لیا کہ کچھ لوگوں کے دل کی گہرائیوں کے اندر وہ تار ہے۔ مگر ایسے آدمی کتنے ہیں؟"

"میں کہتا ہوں ایسا کوئی آدمی نہیں جس کے اندر وہ تار نہ ہو۔ ہاں کسی پر جلد اثر ہوتا ہے، کسی پر دیر میں۔ کچھ ایسے غرض کے بندے بھی ہو سکتے ہیں جن پر شاید کبھی اثر نہ ہو۔ اگر ہم اس تار میں جنبش پیدا نہیں کر سکے تو یہ ہمارا اور ہماری کمزوریوں کا قصور ہے۔"

"یہ کہنا تو ویسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ سارے انسان فرشتے ہو جائیں تو دنیا خود بخود جنت ہو جائے گی۔ لگان ہم دے نہیں سکتے۔ وہ لوگ کہتے ہیں ہم نے کر چھوڑیں گے۔ تو ہم کیا کریں؟ اپنا سب کچھ قرق ہو جانے دیں؟ مرنے والے بیشک دلوں میں رحم پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن مارنے والا خوف پیدا کر سکتا

ہے جو رحم سے کہیں زیادہ اثر ڈالنے والی چیز ہے۔"

امرکانت نے اس مسئلہ پر مہینوں غور کیا تھا۔ وہ مانتا تھا دنیا میں استبداد کا راج ہے۔ لیکن استبداد کو بھی حق اور انصاف پر دُہائی دینی پڑتی ہے۔ آج طاقت اور جبر کے پجاریوں میں بھی یہ ہمت نہیں ہے کہ وہ کسی کمزور قوم پر اس اعلان کے ساتھ حملہ کر سکے کہ ہم تمہارے اوپر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیئے تم ہمارے مطیع ہو جاؤ۔ ورنہ ہم تمہارا نشان مٹا دیں گے۔ اسے بھی اپنے دعوے کی حمایت کے لیئے صداقت یا تہذیب یا تنظیم کا پردہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔"

اس نے جواب دیا "اگر تمہارا خیال ہے کہ آگ سے آگ بجھ سکتی ہے تو تم سخت غلطی پر ہو۔ جب طاقتور بھی حق کی حمایت کے بغیر ہاتھ نہیں اٹھاتا تو کمزور کے لیئے تو آخر تک اس کے سہارے اور آڑ کی ضرورت ہے۔ اس کا سہارا چھوڑ کر تو وہ کہیں کا نہ رہے گا۔ مٹ جائے گا۔"

سلیم نے منہ بنا کر کہا "حضور کو معلوم رہے کہ دنیا میں فرشتے نہیں بستے آدمی بستے ہیں۔"

امرکانت بولا "مگر آدمیوں نے ہمیشہ فرشتے بننے کی کوشش کی ہے۔ اور شاید انسانی وجود کا مقصد بھی یہی ہے۔ کم سے کم ان لوگوں کو تو فرشتہ ہونا ہی چاہیے۔ جو قوم کے رہنما بنتے ہیں۔"

"فرشتہ کی تعریف؟"

"وہ انسان جو دوسروں کے لیئے جیئے اور دوسروں کے لیئے مرے، جس میں ذاتی ثروت یا شہرت کی ہوس نہ ہو۔"

"ایسے انسان شاید ابھی تک خدا نے پیدا نہیں کیئے۔ آپ کے مشورہ کا منتظر ہے۔"

"خدا انسان نہیں پیدا کرتا۔ انسان ارتقار کی ایک منزل کا نام ہے۔"

"اور آپ موحد بنتے ہیں۔"

"میری توحید معاملات پر مبنی نہیں ہے۔"

"اگر آپ نے دو ایک ماہ پہلے اس فلسفہ اور آئین سے کام لیا ہوتا تو علاقے پر یہ تباہی نہ آتی۔ پھوس میں آگ لگا کر آپ چاہتے ہیں کہ شمع کی طرح جلتی رہے۔"

امر کے دل پر چوٹ لگی۔ تلملا اٹھا۔ اس کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ باہر ٹھنڈ پڑنے لگی تھی۔ دونوں اندر گئے۔ سلیم تو تھکا تھا۔ لیٹتے ہی لیٹتے سو گیا۔ امر کا نت ایک نئی روحانی کشمکش سے مضطرب تھا۔ سلیم نے وحشیانہ صاف گوئی سے کام لے کر اس تحریک کا دوسرا پہلو اس کے پیش نظر کر دیا تھا۔ انسان کی تکمیل اس کی خودی کی تکمیل ہے۔ جب وہ اپنے آپ کو بے عیب، سہو و خطا سے بالاتر سمجھنے لگتا ہے۔ اس وقت وہ جو کچھ کرتا ہے اسے منجانب خدا سمجھتا ہے اس میں غلطی کا امکان کہاں۔ امر کانت کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے چشم فریاد سے آسمان کی طرف دیکھا! اس کی خود اطمینانی محرم طائر کی طرح تڑپ رہی تھی۔ وہ اپنے فعل کی الہامی تصدیق چاہتا تھا۔ طرح طرح کے شکوک پیدا ہو رہے تھے۔ ان بے گناہوں کے خون کی ذمہ داری کیا اس کے سر ہے؟ اس نے کیوں اتنی عجلت سے کام لیا؟ کیا رعایا کی یہی ایک صورت تھی؟ کیا اصلاح کی یہ کوشش نتائج کے اعتبار سے جاری رکھنے کے قابل ہے؟ امر کانت کو چکر آ گیا۔ اندھیرے میں بھولے ہوئے مسافر کی طرح اس کا ضمیر سر جھکا کر دعا کرنے لگا۔ بھگوان مجھے کچھ نہیں سوجھتا۔ سیدھا راستہ کالیخاں کی صورت کسی فرشتہ کی طرح آنکھوں کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

(۹)

پٹھانی کی گرفتاری نے شہر میں ایسی ہلچل مچادی جس کا گمان بھی نہ تھا۔ اس ضعیفہ کے شوق شہادت نے مردوں میں بھی جان ڈال دی۔ مطلب کے بندوں اور بچیاؤں کو بھی میدان عمل میں لا کھڑا کیا لیکن ایسے لوگوں کی اب بھی کمی نہ تھی جو کہتے تھے:۔ اس کے لیئے اب جینا اور مرنا دونوں برابر ہے۔ باہر نہ مری جیل میں مری، ہم کو تو ابھی بہت دن جینا ہے۔ بہت کچھ کرنا ہے۔ ہم آگ میں کیسے کودیں شام کا وقت ہے۔ مزدور اپنے اپنے کام چھوڑ کر، چھوٹے دکان دار اپنی اپنی دکانیں بند کر کے موقع واردات کی طرف بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ پٹھانی اب وہاں نہیں ہے، جیل پہنچ گئی ہوگی مسلح پولیس کا پہرا ہے، کوئی جلسہ نہیں ہوسکتا، کوئی تقریر نہیں ہوسکتی۔ بہت سے آدمیوں کا جمع ہونا خطرناک ہے مگر اس وقت کو ئی کچھ نہیں سوچتا۔ کسی کو کچھ نظر نہیں آتا، سب کے سب ایک سیلابی رو میں بہے جا رہے ہیں۔ ایک لمحے میں سارا میدان مکھیوں کا چھتا بن گیا۔

دفعتاً لوگوں نے دیکھا ایک آدمی اینٹوں کے ڈھیر پر کھڑا لوگوں سے کچھ کہہ رہا ہے۔ چاروں طرف سے دوڑ دوڑ کر لوگ وہاں جمع ہوگئے۔ یہ آدمی کون ہے؟ لالہ سمرکانت! جسکی بہو جیل میں ہے، جس کا لڑکا جیل میں ہے۔

"اچھا! یہ لالہ سمرکانت ہیں! خدا عقل دے تو اس طرح۔ باپ سے جو کچھ کمایا وہ بہن میں لٹا رہے ہیں"

"ہے بڑا خوش نصیب"

"خوش نصیب نہ ہوتا تو بڑھاپے میں اتنا جس کیسے کماتا"

"سنو سنو!"

"وہ دن آئے گا، جب اسی جگہ غریبوں کے گھر بنیں گے اور جہاں ہماری ماتا گرفتار ہوئی ہیں وہیں ایک چوک بنے گا۔ اور اس چوک کے بیچوں بیچ ماتا کی مورت کھڑی کیجائے گی۔ بولو ماتا بھارتی کی جے!"

دس ہزار گلوں سے "ماتا کی جے!" کی آواز نکلنی ہے، مجروح، مشتعل اور رقت خیز، گویا بے کسوں کی آہ دنیا میں کوئی آسرا نہ پاکر آسمان والوں سے فریاد کر رہی ہو۔

"سنو سنو!"

"ماتا نے اپنے بچوں کے لیئے اپنے کو قربان کر دیا۔ ہمارے اور آپ کے بھی بچے ہیں۔ ہم اور آپ اپنے بچوں کے لیئے، اپنے پیارے جگر کے ٹکڑوں کیلئے کیا کرنا چاہتے ہیں اس کا فیصلہ کرنا ہوگا۔"

شور مچتا ہے۔ "ہڑتال۔ ہڑتال۔"

"ہاں ہڑتال کرنا ہوگی۔ دوسرا کوئی علاج نہیں ہے۔ اور وہ ہڑتال ایک دو دن کی نہ ہوگی۔ وہ اس وقت تک رہے گی جب تک ہمارے شہر کے دیوتا ہماری آواز نہ سنیں گے۔ ہم غریب ہیں، بیکس ہیں، بے زبان ہیں۔ لیکن جو لوگ بڑے آدمی کہلاتے ہیں وہ اگر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے تو انھیں معلوم ہوگا کہ انھیں غریب، بیکس اور بے زبان آدمیوں نے بڑا آدمی بنایا ہے۔ یہ بڑے بڑے محل۔ کون جان ہتھیلی پر رکھ کر بناتا ہے؟ ان کپڑوں کے ملوں میں کون اپنا پسینہ بہاتا ہے؟ منہ اندھیرے دروازے پر دودھ اور مکھن لاکر کون پکارتا ہے؟ مٹھائیاں اور پھل لے کر کون ناشتے کے وقت حاضر ہوتا ہے؟ صفائی کون کرتا ہے؟ کپڑے کون دھوتا ہے؟ سویرے اخبار اور چٹھیاں لے کر کون پہنچتا ہے؟

شہر کے نوے فیصدی آدمی ان دس فیصدی آدمیوں کے لیے اپنا خون جلا رہے ہیں، اپنی جان کھپا رہے ہیں۔ اس کا انعام یہ ہے کہ دس فیصدی کے لئے سارا شہر چاہیئے اور نوے فیصدی کے لیئے ایک گوشہ بھی نہیں! ایک ایک بنگلے کے لئے کئی کئی ایکڑ زمین چاہیئے۔ اس میں فوارے ہوں، باغیچے ہوں، لان ہوں، ان بھلے آدمیوں کو خبر نہیں ہے کہ جہاں بے شمار مخلوق تعفن اور تاریکی اور غلاظت میں پڑی مر مر کر امراض کے کیڑے پھیلا رہی ہو وہاں کھلے ہوئے بنگلوں میں رہ کر بھی وہ محفوظ نہیں ہیں۔ یہ کس کی ذمہ داری ہے کہ شہر کے چھوٹے بڑے، امیر غریب، سب ہی آدمی تندرست رہ سکیں! اگر ہماری میونسپلٹی اس مقدم فرض کو پورا نہیں کر سکتی تو اسے توڑ دینا چاہیئے۔ رئیسوں اور امیروں کی کوٹھیوں کے لئے، باغیچوں کے لیئے، کیوں اتنی فیاضی سے زمین دیجاتی ہے؟ اسی لیئے کہ میونسپلٹی کی نظر میں ہماری جان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ وہ شہر کو بڑے بڑے خوبصورت اور شاندار محلوں سے سجا دینا چاہتی ہے۔ اسے بہشت کا نمونہ بنا دینا چاہتی ہے مگر جہاں اندھیری اور بدبو دار گلیوں میں پڑے لوگ کراہ رہے ہوں وہاں ان شاندار محلوں سے کیا ہوگا؟ یہ تو وہی بات ہے کہ کوئی جسم کے کوڑھ کو ریشمی کپڑوں سے چھپا کر اٹھلاتا پھرے۔ دوستو، ظلم کرنا جتنا بڑا گناہ ہے اتنا ہی بڑا گناہ ظلم سہنا بھی ہے۔ آج طے کر لو کہ تم یہ ظلم نہ سہو گے۔ سب ایک دل ہو کر ارادہ کر لو کہ اس ظلم کا خاتمہ کر دو گے۔ جس زمین پر ہم کھڑے ہیں یہاں کم سے کم دو ہزار چھوٹے چھوٹے مکان بن سکتے ہیں۔ دن میں دس ہزار آدمی آرام سے رہ سکتے ہیں مگر یہ ساری زمین چار پانچ بنگلوں کیلئے دیجا رہی ہے میونسپلٹی کو دو لاکھ روپے مل رہے ہیں۔ شہر کے دس ہزار مزدوروں کی جان کی قیمت دو لاکھ کے برابر بھی نہیں؟

یکایک پیچھے کے آدمیوں نے شور مچایا "پولیس آگئی۔ پولیس!"
کچھ لوگ تو دو گیارہ ہوئے، کچھ لوگ سمٹ کر اور آگے بڑھ آئے۔
لالہ سمرکانت بولے "بھاگو مت، پولیس مجھے گرفتار کریگی اس کا مجرم میں ہوں۔ اور میں ہی کیا، میرا سارا گھر اس کا مجرم ہے۔ میرا لڑکا جیل میں میری بہو اور پوتا جیل میں ہے۔ میرے لیے اب جیل کے سوا اور کہاں ٹھکانہ ہے۔ میں تو جاتا ہوں۔ (پولیس سے) دہیں ٹھیرئیے، میں خود آرہا ہوں۔ میں تو جاتا ہوں۔ مگر یہ کہے جاتا ہوں کہ اگر لوٹ گریں نے یہاں ایسے غریب بھائیوں کے جھونپڑوں کی قطاریں پھولوں کی کیاریوں کی طرح لہلہاتی نہ دیکھیں تو یہیں میری چتا بنے گی۔"

لالہ سمرکانت کود کر اینٹوں کے نیچے آئے اور بھیڑ کو چیرتے ہوئے جا کر پولیس کپتان کے پاس کھڑے ہو گئے۔ لاری تیار ہو گئی۔ کپتان نے انھیں لاری میں بٹھایا۔ لاری چل دی۔

"لالہ سمرکانت کی جے!" کی گہری، درد دل میں ڈوبی ہوئی آواز کسی بندھوے جانور کی طرح تڑپتی، چھٹ پٹاتی اٹھی، گویا بیچارگی کی قید کو توڑ کر نکل جانا چاہتی ہو۔

ایک مجمع لاری کے پیچھے دوڑا لالہ سمرکانت کو چھڑانے کے لیے نہیں محض عقیدت کے جوش میں، تحویا تبرک، کوئی دعا، کوئی پیغام پانے کی دیوانہ امنگ میں۔ جب لاری گرد میں غائب ہو گئی تو لوگ لوٹ پڑے۔

"یہ کون بول رہا ہے؟"
"کوئی عورت معلوم ہوتی ہے۔"
"کوئی بھلے گھر کی عورت ہے۔"

"ارے یہ تو وہی ہے، لالہ سمرکانت کی سمدھن۔ رامابائی۔ سچ!"
"اچھا! جس نے اپنی ساری ملکیت پاٹ شالے کے نام لکھ دی؟"
"سنو! سنو!!"

"پیارے بھائیو! لالہ سمرکانت جیسا یوگی جس سکھ کے لیے للچا اٹھا وہ کوئی بہت بڑا سکھ ہوگا، پھر میں تو عورت ہوں اور عورت نبل ہوتی ہی ہے۔ آپ کے شاستر پوران سب یہی کہتے ہیں۔ پھر میں اس لالچ کو کیسے روکوں۔ میں ایک دھنی باپ کی بیٹی، دھنی سسر کی بہو، اور دھنی شوہر کی بیوی عیش و آرام میں زندگی بسر کرنے والی، میں کیا جانوں غریبوں پر کیا گذرتی ہے۔ لیکن آپ کے اس شہر نے میری لڑکی چھین لی میری جمع جتھا بھی چھین لی۔ اور اب میں بھی تم لوگوں کی طرح غریب ہوں۔ اگر کوئی آرزو ہے تو یہی کہ جہاں میرا سب کچھ گیا وہیں میری جان بھی جائے۔ یہیں ایک جھونپڑا بنا کر زندگی کے باقی دن کاٹ دینا چاہتی ہوں۔ اور آپ سے سوال کرتی ہوں کہ مجھے ایک کھاٹ بھر زمین دیجئے۔ تمھیں چھوڑ کر اور کس کے پاس مانگنے جاؤں۔ یہ تمہارا شہر ہے۔ اس کی ایک ایک انگل زمین تمہاری ہے۔ تمھیں اس کے راجا ہو۔ مگر سچے راجاؤں کی طرح تم بھی تیاگی ہو۔ راجہ ہریشچندر کی طرح اپنا سب کچھ دوسروں کو دے کر بھکاریوں کو امیر بنا کر تم آپ بھکاری ہو گئے۔ جانتے ہو وہ کھویا ہوا راج تمھیں کیسے ملے گا؟ تم ڈوم کے ہاتھ جب ہی بک چکے۔ اب تمھیں اپنی شیوا اور اپنے روہتاس کو ترک کر دینا پڑیگا جب ہی دیوتا تم سے خوش ہونگے۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ دیوتاؤں میں تمہارے کھوئے ہوئے راج کو واپس دلانے کی بات چیت ہو رہی ہے۔ آج نہیں تو کل تمہارا راج تمہارے قبضے میں آجائے گا۔ اس وقت مجھے بھول نہ جانا۔ میں تمہارے دربار میں اپنی عرضی پیش کئے جا رہی ہوں۔"

دفعتاً پیچھے سے شور مچا۔ پھر پولیس آ گئی۔

"آنے دو ان کا کام ہے مجرموں کو پکڑنا۔ ہم مجرم ہیں۔ گرفتار کر لئے گئے تو آج شہر میں ڈاکہ ڈالیں گے چوری کریں گے۔ یا کوئی فتنہ کھڑا کریں گے۔ میں کہتی ہوں کوئی طاقت جو رعایا پرحق کی طاقت سے نہیں، جبر کی طاقت سے حکومت کرتی ہے وہ لٹیروں کی جماعت ہے۔ جو لوگ غریبوں کے حقوق پامال کر کے خود صاحب زر ہو رہے ہیں، دوسروں کے اختیار چھین کر خود صاحب اختیار بنے ہوئے ہیں، وہ در اصل لٹیرے ہیں چاہے وہ قانون اور انتظام اور ظاہداری کا کیسا ہی سوانگ کیوں نہ بھریں۔ مگر میری عرضی تمہارے سامنے ہے۔ اس لٹیری میونسپلٹی کو ایسا سبق دو کہ پھر اسے غریبوں کے حقوق پامال کرنے کی جرات نہ ہو جو تمھیں کچلیں، ان کے پاؤں میں کانٹے بن کر چبھ جاؤ۔ کل سے ایسی ہڑتال کرو کہ امیروں اور اختیار والوں کو تمہاری طاقت کا احساس ہو جائے۔ ان پر روشن ہو جائے کہ تمہاری مدد کے بغیر وہ نہ اپنی دولت کا لطف اٹھا سکتے ہیں، نہ اپنے اختیار کا۔ انھیں دکھا دو کہ تمھیں ان کے ہاتھ ہو تمھیں ان کے پاؤں ہو تمہارے بغیر وہ بے دست و پا ہیں۔"

وہ ٹیلے سے نیچے اتر کر پولیس کے عملوں کی طرف چلی تو ساری خلقت دل میں امڈ کر آنکھوں میں رک جانے والے آنسوؤں کی طرح اس کی طرف تکتی رہ گئی باہر نکل کر آئیں اور کیسے توڑیں؟ دلیروں کے آنسو باہر نکل کر سوکھتے نہیں، درختوں کے رس کی طرح اندر رہ کر درخت کو سرسبز اور بار ور کرتے ہیں۔ اتنے بڑے مجمعے میں ایک منہ سے بھی جے جے کی آواز نہ نکلی۔ مگر جب رامابائی موٹر پر بیٹھ گئیں اور موٹر چلی تو عقیدت کی وہ لہر آئی کہ بندشوں کو توڑ کر ایک تیلی، تیز رو، گہری دھار میں نکل پڑی۔

ایک بوڑھے آدمی نے ڈانٹ کر کہا "بچے بہت کر چکے۔ اب گھر جا کر آٹا دال جمع کرلو۔ کل سے لمبی ہڑتال کرنی ہے"۔

ایک دوسرے آدمی نے اس کی تائید کی۔ اور کہا۔ "یہ نہیں کہ یہاں تو گلا پھاڑ پھاڑ چلائے اور سورج نکلتے ہی اپنے اپنے دھندے میں لگ گئے"۔

"اچھا یہ کون کھڑا ہو گیا؟"

"واہ اتنا بھی نہیں پہچانتے۔ ڈاکٹر صاحب ہیں"۔

"ڈاکٹر صاحب بھی آ گئے؟ تب تو فتح ہے"۔

"کیسے کیسے شریف آدمی ہماری طرف سے کھڑے ہیں۔ پوچھو ان بیچاروں کو کیا لینا ہے، جو اپنا عیش و آرام چھوڑ کر، اپنے برابر والوں سے دشمنی مول لیکر جان ہتھیلی پر لیئے تیار ہیں"۔

"ہمارے اوپر اللہ کا رحم ہے۔ ان ڈاکٹر صاحب نے پچھلے دنوں جب پلیگ پھیلا تھا غریبوں کی کیسی خدمت کی ہے کہ واہ! جن کے پاس اپنے بھائی بند تک نہ کھڑے ہوتے تھے ان کے سرہانے رات کی رات بیٹھے رہنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ ہمارے حافظ جی تو کہتے تھے۔ یہ اللہ کا فرشتہ ہے"۔

"سنو سنو! بکواس کرنے کو تو ساری رات پڑی ہے"۔

"بھائیو۔ آپ نے پچھلی بار جو ہڑتال کی تھی اس کا کیا نتیجہ ہوا؟ اگر پھر ویسی ہی ہڑتال ہوئی تو اس سے کہیں بہتر ہے کہ آپ ہڑتال نہ کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہم میں سے کچھ لوگ گرفتار ہو جائیں، باقی آپس میں اختلاف ہونے کے باعث ایک دوسرے کو بدنام کریں گے۔ اور اصلی منشا رفوت ہو جائے گی۔ پرانی کدورتیں نکالی جانے لگیں گی۔ گڑے مردے اکھاڑے جانے لگیں گے۔ نہ کوئی تنظیم رہی گی، نہ کوئی ذمہ داری۔ اس لئے میں آپ سے کہتا ہوں کہ پہلے اپنا دل ٹٹول کر

دیکھ لیجئے اگر اس میں خامی ہو تو ہڑتال کا خیال دل سے نکال ڈالئے۔ اگر یقین ہو جائے کہ وہ اندر سے مضبوط ہے۔ اس میں نقصان اٹھانے کی، بھوکوں مرنے کی، تکلیفیں جھیلنے کی طاقت ہے تو ہڑتال کیجئے۔ اور عہد کر لیجئے کہ جب تک ہڑتال رہے گی تم اپنی عداوتیں بھول جاؤ گے نفع نقصان کی پروا نہ کرو گے۔ تم نے کبڈی تو کھیلی ہی ہوگی۔ کبڈی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک فریق کے سب کھلاڑی مر جاتے ہیں صرف ایک رہ جاتا ہے۔ مگر وہ ایک کھلاڑی بھی اسی طرح قاعدے قانون کی پابندی کرتا ہے گویا اس کے سبھی رفیق زندہ ہیں۔ اسے آخر تک یہ امید رہتی ہے کہ وہ اپنے مرے ہوئے رفیقوں کو جلائے گا۔ اور سب کے سب پھر پوری طاقت سے بازی جیتنے کی کوشش کریں گے۔ وہاں ہر ایک کھلاڑی کا صرف ایک مقصد ہوتا ہے۔ بالا جیتنا۔ کس گوئیاں نے اسے کب گالی دی تھی، کب اس کا کنکوا پھاڑ ڈالا تھا۔ یا کب اسے چانٹا مار کر بھاگا تھا اس کی اسے ذرا بھی یاد نہیں آتی۔ تمہیں بھی اس وقت اسی طرح اپنا کھیل کھیلنا پڑے گا۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ تمہاری فتح ہی ہوگی۔ جیت بھی ہو سکتی ہے، ہار بھی ہو سکتی ہے، جیت یا ہار سے ہمیں غرض نہیں۔ بھوکا بچہ بھوک سے بے قرار ہو کر روتا ہے۔ مٹھائیاں ملیں یا مار۔ اس کی اسے پروا نہیں ہوتی۔ ممکن ہے ماں کے پاس پیسے نہ ہوں یا اس کی طبیعت اچھی نہ ہو بچے کی تو عادت ہے کہ بھوک لگنے پر روئے۔ اسی طرح ہم بھی رو رہے ہیں۔ ہم روتے روتے سو جائیں گے، یا ماں مامتا سے بے تاب ہو کر ہمیں کچھ کھانے کو دے گی، یہ کون جانتا ہے ....."

اور پولیس کپتان تھانے دار کو ڈانٹ رہا تھا "جلد لاری منگواؤ۔ تم بولتا تھا اب کوئی آدمی نہیں ہے۔ یہ کہاں سے نکل آیا؟"

تھانہ دار صاحب نے منہ لٹکا کر کہا "حضور یہ ڈاکٹر صاحب تو آج

پہلی بار پلیٹ فارم پر آئے ہیں۔ ان کی طرف تو ہمارا گمان بھی نہ تھا۔ لاری تو ابھی دیر میں آئے گی حکم ہو تو کوئی تانگہ منگوالوں ؟"

"نہیں۔ سب آدمی تانگہ کو گھیر لے گا۔ دوڑ کر کوئی ٹیکسی لاؤ۔"

ڈاکٹر صاحب کی تقریر جاری تھی۔

"ہماری کسی سے دشمنی نہیں جس سماج میں غریبوں کے لئے جگہ نہیں، وہ اُس مکان کی طرح ہے جس کی بنیاد نہ ہو۔ کوئی ہلکا سا جھونکا بھی اُسے زمین پر گرا سکتا ہے۔ میں اپنے صاحب دولت اور صاحب اختیار بھائیوں سے پوچھتا ہوں۔ کیا یہی انصاف ہے کہ ایک بھائی تو بنگلے میں رہے، دوسرے کو جھونپڑی نصیب نہ ہو۔ کیا تمھیں اپنے ہی جیسے آدمیوں کو اس حالت میں دیکھ کر شرم نہیں آتی۔ تم کہو گے ہم نے عقل کے زور سے ثروت پیدا کی ہے، کیوں نہ اس کا لطف اٹھائیں مگر کیا آپ نے دنیا کی تاریخ نہیں پڑھی؟ جب عقل پر انصاف کی جگہ خود غرضی کا غلبہ ہو جاتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ سماج میں کوئی زبردست انقلاب ہونے والا ہے۔ گرمی بڑھ جاتی ہے تو اس کے بعد ہی طوفان آتا ہے....."

داروغہ نے کہا "ڈاکٹر صاحب، آپ کی تقریر تو ختم ہو گئی ہو گی۔ اب نیچے آجائیے۔ ہمیں کیوں وہاں آنا پڑے۔"

شانتی کمار نے ٹیلے پر کھڑے کھڑے کہا "میں اپنی خوشی سے گرفتار ہونے نہ آؤں گا۔ آپ زبردستی گرفتار کر سکتے ہیں۔" اور پھر تقریر کا سلسلہ جاری کر دیا۔

"مالداروں کو کس حمایت کا غرّہ ہے؟ پولیس کا۔ ہم پولیس ہی سے پوچھتے ہیں، اپنے کانسٹبل بھائیوں ہی سے ہمارا سوال ہے۔ کیا تم بھی غریب نہیں ہو، کیا تم اور تمھارے بچے سڑے ہوئے، اندھیرے، گندے بلوں میں نہیں رہتے؟ لیکن یہ زمانے کی خوبی ہے کہ تم بے انصافی اور ظلم کی حمایت پر

اپنے ہی بال بچوں کا گلا گھونٹنے کے لئے تیار کھڑے ہو.....

کپتان نے مجمع کے اندر جا کر شانتی کمار کا ہاتھ پکڑ لیا اور ٹیلے کے نیچے کھینچ لیا۔ ڈاکٹر صاحب گرتے گرتے بچے۔

دفعتاً نینا سامنے سے آ پہنچی۔

شانتی کمار نے گھبرا کر پوچھا "تم کدھر سے آگئیں نینا سیٹھ جی اور رامادیوی تو چل دیں۔ اب میری باری ہے۔"

نینا مسکرا کر بولی "اور آپ کے بعد میری۔"

شانتی کمار نے سہمی ہوئی آواز میں کہا "نہیں ایسا غضب نہ کرنا۔ اب تمہارا ہی بھروسا ہے۔"

نینا نے کچھ جواب نہ دیا۔ کپتان ڈاکٹر صاحب کو لئے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ اُدھر مجمع میں شور مچ رہا تھا۔ اُن کی سمجھ میں نہ آتا تھا اب اُن کا فرض کیا ہے۔ اُن کی حالت پگھلی ہوئی دھات کی سی تھی۔ جسے کسی سانچے میں ڈھال سکتے ہو۔ اس وقت کوئی بھی چلتا ہوا آدمی انھیں جس طرف چاہے لے جا سکتا تھا۔ تشدد کی طرف بھی آسانی سے۔ اسی وقت نینا جا کر ٹیلے پر کھڑی ہو گئی۔

آج بہت دنوں کے بعد نینا سیر کرنے نکلی تھی۔ راستے میں اُسے لالہ سمرکانت اور رامادیوی کی گرفتاری کی خبر ملی۔ اُس نے ڈرائیور کو اس میدان کی طرف چلنے کا حکم دیا۔ اب وہ زیادہ تحمل نہیں کر سکتی۔ اتنے دنوں اس نے شوہر اور سسر کی مرضی کو مقدم سمجھا تھا۔ اپنی طرف سے کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہتی تھی کہ سسرال والوں کا دل دُکھے لیکن اس خبر نے اُس کے ضبط کا بند توڑ دیا۔ منی رام جامے سے باہر ہو جائیں گے۔ لالہ دھنی رام چھاتی پیٹنے لگیں گے اُسے غم نہیں۔ اگر اس وقت کوئی روک لیتا تو وہ شاید موٹر سے کود

پڑتی۔ وہ فطرتاً شرمیلی عورت تھی۔ روز جلسے ہوتے تھے لیکن اسے کبھی ان میں شریک ہونے یا کچھ بولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ یہ نہیں کہ اس کے دل میں خیالات نہ تھے یا ان کے اظہار پر قادر نہ تھی۔ نہیں، اس کا صرف یہ سبب تھا کہ اُسے مجمع کے روبرو کھڑے ہوتے شرم آتی تھی۔ یا یوں کہو کہ اندر کی پکار کبھی اتنی زوردار نہ ہوئی کہ شرم اور حجاب کی قیدوں کو توڑ دیتی۔ بعض ایسے جانور بھی ہوتے ہیں جن میں ایک خاص آسن ہوتا ہے۔ یوں آپ انھیں مار ڈالئے آگے قدم نہ اٹھائیں گے۔ لیکن آسن پر انگلی رکھتے ہی ان میں ایک نئی قوت عمل، ایک نئی زندگی، پیدا ہو جاتی ہے۔ لالہ سمرکانت کی گرفتاری نے نینا کے دل میں اسی عضو لطیف پر ضرب لگائی اور وہ پہلی بار مجمع کے روبرو آ کھڑی ہوئی۔ بے خوف مستقل، ایک نئی بیداری اور عزم سے پُرنور۔

"بھائیو! میں لالہ سمرکانت کی بیٹی اور لالہ دھنی رام کی بہو ہوں۔ میرا پیارا بھائی جیل میں ہے، پیاری بھاوج جیل میں ہے۔ آج میرے پتاجی بھی وہیں بھیج گئے۔"

ایک آواز آئی "رامانی بھی۔"

"ہاں رامانی بھی جنھیں میں اپنی ماں سمجھتی تھی۔ لڑکی کے لئے وہی میکہ ہے جہاں اس کے ماں باپ، بھائی، بھاوج رہیں۔ اور لڑکی کو میکہ کتنا پیارا ہوتا ہے۔ یہ آپ خوب جانتے ہیں۔ اس زمین کے کئی قطعے میرے سسرجی نے خریدے ہیں۔ مجھے یقین ہے اگر میں ضد کروں تو وہاں امیروں کے بنگلے نہ بنوا کر غریبوں کے جھونپڑے بنوا دیں گے لیکن ہمارا مقصد صرف اتنا ہی نہیں ہے۔ ہماری لڑائی تو اس اصول پر ہے جس شہر کی تین چوتھائی آبادی گندے بلوں میں مر رہی ہو، اُسے کوئی مجاز نہیں ہے کہ محلوں اور بنگلوں کے لئے

زمین نیچے۔ آپ نے دیکھا تھا یہاں کئی ہرے بھرے گاؤں تھے میونسپلٹی نے ایک اصلاحی کمیٹی بنائی۔ کسانوں کی زمین کوڑیوں کے مول چھین لی گئی۔ اور آج وہی زمین اشرفیوں کے مول بک رہی ہے۔ اس لئے کہ بڑے آدمیوں کے بنگلے بنیں۔ ہم بزرگاں شہر سے پوچھتے ہیں کیا امیروں کو ہی صاف ہوا اور روشنی کی ضرورت ہے؟ غریبوں کے جان نہیں ہوتی! امیروں ہی کو تندرست رہنا چاہئے غریبوں کو تندرستی کی ضرورت نہیں۔ امیر دو چار مہینے بیماری کا مزہ اٹھا سکتا ہے۔ اس کے لئے صحت بخش مقامات ہیں جہاں وہ تفریح کے لئے جا سکتا ہے اور جاتا ہے۔ اس کے لئے بڑے بڑے ڈاکٹر ہیں جو ایک بار اُسے موت کے پنجے سے بھی چھڑا سکتے ہیں۔ غریب تو ایک دن بھی بیمار نہیں رہ سکتا۔ اس کی بیماری اسکی موت ہے۔ مگر اب وہ اس طرح مرنے کو تیار نہیں ہے۔ اگر مرنا ہی ہے تو اس میدان میں کھلے ہوئے آسمان کے نیچے، چاند کی سنہری روشنی میں مرنا اندھیرے بلوں میں مرنے سے کہیں اچھا ہے لیکن پہلے ہمیں ان بزرگوں سے ایکبار اور پوچھ لینا ہے کہ وہ اب بھی ہماری درخواست منظور کریں گے یا نہیں۔ اب بھی اس اصول کے سامنے سر جھکائیں گے یا نہیں؟ اگر انہیں گھمنڈ ہو کہ وہ ہتھیار کے زور سے غریبوں کو کچل کر ان کی زبان بند کر سکتے ہیں تو یہ ان کی غلطی ہے۔ غریب کو کچل کر امیر، امیر نہیں رہ سکتا۔ فقیر بھی نہیں رہ سکتا۔ دولت کا انبار ہو کر رہ جائے گا۔ امیروں کی ہستی غریبوں سے قائم ہے۔ غریب ہی اس کی نمائش اور عیش اور تکلف کے سامان پیدا کرتا ہے۔ غریب ہی اسے زندہ رکھتا ہے۔ اگر اس خبط میں پڑ کر ہمارے بزرگ اس وقت غریبوں کی آواز سُن لیں، ان کے مطالبے مان لیں تو انہیں مفت کا احسان ملے گا۔ بالکل مفت۔ کیونکہ غریب بہت دن غریب نہ رہیں گے۔ اور وہ زمانہ دور نہیں ہے جب غریبوں کے ہاتھ میں طاقت ہو گی۔ اور

اوران کے ہاتھ میں امیروں کی قسمت کا فیصلہ ہوگا۔ اس لئے میں لکشمی کے بیٹوں سے کہتی ہوں انقلاب کے درندے کو چھیڑ چھیڑ کر نہ جگائیے۔ اُسے جتنا ہی چھیڑوگے اتنا ہی جھلائے گا۔ اور جب وہ بالآخر اُٹھ کر جمائی لے گا اور زور سے دہاڑے گا تو پھر آپ کو بھاگنے کی راہ نہ ملے گی۔ ہمیں بورڈ کے ممبروں کو بھی جتاونی دینی ہے اور اس کے لئے اس سے بڑھ کر دوسرا موقع نہ ملے گا۔ ممبروں کا جلسہ ہو رہا ہے۔ غالباً اسی زمین کا مسئلہ درپیش ہوگا۔ ہم کو اسی وقت بورڈ کے سامنے حاضر ہو کر اپنی فریاد سنانی چاہیئے۔ دیر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ورنہ ممبر صاحبان اپنے اپنے گھر کی راہ لیں گے ہڑتال میں فساد کا اندیشہ ہے۔ اس لئے ہڑتال اسی حالت میں کرنی چاہیئے جب اور کسی طرح کام نہ نکل سکے۔"

نینا نے جھنڈا اٹھا لیا اور میونسپل آفس کی طرف چلی۔ اس کے پیچھے بیس پچیس ہزار کا مجمع ندی سا اُمنڈتا ہوا چلا۔ اور یہ جماعت میلوں کی بھیڑ کی طرح غیر منظم بھیڑ چال نہ تھی۔ بلکہ فوجی قطاروں کی طرح منظم اور صف بستہ اور ہم قدم چار چار آدمیوں کی بے شمار قطاریں متین انداز سے، ایک خیال، ایک مقصد ایک تحریک کی متحدہ قوت کا احساس کرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ اور ان کا تانتا نہ ٹوٹتا تھا، گویا زمین سے نکلتی چلی آتی ہوں۔ سڑک کے دونوں طرف چھجوں اور چھتوں پر تماشائیوں کی دیواریں کھڑی تھیں۔ سبھی متحیر تھے۔ افوہ! کتنے آدمی ہیں! ابھی چلے ہی آ رہے ہیں۔ کبھی ختم بھی ہوں گے یا نہیں؟

اُدھر میونسپل بورڈ میں تہلکہ مچا ہوا تھا۔

حافظ حلیم نے ٹیلیفون کا چونگا میز پر رکھتے ہوئے کہا "ڈاکٹر شانتی کمار بھی گرفتار ہو گئے۔"

مسٹر سین نے خوش ہو کر کہا "اب اس موومنٹ کا جڑ کٹ گیا۔ ڈاکٹر

اس کا سول (روح) تھا۔"

پنڈت انکارناتھ نے چٹکی لی "اس بلاک پر اب بنگلے نہ بنیں گے جھونپڑے بنیں یا نہ بنیں۔ یہ طے ہے۔"

سین بالو اپنے لڑکے کے نام سے ایک بلاک کے خریدار تھے۔ جل اُٹھے بولے "اگر بورڈ میں اپنے پاس کئے ہوئے رزولیوشنوں پر کام کرنے کی طاقت نہیں ہے تو اُسے ریزائن کر کے الگ ہو جانا چاہیئے۔"

مسٹر شفیع نے جو یونیورسٹی کے پروفیسر اور ڈاکٹر شانتی کمار کے دوست تھے سین کو آڑے ہاتھوں لیا "بورڈ کے فیصلے خدا کے فیصلے نہیں ہیں مسٹر سین بلکہ خدائی فیصلوں میں بھی کبھی ترمیم ہو جاتی ہے۔ اس میدان میں ایک ہزار آدمی رات کو سوتے ہیں۔ انھیں کیا آپ گولی مار دیں گے؟ اور وہاں کون مزدور کام کرنے جائے گا؟ مزدوروں میں ابھی اتنی تنظیم باقی ہے۔ میں بورڈ کو آگاہ کئے دیتا ہوں کہ اگر اس نے اس قرارداد کو منسوخ نہ کر دیا تو شہر پر بہت بڑی آفت آجائے گی۔ سیٹھ سمرکانت اور ڈاکٹر شانتی کمار کا شریک ہونا بتا رہا ہے کہ یہ تحریک بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اس کی جڑ بہت گہری پہنچ گئی ہے اور اسے اکھاڑ پھینکنا اب غیر ممکن ہو گیا ہے۔ بورڈ کو اپنا فیصلہ تبدیل کرنا پڑے گا۔ خواہ آج کرے۔ یا سو دو سو جانوں کی نذر لے کر کرے۔ اب تک کا تجربہ یہی کہہ رہا ہے کہ بورڈ کی سختیوں کا بالکل اثر نہیں ہوا۔ بلکہ الٹا اثر ہوا۔ اب جو ہڑتال ہو گی وہ اتنی خوفناک ہو گی کہ اس کے خیال سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ بورڈ اپنے سر بہت بڑی ذمہ داری لے رہا ہے۔"

مسٹر حامد علی کلاتھ مل کے مینیجر تھے۔ ان کا مل گھاٹے پر چل رہا تھا ڈرتے تھے کہیں لمبی ہڑتال ہو گئی تو بدھیا ہی بیٹھ جائے گی۔ تھے تو بیحد موٹے، مگر بے حد

محنت پسند۔ بوے حق کو تسلیم کرنے میں بورڈ کو کیوں اتنا پس وپیش ہو رہا ہے۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ شاید اس لئے کہ اس کے غرور کو جھکنا پڑے گا۔ لیکن حق کے سامنے جھکنا کمزوری نہیں مضبوطی ہے۔ اگر آج اسی مسئلہ پر بورڈ کا نیا انتخاب ہو تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ بورڈ کی یہ قرار داد حرف غلط کی طرح مٹ جائیگی بیس پچیس ہزار آدمیوں کی بہتری کے لئے اگر بورڈ کو دو چار لاکھ کا نقصان اٹھانا اور دس پانچ ممبروں کی دل شکنی بھی کرنی پڑے تو اُسے تامل نہ کرنا چاہیئے۔۔۔۔۔۔"

پھر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ حافظ حلیم نے رسیور کان سے لگایا اور سنکر بولے "پچیس ہزار بلوائیوں کی فوج ہمارے اوپر دھاوا کرنے آرہی ہے۔ لالہ سمر کانت کی صاحبزادی اور دھنی رام کی بہو اُس کی سرغنہ ہے۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے ہماری رائے پوچھی ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ فائرنگ کئے بغیر مجمع کو پیچھے ہٹانا غیر ممکن ہے۔"

بورڈ کے ممبروں کے چہرے فق ہو گئے۔ فوری عمل کی ضرورت تھی۔ ضابطے کی پابندیوں کا موقع نہ تھا۔ فوراً رائے لی گئی۔ بارہ ہاتھ فائرنگ کے موافق تھے آٹھ مخالف، لالہ دھنی رام غیر جانب دار رہے۔

حافظ حلیم نے تشویش کے انداز سے کہا "تو بورڈ کی رائے ہے کہ جلوس کو روکا جائے چاہے فائر ہی کرنا پڑے۔"

مسٹر سین نے فرمایا "کیا اب بھی کوئی شک ہے؟"

پھر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا "بڑا غضب ہو گیا حافظ جی"

حافظ نے پوچھا۔ کیا بات ہوئی کہئے تو؟"

"ابھی کچھ معلوم نہیں۔ شاید مسٹر دھنی رام غصے سے بھرے ہوئے جلوس کے سامنے آئے اور اپنی بیوی کو وہاں سے ہٹ جانے کو کہا۔ لیڈی نے انکار

کیا۔ اس پر کچھ تکرار ہوئی۔ مسٹر منی رام کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ فوراً لیڈی کو شوٹ کر دیا۔ اگر وہ خود بھاگ نہ جاتے تو دھجیاں اڑ جاتیں۔ جلوس دیوی کی لاش اٹھائے پھر میونسپل بلڈنگ کی طرف جا رہا ہے۔"

حافظ جی نے بیروں کو یہ خبر سنائی تو بورڈ میں سنسنی پھیل گئی۔ گویا کسی جادو سے ساری مجلس نقش دیوار ہو گئی ہو۔

یکایک لالہ دھنی رام کھڑے ہو کر بھرائی ہوئی آواز میں بولے "دوستو، آج پچاس سال سے ایک ایک کنکر چن چن کر جو محل بنا رہا تھا وہ آج آن کی آن میں ڈھ گیا۔ ایسا ڈھ گیا کہ اس کی بنیاد کا بھی پتہ نہیں۔ اچھے سے اچھے مسالے دیئے۔ اچھے سے اچھے کاری گر لگائے۔ اچھے سے اچھے نقشے بنوائے، محل تیار ہو گیا تھا۔ صرف اوپر کا کنگرہ باقی تھا۔ اسی وقت ایک طوفان آتا ہے۔ اور اس عالی شان محل کو اس طرح اڑا لے جاتا ہے، گویا پھوس کا ڈھیر ہو۔ معلوم ہو گیا کہ وہ محل میری زندگی کا محض ایک خواب تھا۔ سنہرا خواب کہئے، تھا خواب ہی وہ خواب آج پریشان ہو گیا۔ پریشان ہو گیا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ دروازے کی طرف چلے۔

حافظ حلیم نے غمناک لہجے میں کہا "سیٹھ جی ..... میں امید کرتا ہوں کہ بورڈ کو بھی آپ سے کمال ہمدردی ہے۔ ہم سب آپ کے ماتم میں شریک ہیں۔"

سیٹھ جی پیچھے پھر کر بولے "اگر بورڈ کو میرے ساتھ ہمدردی ہے تو اسی وقت مجھے اختیار دیجئے کہ جا کر لوگوں سے کہہ دوں، بورڈ نے وہ قطع زمین تمہاری نذر کر دیا۔ ورنہ یہ آگ کتنے ہی گھروں کو بھسم کر دے گی۔ کتنوں ہی کے خواب پریشان کر دے گی۔"

بورڈ کے کئی ممبر بولے "چلئے ہم لوگ بھی آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔"

بس آدمی اُن کے ساتھ چلنے کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ مسٹر سین نے دیکھا کہ وہاں کل چار آدمی رہے جاتے ہیں تو وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے ساتھ ان کے تینوں دوست بھی اٹھے۔ آخر میں حافظ حلیم کا نمبر آیا۔

جلوس اُدھر سے نیتا کی لاش لئے ہوئے چلا آ رہا ہے۔ میلوں کی لمبی قطار ہے منضبط، خاموش، متین۔ نیتا کی شہادت نے انھیں دیوار آہن کی طرح مستحکم اور اٹل بنا دیا ہے۔

اسی وقت بورڈ کے پچیسوں ممبروں نے سامنے سے آکر احترام سے جنازے کے سامنے سر جھکایا۔ اور حافظ حلیم نے آگے بڑھ کر بلند مگر کانپتی ہوئی آواز سے کہا "بھائیو! آپ میونسپلٹی کے ممبروں کے پاس جا رہے ہیں۔ ممبر خود آپ کا استقبال کرنے کو حاضر ہیں۔ اور اپنی عقیدت کے خراج کے طور پر اتفاق رائے سے وہ پورا پلاٹ آپ کی نذر کرتے ہیں اس فیصلے پر بورڈ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ اور آپ کو بھی۔ آج بورڈ نے تسلیم کر لیا کہ وہ غریبوں کی صحت، آرام اور ضروریات کو امیروں کے شوق، تکلف اور ہوس سے زیادہ لحاظ کے قابل سمجھتا ہے۔ آج اس نے تسلیم کر لیا کہ اس قطعے پر غریبوں کا اس سے کہیں زیادہ حق ہے جتنا امیروں کا۔ اس نے تسلیم کر لیا کہ وہ اپنے غریب بھائیوں کی جان کو روپے سے زیادہ عزیز سمجھتا ہے۔ اس نے تسلیم کر لیا کہ شہر کی زینت بڑی بڑی کوٹھیوں اور بنگلوں سے نہیں، چھوٹے چھوٹے آرام دہ مکانوں سے ہے جن میں مزدور اور تھوڑی آمدنی کے لوگ آرام سے رہ سکیں۔ اس نے تسلیم کر لیا کہ مہذب شہریت عوام کی صحت اور زندگی پر قائم ہے۔ میں خود ان آدمیوں میں ہوں جو اس اصول کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ بورڈ کا بڑا حصہ میرے ہی خیال کے آدمیوں کا تھا لیکن آپ کی قربانیوں نے اور آپ کے لیڈروں کی جاں بازیوں نے بورڈ

کی خودسری پر فتح پائی۔ اور آج میں اس فتح پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ اور اس فتح کا سہرا اس دیوی کے سر ہے جس کا جنازہ آپ کے کندھوں پر ہے۔ لالہ سمرکانت میرے پرانے رفیق ہیں۔ ان کا سپوت بیٹا میرے لڑکے کا دلی دوست ہے امرکانت جیسا شریف نوجوان میری نظر سے نہیں گذرا۔ اسی کی صحبت کا اثر ہے کہ آج میرا لڑکا سول سروس چھوڑ کر جیل میں بیٹھا ہوا ہے۔ نینا دیوی کے دل میں اس شہادت سے پہلے برسوں سے جو کشمکش ہوئی ہوگی اس کا اندازہ ہم اور آپ نہیں کر سکتے۔ ایک طرف باپ اور بھائی اور بھاوج جیل میں قید، دوسری طرف شوہر اور خسر ملکیت اور جائداد کی دھن میں مست۔ لالہ دھنی رام مجھے معاف کریں گے۔ میں اُن پر فقرہ نہیں کستا۔ یہ فقروں کا موقع نہیں ہے جس ہوس میں وہ گرفتار تھے، اسی میں ہم۔ اور آپ اور ساری دنیا گرفتار ہے۔ اُن کے دل پر اس وقت ایک ایسے غم کی چوٹ ہے جس سے زیادہ دل شکن کوئی صدمہ نہیں ہو سکتا۔ ہم کو، اور میں یقین کرتا ہوں کہ آپ کو بھی، ان سے کمال ہمدردی ہے۔ ہم سب اُن کے غم میں شریک۔ نینا دیوی کے دل میں میکے اور سسرال کی یہ جنگ شاید اس تحریک کے ساتھ ہی شروع ہوئی۔ اور آج اس کا حسرتناک انجام ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی اس پاک قربانی کی یادگار ہمارے شہر میں ہمیشہ قائم رہے گی۔ میں بت پرست نہیں ہوں، لیکن سب سے پہلے میں تجویز کروں گا کہ اس پلاٹ پر جو بستی آباد ہو اس کے وسط میں اس دیوی کی یادگار نصب کیجائے تاکہ آنے والی نسلیں اس کی شاندار قربانی کی داد تازہ کرتی رہیں۔

دوستو، میں اس وقت آپ کے سامنے کوئی تقریر نہیں کر رہا ہوں۔ نہ یہ تقریر کرنے کا موقع ہے۔ نہ سننے کا۔ روشنی کے ساتھ تاریکی ہے۔ جیت کے ساتھ اور خوشی کے ساتھ غم۔ تاریکی اور روشنی کا میل سہانی صبح ہے، جیت اور ہار کا

میل صلح۔ یہ خوشی اور غم کا میل ایک نئے دور کا آغاز ہے اور خدا سے ہماری دعا ہے کہ یہ دور ہمیشہ قائم رہے۔ ہم میں ایسی ہی حق پر جان دینے والی ہستیاں پیدا ہوتی رہیں، کیونکہ ایسی ہستیوں سے دنیا کا نظام قائم ہے۔ آپ سے ہماری گذارش ہے کہ اس فتح کے بعد ہارنے والوں کے ساتھ وہی سلوک کیجئے جو بہادر دشمن کے ساتھ کیا جانا چاہیئے۔ ہماری اس پاک سرزمین میں ہارے ہوئے دشمنوں کو دوست سمجھا جاتا تھا۔ لڑائی ختم ہوتے ہی ہم غصّہ اور رنجش کو دل سے نکال ڈالتے تھے۔ اور دل کھول کر دشمن سے گلے مل جاتے تھے۔ آئیے ہم اور آپ گلے مل کر اس دیوی کی روح کو خوش کریں۔ جو ہماری سچی رہنما، تاریکی میں صبح کا پیغام لانے والی سفیدی تھی۔ خدا ہمیں توفیق دے کہ اس سچے شہید سے ہم حق پرستی اور خدمت کا سبق حاصل کریں۔"

حافظ جی کے خاموش ہوتے ہی "نینا دیوی کی جے" ایسی عقیدت میں ڈوبی ہوئی آواز تھی کہ آسمان تک ہل اٹھا۔ پھر "حافظ زندہ باد" کے نعرے بلند ہوئے۔ صرف حافظ حلیم میونسپلٹی کے دفتر میں جا بیٹھے اور پولیس کے حکام سے قیدیوں کی رہائی کے متعلق مشورہ کرنے لگے۔

جس یگیہ کو چھ مہینے پہلے ایک دیوی نے شروع کیا تھا۔ اُسے آج ایک دوسری نے اپنی جان کی قربانی دے کر ختم کر دیا۔

(۱۰)

ادھر سکینہ زنانے جیل میں پہنچی۔ ادھر سکھدا، پٹھانی اور راما دیوی کی رہائی کا پروانہ آ پہنچا۔ اُس کے ساتھ ہی نینا کی شہادت کی خبر بھی پہنچی۔ سکھدا سر جھکائے بت کی طرح بیٹھی رہ گئی۔ گویا تن میں جان نہ ہو۔ کتنی مہنگی فتح تھی۔

راما بائی نے گہری سانس کھینچ کر کہا "دنیا میں ایسے ایسے کٹھ کلیجے بھی پڑے ہوئے ہیں جو خود غرضی کے نشے میں بیوی کا خون بھی کر سکتے ہیں"۔ سکھدا جنون کی کیفیت میں بولی "اس نے نینا کو قتل نہیں کیا، اماں۔ اس فتح کے لئے قربانی دی بغیر اس کے یہ فتح ناممکن تھی"۔ پٹھانی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "مجھے تو یہی رونا آتا ہے کہ امر بھیا کو کتنا رنج ہوگا۔ بھائی بہن میں اتنی محبت میں نے نہیں دیکھی"۔

جیلر نے آکر کہا "آپ لوگوں کو رہائی کی خوشخبری اور اس پر مبارکباد دیتا ہوں تیار ہو جائیے۔ شام کی گاڑی سے سکھدا دیوی، پٹھانی اور راما دیوی کو جانا ہے ہم لوگوں سے جو خطا ہوئی ہو اُسے معاف کیجئے گا"۔

کسی نے اس کا جواب نہ دیا۔ گویا کچھ سنا ہی نہیں۔ فتح کی خوشی بھی اس غم میں ڈوب گئی تھی۔

سکینہ نے سکھدا کے کان میں کہا "جانے سے پہلے ذرا بابو جی سے مل لیجیگا۔ اس سانحے کی خبر سن کر معلوم نہیں دشمنوں پر کیا گذرے۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے"۔

بچہ راما کانت سامنے صحن میں کیچڑ سے پھسل کر گر گیا تھا اور پیروں کو زمین کو اس شرارت کی سزا دے رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ گلا پھاڑ پھاڑ کر فریاد بھی کرتا تھا سکینہ اور سکھدا دونوں اُسے اٹھانے دوڑیں۔ اور درخت کے نیچے کھڑی ہو کر

اسے چپ کرنے لگیں۔

سکینہ کل صبح آئی تھی لیکن اب تک سکھدا اور اس میں رسمی آداب وسلام کے سوا اور کوئی بات چیت نہ ہوئی تھی۔ سکینہ جھیپتی تھی کہ کہیں سلیم کا ذکر نہ چھڑ جائے اور سکھدا اس طرح اُس سے آنکھیں چرائی تھی گویا سکینہ کی تپسیا اس کی بے وفائی کا داغ مٹانے کے لئے کافی نہیں ہوئی۔ وہی سکھدا جو امر کانت کو ظالم اور بیوفا سمجھتی تھی، اس وقت سکینہ کو مورد الزام ٹھہرا رہی تھی اس کے خیال میں ایک بار جس سے پریم ہو جائے۔ اس کے نام پر زندگی کاٹ دینی چاہیئے تھی۔

مگر اس کی اصلاح میں جو ہمدردی اور دلسوزی تھی، اس نے سکھدا کو مغلوب کر دیا۔ بولی "جہاں ارادہ تو کر رہی ہوں۔ تمہارا بھی کوئی سندیسا کہنا ہے؟"

سکینہ اس بیرحمانہ چوٹ پر تلملا اٹھی۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی "میں کیا سندیسا کہوں گی بہوجی۔ اتنا ہی کہہ دیجئے گا کہ نینا دیوی چلی گئیں۔ مگر جب تک سکینہ زندہ ہے آپ اسے نینا ہی سمجھتے رہئے۔"

سکھدا نے اُسی بے رحمانہ تبسم کے ساتھ کہا "میں سمجھتی تھی تم سے اُن کا کوئی دوسرا ہی رشتہ تھا؟"

سکینہ نے گویا اس وار کو رد کیا "تب انھیں معشوق کی ضرورت تھی آج بہن کی ضرورت ہے۔"

سکھدا خفیف ہو گئی "میں تو تب بھی زندہ تھی۔"

سکینہ نے دیکھا جس موقع سے وہ کانپ رہی تھی وہ آج ناخواستہ سر پر آپہنچا۔ اب اپنی صفائی پیش کرنے کے سوا اس کے لئے اور کوئی راستہ نہ تھا۔

اس نے پوچھا "میں کچھ کہوں برا تو نہ مانئے گا؟"

"بالکل نہیں۔"

"تو سنئے۔ تب آپ نے انھیں گھر سے نکال دیا تھا۔ آپ پورب جاتی تھیں وہ پچھم جاتے تھے۔ اب آپ اور وہ ایک دل، ایک جان، ایک خیال ہیں۔ جس بات کو وہ زندگی کی معراج سمجھتے تھے وہ آپ نے پوری کر دکھائی۔ آج وہ آپ کو پا جائیں تو آپ کے قدموں کا بوسہ لیں۔"

سکھدا کو اس کے جواب میں وہی لطف آیا جو ایک شاعر کو دوسرے شاعر سے داد سخن پاکر حاصل ہوتا ہے اس کے دل میں جو بدگمانی اور کدورت اب بھی چھپی ہوئی تھی۔ وہ جیسے آپ ہی آپ نکل پڑی۔

"یہ تو تمہارا خیال ہے سکینہ۔ ان کے دل میں کیا ہے یہ کون جانتا ہے۔ مردوں پر اعتبار کرنا میں نے چھوڑ دیا۔ اب وہ چاہے میری کچھ عزت کرنے لگیں عزت تو پہلے بھی کم نہ کرتے تھے۔ لیکن تمہیں وہ دل سے نکال سکتے ہیں۔ اس میں مجھے شک ہے۔ تمہاری شادی میاں سلیم سے ہو جائے گی۔ پھر بھی دل میں وہ تمہاری پوجا کرتے رہیں گے۔"

سکینہ کا بشرہ خشک ہو گیا۔ نہیں وہ سہم اٹھی۔ جیسے کوئی دشمن اُسے دم دے کر اس کے گلے میں پھندا ڈالنے جا رہا ہو۔ اس نے گویا گلے کو بچاتے ہوئے کہا "تم اُن کے ساتھ پھر ظلم کر رہی ہو بہن، وہ ان آدمیوں میں نہیں ہیں۔ جو دنیا کے ڈر سے کوئی کام کریں۔ انھوں نے خود سلیم سے میری خط و کتابت کروائی۔ میں ان کی منشا سمجھ گئی۔ مجھے معلوم ہو گیا تم نے اپنے روٹھے ہوئے دیوتا کو منا لیا۔ مجھے اس پر رنج کے بدلے خوشی ہوئی۔ اس لئے نہیں کہ میں کوئی دیوی ہوں۔ بلکہ محض اس لئے کہ مجھے خوف تھا میں انھیں خوش رکھ سکوں گی یا نہیں۔ میں دل میں کانپ رہی تھی۔ اپنی کم لیاقتی پر۔ اپنے گنوارپن پر۔ میری حالت

اس کنگلے کی سی ہو رہی تھی جو خزانہ پاکر بوکھلا گیا ہو۔ اپنی جھونپڑی میں اُسے کہاں رکھے، کیسے اس کی حفاظت کرے۔ ان کی اصلی منشا سمجھ کر میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ میں باتیں نہیں بنا رہی ہوں، دل کی اصلی کیفیت بیان کر رہی ہوں دیوتا پوجا کرنے کی چیز ہے۔ وہ ہمارے گھر میں آجائے تو اسے کہاں بٹھائیں کہاں سلائیں، کہاں کھلائیں۔ مندر میں جاکر ہم ایک لمحے کے لئے کتنے دیندار، کتنے پرہیزگار بن جاتے ہیں۔ گھر میں آکر اگر دیوتا ہماری اصلی صورت دیکھے تو شاید ہم سے نفرت کرنے لگے سلیم کو میں سنبھال سکتی ہوں، وہ اسی دنیا کے آدمی ہیں میں انھیں سمجھ سکتی ہوں۔ امرکانت کو سمجھنا میرے لئے مشکل ہے۔"

اسی وقت زنانے وارڈ کا دروازہ کھلا اور تین قیدی اندر داخل ہوئے تینوں گھنٹوں تک جانگئے اور آدھی بانہہ کے اونچے کرتے پہنے ہوئے تھے ایک کے کندھے پر بانس کی سیڑھی تھی۔ دوسرے کے سر پر چونے کی بوری تیسرا چونے کی ہانڈی، کوچیاں اور بالٹیاں لئے ہوئے تھا۔ آج سے زنانے جیل کی پتائی ہوگی۔ سالانہ صفائی اور مرمت کا زمانہ آگیا ہے۔

سکینہ نے قیدیوں کو دیکھتے ہی اچھل کر کہا "وہ تو جیسے بابوجی ہیں۔ ڈول اور رسی لئے ہوئے۔ سلیم سیڑھی اٹھائے ہوئے ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے اُس نے بچے کو گود میں اٹھالیا اور اسے بھینچ بھینچ کر پیار کرتی ہوئی دروازے کی طرف لپکی۔ بار بار اُس کا منہ چومتی اور کہتی جاتی تھی۔ چلو تمہارے بابوجی آئے ہوئے ہیں۔ دوڑ چلو۔ دوڑ چلو۔ مسرت نے جیسے دیوانہ کر دیا ہو۔ جیسے دل میں پیار امڈ رہا ہو۔

سکھدا بھی آرہی تھی۔ مگر آہستہ آہستہ۔ اُسے رونا آرہا تھا۔ آج اتنے دنوں بعد ملاقات بھی ہوئی تو اس وشا میں۔

یکایک منی جانے کدھر سے دوڑتی ہوئی آئی اور امر کے ہاتھ سے رسی اور ڈول چھینتی ہوئی بولی "ارے! یہ تمہارا کیا حال ہے لالہ؟ آدھے بھی نہیں رہے چلو آرام سے بیٹھو۔ میں پانی کھینچے دیتی ہوں"

امر نے ڈول کو مضبوط پکڑ کر کہا "نہیں نہیں تم سے نہ بنے گا۔ ڈول بہت بھاری ہے۔ چھوڑو۔ اونہہ کیا کرتی ہو۔ جیلر دیکھے گا تو مجھ پر ڈانٹ پڑے گی"

منی نے ڈول چھین کر کہا "میں جیلر کو جواب دے لوں گی۔ ایسے ہی تھے تم وہاں"

ایک طرف سے سکینہ اور سکھدا۔ دوسری طرف سے پٹھانی اور راما آ پہنچیں مگر کسی کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ سبھوں کی آنکھیں نم تھیں اور گلے بھرے ہوئے۔ چلی تھیں خوشی کے ولولے میں۔ پر ہر قدم کے ساتھ پانی گہرا ہوتے ہوتے بالآخر سر تک آ پہنچا تھا۔

امر کانت ان دیویوں کو دیکھ کر پُرغرور عقیدت سے پھول اٹھا۔ ان کے مقابل وہ کتنا حقیر تھا، کتنا ناچیز، کن الفاظ میں ان کی تعظیم کرے۔ کیسے اپنی عقیدت کا اظہار کرے۔ کیا پیش کش لے کر ان کے سامنے حاضر ہو، اس کی امید پرور رنگاہوں میں بھی قوم کا مستقبل کبھی اتنا روشن نہ تھا۔ اس کے سر سے پاؤں تک قومی غرور کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ آنکھوں میں ذوق پرستش کے آنسو جھلک آئے۔ مست ہو گیا۔

دوسروں کی گرفتاری کی خبر تو اسے مل چکی تھی۔ مگر راما بائی کو وہاں دیکھ کر اس پر وجدانی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کے قدموں پر گر پڑا۔ راما بائی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے دعا دیتے ہوئے کہا "آج چلتے چلاتے تم سے خوب ملاقات ہو گئی بیٹا۔ ایشور تمہاری مرادیں پوری کرے۔ مجھے تو یہاں آئے

آج پانچواں دن ہے۔ پر ہماری رہائی کا حکم آگیا۔ نینا نے ہمیں قید سے چھڑایا۔
امر نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا۔ "تو کیا نینا بھی آگئی؟ اس کے گھر والے تو بہت بگڑے ہوں گے۔"

سبھی دیو باں رو پڑیں۔ اس سوال نے گویا ان کے کلیجے مسوس لیے کیسے کہدیں کہ تمھاری نینا نے خود ہستی کی قید سے آزاد ہو کر ہمیں جیل کی قید سے چھڑایا۔ اتنی ہمت کہاں سے لائیں۔ بہن کا عاشق بھائی یہ خبر سن کر کیا چھاتی نہ پیٹنے لگے گا!

امر نے حیرت کی آنکھوں سے ہر ایک کے منہ کی طرف دیکھا۔ ایک الہامی دہشت سے اس کا سارا جسم تھرا اٹھا۔ ان چہروں پر فتح کی مسرت نہیں غم کی افسردگی چھائی ہوئی تھی بے صبر ہو کر بولا۔ "کہاں ہے وہ؟ یہاں کیوں نہیں آئی۔ اس کی طبیعت اچھی نہیں ہے کیا؟"

راما بائی نے دل کو سنبھال کر کہا۔ "نینا کو آکر چوک میں دیکھنا بیٹا! جہاں اس کی مورت کھڑی کی جائے گی۔ اس نئے چوک میں جو بننے والا ہے۔ وہ شہر کی دیوی ہے۔ ہر ایک دل میں تم اسے عقیدت کے سنگھاسن پر بیٹھا پاؤ گے۔"

امر کی کیا حالت ہوئی؟ اس پر بجلی گر پڑی، یا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ یہ جملے اس کے دل کی کیفیت نہیں ظاہر کر سکتے۔ وہ وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اسے چاروں طرف ایک خلا سا محسوس ہوا۔ اب دنیا میں اس کا زندہ رہنا بے کار ہے! نینا گویا جنت کے دروازے پر کھڑی اسے بلا رہی تھی۔

راما دیوی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بیٹا اس کے لئے کیا رونا ہو وہ مری نہیں۔ امر ہو گئی۔ اسی کی قربانی سے یہ یگیہ پورا ہوا۔"

سلیم نے گلا صاف کرکے پوچھا۔ "بات کیا ہوئی۔ وہ تو کسی تحریک میں حصہ نہ لیتی تھیں؟"

رامانے جواب دیا۔ "وہیں میدان میں جلسہ ہو رہا تھا۔ لالہ سمرکانت، میں اور ڈاکٹر صاحب گرفتار ہو چکے تھے۔ اُسی وقت نینا پہنچی اور سب آدمیوں کو ساتھ لے کر میونسپل بورڈ کے دفتر کو چلی۔ ایک لاکھ سے کم کا مجمع نہ تھا۔ اُسی وقت منی رام نے آکر اس پر گولی چلا دی۔ وہیں گر پڑی۔ کچھ منہ سے کہنے بھی نہ پائی۔"

امر کو جوں جوں اس معصوم زندگی کے واقعات یاد آتے تھے، اس کے دل میں گویا غم کا ایک نیا سوتا کھل جاتا تھا۔ اُس دیوی کے ساتھ اس نے اپنا ایک فرض بھی تو نہ ادا کیا۔ یہ سوچ کر اس کا دل مسوس اٹھا۔ وہ اگر گھر چھوڑ کر نہ بھاگا ہوتا تو لالہ سمرکانت کیوں اسے حریص اور بدمزاج منی رام کے گلے باندھتے! اور کیوں اُس کی یہ افسوسناک موت ہوتی۔ اس تحمل اور وفا اور پریم کی دیوی کے ساتھ اس نے اپنا کوئی فرض نہ پورا کیا۔ یہ داغ اس کے دل سے کبھی نہ مٹے گا!

لیکن دفعتاً اس دریائے غم میں ڈوبتے ہوئے اُسے مشیت غیب کی ایک کشتی سی مل گئی۔ غیبی تحریک کے بغیر کسی میں خدمت اور قربانی کا یہ جوش کیسے پیدا ہو سکتا تھا؟ خانہ داری کے فکروں میں اور نفس کی پرستش میں اور دنیا کی نعمتوں کی ہوس میں تو ساری دنیا مرتی ہے۔ عوام کی خدمت میں شہید ہونے کا فخر تو خاصان خدا کو ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ امر کی حرماں نصیب آنکھوں میں چاروں طرف مشیتِ ایزدی کے جلوے نظر آئے، ساری لامحدود روشن!

سلیم نے پھر پوچھا۔ "بیچارے لالہ جی کو تو بہت رنج ہوا ہوگا؟"

رامادیوی نے فخر کے ساتھ کہا۔ "وہ تو پہلے ہی گرفتار ہو چکے تھے بیٹا اور ڈاکٹر صاحب بھی۔"

امر کو ایسا معلوم ہوا اس کی آنکھوں کا نور دوچند ہو گیا ہے۔ اس کے بازوؤں میں چوگنی طاقت آ گئی ہے۔ اُس نے وہیں ایشور کے قدموں پر سر جھکا دیا اور اب اُس کی آنکھوں سے جو آنسو گرے وہ رنج کے نہیں، غرور اور مسرت کے تھے۔ اُس کے دل میں ایمان اور یقین کا ایک نغمہ سا گونج اٹھا۔ جو کچھ ہے رضائے الٰہی ہے۔ جو کچھ کرتا ہے وہ کرتا ہے وہی حیات کا مخزن اور مسرت کا منبع ہے۔

سکینہ اور منی دونوں اس کے سامنے کھڑی تھیں۔ جس نظارے سے اس کے دل میں خواہشات کا ایک طوفان سا اٹھنے لگتا تھا اُسی نظارے میں آج اس نے پاکیزہ محبت کے درشن پائے جو خواہشات کو فنا کر دیتا ہے، اور انھیں کی خاک سے ایثار اور بیداری کے پھول کھلاتا ہے۔ جو انسان کو شوق اور تمنا کی پستی سے اٹھا کر نیاز اور قربانی کے عروج پر لے جاتا ہے۔ اُسے ایسا گمان ہوا وہ خود پاسک ہے اور یہ عورتیں اس کی دیویاں ہیں جن کے قدموں کی خاک کو پیشانی پر لگانا ہی گویا اس کی زندگی کی معراج ہے۔

رامادیوی نے بچے کو سکینہ کی گود سے لے کر امر کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔ "یہی تیرے بابو جی ہیں۔ ان کے پاس جا۔"

بچے نے امرکانت کا وہ قیدیوں کا باناد یکھا تو چلا کر رامادیوی سے چمٹ گیا۔ پھر اسی گود میں منہ چھپائے کنکھیوں سے امر کو دیکھنے لگا، گویا میل تو کرنا چاہتا ہے لیکن خوف یہی ہے کہ یہ سپاہی اسے پکڑ نہ لے۔ کیونکہ اس دھجے کے آدمی کو اپنا بابو جی سمجھنے میں اُس کے بھولے بھالے دل کو تامل ہو رہا تھا۔

سکھدا کو بچے پر غصہ آیا۔ "کتنا ڈرپوک ہے گویا وہ اسے کھا جاتے۔"

امر کانت نے سکھدا کی طرف روئے سخن کر کے کہا۔ "سوچتا ہوگا یہ بن مانس بھلا یا بوجی ہو سکتا ہے۔ (ایک لمحے کے بعد) آپ لوگ اس میدان میں ہم سے بازی لے گئیں۔ آپ نے جس کام کا بیڑا اٹھایا اسے پورا کر دکھایا۔ ہم تو جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے ہیں جو تھوڑی بہت ہلچل یہاں ہوتی ہے اس کا جس بھی منی بہن کو ہے۔ ان دونوں دیویوں کے دل میں قومی خدمت کا جوش و ولولہ اور فرض کے لئے جو عشق ہے اس نے ہمارا سر اونچا کر دیا۔ سکھدا نے جو کچھ کیا وہ آپ لوگ مجھ سے زیادہ جانتی ہیں۔ تین سال کے قریب ہوئے جب میں باغی ہو کر گھر سے بھاگا تھا۔ سمجھتا تھا ان کے ساتھ میری زندگی برباد ہو گئی۔ لیکن آج میں اُن کے قدموں کی خاک کو اپنی پیشانی پر لگانے میں اپنی عزت سمجھتا ہوں۔ میں سبھی ماؤں اور بہنوں کے سامنے اُن سے معافی مانگتا ہوں۔"

سلیم نے مسکرا کر کہا۔ "یوں زبانی نہیں۔ پہلے آپ ان کے قدموں کی خاک ماتھے پر ملئے اور تب کان پکڑ کر ایک لاکھ بار اُٹھئے بیٹھئے۔"

امر نے جواب دیا۔ "اب تم مجسٹریٹ نہیں ہو بھائی، بھولو مت، ایسی سزائیں اب نہیں دے سکتے۔"

سلیم نے پھر شرارت کی۔ سکینہ سے بولا۔ "تم چپ چاپ کیوں کھڑی ہو سکینہ، تمھیں بھی تو ان سے کچھ کہنا ہے، یا موقع تلاش کر رہی ہو؟"

پھر امر سے بولا۔ "آپ اپنے قول سے پھر نہیں سکتے جناب۔ جو وعدے کئے ہیں وہ پورے کرنے پڑیں گے۔"

سکینہ کا چہرہ مارے شرم کے سرخ ہو گیا۔ جی چاہتا تھا جا کر سلیم کے چٹکی لے چہرے پر مسرت اور شگفتگی کا ایسا شوخ رنگ تھا جو چھپائے نہ چھپتا تھا۔ گویا اس کے چہرے پر بہت دنوں سے جو سیاہی لگی ہوئی تھی وہ آج دھل گئی ہو۔ اور

وہ دنیا کے سامنے اپنی صفائی کا ڈھنڈھورا پیٹنا چاہتی ہو۔ اس نے پٹھانی کو ایسی نظروں سے دیکھا جو ملامت آمیز لفظوں میں کہہ رہی تھیں۔ اب تمہیں معلوم ہوا تم نے کتنی بڑی حماقت کی تھی! اپنی نظروں میں وہ کبھی اتنی اونچی نہ اٹھی تھی۔ زندگی میں اُسے اتنی نیکنامی اور اتنی عزت ملے گی اس کا تو اسے خواب میں بھی گمان نہ تھا۔

سکھدا کے چہرے پر بھی غرور اور مسرت کی جھلک کچھ کم نہ تھی۔ وہاں جو حسرت اور افسردگی چھائی رہتی تھی اس کی جگہ ایک دلاویز شگفتگی نظر آرہی ہے۔ آج اُسے کوئی ایسی نعمت مل گئی ہے جس کی تمنا پنہاں رہ کر بھی اس کی زندگی میں ایک خلا کی، ایک تشنگی کی یاد دلاتی رہتی تھی۔ اس خلا میں جیسے آج شہد بھر گیا ہے وہ تشنگی گویا بارش کے قطروں سے ہریالی بن گئی ہے۔

رہی منی، وہ الگ بیدل سی سر جھکائے کھڑی ہے۔ اس کی زندگی کی سونی منڈیر پر ایک طائر نہ جانے کہاں سے اُڑتا ہوا آکر بیٹھ گیا تھا۔ وہ آنچل میں دانے بھرے، آآ کرتی، پاؤں دبائے، اسے پکڑنے کے لئے لپکی۔ اُس نے دانے زمین پر بکھیر دئے۔ طائر نے دانے چگے؛ اُسے پُراعتبار نظروں سے دیکھا گویا پوچھ رہا ہو، تم مجھے محبت سے پالوگی یا چار دن من بہلا کر پر کاٹ لگی اور دیواروں سے سر ٹکرانے کے لئے چھوڑ دوگی؛ لیکن اس نے جوں ہی طائر کو پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا، وہ پھر سے اڑ گیا اور تب ایک اونچی شاخ پر پھدکتا ہوا اُسے شبہ کی نظروں سے دیکھنے لگا، گویا کہہ رہا ہو، میں آسمان کا سیاح ہوں۔ تمہارے پنجرے میں میرے لئے سوکھے دانے اور کُلھیا میں پانی کے چند قطروں کے سوا اور کیا ہے۔

سلیم نے ناند میں قلمی ڈالدی۔ سکینہ اور منی نے ایک ایک ڈول

اٹھالیا اور پانی لانے چلیں۔

امر کانت نے کہا۔ "بالٹی مجھے دیدو میں بھرے لاتا ہوں۔"

منی بولی۔ "تم پانی بھروگے اور ہم بیٹھے دیکھیں گے؟"

امر نے ہنس کر کہا۔ "اور کیا تم پانی بھروگی اور میں تماشا دیکھوں گا۔"

منی بالٹی لے کر بھاگی۔ سکینہ بھی اس کے پیچھے دوڑی۔

راما دیوی امر کانت کے لئے کچھ ناشتہ بنانے چلی گئی تھی۔ یہاں جیل میں بیچارے کو روٹی دال کے سوا اور کیا ملتا ہے۔ وہ بھی گت کی نہیں۔ وہ چاہتی تھی پکوان کا ایک تھال لائے اور اُسے کھلا کر خوش ہو۔ راما دیوی کو جیل میں بھی گھر کی ساری سہولتیں حاصل تھیں۔ لیڈی جیلر، چوکیدارنیں، اور دیگر عملہ سبھی اُس کے غلام تھے۔ پٹھانی کھڑی کھڑی تھک جانے کے باعث جا کر لیٹ رہی تھی۔ منی اور سکینہ پانی لانے چلی گئیں۔ سلیم کو بھی سکینہ سے نہ جانے کتنی باتیں کہنی تھیں۔ وہ بھی بیلے کی طرف چلا گیا۔ یہاں صرف امر اور سکھدارہ گئے۔

امر نے سکھدا کے قریب آکر بچے کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔ "یہ جیل تو میرے لئے جنت ہو گیا۔ سکھدا جتنی تپسیا کی تھی اُس سے کہیں زیادہ پھل پایا۔ اگر دل کو کھول کر دکھانا ممکن ہوتا تو دکھا دیتا کہ مجھے تمہاری کتنی یاد آتی تھی۔ بار بار اپنی حماقت پر پچھتاتا تھا۔"

سکھدا نے بات کاٹی۔ "اچھا! اب تم نے باتیں بنانے کا فن بھی سیکھ لیا۔ تمہارے دل کا حال کچھ کچھ مجھے بھی معلوم ہے۔ اُسے کھول کر دکھانے کی ضرورت نہیں۔ اس میں نیچے سے اوپر تک غصہ ہی غصہ بھرا ہوا ہے۔ عفو یا رحم کا نام بھی نہیں۔ میں شوقین سہی، عیش پسند سہی، لیکن اس خطا کی یہ سزا! اور جب یہ جانتے تھے کہ وہ میری خطا نہیں، میری پرورش اور تربیت کی خطا تھی۔"

امر نے شرمندہ ہو کر کہا۔ "تم بے انصافی کر رہی ہو سکھدا۔"

سکھدا نے اُس کی ٹھڈی کو اوپر اٹھا کر کہا۔ "میری طرف دیکھو! میری ہی بے انصافی ہے۔ تم انصاف کے پتلے ہو۔ بچا۔ تم نے سیکڑوں خط بھیجے۔ میں نے ایک کا بھی جواب نہ دیا۔ کیوں؟ میں کہتی ہوں تمھیں اتنا غصہ آیا کیسے؟ اور ایک بیکس عورت پر جو تمھارے قدموں تلے پڑی ہوئی تھی۔ آدمی کو اپنے پالے ہوئے جانوروں سے بھی محبت ہو جاتی ہے۔ میں تو پھر بھی انسان تھی روٹھ کر ایسا بھول گئے گویا میں مر گئی۔"

امر کانت اس الزام کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ پھر بھی ہٹ دھرمی کرتا ہوا بولا۔ "تم نے بھی تو کوئی خط نہیں لکھا؟ اور میں لکھتا بھی تو تم جواب دیتیں؟ دل سے کہنا۔"

"تو تم مجھے سبق دینا چاہتے تھے؟"

"نہیں نہیں۔ یہ بات نہیں ہے سکھدا۔ ہزاروں بار ارادہ ہوا کہ تمھیں خط لکھوں۔ لیکن ....."

سکھدا نے جملے کو پورا کیا۔ "لیکن خوف یہی تھا کہ شاید میں تمھارے خطوں کو آنکھ اٹھا کر دیکھتی بھی نہیں۔ اگر عورت کے دل کا تمھیں یہی علم ہے تو میں کہوں گی تم نے اُسے بالکل نہیں سمجھا۔"

امر نے اپنی شکست کا اعتراف کیا۔ "تو میں نے یہ دعویٰ کب کیا تھا کہ میں عورت کے دل کا پرکھی ہوں؟"

امر کانت نے یہ دعویٰ نہ کیا ہو۔ لیکن سکھدا کے خیال میں اُسے یہ دعویٰ تھا۔ میٹھے شکوے کے ساتھ بولی۔ "مرد کی بہادری تو اس میں نہیں ہے کہ عورت کو اپنے پیروں پر گرائے۔ میں نے اگر تمھیں خط نہ لکھا تو اس کا سبب

تھا۔ تم نے میرے ساتھ ظلم کیا تھا۔ میری توہین کی تھی۔ مجھے پیروں سے کچلا تھا..... لیکن ان باتوں کو جانے دو۔ کہیں بڑھ نہ جائیں۔ یہ بتاؤ جیت کس کی ہوئی میری یا تمھاری؟"

امر نے کہا۔ "میری۔"

"اور میں کہتی ہوں، میری۔"

"کیسے؟"

"تم نے بغاوت کی تھی۔ میں نے تشدد کے زور سے اسے فرو کر دیا۔"

"نہیں تم نے میرے مطالبے منظور کر لئے۔"

اسی وقت سیٹھ دھنی رام جیل کے افسروں اور عملوں کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ لوگ حیرت سے اُن کی طرف دیکھنے لگے۔ سیٹھ جی اتنے لاغر ہو گئے تھے کہ بڑی مشکل سے لکڑی کے سہارے چل سکتے تھے۔ قدم قدم پر کھانستے بھی جاتے تھے۔

امر نے آگے بڑھ کر ان کی تعظیم کی۔ انھیں دیکھتے ہی اُس کے دل کا غبار گویا دُھل گیا۔

سیٹھ جی نے اُسے دُعا دے کر کہا۔ "مجھے یہاں دیکھ کر تمھیں تعجب ہو رہا ہوگا بیٹا۔ تم سمجھتے ہوگے یہ کھوسٹ ابھی تک جیتا ہے اسے موت کیوں نہیں آتی۔ کیا کروں۔ موت کو بلاتے بلاتے ہار گیا۔ یہ بدنصیبی ہے کہ دنیا نے مجھے ہمیشہ بدگمانی کی نظروں سے دیکھا، میں نے جو کچھ کیا، اس میں لوگوں کو غرض کی بو آئی مجھ میں بھی کچھ سچائی ہے، کچھ درد ہے، کچھ غیرت ہے، کچھ انسانیت ہے، یہ کسی نے تسلیم نہیں کیا۔ دنیا کی نظروں میں نراجیوان ہوں، حریص، خود غرض

اسی لئے کہ میں سمجھتا ہوں ہر ایک کام کا وقت معین ہے۔ کچا پھل پال میں ڈال دینے سے پکتا نہیں۔ پکتا تبھی ہے جب پکنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ جب میں اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی گہری تاریکی کو دیکھتا ہوں تو مجھے صبح کی روشنی کے سوا، اُسے بتانے کی کوئی دوسری تدبیر نہیں سوجھتی۔ کسی دفتر میں جاؤ۔ بغیر رشوت کے کام نہیں چلتا۔ کسی گھر میں جاؤ حسد کا راج پھیلا ہوا ہے۔ کسی قومی تحریک کو دیکھو وہی نفسانیت، وہی خودغرضی۔ اسے ایشور کی مرضی ہی دور کر سکتی ہے اس طرح کی تحریکوں پر مجھے اعتبار نہیں ہے۔ ان سے محبت کی جگہ نفرت بڑھتی ہے۔ جب تک مرض کی ٹھیک تشخیص نہ ہو گی، باہر کی ٹیم ٹام سے کچھ نہ ہوگا"

امرکانت نے پوچھا۔ "تو ہم لوگ اس مبارک دن کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں؟"

ایک وارڈر دوڑ کر کئی کرسیاں لایا۔ سیٹھ جی اور جیل کے دونوں افسر بیٹھے۔ سیٹھ جی نے پان نکال کر کھایا اور اتنی دیر میں اس اعتراض کا جواب سوچ لیا تب بزرگانہ شفقت کے انداز سے بولے۔ "نہیں میں یہ نہیں کہتا۔ یہ اپاہجوں اور ناکاروں کی دلیل ہے۔ ہمیں عوام میں دل و دماغ کی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیئے۔ جس وقت قوم کی روح بیدار ہو جائے گی اُسے جبر سے قابو میں رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ میں اسے کبھی نہیں مان سکتا کہ آج آدھی مالگذاری ہوتے ہی رعایا خوشحالی کی چوٹی پر جا پہنچے گی۔ اس میں ایسے کتنے ہی ذہنی اور معاشرتی نقائص ہیں کہ آدھی تو کیا پوری مالگذاری بھی چھوڑ دی جائے پھر بھی ان کی حالت میں کوئی نمایاں فرق نہ ہو گا۔ اس مسئلہ پر گورنر صاحب سے میرا خوب مباحثہ ہوا۔ اور ہم اسی نتیجے پر پہنچے کہ ایسے پیچیدہ معاملے میں کافی غور و خوض سے کام نہیں لیا گیا۔ تم جانتے ہو ان سے میری کتنی بے تکلفی ہے۔ منی رام

کی وفات پر انھوں نے خود ماتم پرسی کا تار بھیجا تھا، تمھیں شاید معلوم نہ ہو۔ گورنر صاحب نے بذات خاص اس علاقے کا دورہ کیا۔ پہلے تو کوئی آدمی ان سے ملنے آتا ہی نہ تھا۔ وہ ہنس رہے تھے کہ ایسی سوگھی اکڑ کہیں نہیں دیکھی۔ جسم پر ثابت کپڑے نہیں ہیں، لیکن مزاج یہ ہے کہ ہمیں کسی سے کچھ نہیں کہنا ہے۔ بڑی مشکل سے تھوڑے سے آدمی جمع ہوئے۔ جب ہز ایکسیلنسی نے انھیں تسلی دی اور کہا تم لوگ دُرد مت۔ ہم تمھارے ساتھ بے انصافی نہیں کرنا چاہتے۔ ہم کو خوب معلوم ہے کہ تمھاری حالت قابل رحم ہے، تب سب کے سب رونے لگے۔ ہز ایکسیلنسی اس قضیے کو جلد سے جلد طے کر دینا چاہتے ہیں۔ اور اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ سب قیدی رہا کر دئے جائیں اور ایک کمیٹی بنائی جائے جس میں تین آدمی سرکار کے ہوں اور پانچ علاقے سے۔ اور اس میٹی کا فیصلہ ناطق ہو۔ اس میں تم اور سیاں سلیم تو ہوں گے ہی، تین آدمیوں کو تمھیں چننے کا اور اختیار ہوگا۔ صدر جلسہ اتفاق رائے سے چنا جائے گا۔ بس میں تمھیں یہی خبر دینے آیا ہوں۔ اور مجھے امید ہے تمھیں اس تجویز کے قبول کرنے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ موجودہ حالات میں اس سے بہتر شرطیں نہیں مل سکتی تھیں اور اگرچہ اس میں خودستائی کا پہلو ہے، لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ اس موقع پر ہز ایکسیلنسی سے میرا چپقلش خاصی جھوڑ ہوئی۔ اور کئی بار تو ایسا معلوم ہوا کہ موقع میرے ہاتھ سے نکل رہا ہے، لیکن میں نے تحمل سے کام لیا اور اس کا نتیجہ تمھارے سامنے ہے۔"

سکینہ اور منی میں کانا پھوسی ہونے لگی۔ سلیم کے چہرے پر بھی رونق آگئی لیکن امرا اسی طرح خاموش، خیالات میں ڈوبا بیٹھا رہا۔

سلیم نے بے صبری کے ساتھ پوچھا۔ "ہمیں کامل اختیار ہوگا جسے چاہیں چنیں؟"

"کامل"

"اور جیسا آپ نے فرمایا اُس کا فیصلہ ناطق ہوگا؟"

سیٹھ جی نے ہچکچا کر کہا۔ "میرا تو ایسا ہی خیال ہے۔"

"ہمیں آپ کے خیال کی ضرورت نہیں۔ ہم تو ان شرطوں کو تحریر میں دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"اور اگر تحریر نہ ملے۔"

"تو ہمیں یہ معاہدہ منظور نہیں۔"

"نتیجہ یہی ہوگا کہ یہیں پڑے رہو گے اور رعایا تباہ ہوتی رہے گی۔"

"جو کچھ بھی ہو۔"

"تمھیں تو یہاں کوئی خاص تکلیف نہیں ہے۔ لیکن غریبوں پر کیا بیت رہی ہے یہ سوچو۔"

"خوب سوچ لیا ہے۔"

"نہیں سوچا۔"

"سوچ لیا ہے۔"

"بالکل نہیں سوچا۔"

"خوب اچھی طرح سوچ لیا ہے۔"

"سوچتے تو ایسا نہ کہتے۔"

"سوچا ہے اسی لئے ایسا کہہ رہا ہوں۔"

امر نے تحکمانہ انداز سے کہا۔ "کیا کر رہے ہو سلیم۔ کیوں حجت کر رہے ہو۔ اس سے فائدہ؟"

سلیم نے تیز ہو کر کہا۔ "میں حجت کر رہا ہوں! واہ ری آپ کی سمجھ!

سیٹھ جی مالدار ہیں، حکام رس ہیں - اس لئے وہ حجت نہیں کرتے، میں غریب ہوں، قیدی ہوں، مظلوم ہوں، اس لئے حجت کر رہا ہوں۔"

"سیٹھ جی بزرگ ہیں۔"

"یہ آج سنا کہ حجت کرنا بزرگی کی نشانی ہے۔"

امر اپنی ہنسی نہ روک سکا۔ بولا، "یہ شاعری نہیں ہے بھائی جان کو جو میں آیا بک گئے۔ یہ ایسے معاملے ہیں جن پر لاکھوں آدمیوں کی زندگی بنتی بگڑتی ہے۔"

"شاعری کی آپ نے اچھی قدر کی۔ مانتا ہوں جناب کی سخن فہمی کو، شاعری آپ کے خیال میں بکواس ہے۔ معقول، یہ شاعری نہیں ہے بھائی جان کہ جو منہ میں آیا بک گئے، یہ الفاظ بہت دن یاد رہیں گے۔ اس کے بعد میری نظروں میں تمہاری آدھی عزت بھی نہیں رہی۔ جس نے دل نہیں پایا اسے میں انسان نہیں سمجھتا۔"

"اچھا میں حیوان سہی، وحشی سہی۔ کیا گردن مار دوگے۔ محترم سیٹھ جی نے اس مسئلے کو حل کرنے میں ہماری مدد کی ہے جیسا اُن کا فرض تھا۔ اور اس کے لئے ہمیں اُن کا شکر گذار ہونا چاہیے۔ ہم اس کے سوا اور کیا چاہتے ہیں کہ غریب کسانوں کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ اور جب اُس مقصد سے ایک کمیٹی بنائی جا رہی ہے تو ہمارا فرض ہے کہ اس کا خیر مقدم کریں۔"

سیٹھ جی نے خوش ہو کر کہا "کیسی اچھی تشریح کی ہے کہ واہ! طبیعت خوش ہو گئی۔ ہز اکسیلنسی نے خود تمہاری تعریف کی۔"

جیل کے دروازے پر موٹر کار کا ہارن سنائی دیا۔ جیلر نے کہا۔ "لیجئے دیویوں کے لئے کار آ گیا۔ آیئے ہم لوگ چلیں۔ دیویوں کو تیاریاں کرنے دیں

بہنو، مجھ سے جو کچھ خطا ہوئی ہو اسے معاف کیجئے گا۔ میری نیت آپ کو تکلیف دینے کی نہ تھی۔ ہاں ضابطے کی پابندیوں سے مجبور تھا۔"

یہ طے پایا کہ سب کے سب ایک ہی لاری میں جائیں۔ دیویاں تیاریوں میں مصروف ہوئیں۔ امر اور سلیم کے کپڑے بھی بہن منگوا لائے گئے۔ آدھ گھنٹے میں قافلہ جیل سے نکلا۔

دفعتاً ایک دوسرا کار پہنچا اور اُس پر سے لالہ سمر کانت، حافظ حلیم، ڈاکٹر شانتی کمار اور سوامی آتمانند اتر پڑے۔ امر نے دوڑ کر باپ کے قدموں کو بوسہ دیا۔ آج اس کا دل سعادتمندانہ عقیدت سے امڈا پڑتا تھا۔ نینا گویا آنکھوں میں آنسو بھرے اُس سے کہہ رہی تھی، بھیّا دادا کو کبھی ناراض نہ کرنا۔ اُن کے طور طریق تمھیں ناگوار بھی گذریں، پھر بھی زبان مت کھولنا۔ وہ ان کے قدموں کو آنسوؤں سے دھو رہا تھا۔ اور سیٹھ جی اس کے اوپر موں ٹ کر رہے تھے۔

سلیم بھی حافظ جی کے گلے سے جا لپٹا۔ حافظ جی نے دعا دے کر کہا "خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تمھاری قربانیاں بارآور ہوئیں۔ کہاں ہے سکینہ، اُسے بھی دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا کر لوں۔"

سکینہ سر جھکائے آئی اور دست بستہ آداب بجا لا کر مودب کھڑی ہو گئی حافظ جی نے اُسے ایک نظر دیکھ کر سمر کانت سے کہا "سلیم کا انتخاب تو ایسا بُرا نہیں رہا۔"

سمر کانت مسکرا کر بولے "حسن کے ساتھ جہیز میں دیویوں کے اوصاف بھی ہیں۔"

خوشی کے موقعوں پر ہم اپنے غم بھول جایا کرتے ہیں۔ حافظ جی کو سلیم کے سول سروس سے الگ ہونے کا، سمر کانت کو نینا کا اور سیٹھ دھنی رام کو بیٹے کا

غم کچھ کم نہ تھا۔ مگر اس وقت سبھی خوش تھے۔ کسی جنگ میں فتح پا جانے کے بعد اہل سیف مرنے والوں کے نام کو رونے نہیں بیٹھتے۔ وہ تو جشن کا موقع ہوتا ہے، شادیانے بجتے ہیں، محفلیں جمتی ہیں، مینار کبابیاں دیکھاتی ہیں۔ رونے کو ہم تنہائی ڈھونڈھتے ہیں۔ اور ہنسنے کے لئے مجمع۔

سب خوش تھے۔ صرف امر کانت اداس تھا نہ جانے کیوں؟

جب لوگ اسٹیشن پہنچے تو سکھدا نے پوچھا "تم اتنے اداس کیوں ہو؟"

امر نے جیسے جاگ کر کہا۔ "میں اداس تو نہیں ہوں۔ اداس کیوں ہوتا"

"اداسی کہیں چھپانے سے چھپتی ہے"

"اداس نہیں ہوں صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ میرے ہاتھوں بلاوجہ جان و مال کا اتنا نقصان ہوا۔ جس مصلحت سے اس وقت کام لیا گیا کیا اس سے اس وقت نہ لیا جا سکتا تھا؟ اس ذمہ داری کا بوجھ مجھے دبائے ڈالتا ہے"

"میں تو سمجھتی ہوں ان قربانیوں کے بغیر اس معاہدے کی نوبت نہ آتی"

اسی وقت امر کانت پوتے کو کندھے پر بٹھائے ہوئے آ کر بولے۔

"ابھی تو گھر ہی چلنے کے ارادے ہیں؟"

امر نے کہا۔ "مجھے تو ابھی ہردوار جانا ہے"

سکھدا بولی۔ "تو ہم سب وہیں چلیں گے"

سمر کانت نے مایوس ہو کر کہا۔ "اچھی بات ہے، تو میں ذرا بازار سے سلونی کے لئے ساڑیاں لیتا آؤں"

سکھدا نے آنکھ مار کر کہا۔ "سلونی ہی کے لئے کیوں۔ منی بھی تو ہے"

منی ادھر ہی آ رہی تھی۔ اپنا نام سن کر پوچھ بیٹھی۔ "کیا مجھ سے کچھ کہتی ہو؟"